(۲)

مرتبہ
کمال احمد صدیقی

منتخب
اردو
ڈرامے
(۲)

سلسلہ مطبوعات نمبر ۳۶۱

مرتبہ کمال احمد رضوی
طابع شیخ نیاز احمد
مطبع علمی پرنٹنگ پریس لاہور
۱۹۶۰ء

پھول، موسیقی اور چاندنی رات کے نام

# مندرجات

# پیش لفظ

منتخب اردو ڈرامے کی پہلی جلد، یک بابی ڈراموں کے لیے مخصوص تھی لیکن زیر نظر مجموعہ اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے اور اس میں طویل اردو ڈراموں کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے -

یک بابی ڈرامے اور طویل ڈرامے میں وہی فرق ہے جو افسانے اور ناول میں ہوتا ہے - زندگی کے وہ چند لمحات، افسانہ کی ہیئت میں سموئے جاتے ہیں جو انفرادی زندگی میں ایک موڑ ' سنگ میل یا ذہنی انقلاب کی حیثیت رکھتے ہوں- افسانہ میں کردار یا ماحول کی کشمکش ہوتی ہے - فرد کے عمل اور عمل کا بیان ہوتا ہے - اس کے برعکس کامیاب ناول یک وقت معاشرہ اور افراد کی جدوجہد زندگی کا مرقع ہوتا ہے - جس طرح لمحات و تاثرات کی گہرائیاں ناول میں ابھرتی ہیں اس طرح مکمل ڈرامہ زندگی کے ان حقائق و نظریات کی کشمکش اور تصادم کی بنیادوں پر تعمیر ہوتا ہے جو انسانی جد و جہد کا ازلی و ابدی نقطہ آغاز ہے - ناول کی حدیں جہاں پر آ کر ختم ہو جاتی ہیں وہاں سے ڈرامہ کا آغاز ہوتا ہے -

ڈرامہ کی عمارت عمل اور الفاظ کے ایسے اٹوٹ پتھروں سے تعمیر ہوتی ہے جو زندگی کے جذبات و احساسات ، خواہشات اور تصورات سے مرصع ہونے کے باعث یادگار عمارت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے - یہی عمارت ہمہ گیر اور اجتماعی زندگی کی ایک عظیم رمزیہ علامت بھی ہوتی ہے - لہذا ڈرامہ واقعات اور حادثات کے ماورا انہی حقائق کو پیش کرنے کا نام ہے جہاں ادب کی دیگر اصناف شدت عمل اور تاثر کو قائم رکھنے میں بے مایہ ثابت ہوئی ہیں - ڈرامہ کی تکمیل کا آخری نقطہ اسٹیج ہے - بدقسمتی سے ہمارا اردو ڈرامہ اس نقطہ سے محروم ہے - تاہم ادیبوں نے ادب کی اس عظیم صنف کو اپنانے کی ضرورت محسوس کی کیونکہ اجتماعی زندگی کے تغیرات و انقلابات کا تقاضا تھا کہ

ان تغیرات و انقلابات کے پس منظر ان حقائق اور احساسات کو شعور اور جذبات کے متوازی زاویوں میں پیش کیا جائے ، جہاں ناول اور شاعری اپنے یک طرفہ تاثرات کی وجہ سے کامیابی حاصل نہیں کر سکتے -

ان ڈراموں کے انتخاب میں ڈرامہ کی اهمیت اور معیار کو مدنظر رکھا گیا ھے - مجھے معلوم ھے کہ ان ڈراموں کو اسٹیج کی کسوٹی میسر نہیں آئی ان میں تکنیک کی پختگی اور حقائق کی همه گیر اهمیت اپنی جگہ بدرجہ اتم موجود ھے - اور اس لیے مجھے یقین ھے کہ ان ڈراموں کو جب بھی اسٹیج کی روشنی اور سائے میسر آئینگے تو یہ ڈرامے اپنی بھر پور کیفیت کی وجہ سے اپنی تاریخی اور عبوری دور کی پوری پوری نمائندگی کر سکینگے -

ان ڈراموں کی ادبی اور فنی نوعیت ایک تاریخی اور عبوری دور کی حامل ھے' چنانچہ موضوعات کے اعتبار سے یہ ڈرامے اجتماعی زندگی کے ان تغیر آمیز ادوار کو پیش کرتے ھیں - جنھیں ھماری ملکی اور قومی زندگی کے انقلاب آفریں دور سے تعبیر کیا جاتا ھے -

ڈرامہ نگار ان ادوار کو جس فنکارانہ انداز سے پیش کرتا ھے یہی ڈرامہ کے فن کی جان ھے - چنانچہ یہ ڈرامے وقت کے ان دھاروں کو کامیابی سے پیش کرتے ہوئے محسوس ھوتے ھیں جن کے سنگھم پر جدید تاریخ کا عالی شان قصر تعمیر ھو رہا ھے -

برعظیم پاک و ھند میں انگریزوں کی عملداری کے ابتدائی دور سے لے کر پاکستان کے نئے معاشرے کی تشکیل تک کے عہد پر یہ ڈرامے محیط ھیں - مرزا ادیب کا ڈرامہ ''نند کمار'' انگریزی حکومت کے خلاف پہلا احتجاج تھا اور یہ احتجاج اس عظیم‌الشان تحریک آزادی کے لیے بیج ثابت ھوا جس کا ثمر آزادی وطن میں ملا - ابراھیم جلیس کا ڈرامہ ''اجالے سے پہلے'' اور مجتبٰی حسین کا ''انکار'' پاکستان کے اس معاشرہ کی کشمکش پر مبنی ھے جس میں پرانی قدروں کو ملیا میٹ کر کے نئی قدروں پر معاشرہ کی چار دیواری کھڑی کی جا رہی ھے -

"تیرے کوچے سے ہم نکلے" اور "دھانی بانکیں اس پر آشوب دور کی تصویر ہے، جب ملک کی تقسیم عمل میں آئی تھی - دلی کے وہ خاندان جن کو نسل بعد نسل کتنے ہی انقلابات دیکھنے پڑے تھے - اب انھیں اس دیار معروف کو چھوڑنا پڑا - قوموں کی راہ آزادی میں ایسے ہزاروں خاندانی المیے وقوع پذیر ہوتے ہیں' لیکن تاریخ کا کارواں ان المیوں کو روندتا ہوا آگے نکل جاتا ہے - اور ماضی کی گردان خاندانی اور انفرادی المیوں کو ہمیشہ کے لیے معدوم کر دیتی ہے - لیکن فن خصوصاً ڈرامے کا فن ماضی کے گردوغبار کے درمیان ان المیوں کی ایک شاندار عمارت کھڑی کر دیتا ہے جو تاریخ و ثقافت کی مخصوص منزلیں بن جاتی ہیں -

ان ڈراموں میں حقیقت نگاری یا واقع نگاری کا رنگ غالب ہے اور اس کی وجوہات بھی واضح ہیں - در اصل ڈرامہ نگار کے سامنے واقعات کا انقلاب آفریں سلسلہ ہمہ گیر شدت سے جاری و ساری ہے - اسے ان واقعات کو جو ہماری تاریخ کے مختلف مگر اہم ابواب ہیں سمجھنے اور پھر فن میں سمونے سے فرصت نہیں ملتی کہ وہ ان واقعات سے ماورا نظریات کے تصادم کو علامتی کرداروں سے پیش کرنے کی طرف متوجہ ہو تاہم ان واقعات میں اتنی جان موجود ہے اور یہ اتنے نتیجہ خیز ہیں کہ انہیں ڈرامہ کی ہیئت میں پیش کرنے سے ادب میں ان کا مخصوص مقام پیدا ہو گیا ہے -

محمد مجیب کا ڈرامہ "حبہ خاتون" اور حبیب تنویر کا "آگرہ بازار" مزاج اور تنوع کے لحاظ سے دو الگ الگ موضوعات ہیں لیکن ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ ثقافت کے اس دور کی نشان دہی کرتے ہیں جو دور ماضی کے خزائن میں مدفون ہو چکا ہے - آگرہ اور کشمیر کے درمیان ایک بڑا فاصلہ حائل ہے لیکن اس فاصلہ کو ادب نے اس طرح دور کیا ہے کہ کشمیر کی پر سکون وادی اور آگرہ کی چہل پہل کے تفصیلی نقوش ایک ہی نظر میں دیکھ سکتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو مرحوم کا ڈرامہ "اس منجدھار میں" ایک نیا تجربہ ہے - اور اس سے قطع نظر کہ اس میں منٹو کا مخصوص انداز تحریر جلوہ گر ہے '

اس میں جذباتی کشش مکش اور محرومی آرزو کو بڑے موثر فنکارانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے ۔ اور یہی اس کی عظمت ہے ۔

اپندرناتھ اشک کا ڈرامہ' قیدحیات ، متوسط طبقہ کی ان اخلاقی اور تمدنی قدروں پر ابھرتا ہے ۔ جن میں معمولی سا جھول پڑ جانے سے اس طبقہ کی زندگی درھم برھم ہو جاتی ہے ۔ اقدار کی ان سلوٹوں ھی سے ڈرامہ نگار فن کا ابدی پیراھن تیار کرتا ہے ۔

مختصر یہ کہ یہ ڈرامے رواں دواں زندگی کے ایسے نقوش ھیں جنھیں ڈرامہ اپنی ھیئت اور اپنے اندرونی استدلال کی مدد سے غیرفانی بنا دیتا ہے ۔ ڈرامے کی خصوصیت بھی یہی ہے ۔ ان سب باتوں کے باوجود ڈرامہ پر نئے نئے تجربات ھوتے رھیں گے نئے تھیٹر کی تعمیر اور اسٹیج کی ترقی سے ڈراموں میں نیا خون نئی زندگی اور نئی نشو و نما پیدا ھوگی ، لیکن ڈراموں کے زیر نظر مجموعہ کی اپنی تاریخی اور ثقافتی اھمیت قائم رھے گی ۔ بلکہ مجھے امید ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان ڈراموں کی ادبی حیثیت زیادہ واضح ھوتی جائے گی ۔ اور نہ صرف ڈرامے کے طالب علم کے لیے یہ تاریخی دستاویز ثابت ھوگا بلکہ ڈرامہ کھیلنے والوں کے لیے بھی اس میں نمایند مواد حاصل ھو سکے گا ۔

آخر میں ان تمام اھل قلم دوستوں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جن کے تعاون کے بغیر یہ ادبی دستاویز کبھی مکمل ھو کر منظرعام پر نہیں آ سکتی تھی ۔

کمال احمد رضوی

لاھور ۱۳ مئی ۱۹۶۰ء

ابراہیم جلیس

# کردار

اعظم : ایک خوبصورت صحت مند بے روزگار گریجویٹ

مجید : اعظم کے کالج کا ساتھی۔ بے روزگار گریجویٹ۔

نُورافشاں : نوجوان خوبصورت بی اے پاس لڑکی۔

کرنل ارباب خاں : نورافشاں کا باپ۔ ریٹائرڈ کرنل۔

مسعود علی خان : نوجوان سرمایہ دار۔ نُورافشاں کا عاشق

حاکم علی خاں : پروپرائٹر گرٹ اینڈ ٹیپ فرم۔

○

# پہلا منظر

ایک ادنیٰ متوسط درجے کے گھرانے کا کمرہ جس میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی ہیں۔ لکھنے کی میز دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ہے جس پر بہت سی کتابوں۔ اخباروں اور رسالوں کا ڈھیر پڑا ہوا ہے اس میز کے اوپر فلمی ستاروں کی دو تصویریں فریموں میں لگی ہوئی آویزاں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کمرے میں دو گریجویٹ رہتے ہیں جن میں سے ایک اس وقت چارپائیوں کے سرہانے آمنے سامنے رکھی ہوئی دو آرام کرسیوں میں سے ایک آرام کرسی پر بیٹھا کچھ پڑھنے میں مشغول ہے اس نے شب خوابی کا ڈھیلا پاجامہ اور ٹوٹے ہوئے بٹنوں والی کھلے گریبان کی میلی قمیض پہن رکھی ہے وہ ایک خوبصورت اور صحت مند نوجوان ہے۔ سامنے دیوار پر ایک پرانی وضع کا وال کلاک گیارہ بجنے کے گھنٹے بجاتا ہے۔ نوجوان چونک کر کلاک کی طرف دیکھتا ہے۔

**نوجوان:** (بلند آواز سے) اوہ — گیارہ بج گئے —!

(کرسی سے اٹھتا ہے چارپائی کے نیچے سے سوٹ کیس گھسیٹ کر باہر نکالتا ہے۔ اس میں سے ایک صاف ستھری دھلی ہوئی سفید قمیض اور بنیان نکال کر کندھے پر ڈال لیتا ہے اور چارپائی سے تکیہ اٹھا کر دیکھتا ہے کہ اس کی پتلون غائب ہے جو "کریز" کی خاطر اس نے تکیے کے نیچے رکھی تھی وہ کچھ پریشان سا ہو جاتا ہے اور

پکارتا ہے )

بانو ———— بانو ———— !

( اندر سے ایک ننھی بچی کی آواز آتی ہے )

جی ———— آئی بھائی جان —— !

( اس آواز کے دو تین لمحوں کے بعد ایک آٹھ دس سالہ خوبصورت
سی بچی جس کے دونوں ہاتھ آٹے میں گندھے ہوئے ہیں۔ جیسے
وہ ابھی ابھی آٹا گوندھ کر آ رہی ہو۔ کمرے میں داخل ہوتی ہے
اس وقت اس نوجوان کی پیٹھ لڑکی کی طرف ہے )

بانو : اعظم بھائی جان ———— آپ نے مجھے بلایا ؟

اعظم : ( پلٹ کر ) ہاں ———— دیکھو بانو ! میری گرم پتلون اندر تو نہیں ہے وہ جو مٹیالے رنگ کی ہے ،

بانو : ( کچھ سوچ کر ) وہ پتلون ! وہ پتلون تو مجید بھائی جان پہن کر گئے ہیں

اعظم : ( گھبراہٹ اور غصے کے ملے جلے لہجے میں ) کمبخت اُلو کا پٹھا اسے نہیں معلوم تھا۔ آج ۱۲ بجے میرا انٹرویو ہے۔

بانو : بھول گئیں ۔۔۔ ( مجید بھائی جان بھی تو انٹرویو میں گئے ہیں ان کا انٹرویو صبح نو بجے تھا۔ اس وقت آپ سو رہے تھے وہ کہہ گئے تھے کہ میں ساڑھے گیارہ بجے تک ضرور واپس آ جاؤں گا۔

اعظم : اگر وہ نان سنس ساڑھے گیارہ بجے تک واپس نہیں آیا تو پھر میں اپنے انٹرویو میں کیا پہن کر جاؤں گا۔

بانو : ( پیار سے اعظم کی ٹھوڑی کو اپنا گندھا ہاتھ لگاتی ہے جس سے تھوڑا سا گیلا آٹا اعظم کی ٹھوڑی پر لگ جاتا ہے ) بھائی جان ———— انٹرویو میں آپ وہ پتلون پہن کر نہ جائیں تو بہتر ہے۔

اعظم : ( حیرت سے ) کیوں ؟

بانو : وہ پتلون تو بڑی منحوس ہے۔ میں کب سے دیکھ رہی ہوں۔ آپ اور مجید بھائی جان ہر انٹرویو میں وہی پتلون پہن کر جاتے ہیں لیکن نہ تو آپ کو نوکری ملتی ہے اور نہ مجید بھائی جان کو۔

(اعظم کھسیانا ہو کر مسکراتا ہے اور بانو کو اٹھا کر اس کی پیشانی چومتا
ہے اور اسے اپنے ساتھ بٹھا کر اسے سمجھانے کے انداز میں کہتا ہے)

اعظم : اَنّی ڈیر چوہوں کی خالہ —— تم تو اب بہت بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہو۔ مگر بانو —— دراصل یہ تیلون منحوس نہیں ہے بلکہ یہ نظام منحوس ہے اور جب تک یہ نظام منحوس رہیگا اس وقت تک میں اور مجید جیسے فرسٹ کلاس گریجویٹ یونہی بے روزگاری کے چکر میں مبتلا رہیں گے سمجھی —— !

بانو : (معصومیت سے) جی نہیں سمجھی —— کون نظام ؟ —— وہ جو آپ کے دوست نہیں ہیں کالے سے ۔ وہ جنہوں نے مجھے چاکلیٹ کا ڈبہ دیا تھا ؟

اعظم : ارے وہ نہیں پگلی —— یہ ہمارا معاشی اور اقتصادی نظام ۔ وہ بیچارہ ٹھیک ہے کہ وہ لمبا بھی ہے اور کالا بھی —— لیکن وہ کسی غریب اعظم کی ننھی بہن کو چاکلیٹ کا ڈبہ کبھی نہیں دیتا ۔

(اندر سے اعظم کی اماں کی آواز آتی ہے)

آواز : بانو —— بیٹی بانو —— !

بانو : آئی امی —— ادھر بانو ادھر بانو —— ایک ننھی سی جان پر کتنی مصیبت ہے ۔
—— امی امی —— امی امی ——

(اندر بھاگ جاتی ہے)

ایک لمحے کے بعد باہر کے دروازے سے ایک نوجوان کوٹ
کندھے پر ڈالے ۔ نکٹائی کی گرہ ڈھیلی کیے ۔ ہاتھ میں بی اے
کی ڈگری سرٹیفکٹوں کا پلندہ لیے تھکے ہارے قدموں اندر داخل
ہوتا ہے کوٹ اور کاغذات کا پلندہ چارپائی پر پھینک کر دھڑام
سے خالی آرام کرسی پر گر جاتا ہے)

اعظم : او مجید کے بچے ۔ تم میری پتلون پہن کر چلے گئے ۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ بارہ بجے میرا انٹرویو ہے ۔

مجید : (وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے) ابھی بارہ بجنے میں بہت دیر ہے یار ۔

**اعظم** : اس طرح لاٹ صاحب کی طرح مت بیٹھیو۔ اٹھو جلدی سے میری پتلون اتار کر مجھے دے دو۔ کمبخت ساری کریز تباہ کر دی۔

**مجید** : (کرسی سے اٹھتے ہوئے) اماں کیا کرو گے یار ایسے انٹرویوز میں جا کر۔ اپنے پاس نہ تشہیر ہے نہ ہمشیرہ۔ اس معاشرے میں نوکری تو صرف سالے بہنوئی قسم کے لوگوں کو ملتی ہے۔ سمجھ گئے مسٹر محمد اعظم بی۔ اے علیگ۔

**اعظم** : بکواس نہ کرو۔ جاؤ جلدی سے پتلون بدلو۔

(مجید اپنی چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ کر اپنا دھاری دار پاجامہ اور کرتہ اٹھا کر اندر جاتا ہے اور اعظم میز پر سے پاسنگ شو سگریٹ کی ڈبی سے ایک سگریٹ نکال کر جلاتا ہے اور کتاب اٹھا کر انٹرویو کے لیے تیاری کی خاطر ٹہلنے کے انداز میں زور زور سے پڑھنا شروع کر دیتا ہے)

**اعظم** :

(مجید اندر سے دھاری دار پاجامہ اور کرتہ پہنے نکل آتا ہے اور اعظم کے کندھے پر پتلون پھینکتے ہوئے کہتا ہے)

**مجید** : لو ڈیئر سنبھالو اپنی عزت آبرو کی محافظ پتلون

(اعظم کتاب بند کر کے میز پر رکھتا ہے۔ چارپائی پر سے اپنی قمیص بھی اٹھاتا ہے اور پیکٹ سگریٹ مجید کے حوالے کر کے اندر چلا جاتا ہے۔ مجید سگریٹ کو چوم کر آرام کرسی پر دراز ہو جاتا ہے اور تپائی پر لمبی ٹانگیں پھیلا کر دلآویز ترنم کے ساتھ گنگنانے لگتا ہے)

●

بڑا دکھ ہے ہم کو کہ بیکار ہیں ہم
حیات عمل کے گنہگار ہیں ہم

یہ کھیتی ہے جس میں دفینے مکیں ہیں
وہ دریا ہے جس میں گہر ہمنشیں ہیں
وہ جنگل ہیں جو رشکِ خلدِ بریں ہیں
یہ فطرت کے انعام اپنے نہیں ہیں

تہی دست و محروم و نادار ہیں ہم
بڑا دکھ ہے ہم کو کہ بیکار ہیں ہم
کہاں زر پرستی کہاں قدر دانی
کہاں لوٹ غارت کہاں مہربانی
کہاں تک یہ بالجبر مر مر کے جینا
لہو بن کے کھولے جبیں پر پسینہ
دھڑکتی ہیں نبضیں سلگتا ہے سینہ

بڑا دکھ ہے ہم کو کہ بیکار ہیں ہم
حیات و عمل کے گنہگار ہیں ہم

(اعظم قمیص اور پتلون پہنے نکل رہا ہے۔ مجید کو گنگناتا دیکھ کر کہتا ہے)

**اعظم** : او یاس پسند شاعر۔ بند کرو اپنا نوحہ۔ اور بتاؤ مجھے کہ تمہارے انٹرویو میں کیا کیا سوالات پوچھے گئے؟

(یہ کہہ کر وہ ٹائی ہاتھ میں لیے دیوار پر لٹکے ہوئے چھوٹے سے
آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر نکٹائی باندھنے لگتا ہے)

**مجید** : (ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھر کر) ہائے ہائے۔ انٹرویو تھا بنک کی کلرکی کا۔ اور سوالات یہ پوچھے گئے

سوال نمبر ایک : پاکستان کے دشمن ملک افغانستان کو روپیہ کس بنک یا بنکوں کی معرفت بھیجتے ہیں؟

**اعظم** : (نکٹائی باندھتے ہوئے) تم نے کیا جواب دیا۔

**مجید** : میں نے جواب دیا کہ یہ ایک راز ہے جس کو فاش کرنا مفادِ عامہ کے لیے مضرت کا باعث ہو سکتا ہے۔

**اعظم** : ہونہہ!

**مجید** : سوال نمبر ۲ ۔ "فلاں سوڈا واٹر کی ایک بوتل کی کیا قیمت ہے؟" میں نے جواب دیا۔ خریدار کی جیب میں جتنے بھی پیسے ہوں ۔

(اعظم جو ٹائی باندھ چکا ہے۔ بالوں میں کنگھا کر رہا ہے)

**مجید** : سوال نمبر ۳ ۔ ان کتابوں میں سے کس کتاب کو عالمگیر شہرت حاصل ہے؟ بک آف نالج یا چیک بک؟

**اعظم** : ویری انٹرسٹنگ کویسچن! تم نے کیا جواب دیا۔

**مجید** : میں نے جواب دیا ——— بلاشبہ چیک بک جناب ۔

**اعظم** : بڑے میز آف فیکٹ قسم کے آدمی ہو یار تم ۔

**مجید** : شکریہ ۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ اب رہا آخری سوال ۔ پوچھا گیا کہ ——— پاکستانی عوام نے اپنے مکمل اعتماد کا جو چیک اپنے رہنماؤں کو دیا تھا آیا وہ کیش ہوا یا نہیں؟

**اعظم** : (کوٹ پہنتے ہوئے) گویا ایک ہی معقول سوال پوچھا گیا۔ تم نے کیا جواب دیا۔ یہ سوال سنکر تو تمھاری سٹی گم ہو گئی ہو گی ۔

**مجید** : ہاں جانو یار ——— وہ فرسٹ کلاس رہا ہے کہ اسٹوڈیو پورڈ عش عش کرنے لگ گیا۔ میں نے جواب دیا "حضور عوام کے مکمل اعتماد کا بینک چیک ایک آرڈر چیک تھا اور رہنماؤں کی بینک میں تو اکاؤنٹ تھا اوور ڈرافٹ ۔

**اعظم** : بہت اچھے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری صحبت میں تم دن بدن عقل مند ہوتے جا رہے ہو

**مجید** : (طنزیہ لہجے میں) جی ہاں اچھے خوبصورت ہیں آپ ۔

(اعظم مسکراتا ہے اور میز پر سے اپنی بی اے کی ڈگری اور سرٹیفکیٹوں کا پلندہ اٹھاتا ہے اور کہتا ہے)

**اعظم** : اچھا۔ ممی گو ناؤ ۔ وِش می گڈ لک ۔

**مجید** : بائی بائی ——— مے سکسیس بی یور ڈیو۔

(اعظم دروازے تک جاتا ہے اور ہاتھ ڈال کر کچھ سوچتا ہے۔ اور
پلٹ کر کہتا ہے)

اعظم: ارے ہاں یار مجید۔ تمھارا ایک خط آیا ہوا ہے۔ غالباً تمھارے والد کا ہے کیونکہ لفافے پر ٹنڈو آدم کی مہر لگی ہوئی ہے

(جیب سے خط نکال کر اس کی طرف لوٹتا ہے اور خط لے لیتا ہے)

مجید: روپیہ منگوایا ہوگا (لفافہ چاک کرتے ہوئے) ہم تو یار ش
خط کا مضمون جانے بغیر ہی لفافہ دیکھ کر

(مجید بہ آوازِ بلند خط پڑھتا ہے اور اعظم سنتا ہے)

از ٹنڈو آدم (سندھ) ۷۸۶/۹۲

برخوردار نور چشم میاں مجید جان طول عمرہ

دعا بعد لوری پیار ——— ہم تمام خیریت سے ہیں تمھاری خیریت نیک مطلوب الٰہی
نیک چاہتے ہیں۔ دیگر احوال یہ ہے کہ دریائے سندھ میں سیلاب اور بارشوں کے باعث اس
سال فصل بالکل برباد ہو چکی ہے۔ بڑی پریشانی لاحق ہو گئی ہے۔ تمھیں یہاں سے گئے ہوئے
چار مہینے ہو چکے ہیں۔ ابھی تمھیں نوکری ملی یا نہیں؟ پچھلے خط میں تم نے لکھا تھا کہ ایک ہفتہ
کے اندر اندر تمھیں نوکری مل جائے گی۔ پتہ نہیں تم وہاں کیا کر رہے ہو۔ خدا تمھیں صحبتِ بد سے
بچائے۔ تم نے لکھا تھا کہ عنقریب روپیہ بھی بھیجوں گا۔ روپیہ جلد بھیجو۔ ہماری بڑی ننگی
میں بسر ہو رہی ہے۔

اعظم: (چونک کر) ننگی میں بسر ہو رہی ہے
مجید: اوہ ——— تنگی میں بسر ہو رہی ہے۔ قبلہ والد صاحب نقطوں کو زیادہ اہمیت دینے کے قائل نہیں
معلوم ہوتے۔
اعظم: چلو آگے پڑھو۔
مجید: ہاں تو ہماری بڑی تنگی میں بسر ہو رہی ہے۔ تمھارے دونوں چھوٹے بھائی ——— آوارہ

بھگ گئے ہیں۔ کیونکہ ہمارا سکول کی عمارت کو ایک بڑے افسر کی رہائش گاہ کے
لیے الاٹ کر دیا گیا ہے اس لیے ان کا پڑھنا لکھنا سب ختم ہو گیا ہے۔ دن بھر
سڑکوں پر گلی ڈنڈا اور گولیاں کھیلتے رہتے ہیں اور بازاری گالیاں سیکھ رہے ہیں۔
مولا رحم کرے تمہاری اماں کی آنکھیں بہت خراب ہو گئی ہیں وہ عینک لگانا
چاہتی ہیں۔ جب تم شنڈو آدم آؤ تو ان کے لیے ایک دس نمبری عینک ضرور لیتے آؤ۔

**اعظم** : دس نمبری عینک ۔ بہت خوب ۔

**مجید** : (پڑھتے ہوئے) پیاری بیگم کی زچگی ہو گئی ہے۔ جڑواں بچے ہوئے تھے ایک تو مر گیا
دوسرا حیات ہے۔ زچہ اور بچہ دونوں اللہ کے فضل سے تندرست ہیں۔ اب
کی بقر عید پر شنڈو آدم ضرور آؤ۔ اور ہاں آتے ہوئے کراچی کا ایک بکرا بھی ضرور
لیتے آنا بڑی تعریف سنی ہے کراچی کے بکروں کی۔ کسی جاننے والے کے ذریعہ
گھر کا تیار کردہ ایک مکھن کا ڈبہ بھیجوں گا ہر کھانے میں مکھن استعمال کرو۔ صحت
کا خیال رکھو۔ اپنے دوست اعظم کو سلام کہنا

**اعظم** : وعلیکم سلام۔ اور دیگر احوال یہ ہے کہ مکھن کا ڈبہ ضرور بھیجئے کراچی میں ہر جگہ مکھن کی ضرورت پڑتی ہے۔

**مجید** : (پڑھتے ہوئے) خط کا جواب جلد دو اور کم از کم سو روپے بواپسی ڈاک بذریعہ
تارمنی آرڈر بھیج دو سخت انتظار رہے گا۔

تمہارا باپ

چودھری یوسف خاں

خط بند کرتے ہوئے اکبر ا لاؤ ــــــــ روپیہ بھیجو بذریعہ تارمنی آرڈر
بھیجو ــــــــ"

**اعظم** : یار مجید! چودھری صاحب نے روپیہ تو ایسی بے تکلفی سے منگوایا ہے۔ جیسے ان کا فرزند
دلبند پاکستان کا وزیر خزانہ لگا ہوا ہے۔

مجید : (لمبی ٹھنڈی سانس لےکر) واہ جی۔ میرے پیارے والد چودھری یوسف خاں صاحب۔ اللہ آپ کو ہمیشہ اچھا رکھے۔

اعظم : اچھا بھئی اب میں چلا۔ بڑی دیر ہو گئی۔

مجید : آل رائیٹ۔ بائی۔ بائی۔

(اعظم باہر چلا جاتا ہے۔ مجید آرام کرسی پر دراز ہو جاتا ہے)

پردہ

○

# دوسرا منظر

ایک سڑک۔ بس اسٹاپ۔ بس اسٹاپ کے ساتھ ایک
نوجوان اندازاً بائیس تئیس برس کی لڑکی بس کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کے
ہاتھ میں ایک اکسرسائز بکس کا ایک پلندہ ہے۔ آنکھوں پر سیاہ
رنگ کا چشمہ۔ سادہ مگر جاذب نظر لباس پہنے ہوئے ہے۔ بس
کے انتظار میں وہ ایک اکسرسائز بک دیکھ رہی ہے۔ اس کے علاوہ
بس سٹاپ پر کوئی نہیں ہے۔ سڑک بھی سنسان ہے۔ اتنے میں
اعظم ایک طرف سے داخل ہوتا ہے۔ اس نوجوان لڑکی کو دیکھ کر
رکتا ہے۔ مسکراتا ہے اور دبے پاؤں اس کی طرف بڑھتا ہے
اور اس کے قریب جا کر کہتا ہے

اعظم: ہیلو مس نور افشاں بی اے۔ بی ٹی۔

نور افشاں: (چونک کر) ارے اعظم! بڑے عرصے کے بعد دکھائی دئیے ہیں آپ! کہاں رہتے ہیں آج کل؟

اعظم: یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا نور کہ آج کل میں کہاں رہتا ہوں البتہ جب میں تمھیں دیکھتا ہوں تو پھر سوچنے لگ جاتا ہوں کہ مجھے کہاں رہنا چاہئیے! جی تو چاہتا ہے کہ اس سڑک کو چھوڑ کر اس راستہ پر چلنا شروع کر دوں جس پر تمہارے چہرے کا چاند کا اجالا پھیلا ہوا ہے جس کی فضا تمہاری چوڑیوں کی کھنک تمہارے پازیبوں کی جھنک اور تمہارے جسم کی خوشبو سے مہک رہی ہو جس کے کنارے تمہارے لمبے جسم کا سرو کھڑا ہے اور زلفوں کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں اجالا پھیلا ہوا ہے اور

نور افشاں: (شرماتے ہوئے) نان سنس کیا بکواس کر رہے ہو۔ یہ سڑک ہے۔ بس سٹاپ ہے کوئی یہ باتیں سن لے تو ——

**اعظم** : اس کی پرواہ نہ کرو نور۔ اول تو لوگ سسر سے یہاں موجود ہی نہیں۔ اگر ہوتے بھی تو وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ان شاپ بھی دنیا کی چند روشیک تحفوں میں سے ایک ہے۔

**نور افشاں** : (ہنستے ہوئے) اچھا اعظم! بانو آج کل اسکول کیوں نہیں آ رہی ہے؟

**اعظم** : یہ ھی خوب رہی بانو نے تو مجھے بتایا تھا کہ اس کی مس نے یہ کہا تھا کہ اگر اس نے بیٹے بھی اسکول نہیں بھیر لائی گی تو اسکول آنے کی ضرورت نہیں خود ہی منع کرتی ہو اور خود ہی پوچھتی بھی ہو۔

**نور افشاں** : واہ! میں اس کی مس تھوڑی ہی ہوں اس کی کلاس ٹیچر تو مس رضیہ ہے۔ رضیہ نے کہا ہوگا۔ میں تو نے صرف انگلش پڑھاتی ہوں میں بھلا ایسے کیسے کہہ سکتی ہوں جبکہ

**اعظم** : (بات کاٹتے ہوئے) جب کہ وہ محمد اعظم کی چھوٹی بہن ہے کیوں؟

**نور افشاں** : (پیار سے) ہرٹ نہ ہو آپ بانو کی تعلیم نہ روکیں۔ وہ بڑی ذہین لڑکی ہے اور فیس کا کیا ہے وہ کون سا بڑا مسئلہ ہے۔

**اعظم** : مس نور افشاں تعلیم کا مسئلہ ملک کے دفاع کے بعد سب سے اہم مسئلہ ہے لیکن فیس کا مسئلہ تو عام مسائل کا فادر ان لاء (FATHER IN LAW) ہے۔

**نور افشاں** : ان فضول باتوں کو چھوڑیئے۔ آپ کل سے بانو کو اسکول بھیجئے۔ فیس میں دے دیا کروں گی۔

**اعظم** : نہ نہ میڈم نو۔ یہ تکلیف نہ کیجئے۔ اب بانو کو آٹا ہی گوندھنے دیجئے۔ اس زمانے میں آٹا کتاب سے زیادہ ضروری ہے۔

**نور افشاں** : خواہ مخواہ غیرت برت رہے ہو۔

**اعظم** : غیرت نہیں بلکہ غربت برت رہا ہوں۔ اچھا اب مجھے اجازت دو۔ مجھے انسٹیٹیوٹ میں جانا ہے۔ ابھی بارہ بجے۔

(جانے لگتا ہے نور افشاں کہتی ہے)

**نور افشاں** : آؤ نا۔ بس ہم چلتے ہیں۔

(اعظم کوٹ کی دونوں جیبیں باہر الٹ کر)

اعظم : ادھر تو بس یہی ہے نور۔

نور افشاں : ٹکٹ میں لے لوں گی۔

اعظم : اب تو صرف ایک بار ٹکٹ کٹوانے کا ارادہ ہے میڈم۔ اور وہ بھی اس صدیوں برس پرانی دنیا سے جانے کے وقت۔

نور افشاں : بے کار کی گپ چھوڑو اعظم۔ آؤ۔

اعظم : (اس کے قریب جا کر) انتظار کرو نور۔ ہماری زندگی میں وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جب ہم دونوں بس، ٹرام، ٹرین، اسٹیمر، ہوائی جہاز، سینما اور کرکٹ میچ کے ٹکٹ اکٹھا خریدا کریں گے۔

نور افشاں : (ہنستے ہوئے) جلدی کیسی کیسے۔ اچھا اعظم۔ دیکھو آج شام کو تو آ رہے ہو نا۔ مجھے تم سے بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں آج شام چھ بجے برنس گارڈن میں تمہارا انتظار کروں گی۔ آؤ گے نا!

اعظم : آف کورس۔

نور افشاں : مجھے بہت شدت سے انتظار رہے گا۔

اعظم : میں ضرور آؤں گا۔ وہ دیکھو تمہاری بس آ رہی ہے ٹاٹا۔

نور افشاں : (ہاتھ ہلاتے ہوئے بس کی طرف بڑھتی ہے۔ اعظم اپنے راستے پر چلا جاتا ہے)

پردہ

# تیسرا منظر

(اسٹیج ایک چوبی پٹے سے دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک طرف ایک
کمرہ ایک میز اور میز کے سامنے ایک کرسی ہے۔ میز چھوٹے
کمرے کی ہے جس پر دوات قلم اور کیلنڈر رکھے ہیں۔ گویا ساری
اسٹیشنری سجی ہوئی ہے جو ایک دفتر کی میز پر ہوتی ہے۔ چوبی پٹے
کے دوسری طرف ایک کرسی پر چپڑاسی سویا ہے اور ساتھ میں ایک لمبی
کی رسی بھی بندھی ہوئی ہے۔ پردہ اٹھنے کے تھوڑی دیر بعد ایک
بہت ضخیم تندرست بدشکل آدمی جو اس دفتر کا مالک ہے داخل
ہوتا ہے۔ چپڑاسی کو دیکھتا ہے کہ وہ سو رہا ہے پہلے وہ اپنے
ڈنڈے کی نوک اس کی ناک کی نوک پر رکھتا ہے۔ چپڑاسی
نیند میں مکھی اڑانے کے انداز میں ہاتھ ہلا دیتا ہے۔ اس کے بعد
دفتر کا مالک اپنے ڈنڈے کو پلٹ کر وہ سرا جو اس کے ہاتھ
میں ہے چپڑاسی کے پیٹ میں چبھوتا ہے۔ چپڑاسی ہڑبڑا کر جاگ
پڑتا ہے۔ دفتر کا مالک غصے سے پوچھتا ہے)

**مالک:** دفتر کے اوقات میں سوتے ہو۔

**چپڑاسی:** معاف کیجیے صاحب۔ رات بھر میرے بچے نے رو رو کر مجھے سونے نہیں دیا۔

**مالک:** کل سے اپنے بچے کو بھی دفتر لایا کرو۔

**چپڑاسی:** اچھا سرکار جی!

**مالک:** تاکہ وہ تمھیں یہاں بھی نہ سونے دے۔

(یہ کہہ کر وہ غصے سے اندر چلا جاتا ہے اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر نیم دراز
ہو کر آنکھیں بند کر لیتا ہے جیسے گہری سوچ میں ہے۔ اتنے میں چپڑاسی
والے حصے میں اعظم داخل ہوتا ہے اور سیدھے اندر جانے لگتا
ہے تو چپڑاسی ہاتھ پھیلا کر اسے روکتا ہے)

**چپڑاسی** : ہاں ہاں ہاں! اِدھر اندر کہاں جا رہے ہو؟

**اعظم** : صاحب ہیں؟

**چپڑاسی** : (اندر کی طرف جھانک کر) ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں۔

**اعظم** : کیا مطلب؟

**چپڑاسی** : ہیں اس لیے کہ ہیں، اور نہیں اس لیے کہ سو رہے ہیں۔

**اعظم** : یہ کون سا سونے کا وقت ہے۔ اب تو بارہ بجنے والے ہیں۔

**چپڑاسی** : ہاں تم جیسے آدمیوں کے تو ہمیشہ ہی بارہ بجے ہوتے ہیں۔

**اعظم** : لیکن صاحب نے تو مجھے ٹھیک بارہ بجے بلایا تھا۔

**چپڑاسی** : ٹھیک ہے۔ اس وقت تمہارے بارہ بج رہے ہیں جب صاحب کے بارہ بجیں گے۔ دیکھا جائے گا۔
جاؤ۔ وہاں بنچ پر بیٹھ جاؤ۔

(یہ کہہ کر چپڑاسی جیب سے چنے نکال کر مٹھی بھر چنے پھانک
لیتا ہے)

(اعظم کچھ سوچ کر قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے اور پھر
مسکراتے ہوئے چپڑاسی کے پاس آکر اٹھنی ہتھیلی پر رکھ کر انگلی
سے اوپر اچھالتا ہے اور پوچھتا ہے)

**اعظم** : بھیا تمہارا نام کیا ہے؟

(چونی دیکھ کر چپڑاسی کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ

آجاتی ہے اور چنے پھانکتا کھکھیا کر مسکراتا ہوا اور بڑی لجاجت
کے لہجے میں کہتا ہے )

چپڑاسی: محمد رمضان۔

اعظم: واہ بھئی واہ۔ نام محمد رمضان اور یوں دن ہاٹے چنے پھانک رہے ہو۔
اس کے بعد وہ ایک بار اور ہوائی اگھو یطے پر جاتا ہے اور اسے اچھالتے
ہوئے کہتا ہے )
بھئی محمد رمضان اگر تم چاہو تو بھی صاحب کے بارہ بجا سکتے ہو۔
(چپڑاسی ہوا میں اچھلی ہوئی چوانی کو ہاتھ بڑھا کر اچک لیتا ہے
اور چوانی کو دکھاتے ہوئے عنتر سے کہتا ہے )

چپڑاسی: اگر یہ بات ہے تو میں ہر وقت صاحب کے بارہ بجا سکتا ہوں۔
یہ کہہ کر وہ کاغذ کی ایک چٹ اعظم کو دیتا ہے اعظم اس پر اپنا
نام لکھتا ہے اور چپڑاسی دبے دبے پاؤں اندر جاتا ہے۔ صاحب
خراٹے لے رہے ہیں۔ چپڑاسی پہلے آہستہ سے کھنکارتا ہے۔
لیکن صاحب نہیں جاگتے۔ پھر وہ زور سے کھنکارتا ہے۔ صاحب
ہڑبڑا کر جاگتے ہیں اور عینک لگا کر اسے دیکھتے ہیں اور منہ چڑا کر کہتے ہیں )

صاحب: اوہ تم ہو کمبخت۔ میں تو اس وقت لیڈی اسٹینو گرافر کی توقع کر رہا تھا۔ اچھا دیکھو! اس طرح کھنکار
کر کسی کو جگانا نہایت بدتمیزی کی بات ہے۔ سمجھ گئے۔

چپڑاسی: جی ہاں!

مالک: تو جاؤ پھر۔

چپڑاسی: حضور۔ ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔
(وہ اعظم کا کارڈ پیش کرتا ہے۔ مالک بلند آواز سے پڑھتے ہیں )

محمد اعظم بی۔اے (مالک)

**مالک** : بھیج دو اندر۔

(چپڑاسی جاتا ہے اور اعظم کو اندر بھیجتا ہے)

**اعظم** : السلام علیکم۔

**مالک** : وعلیکم السلام رحمت اللہ برکاتہٗ۔

(اور پھر عینک لگا کر اسے دیکھتا ہے۔ پھر آدھے شیشوں والی عینک لگا کر دیکھتا ہے۔ اس کے بعد ایک آنکھ کا چشمہ لگا کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے اور اعظم بڑی حیرت سے اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہے)

**مالک** : بیٹھ جاؤ۔ ماشاء اللہ بہت تندرست اور خوبصورت نوجوان ہو۔

**اعظم** : جی۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔

**مالک** : (قہقہہ لگا کر) بھئی یہ بھی خوب رہی۔ ذرہ نوازی؟ ارے یار تم تو پہاڑ ہو پہاڑ۔

**اعظم** : (مسکراتے ہوئے) اچھا تو چلئے۔ یہ آپ کی پہاڑ نوازی رہی۔

**مالک** : یہ ہوئی نہ کوئی بات۔ اچھا یہ بتاؤ۔ یہاں کیوں آئے ہو؟

**اعظم** : جی میں علیگڑھ یونیورسٹی کا فرسٹ کلاس گریجویٹ ہوں۔ پچھلے تین سال سے شدید قسم کی بیروزگاری کے دن گذار رہا ہوں۔

**مالک** : بہت خوب! بہت اچھا کر رہے ہو

**اعظم** : (حیران ہو کر) جی!

**مالک** : جی وی کچھ نہیں۔ بس کہے جاؤ۔ کہتے چلے جاؤ۔ تاکہ ہم سنتے جائیں اور سنتے چلے جائیں۔

**اعظم** : مجھے آپ کے دوست سفارش علی خاں صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے اور یہ بتایا ہے کہ آپ کے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی جگہ خالی ہے۔ اگر آپ اس کی جگہ مجھے مامور ——

مالک : (بات کاٹ کر) ہاں بھول گئیں اس جگہ کا نام تو جب سے ہماری فرم قائم ہوئی ہے۔ ہم نے کوئی چھ سپرنٹنڈنٹ ملازم رکھے۔ لیکن پتہ نہیں کیا بات ہے۔ جیسے ہی کوئی سپرنٹنڈنٹ ملازم ہوتا ہے تین چار ہفتوں کے اندر اندر انتقال کر جاتا ہے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ آسامی سپرنٹنڈنٹ کی نہیں بلکہ موت کی آسامی ہے۔

اعظم : جی میں موت سے نہیں ڈرتا۔ آپ فکر نہ کریں۔ کیونکہ آجکل میں جو زندگی گذار رہا ہوں وہ موت سے بھی بدتر ہے۔

مالک : ہاں بھئی کیوں اپنا انتقال کروانے کے پیچھے پڑ گئے ہو۔

اعظم : قبلہ میں نے عرض کیا۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔

مالک : بھئی کیا ڈینگ مار رہے ہو! موت سے نہیں ڈرتے؟ ہاں نوجوان ہم نے تو بڑے بڑے رستموں کو موت کے سامنے کانپتے ہوئے دیکھا ہے۔ اپنی تو یہ حالت ہے کہ جب کوئی دوسرا مرتا ہے تو اپنے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔

اعظم : جناب عالی! آپ میرا امتحان لے سکتے ہیں۔ میں آجکل تنگ آمد بجنگ آمد کا مصداق ہو گیا ہوں۔

مالک : نوجوان! شاید تمہیں نہیں معلوم کہ تم اس وقت کہاں بیٹھے ہو؟ میاں یہ فوجی بھرتی کا دفتر نہیں کہ تم موت اور جنگ کی باتیں کرو۔ بھیا یہ بکروں اور مینڈھوں کی کھالیں اور آنتیں درآمد برآمد کرنے کا دفتر ہے۔ اب تم بتاؤ بکروں اور مینڈھوں کی کھالوں اور آنتوں کے بارے میں تمہاری کیا معلومات ہیں!

اعظم : جی کچھ نہیں۔

مالک : تو پھر کیسے گریجویٹ ہو یار تم۔ کالج میں کیا پڑھا تم نے؟

اعظم : جناب عالی! میں نے فرسٹ کلاس میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ میں نے ولیم شیکسپیئر۔ جارج برنارڈ شا اور آغا حشر کے سارے ڈرامے۔ شیلے کیٹس۔ غالب اور اقبال کی ساری غزلیں اور نظمیں۔ ڈاکٹر جانسن سے لے کر ابراہیم جلیس تک سارے مشہور ادیبوں کی تصنیفات۔ اس کے علاوہ عمرانیات۔ معاشیات سیاسیات ـــــ ـــــ۔

**مالک** : بات کاٹ کر) تصنیفات۔ عمرانیات۔ معاشیات۔ سیاسیات۔ لیکن بکرے کی آنت نہیں۔ کیوں؟
اچھا! یہ بتاؤ شارٹ ہینڈ اور ٹائپ جانتے ہو؟

**اعظم** : نہیں۔

**مالک** : اکاؤنٹنسی؟

**اعظم** : جی نہیں!

**مالک** : اچھا! تو یہ بتاؤ کہ ولیم شیکسپیئر نے بکرے کی کھال اور اقبال نے مینڈھے کی آنت کے بارے میں کوئی ڈرامہ کوئی غزل کوئی نظم اور کوئی مضمون وغیرہ لکھا ہے؟

**اعظم** : جناب عالی! میرا یہ خیال ہے کہ ولیم شیکسپیئر اور علامہ اقبال اس معاملے میں بڑے بدذوق تھے۔

**مالک** : واقعی بڑے بدذوق تھے۔

**اعظم** : وہ تو صرف انسانوں کے بارے میں لکھتے تھے۔

**مالک** : (سمجھانے کے انداز میں) بھیا اپنا تو یہ تجربہ ہے کہ موجودہ زمانے میں بکرا انسان سے کہیں زیادہ قیمتی ہے اور اپنے لیے تو انسان سے کہیں زیادہ بکرا عزیز ہے۔ میرے بھائی تم جانتے ہو ہم نہ صرف بکرا کھاتے ہیں بلکہ بکرے کا دیا بھی کھاتے ہیں۔

**اعظم** : آپ بالکل درست فرماتے ہیں۔

**مالک** : درست فرمانا تو اپنی عادت ہے۔ اسی لیے میں تم سے یہ درست فرماتا ہوں کہ نوکری ووکری کا خیال چھوڑو۔ ماشاءاللہ سے تندرست اور خوبصورت نوجوان ہو۔ میں تمہیں اپنے ایک عزیز دوست سیٹھ دولت خان کے نام ایک رقعہ لکھ دیتا ہوں سیٹھ دولت خان کروڑپتی آدمی ہیں۔ ان کی تین کنواری لڑکیاں ہیں ممکن ہے تمہارا کام بن جائے۔

**اعظم** : (حیران ہو کر) کنواری لڑکیاں۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!

**مالک** : (رقعہ لکھتے ہوئے) سب کچھ سمجھ جاؤ گے برخوردار سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔

(رقعہ لکھ کر لفافہ میں بند کر کے اعظم کو دیتا ہے)

مالک : بس اب سیدھے دریں جاؤ۔ اللہ بہتری کرے گا۔

اعظم : مگر ——————

مالک : اب یہ مگر اگر چھوڑ یار۔ جاؤ بھی اب۔ سونے دو۔ بھئی کمال کرتے ہو۔

( یہ کہہ کر وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے اور کرسی کی پشت پر دراز ہو جاتا ہے )

اعظم : ( کھڑے ہو کر ) بہتر ہوتا اگر آپ مجھے اپنے ہی ماؤس

مالک : ( اسی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے ) بھئی اب ہم گہری نیند میں سو رہے ہیں۔ یعنی کچھ نہیں سن رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب کچھ نہیں سن رہے ہیں تو جواب بھی نہیں دے سکتے۔ اور اگر جواب بھی دیا تو وہ تمھارے لیے بیکار ہے کیونکہ خواب میں کہی ہوئی باتیں ہمیشہ جھوٹ ہوتی ہیں۔

( اعظم غور سے سوئے ہوئے مالک کو دیکھتا ہے اور سینہ بھر ٹھنڈی سانس لیتا ہے اور آہستہ سے باہر جاتا ہے۔ اس وقت مالک آنکھ کھول کر اعظم سے کہتا ہے )

مالک : سفارش علی خاں اور سیٹھ دولت خاں کو میرا سلام بھی کہہ دینا۔

( اعظم پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہے۔ مالک اپنی آنکھ بند کر لیتا ہے اور زور کا خراٹا لیتا ہے۔ اعظم دونوں کندھے اچکا کر پھر باہر نکل جاتا ہے باہر چپراسی اسے روک کر کہتا ہے )

چپراسی : کیوں بھیا! صاحب نے تمھارا کام بنایا ؟

اعظم : کام تو نہیں بنایا۔ البتہ مجھے ضرور بنایا ہے۔

چپراسی : تو پھر مولا کا شکر ادا کرو اور ایک دوسری جوتی اچھالو۔

اعظم : ( دانت پیس کر ) جوتی چاہیے جوتی !

چپراسی : ( گھگیا کر ) ہاں۔ جوتی !

اعظم : ( الٹے ہاتھ سے مارنے کے انداز میں ) ابے بھاگ مرغی کے

چپراسی : ( آستین چڑھاتے ہوئے ) ابھی آ ذرا کے تو سمجھ لوں گا۔

پردہ

// ۱۱

# چوتھا منظر

(باغیچہ ——— ایک بنچ پر نور افشاں بیٹھی ایک کتاب کے
مطالعہ میں محو ہے اعظم پیچھے سے داخل ہوتا ہے اور اپنی فیلٹ
ہیٹ اس کے سر پر رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے )

اعظم : ہیلو مس یونیورس!

نور افشاں : (مصنوعی غصہ سے اس کی فیلٹ ہیٹ نکال کر سامنے بنچ پر رکھ دیتی ہے اور کہتی ہے) تم کبھی وقت کی پابندی نہیں کرتے۔ پورے ۴۵ منٹ لیٹ ہو۔ میں تو بس اب جانے ہی والی تھی۔

اعظم : جب وقت میری پرواہ نہیں کرتا تو میں نے بھی اس کی پرواہ کرنی چھوڑ دی ہے

نور افشاں : (اس کی کلائی کی طرف دیکھتے ہوئے) تمہارے ہاتھ کی گھڑی کیا ہو گئی اعظم؟

اعظم : میونسپل کارپوریشن کے کلاک ٹاور کے لیے ایک گھڑی کی ضرورت تھی اس لیے میں نے اپنی گھڑی بیچ دی۔

نور افشاں : (ٹھنڈی سانس بھر کر) پتہ نہیں اعظم۔ کب تمہیں کوئی کام ملے گا۔ کب تک اس طرح اپنی چیزیں بیچ بیچ کر گذارا کرتے رہو گے؟

اعظم : ان فضول باتوں کو چھوڑو۔ یہ باغ ہے۔ یہاں کچھ ایسی باتیں کرو جو پھولوں کی طرح خوش رنگ ہوں۔ کلیوں کی طرح مہکتی ہوں۔ شبنم کی بوندوں کی طرح چمکیلی ہوں اور جو اس ہری ہری گھاس کی طرح نرم اور ملائم ہوں۔

نور افشاں : اعظم! میں بہت عرصے سے تم سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ——— کہ ——— کہ اگر تم برا نہ مانو تو جب بھی ضرورت پڑے مجھ سے پیسے لیا کرو۔ پھر جب تمہیں نوکری مل جائے گی تم سارے پیسے مجھے لوٹا دینا۔ ہم دونوں کوئی غیر تھوڑے ہی ہیں۔ آج نہیں کل ———۔

(شرما کر چپ ہو جاتی ہے)

اعظم : وہ میڈم! میں ایسا کبھی نہ کر سکوں گا جس معاشرے میں رہتا ہوں۔ اس میں مرد عورت کی ہتھیلی پر

مزیدار کھاتا ہے۔ اس معاشرے میں ہمیشہ سے کوٹ کھاتا اور ساڑھی بیٹھ کر کھاتی ہے

نور افشاں : تم کیسی دقیانوسی باتیں کرتے ہو۔ تعلیم یافتہ ہو کر بھی عورت کو مرد سے کمتر سمجھتے ہو۔

اعظم : میں تو نہیں سمجھتا۔ لیکن زمانہ ایسا ہی سمجھتا ہے۔ لیکن باغ میں اور شام کے وقت یہ تم عورت کے سماجی درجہ کا کیا موضوع چھیڑ بیٹھی ہو۔ کوئی چاکلیٹ۔ پیپرمنٹ اور چوئنگ گم جیسی باتیں کرو نا

نور افشاں : ایسی باتیں ہی تمہیں کر سکتی ہوں اعظم۔ تم نہیں جانتے میں آجکل کیسے ذہنی عذاب سے گذر رہی ہوں۔ تم ابا جی کو جانتے ہو۔ امی کے مرنے اور فوج سے پنشن لینے کے بعد وہ کیسے غلط راستوں پر پڑ گئے ہیں۔ شراب اور رنگ رلیوں میں انھوں نے جو کچھ تھا سارا کا سارا پیسہ اڑا دیا ہے۔ آجکل سیٹھ حاجی رحمت اللہ کے عیاش بیٹے مسعود سے ان کی بڑی گھری چھن رہی ہے وہ اس سے ہزاروں روپے قرض لے چکے ہیں۔

اعظم : انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اب انھیں راہ راست پر نہیں لایا جا سکتا۔

نور افشاں : میں انھیں ان کے حال پر تو چھوڑ دوں اعظم لیکن ۔۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ مسعود سے میرا سودا بھی طے کر لیا ہے۔ اور وہ آوارہ اور بدمعاش مسعود ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اسکول تک چلا آتا ہے۔ راستہ چلنا مشکل کر رکھا ہے۔ کار لیے میرے پیچھے پیچھے گھومتا ہے مجھے اس سے سخت نفرت ہے اعظم سخت نفرت ہے۔

اعظم : اب اگر کبھی مسعود سے ملاقات ہو تو اس سے کہنا کہ اعظم نہ صرف ایک بہت اچھا باکسر بلکہ فری اسٹائل بھی بڑی اچھی طرح جانتا ہے۔

نور افشاں : تم سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو بھی یونہی مذاق میں ٹال دیتے ہو۔ حالانکہ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

اعظم : تو پھر تم چاہتی کیا ہو؟ میں اس سلسلے میں تمھاری کیا مدد کر سکتا ہوں ؟

نور افشاں : تم بہت کچھ کر سکتے ہو مجھے صرف اتنا یقین دلا دو کہ تم زندگی کے راستے پر آخر تک میرے ساتھ چلو گے مجھے کبھی اکیلا نہیں چھوڑو گے۔ تاکہ میں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کر سکوں۔

اعظم : ہمارے ملک کی نوجوان لڑکیاں بھی عجیب جذباتی ہوتی ہیں۔ شادی کی فکر میں آئس کریم کی طرح

یکسلتی رہتی ہیں۔

**نورافشاں:** تمہاری یہی باتیں مجھے پسند نہیں۔ بتاؤ کیا کروں؟

**اعظم:** انتظار میڈیم انتظار!

**نورافشاں:** آخر کب تک؟ اگر اس انتظار کے دوران میرا بے پیہ اور شراب کا لالچی باپ مجھے نیلام کر دے تو

**اعظم:** (نورافشاں کے دونوں کندھے پکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف کرتے ہوئے۔ بھرپور اعتماد کے لہجے میں کہتا ہے) دنیا کی کوئی طاقت تمہیں نیلام نہیں کر سکتی نور! اور اگر تمہارا نیلام بھی ہوگا تو سب سے اونچی بولی میں بولوں گا یہ ٹھیک ہے کہ میری جیب میں سگریٹ کا آدھا پیکٹ خریدنے کے بھی پیسے نہیں ہیں۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں ضرور خرید سکتا ہوں —— ضرور خریدوں گا —————— ضرور اپناؤں گا۔

**نورافشاں:** مگر ـــ

**اعظم:** (اٹھتا ہے اور نورافشاں کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھاتا ہے) اب یہ اگر مگر چھوڑو۔ آؤ کسی بڑھیا ریسٹورنٹ میں چل کر ڈنر کھاتے ہیں۔ میں جہاں ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔ وہاں سے مجھے تنخواہ ملی ہے اور آج میں تمہیں اپنا نمک کھلانے کے بہت موڈ میں ہوں۔ آج مانگ جو مانگتی ہو۔ آج میں اس بغداد کا خلیفہ ہارون رشید ہوں۔ آؤ چلو۔

(اعظم اور نورافشاں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلے جاتے ہیں)

پردہ

○

م

# پانچواں منظر

(کرنل نورافشاں کے باپ کا ڈرائنگ روم ——— نورافشاں کا باپ ریٹائرڈ کرنل ارباب خاں ایزی چیئر پر لیٹا اخبار پڑھ رہا ہے۔ پردہ اٹھنے کے کچھ دیر بعد ایک خوش وضع نوجوان جس کے منہ میں پائپ لگا ہوا ہے اور چہرے بشرے سے بڑا پر تصنع نوجوان معلوم ہوتا ہے اندر داخل ہو کر گلے سے کھنکارتا ہے کرنل چونکتا ہے)

**کرنل ارباب خاں**: او مسعود! آؤ بھئی آؤ۔ آجاؤ۔

**مسعود**: (بیٹھتے ہوئے) ماشاء اللہ۔ کرنل صاحب آجکل تو دن بدن آپ کی صحت نکھرتی چلی جا رہی ہے۔

**کرنل ارباب خاں**: (مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے) میاں مسعود! اب کیا رکھا ہے۔ تم جوانی میں دیکھتے۔ اب تو عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہے لیکن اب بھی دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر حکومت میری خدمات حاصل کرے تو چوبیس گھنٹوں کے اندر سری نگر پہنچ کر مہاراجہ کشمیر کے محل پر اپنا سبز ہلالی پرچم نہ لہرا دوں تو میرا نام ارباب خاں نہیں۔

**مسعود**: کوائٹ ٹرو۔ کوائٹ ٹرو کرنل صاحب۔

(اسی اثنا میں نورافشاں داخل ہوتی ہے اور مسعود کو دیکھ کر ٹھٹک جاتی ہے)

**کرنل ارباب خاں**: آؤ بیٹی۔ آجاؤ۔ یہاں کوئی غیر نہیں بیٹھا ہے۔

(مسعود سے مخاطب ہو کر)

یہ میری بیٹی نورافشاں ہے۔ کہنے کو تو میں اس کا باپ ہوں لیکن جہاں تک میری نگہداشت کا تعلق ہے

یہ میری باپ ہے۔ میں تو اپنی ساری پنشن شراب میں اڑا دیتا ہوں۔ یہ بیچاری ملازمت کرتی اور گھر کا سارا خرچ چلاتی ہے۔ میں چونکہ آزاد خیال آدمی ہوں۔ اس لیے عورتوں کے ملازمت کرنے کو برا نہیں سمجھتا۔

(نورافشاں سے مخاطب ہو کر)

بیٹھو بیٹی۔ بیٹھ جاؤ۔ تم انھیں جانتی ہو؟ تم بھلا انھیں کیسے جان سکتی ہو۔ پہلے تمھارا کبھی تعارف ہی نہیں کرایا گیا۔ یہ ہیں مسٹر مسعود علی خاں میرے نہایت عزیز دوست سیٹھ حاجی رحمت اللہ سورت گر والے کے اکلوتے صاحبزادے حال ہی میں ولایت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹے ہیں۔

**مسعود** : ویری گلیڈ ٹو میٹ یو مادام!

(مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے۔ لیکن نورافشاں اپنے دونوں ہاتھ باندھ لیتی ہے۔ مسعود جھینپ کر ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور کہتا ہے)

**مسعود** : نیور مائینڈ۔ نیور مائینڈ۔ ابھی ہماری کنٹری کی گرلز بڑی شائی ہیں۔ ترقی تو کچھ انگلش گرلز نے کی ہے کرنل صاحب۔ جب میں لندن میں تھا

**کرنل ارباب** : (بات کاٹ کر) ہاں ہاں یار لندن وندن کی بات چھوڑو۔ شام پڑ رہی ہے۔ کچھ کھو گئے؟

(نورافشاں سے مخاطب ہو کر)

جاؤ بیٹی! بتی جلانے کا انتظام کرو۔

**مسعود** : (حیران ہو کر روشنی کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے) بتی تو جل رہی ہے کرنل صاحب!

**کرنل** : ہاں ہاں یہ بتی نہیں بلکہ وہ بتی جو روح میں جلتی ہے۔

(نورافشاں اٹھتی ہے اور باہر چلی جاتی ہے مسعود مسکرا کر کہتا ہے)

**مسعود** : اوہ! خوب خوب!!

**کرنل** : میاں مسعود! یہ شراب بھی خوب چیز ایجاد ہوئی ہے۔ اسے اُم الخبائث کہا جاتا ہے۔ لیکن مجھے تو یہ "اُم المظلومین" معلوم ہوتی ہے۔ ایک گھونٹ میں سارے دکھ درد دُور ہو جاتے ہیں اور نیہ

برسوں پُرانی بوڑھی دنیا جوان نظر آنے لگتی ہے۔ اپنی تو خداوند تعالیٰ سے ایک گذارش ہے۔ ہم مرنے کے بعد جنت میں جانے سے تو رہے۔ دوزخ کے سوائے اپنا ٹھکانہ اور کوئی نہیں۔ لیکن خداوند تعالیٰ سے صرف اتنی اجازت لوں گا کہ ہمیں جہنم کا کوئی گوشۂ تنہائی دیدے اور اسکاچ وہسکی کی ایک بوتل۔ بس اپنی آخرت سنور جائے گی۔

(ابھی اتنا میں نور افشاں نوکر کو ساتھ لے کر آتی ہے۔ نوکر کے ہاتھ میں ایک ٹرے ہے۔ جس میں بلیک اینڈ وائٹ کی بوتل۔ دو گلاس ٹھنڈے پانی کی ایک بوتل اور برف کا ڈونگا رکھا ہوا ہے۔ نوکر قرینے سے یہ ساری چیزیں میز پر سجا دیتا ہے۔ اس کے بعد نور افشاں نوکر کے ساتھ جانے لگتی ہے۔ تو مسعود پوچھتا ہے)

مسعود: آپ ہمیں کمپنی نہیں دیں گی؟

نور افشاں: سوری!

(اندر چلی جاتی ہے)

مسعود: ویری سیڈ! کرنل صاحب جب میں لندن میں تھا

کرنل: (پیگ بناتے ہوئے بات کاٹ کر) ہاں اب بھول جاؤ لندن کو۔ جب سے ہم آزاد ہوئے ہیں لندن کراچی سے بہت دور ہو گیا ہے۔ یہ کراچی ہے کراچی۔ جب میں فوج میں تھا

مسعود: (انتقاماً بات کاٹ کر) آپ کی ڈاٹر کا ایجوکیشن کہاں تک ہے؟

کرنل: بی۔ اے۔ بی۔ ٹی پاس ہے۔ میں اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھیجنا چاہتا تھا —— چنانچہ جب میں فوج میں تھا ——

مسعود: (بات کاٹ کر) ویری گڈ۔ ہماری کنٹری کی گرلز اب کافی ایجوکیٹڈ ہوتی جا رہی ہیں چنانچہ جب میں لندن میں تھا ——

کرنل: (بات کاٹ کر) ہاں ہو گئے نہیں۔ بناؤں پیگ؟

**مسعود** : نو تھینکس ۔ میں ڈرنک ترک کرتا ہوں ۔ لیکن آپ میرے گھر کے ماحول کو جانتے ہیں کس قدر آرتھوڈاکس ہے آجکل میں اپنے بیڈروم میں چھپ کر پیتا ہوں تا کہ کسی کو پتہ نہیں چلے ۔ چنانچہ جب میں لندن میں تھا ——— ۔

**کرنل** : (بات کاٹ کر) بہت اچھا کرتے ہیں آپ ۔ خدا بخشے جب والد مرحوم زندہ تھے ۔ میرے ساتھ بھی یہی مصیبت تھی ۔ تم تو بیڈروم میں چھپ کر پیتے ہو اور یار تو لیبوریٹری میں چھپ کر پی لیا کرتے تھے ۔ بہرحال پیتے ضرور تھے ۔ اور جب میں فوج میں تھا (ٹھنڈی سانس بھر کر) اچھا میاں ۔ اب موج کے وقت فوج کا کیا ذکر ؛

(پیگ اٹھاتا ہے اور ٹوسٹ پروپوز کرنے کے انداز میں کہتا ہے)

**کرنل** : اچھا خدا حافظ !

(مسعود "خدا حافظ" سن کر کچھ پریشان ہوتا ہے ۔ گھڑی دیکھتا ہے اور کرنل کی طرف ۔ لیکن کرنل ایک سانس میں پورا گلاس غٹ غٹ چڑھا کر خالی گلاس میز پر رکھتا ہے اور اپنی بھیگی ہوئی مونچھوں کو صاف کرتے ہوئے مسعود سے کہتا ہے)

**کرنل** : مسعود میاں ۔ میں جب پیتا ہوں تو ہمیشہ "خدا حافظ" کہہ کر ہی پیتا ہوں کیونکہ مجھ جیسا پینے والا جب پانچ چھ پیگ پی جاتا ہے تو پھر سچ مچ خدا کی حفاظت میں پہنچ جاتا ہے ۔ چنانچہ جب میں فوج میں تھا ——— ۔

**مسعود** : (بات کاٹ کر) بہت خوب ! بڑی نادلٹی ہے اس طرح پینے میں ! جب میں لندن میں تھا ——— ۔

**کرنل** : (بات کاٹ کر) آج کل آپ کی اپنی آمدنی کیا ہے مسعود صاحب ؟

**مسعود** : ابھی تو مجھے بارہ سو روپے ماہوار پاکٹ منی ملتی ہے ۔ لیکن آپ تو جانتے ہیں میں ملٹی ملینیر کا بیٹا ہوں فادر تو اب بوڑھے ہو چکے ہیں ان کے بعد میں ساری جائیداد کا اکیلا وارث ہوں ۔

**کرنل** : ہونہہ ! اچھا تو پھر آپکے فادر کب تک اس دنیا سے تشریف لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں ؟

**مسعود** : (چونک کر) کیا فرمایا آپنے کرنل صاحب !

**کرنل** : (بات سمجھ کر) معاف کیجئے ۔ ذرا ہلکا ہلکا سا انٹاکزی کیشن ہو رہا ہے ۔ ممکن ہے اسی کے تحت یہ وا ہیات بات منہ سے نکل گئی ۔

مسعود : (مسکراتے ہوئے) او ہو کوئی بات نہیں۔ میں بالکل سچ پوچھیے تو بڑی مدت سے ایسی واہیات بات کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں جب لندن میں تھا

کرنل : (بات کاٹ کر) بڑے سعادت مند ہو۔ ماشاءاللہ۔ آخر بھلا کب تک اس طرح ہیڈ روم میں چھپ چھپ کر پیتے رہو گے؟

مسعود : (ہنس کر) کرنل صاحب! میں آج جس مقصد کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے وہ بیان کر دینا چاہیے۔

کرنل : ضرور! ضرور بیان کیجئے۔

مسعود : میں یہ عرض سے کرحاضر خدمت ہوا تھا کہ آپ مجھے اپنی فرزندی میں لینے کے معاملے میں تاخیر سے کام نہ لیں۔ آپ یقین رکھیے جب تک میرے والد صاحب میرے سر پر شادی کا سہرا نہیں دیکھیں گے وہ یہ دنیا ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔

کرنل : ان سے ہمیشہ کے لیے اجازت لینے کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ہے؟

مسعود : اوں ہوں! فی الحال تو کوئی نہیں۔

کرنل : لیکن مسٹر مسعود! ابھی ذرا میرا ہاتھ تنگ ہے۔ فوج سے مجھے گیارہ ہزار روپے ملنے والے ہیں امید ہے کہ آئندہ مہینے تک مل جائیں۔ آخر میں اپنی بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام سے کرنا چاہتا ہوں۔

مسعود : روپوں کی بات چھوڑیئے۔ مجھ سے اور قرض لے لیجئے۔ ویسے بھی اب آپ کا اور میرا روپیہ الگ الگ تو نہیں ہے۔ آج تو تاریخ مقرر کر ہی دیجئے گا کرنل صاحب۔ کیونکہ اگلے ماہ کی پانچ تاریخ کو میں بزنس ٹور پر لندن جا رہا ہوں۔ ارادہ ہے کہ ہنی مون وہیں مناؤں۔

کرنل : (کچھ سوچتے ہوئے) دوسری مصیبت یہ ہے مسٹر مسعود کہ لونڈیا اپنے کالج کے زمانے کے ایک مفلس ساتھی کی محبت میں گرفتار ہے۔

مسعود : یہ بھی میں جانتا ہوں۔ شاید اس کا نام اعظم ہے۔ لیکن کرنل صاحب۔ میرے پاس روپیہ ہے یہ مجھ پر چھوڑیئے۔ میں ایک چھوڑ دس اعظم خرید سکتا ہوں۔

کرنل (تھوڑی دیر تک کچھ سوچتے ہوئے) اچھا! تو پھر اللہ کا نام لے کر تاریخ مقرر کئے دیتے ہیں۔ اگلے ماہ کی دوسری تاریخ کیسی رہے گی؟

مسعود: میں تو آج بھی تیار تھا۔ خیر اگلے ماہ کی دوسری تاریخ ہی سہی۔ اچھا کرنل صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ اب مجھے چلنا چاہیئے۔

(کرنل بیگ ہاتھ میں پیالہ لیے گہری سوچ میں مبتلا ہے)

مسعود: پاکستان آکر مجھ سے وقت کی پابندی کی عادت چھوٹتی جا رہی ہے۔ جب میں لندن میں تھا

کرنل: (اچانک غصے سے بات کاٹتے ہوئے) ہاں ہاں لندن۔ لندن لندن لگا رکھا ہے تم آدمی ہو یا لندن۔ ارے بھائی ہم بھی لندن گئے تھے تم سمجھتے ہو۔ ہم صرف ٹسٹ ڈو آدم رہا گئے تھے جب میں فوج میں تھا

مسعود: (کچھ کہنے کے بجائے ایک غصے سے جیسے ان سے خود بھی غصہ میں آگر اس کی بات کاٹتا ہے) رہنے دیجیے کرنل صاحب! میں آپ کی فوج والی بات ہرگز نہیں سنوں گا۔

کرنل: کیوں بھائی؟

مسعود: آپ میری لندن والی بات سنتے ہی نہیں۔

کرنل: (ہلکا سا قہقہہ لگا کر) اچھا یہ بات ہے! گرم کیوں ہوتے ہو۔ فرض کر لو کہ نہ میں کبھی فوج میں تھا اور نہ تم کبھی لندن میں تھے چلو ہوئی نا بات ختم۔ اچھا بھیا اب تم بھی جاؤ۔ میں بھی آرام کر لوں۔ اب میں بڈھے ہو گیا ہوں۔ نشہ میں بالکل ٹائیٹ۔ نشہ اور بستر سے آنکھیں کڑوائی جا رہی ہیں۔ جب میں فوج میں تھا

(یہ کہہ کر مسعود کی طرف دیکھتا ہے۔ لیکن مسعود بات نہیں کاٹتا اس لیے کرنل پوری بات کہہ دیتا ہے)

تو ٹھیک دس بجے بستر پر دراز ہو جاتا تھا۔

مسعود: اور جب میں لندن میں تھا۔

(یہ کہہ کر وہ کرنل کی طرف دیکھ کر رک جاتا ہے لیکن بات کاٹنے کے بجائے کرنل کہتا ہے)

**کرنل** : ارگو نہیں کیسے جاؤ گے

**مسعود** : جب میں لندن میں تھا تو ٹھیک گیارہ بجے بستر پہ دراز ہو جاتا تھا ۔

(دونوں ہنستے ہیں ۔ مسعود کھڑا ہو جاتا ہے)

**مسعود** : اچھا کرنل صاحب اب مجھے اجازت دیجئے ۔ گڈ نائیٹ !

**کرنل** : گڈ نائیٹ !

**مسعود** : (دروازے کے قریب جا کر) کل تمام ایوننگ ٹی میں آپ ہی کے ساتھ پیوں گا ۔

**کرنل** : آل رائیٹ ۔ گڈ نائیٹ ۔

(مسعود چلا جاتا ہے ۔ اس کے جاتے ہی نورافشاں اندر کمرے میں داخل ہوتی ہے)

**نورافشاں** : اباجی ! یہ تاریخ کیا مقرر ہو رہی تھی ؟

**کرنل** : تمہاری شادی کی تاریخ بیٹی !

**نورافشاں** : کس سے ؟ اس چمڑی کے غلام سے ۔ اس بمبئی کے بادشاہ سے ۔ اس جمنی لنگو سے ! جو ابھی ابھی یہاں سے روانہ ہوا ہے !

**کرنل** : تم تو اس سے بڑی ناراض معلوم ہوتی ہو ۔

**نورافشاں** : میرا بس چلے تو میں دنیا کی کسی لڑکی سے اس کی شادی نہ ہونے دوں ۔

**کرنل** : تم اس کو جانتی ہو ؟

**نورافشاں** : بہت اچھی طرح ۔ اس نے کئی بار سکول آ کر مجھ سے ملنے کی کوشش کی ۔ سڑکوں پر میرا پیچھا کرتا ہے غنڈہ کہیں کا ۔

**کرنل** : (سمجھانے کے انداز میں) بیٹی تم پڑھی اور سمجھدار ہو ۔ یہ بھی جانتی ہو کہ دنیا کی سب سے بڑی خوبصورتی دولت ہے اور سب سے بڑی طاقت روپیہ ہے اور وہ اس کے پاس ہے ۔

**نورافشاں** : مجھے ایسی خوبصورتی اور طاقت سے نفرت ہے ۔

**کرنل**: (ایکدم بگڑ کر قدرے غصے سے) نور! میں جانتا ہوں کہ تمہیں اُس مفلس لونڈے نے بہکا رکھا ہے۔ وہ محبت کے سوائے تمہیں کیا دے سکتا ہے۔ محبت ڈبل روٹی نہیں جو تمہارا پیٹ بھر سکے۔ محبت جارجٹ کی ساڑھی نہیں جو تمہارا جسم ڈھانک سکے۔ محبت کوئی کوٹھی نہیں جس میں تم رہ سکو۔ نکالو اس منحوس لونڈے کو دل سے۔

**نورافشاں**: (کرخت لہجے میں) اباجی! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ اس معاملہ میں مجھے کوئی رائے نہیں دے سکتے۔

(کرنل چونک کر حیرت سے اپنی بیٹی کو گھور گھور کر دیکھتا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب آتا ہے اور بڑے ملائم لہجے میں کہتا ہے)

**کرنل**: بیٹی، چھوڑو بیٹی۔ اب میں باپ بن کر تم سے بات کر رہا ہوں اور اس ملک کے تمام باپوں کی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ تم ایک شاندار کوٹھی میں رہو۔ رولس رائس کار میں گھومو۔ تمہارے بینک شلف میں ڈالروں اور ریالوں کے بجائے صرف چیک بک ہی چیک بک ہوں۔ رہا زندگی گزارنے کا سوال ــــ تم پڑھی لکھی سمجھدار ہو۔ جس طرح کوئی نہایت بدصورت لڑکی تمہاری عمدہ سہیلی بن سکتی ہے۔ اسی طرح مسعود بھی ایک اچھا شوہر ہو سکتا ہے۔

**نورافشاں**: اباجی! مجھے نہ کوٹھی چاہیے نہ رولس رائس نہ چیک بک۔ نہ روپیہ!

**کرنل**: (غصے سے) لیکن مجھے تو چاہیے۔

**نورافشاں**: (ایک دم چونک کر حیرانی سے) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اباجی!

**کرنل**: (ایکدم سنبھل کر نہایت درد ناک لہجے میں) بیٹی آج میں تمہیں وہ راز بتا ہی دوں گا جو میں نے ہمیشہ تم سے چھپائے رکھا۔ جیسے وہ راز کیا ــــ ایک عام سی بات ہے جس کو تم آئے دن اپنی آنکھوں سے اردگرد گھروں میں اور فلموں میں دیکھتی ہو۔ ناولوں اور افسانوں میں پڑھتی ہو۔ وہی بار بار دہرائی جانے والی بات پھر دہرائی جا رہی ہے۔ میں سیٹھ حاجی رحمت اللہ کا ڈیڑھ لاکھ روپے کا مقروض ہوں۔ یہ مکان جس میں تم رہتی ہو یہ بھی اس کے پاس رہن ہے۔ وہ چاہے تو مجھے کسی وقت بھی جیل بھجوا سکتا ہے۔ کسی وقت بھی خودکشی پر مجبور کر سکتا ہے۔ ــــــ یہ ــــ یہ ــــ صداقت کی

طرف سے بات ہوئی کہ مسعود خود تمہارا گرویدہ ہو گیا۔

**نورافشاں:** اور آپ اب مجھے ڈیڑھ لاکھ روپے کے پرامیسری نوٹ کی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

**کرنل:** میں بہت مجبور ہوں بیٹی! ویسے اگر تم مجھے جیل بھجوا کر میری غیر طبعی موت کا نظارہ کر سکتی ہو تو تمہیں ہر بات کا

پورا پورا حق ہے بیٹی۔

**نورافشاں:** لیکن اباجی! میں بالکل پسند نہیں کرتی۔ بالکل نہیں اباجی!

**کرنل:** شریفوں کی بیٹیاں کبھی بیا شوہر خود نہیں پسند کرتیں بلکہ اُن کے ماں باپ ان کے شوہر پسند کرتے ہیں۔ بتاؤ

کیا تمہاری ماں نے مجھے پسند کیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ وہ مجھ سے پہلے پہل نفرت کرتی تھی۔ لیکن میری شادی

اس سے ہو گئی تھی۔ ہو گئی۔ ایسا سب شریف گھرانوں میں ہوتا ہے۔ ہم بھی شریف لوگ ہیں بیٹی۔

**نورافشاں:** (حسرت بھرے لہجہ میں) ہونہہ شریف لوگ!

**کرنل:** (غصہ سے) تمہیں اسی وقت جواب دینا پڑے گا نور! کیا تم باپ کی غیر طبعی موت یا لمبی قید پر ایک مفلس

نوجوان کی محبت کو ترجیح دو گی۔ کیا تم اتنی خود غرض ہو بیٹی۔ کہ اپنے عیش کی خاطر تم اپنے باپ کی ایک درخواست

کو ٹھکرا دو گی جس نے پچھلے پچیس سال سے تمہیں بالکل بے غرض طریقہ پر پالا۔ پوسا تعلیم دی۔ تمہیں اتنا کچھ

دیا اور کبھی اس کا معاوضہ تک طلب نہیں کیا۔

**نورافشاں:** (غصہ سے) معاوضہ!! (دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ کر چیختی ہوئی اندر بھاگتی ہے) بس اباجی بس!

میں اب کچھ نہیں سنوں گی۔ کچھ نہیں سننا چاہتی۔ کچھ نہیں سننا چاہتی۔

(کرنل غصے سے شراب کا آدھا پیگ اٹھاتا ہے اور غٹ غٹ

چڑھا کر گلاس اس زور سے میز پر رکھتا ہے کہ گلاس ٹوٹ جاتا ہے)

**پردہ**

۵

# چھٹا منظر

(سڑک کے فٹ پاتھ پر ایک بنچ بچھی ہوئی ہے جس پر اعظم بیٹھا
اخبار پڑھ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک سیاہ فام گرانڈیل
نوجوان جس نے ٹیکسی ڈرائیور جیسی ٹوپی پہنی ہے۔ چوڑے پھولوں
والی رنگ برنگی چست قمیص اور نیلے رنگ کی پتلون میں ملبوس
پاؤں میں لانگ بوٹ۔ گلے میں ایک رنگین رومال صورت شکل
سے وہ غنڈہ اور پاکٹ مار معلوم ہوتا ہے۔ اعظم کو بہترین سوٹ
میں ملبوس دیکھ کر وہ مال کی طرف دیکھ کر آنکھ مارتا ہے۔ اور
آہستہ آہستہ اس کے قریب جا کر بنچ پر ساتھ بیٹھ جاتا ہے
اور مسکراتے ہوئے پوچھتا ہے )

**غنڈہ** : چھٹا ماچس ہوئینگا بابو تمہارا پاس ؟

(اعظم اس پر ایک سرسری نظر ڈال کر جیب سے ماچس نکال کر
اس کے حوالے کر دیتا ہے اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو جاتا ہے )

**غنڈہ** : (اسی طرح گنگنا کر مسکراتے ہوئے ) ماچس کے واسطے ایک سگرٹ بھی مل جائینگا بابو ؟

(اعظم اخبار سے چہرہ ہٹا کر غور سے غنڈے کو دیکھتا ہے اور
جیب سے ہائی کلاس سگریٹ کی ڈبیا نکال کر اسے سگریٹ پیش
کرتے ہوئے کہتا ہے )

**اعظم** : جناب بڑے بے تکلف انسان معلوم ہوتے ہیں۔ لیجئے شوق فرمائیے۔

**غنڈہ** : (سگریٹ لے کر مسکراتے ہوئے ) تم بڑا اکھڑ آدمی معلوم ہوتا ہے بابو۔

(اعظم کوئی جواب نہیں دیتا۔ غنڈہ ماچس زور سے جلاتا ہے
جس سے ایک شعلہ بھڑک کر بجھ جاتا ہے)

**غنڈہ**: بابو یہ سالا تمہارا ماچس کیسا ہے۔ سالا جلتا کم جلاتا جیاستی ہے۔ ذرا تم تکلیف کرنا۔

(اعظم اس کے ہاتھ سے ماچس لے کر جلاتا ہے۔ لیکن جب اس
کا سگریٹ جلانا چاہتا ہے تو غنڈہ اعظم کے کوٹ کی جیب میں
ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ لیکن اعظم فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے غنڈہ
پریشان ہو جاتا ہے۔ اعظم کہتا ہے)

**اعظم**: میرے عزیز دست کار دوست! تم اس میں سے جو کچھ نکالنا چاہتے ہو وہ اس میں نہیں ہے۔ جو اس میں ہے اسے نکال کر تمہیں مایوسی ہوگی۔ اس جیب میں صرف ایک میلا رومال، پاسنگ شو کی تین سگریٹیں۔ تھوڑے سے پیسے اور میری محبوبہ کا ایک محبت نامہ ہے۔

(غنڈہ ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہتا ہے۔ لیکن اعظم مضبوطی سے اس کی کلائی
پکڑے رکھتا ہے)

**اعظم**: گھبراؤ نہیں! میرے دوست۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔ اطمینان سے بیٹھو۔ مجھے تمہاری ایک مہربانی کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے۔

**غنڈہ**: ہم تم کو ایک دم گلت سمجھا بابو۔ ہم کو معاف کر دیو۔ ہم سالا بڑا اسوری فیل کرتا پڑا ہے۔ ہم، رڈن مانگتا ہے۔ مرسی مانگتا ہے۔

**اعظم**: تم مرسی مانگتا اور ہم تمہارا تھینکس ادا کرتا ہے کہ تم نے جیب کاٹنے کے لئے قینچی یا ریزر بلیڈ استعمال نہیں کیا۔ ورنہ کالج کی یہ آخری اور بہترین یادگار —— یعنی یہ سوٹ ستیاناس ہو جاتا۔ اب یہی ایک سوٹ باقی رہ گیا ہے جس سے عزت بچی ہوئی ہے۔ تمہیں روکنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم تمہارے ہاتھ پر بیعت کر کے تمہاری شاگردی اختیار کرنا چاہتا ہے۔

**غنڈہ**: ہم سمجھا نہیں۔ سالا تم کیا بولتا پڑا ہے؟

اعظم : میں تم سے یہ دستکاری سیکھنا چاہتا ہوں۔ یعنی یہ سیکھنا چاہتا ہوں کہ جیب کس طرح کاٹی جاتی ہے۔

غنڈہ : چھی چھی —— تم بابو لوگ۔ تم سالا کیسے ہیں یہ کام کر سکتا ہے۔

اعظم : ہم پروا نہیں کرتا سکتا مسٹر —— مسٹر؟ تمہارا نام!

غنڈہ : (ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ گرا کر) عبدل عرف ٹیلیپ کمار۔ جب ہم بمبئی میں تھا تو اکھا بمبئی میں سالا ہم کو پرنس آف چوپاٹی بولتا تھا۔

اعظم : ویل ہز ہائی نس پرنس آف چوپاٹی۔ تم آج ہم کو اپنا شاگرد بنالو ہم بہت تنگ آگیا۔

عبدل : تم سالا ہم پر چوٹ مارتا ہے۔ ہم سمجھ گیا۔

اعظم : چوٹ نہیں مارتا عبدل۔ تم نہیں جانتا۔ ہم سالا تم سے بھی جیاستی کڑکا ہے۔ ادھر دو سال سے نوکری کی تلاش کرنا پڑتا ہے۔ لیکن سالا نوکری سالا لوگ کو ملتا ہے۔ تم تو جیب کاٹ کر کچھ تو کچھ کما ہی لیتا ہے۔ لیکن سالا ہم یہ بھی نہیں کر سکتا۔ اب تم ہی بتاؤ۔ ہم پاکٹ نہیں مارینگا تو کیا کریں گا۔

عبدل : یہ نہ کہو بابو۔ پاکٹ مارنا تو بڑا اندم ہے۔ کرائم ہے۔

اعظم : تمہارا ہمارا پاکٹ مارنا ضرور جرم ہے عبدل۔ کیونکہ تمیں اور ہمیں پاکٹ مارنے کا صحیح طریقہ نہیں آتا۔ ہاتھ کی صفائی۔ ریزر بلیڈ۔ اور قینچی سے جیب کاٹتا ہے۔ لیکن یہ جو بڑی توند والا ہوتا ہے نا۔ یہ جیب کاٹنے کے لیے قینچی یا بلیڈ انگلی نہیں استعمال کرتا۔ بلکہ چیزوں کی قیمتیں بڑھا کر بازار کی چیزیں چور بازار میں لے جا کر مکانات کے لیے جاتے اور تمہارے سروں پر پگڑیاں باندھ کر حکومت اور قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایسی صفائی سے جیب کاٹتا ہے کہ جیب بھی موجود، جیبا لابھی موجود لیکن جیب کا مال صاف۔

عبدل : (زور کا قہقہہ لگا کر اعظم کی پیٹھ پر محبت سے بک زور سے ہاتھ مارتا ہے اور کہتا ہے) یار تم بڑے مزے کی باتیں کرتا ہے ہم کو سالا تم پر رحم آتا ہے۔ بین کی فکر مت کرو۔ آج سے ہم تمہارا دوست ہے۔ تمہارا برادر ہے۔ تم ہم کو بمبئی میں ملتا تو ہم تم کو بھی پرنس بنا دیتا۔ تم سالا یہاں ملا۔ ادھر تو اپنا بڑا خانہ خراب ہو گیا۔ ٹیڑی گڑبانک لائف ہے لوگوں کو کھانے کو روٹی تک کیا پیٹرن تک نہیں ملتا۔ پھر بھی ہم فرینڈ کا ناتے تمہارا ہیلپ کریں گا۔

یہ کہہ کر عبدل جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکال کر اعظم کی جیب میں

ڈالنا چاہتا ہے اور اعظم اس کا ہاتھ روکتا ہے تو عبدل غصے سے کہتا ہے )

عبدل : خدا قسم تم ہمارا ہاتھ نہیں روکتی۔ ہم تم کو فرسٹ کلاس بولا۔ برادر بولا۔ تم برادر کا مدد نہیں لائیں گا۔ تو ہم تمہارا الٹ کا دشمن بن جائیں گا۔ تم نے کبھی پٹھان کا محبت نہیں دیکھا۔ ہم بھی بہت اچھا آدمی ہے بابا۔

اعظم : تمہارا بہت بہت شکریہ مسٹر عبدل۔ سچ مچ تم بہت اچھا آدمی ہے (کوئی آدمی اپنے ماں کے پیٹ سے اچھا یا برا نہیں پیدا ہوتا۔ سب انسان معصوم پیدا ہوتے ہیں لیکن بڑے ہونے کے بعد اچھا یا برا ماحول اور یہ کمبخت روپیہ اسے اچھا یا برا بنا دیتا ہے۔ اب جو تم یہ برا کام کرتے ہو مجبوری کی وجہ سے کرتے ہو۔ جس طرح پرانے زمانے میں گھی ٹیڑھی انگلی سے نکلتا تھا اسی طرح اس زمانے میں روپیہ بے ایمانی سے حاصل ہوتا ہے۔

عبدل : اب سالا تم لیکچر بازی کا چکر چھوڑو۔ ہمارا بھیجا نکو کھاؤ۔ ہم تمہارے کو ایک کام دلا سکتا ہے مگر سالا تم نہیں کریں گا۔

اعظم : ہم ضرور کرے گا۔

عبدل : (ٹھنڈی سانس بھر کر) بہت محنت کا کام ہے۔

اعظم : ہم محنت سے نہیں ڈرتا۔ محنت دنیا کی سب سے بڑی عزت ہے۔ ہم بھی محنت کی روٹی کھانا مانگتا ہے۔

عبدل : تو پھر سالا تم فکر کرنا کائے کو ہے۔ آج ہی ہم تم کو وہ کام دلائیں گا۔ تم رات میں وہ کام کرو۔ دن کو بڑی نوکری ڈھونڈو۔ تم سالا پڑھا لکھا آدمی ہے تم کو ضرور کوئی بڑا نوکری ملیں گا۔ تم سالا پولیس میں لگ کے بڑا انسپکٹر بن جائیں گا اور ہم لوگ چلتے ہیں۔ (عبدل اعظم کو تکیے پر سے اٹھا لیتا ہے)

عبدل : ابھی ذرا ہم بندر روڈ کا ایک چکر لگائیں گا۔ اگر آج کوئی بڑا اسامی ملیں گا تو ہم تم کو ففٹی ففٹی دیدیں گا۔ تم دعا کرو کوئی مرغا پھنسے۔

اعظم : یہ بہت بری بات ہے عبدل! میں تمہیں یہ کام کرنے نہیں دوں گا۔

عبدل : اڑے جاؤ رے۔ جب تم پولیس میں لگ کے بڑا بن جائیں گا تو ہم تمہارا سامنے پاکٹ ماریں گا۔ تم کیا سمجھتا ہے۔ ہم پرنس آف جیپاٹی ہے۔ پرنس آف جیپاٹی۔ آؤ چلو۔

عبدل اپنے انداز میں چلتا ہے اور گاتا ہے ؎

"ہم لاکھ چھپیں رہی گوری تم تھم تھم کے"

پردہ

6

# ساتواں منظر

(اعظم کا کمرہ۔ فرنیچر وہی جو پہلے منظر میں تھا۔ کمرے
میں مجید بیٹھا ایک تصویر کے فریم کو کھول رہا ہے۔ اعظم تھکے ہارے
قدموں داخل ہوتا ہے اور آرام کرسی پر گر کر پوچھتا ہے)

اعظم : سناؤ حضور جناب پروفیسر! کیا جھک مار رہے ہو؟

مجید : اپنی بی۔ اے کی سند میں سے ہٹا کر صوفیہ کی تصویر جڑ رہا ہوں۔ کم از کم کمرے کی رونق تو بڑھ جائے گی۔

اعظم : بہت اچھا کر رہے ہو۔ میری رائے ہے کہ ڈگری پر نورجہاں کی تصویر لگا دو۔ کم از کم آنکھوں کو تراوٹ تو محسوس ہو۔

: یار اعظم! ایم۔ اے کی ڈگری زندگی میں کبھی تو فرحت نہیں ہو سکتی۔ اچھا یار تمھارے انٹرویو کا کیا بنا

اعظم : وہی جو تمھارے انٹرویو کا بنا اور سارے انٹرویو کا بنتا چلا آتا ہے۔

مجید : ارے ہاں اعظم! میں تمھیں آج کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ بتانا بالکل ہی بھول گیا۔ آج صبح تم نے اخبار میں دوسرے صفحہ پر ایک اشتہار پڑھا تھا؟

اعظم : نوکری کا؟

مجید : نہیں یار چھوکری کا! کوئی سیٹھ دولت خاں ہے اس کی تین لڑکیاں ہیں۔ ایک کی عمر سولہ سال۔ دوسری کی پچیس سال۔ تیسری کی تیس سال۔ اشتہار میں اعلان تھا کہ جو نوجوان اس کی سولہ سالہ لڑکی سے شادی کرے گا اسے سولہ ہزار روپے کا جہیز، جو پچیس سالہ لڑکی سے شادی کرے گا اُسے پچیس ہزار روپے کا اور جو تیس سالہ لڑکی سے شادی کرے گا اسے تیس ہزار روپے کا جہیز ملے گا۔ شرط یہ ہے کہ لڑکا گریجویٹ ضرور ہو۔

اعظم : تو پھر تم یہاں بیٹھ کر کیا جھک مار رہے ہو۔ فوراً چلے کیوں نہیں؟

مجید : یار وہیں سے تو آ کر بیٹھا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے کسی حوا کے لیے میری پسلی بانجھ ہی چھوڑی ہے

اعظم : کیا تمہیں ریجیکٹ کر دیا گیا ؟
مجید : نہیں بس سیٹھ نے تو مجھے بہت پسند کیا۔ لیکن بعد میں مجھ کو بائیں پر تیار ہو گیا۔
اعظم : تم ہو ہی بیہودہ ! ضرور کوئی اوٹ پٹانگ بات کی ہوگی !
مجید : نہیں یار۔ یہ بات نہیں جب سیٹھ صاحب نے مجھے پسند کر لیا اور پوچھا کہ کوئی اب کیا کہتے ہو؟ تو میں نے سیٹھ سے پوچھا۔

سیٹھ صاحب ! تیس سال سے زائد عمر کی کوئی بیٹی نہیں آپ کی ؟

اس پر سیٹھ کو غصہ تو بہت آیا۔ ایکدم سرخ ہو گیا۔ لیکن غصہ کو پیتے ہوئے اس نے کہا

• اچھا تو ہم آپ کو اپنی بڑی لڑکی کے لیے فرزندی میں لیتے ہیں۔

اس پر میں نے ایک اور تجویز پیش کی کہ

سیٹھ صاحب ! کیا یہ ممکن نہیں کہ میں آپ کی تینوں لڑکیوں سے بیک وقت شادی کر لوں ؟

بس بھیا کچھ نہ پوچھو۔ سیٹھ ایک دم شیر کی طرح گرجنے لگا۔ اپنے نوکروں کی پلٹن بلوائی۔ لیکن تم جانتے ہو تیز دوڑنے میں ساری یونیورسٹی میں اول نمبر تھا۔ ایسا بھاگا وہاں سے کہ یہیں آکر دم لیا۔

اعظم : سیٹھ کے غصے میں آنے کی تو بظاہر کوئی وجہ نہیں نظر آتی کیونکہ ہمارے معاشرے میں ایک سے زائد شادیوں کی عام اجازت ہے۔ اچھا فکر نہ کرو۔ میں تمہارے لیے راستہ ہموار کرتا ہوں۔ برسوں میں جس انسٹرکٹر میں کیا تھا۔ اس کے افسر نے ای سیٹھ دولت خاں کے نام مجھے ایک سفارشی رقعہ دیا ہے اگر سیٹھ نے مجھے پسند کر لیا تو میں اس کے سامنے یہ شرط پیش کروں گا کہ مجھے کوئی اچھی سی نوکری دے دیجیے میں آپ کی لڑکیوں کے لیے مناسب بر ڈھونڈ لاؤں گا۔ اس میں تمہارا چانس نکل سکتا ہے۔ مگر فرض کرو اگر لڑکیاں بدصورت نکلیں تو —— ؟

مجید : کوئی حرج نہیں۔ میں کالی اور بدصورت لڑکیوں کے بارے میں بڑا فراخ دل ہوں۔ بلکہ میں تو اکثر یہ سوچتا ہوں کہ اگر دنیا کے سارے مرد خوبصورت عورتوں سے شادیاں کریں تو یہ کالی پیلی لڑکیاں بے چاری کیا کریں گی اور پھر ان کے کالے یا بدصورت ہونے میں ان بیچاریوں کا کیا قصور ؟ اور پھر بھیا ! سب سے بڑی بات تو

یہ ہے کہ میں خوبصورت عورت ہے اس لیے شادی نہیں کرنا چاہتا کہ خوبصورت عورت کا شوہر اچھا خاصا تاج محل کا داروغہ بن جاتا ہے جو ہر دم یہ نگرانی کرتا رہتا ہے کہ تماشائی کہیں دیواروں پر پنسل سے لکیریں نہ کھینچ دیں۔ عمارت کا پلستر نہ اکھیڑ دیں اور بغیر اجازت اندر نہ داخل ہوں۔

اعظم : اچھا اچھا! اب بکواس بند کرو۔ میں کل ہی سیٹھ دولت خاں کے پاس جاؤں گا۔ تمھاری بارات تو کیا تمھارا جلوس نکلوا دوں گا۔ اچھا اب یونہی بیٹھے رہو گے۔ چلو گے نہیں نائٹ ڈیوٹی پر؟

مجید : یار اعظم! سیدل نے جو نائٹ ڈیوٹی لگائی ہے وہ بڑی مشکل ہے۔ یار مجھے تو ایک ہی رات میں بخار ہو گیا۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔

اعظم : تو پھر تم آرام کرو۔ میں جاتا ہوں۔

(اعظم اٹھتا ہے)

مجید : اور ہاں اعظم! ہماری نائٹ ڈیوٹی کا بعض لوگوں کو پتہ چل گیا ہے۔

اعظم : اس سے کیا فرق پڑتا ہے! محنت میں کاہے کی شرم!

(اعظم چلا جاتا ہے ——— مجید گنگنانے لگتا ہے)

پھر کوئی آیا دلِ زار۔ نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا

(آخری مصرعہ پر کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ مجید کہتا ہے)

مجید : کم اِن۔

(مسعود علی خاں اندر داخل ہوتا ہے اور اپنا تعارف کراتا ہے)

مسعود : مجھے مسعود علی خاں کہتے ہیں۔ میں مسٹر اعظم سے ملنا چاہتا ہوں۔

مجید : جی وہ اس وقت تو باہر گئے ہوئے ہیں ۔

مسعود : آپ یہیں رہتے ہیں ؟

مجید : جی ہاں !

مسعود : آپ مسٹر مجید تو نہیں ؟

مجید : جی ہاں !

مسعود : تو گویا آپ سے بھی بات کی جا سکتی ہے ۔ کیا آپ کل رات آٹھ بجے ۔ پکاڈلی نائٹ کلب آ سکتے ہیں
بات آپ ہی کے فائدے کی ہے ۔ آپ کی ساری مصیبتیں اور پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں ۔

مجید : جی ! اچھا ۔ میں آ جاؤں گا ۔

مسعود : بہت بہت شکریہ ! تو میں کل رات آٹھ بجے آپ کا منتظر رہوں گا ۔

مجید : جی ۔

مسعود : اچھا مجھے اجازت دیجئے ۔

( مصافحہ کرتا ہے اور دروازہ تک جا کر رک جاتا ہے اور مجید کو
یاد دلاتا ہے )

دیکھیے بھول جائیے گا نہیں ۔ پکاڈلی نائٹ کلب !

مجید : اوکے !

( مسعود چلا جاتا ہے )

پردہ

○

# آٹھواں منظر

منظر ——— اعظم میلی کچیلی پتلون اور میلی کچیلی قمیص
میں ملبوس ہے اس کے پاؤں میں چپل ——— گلے میں ایک
بڑا رومال —— اور ہونٹوں میں بیڑی جلتی ہوئی ،
——— اتنے میں رکشا کی گھنٹی کی آواز آتی ہے
اور ساتھ ہی عبدل رکشا چلاتا اسٹیج پر آتا ہے ——— وہ
گاتا ہے

تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے
پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے

اعظم کے پاس آکر رکشا روک کر سیٹ پر سے پچھلی سیٹ پر
بیٹھ جاتا ہے ۔

**اعظم** : سنا ؤ میری چوپاٹی کے شہزادے رکشا چارا کمایا تم نے ؟

**عبدل** : ڈونٹ ٹاک مسٹر اعجم ۔ آج سالا اپنا موڈ ایکدم خراب ہو گیا سالا ۔

**اعظم** : کیوں کیا ہوا تمہارے موڈ کو ؟

**عبدل** : آج اپنا ایک گوری میم صاحب سے فائٹنگ ہو گیا ۔

**اعظم** : گوری میم صاحب سے فائٹنگ ——— کیوں ؟

**عبدل** : دیکھو یار ! ہم اس کو ولٹن مارکیٹ پر رکشا میں بٹھایا ۔ ایمپریس مارکیٹ لایا ۔ پھر ہوا بندر لے گیا اکھا تین کلاک گھمایا ۔ آخر میں ہم کو دو روپے دیتا ہے ۔ ہم کو بڑا غصہ آیا ۔ اوپر گرم گرم آسمان بھی جلتا ہے ۔ نیچے جمین جلتا پڑا ہے ۔ ہمارا مستک پھر یلا ہے ۔ ہم بولا ۔ فائیو روپیز نکالو میم صاحب !

یہ ٹورو بیز کیا دیتا ہے تم۔ میم صاحب بولا "جاؤ ہم نہیں دیں گا۔ تم کون سا اس میں پٹرول ڈالتا ہے"۔
بس ہم اس بات پر ایکدم فرنٹ ہو گیا اور بولا "میم صاحب ہم اس میں پٹرول تو نہیں ڈالتا ہے۔ اپن کا خون ڈالتا ہے خون۔ بلڈ ڈالتا ہے۔ پیٹرول دو روپے دس آنے میں گیلن ملتا ہے۔ ادھر خون کا کون قیمت دے سکتا ہے۔

میم صاحب بولا: جاؤ بلڈی فول۔ بھاگ جاؤ۔ ہم دو روپے سے ایک پیسہ جیاستی نہیں دیں گا۔ تمھارا جو مرضی میں آئے کرلو۔

ہم بولا: میم صاحب تم لیڈی لوگ ہے۔ ایسا نہیں بولو نا کہ جو مرجی میں آئے کرلو۔ ہم جو مرضی میں آئے کریگا تو ہم کو دس سال کے لیے جیل میں بند کرا دیں گا۔ اتنے میں بھائی لوگ اکٹھا ہو گئے۔ سب سالے گوری چمڑی سے ڈرتے ہیں۔ ہم کو سالے بولنے لگے۔ لے لو یار دو روپے ٹھیک ہے۔ ہم میم صاحب کو بولا۔
میم صاب! دو روپے بھی تم رکھ لیو! ہم تم کو بخشش دیتا ہے"۔

بخشش کا نام سنکر میم صاحب بہت گسہ ہوا۔ بہت گسہ ہوا۔ وہ جتنا گسہ ہوا اتنا ہم کو بہت اچھا لگا۔ ایسا معلوم پڑا کہ ہم سنیما اسکوپ پکچر دیکھ رہا ہے۔ ہم ایکدم محبت میں ڈیپ چلا گیا۔ میم صاحب گسے سے دو روپے پھینکا اور گٹ پٹ کرتا گھر کے اندر چلا گیا۔ ہم نے دو روپے اٹھا لیا۔ پیڈل پر پاؤں رکھا۔ سینہ پر ہاتھ مارا اور

نو لاکھ چلی ری گوری تھم تھم کے

اعظم: یار عبدل! تم جو عورت سے جھگڑا کرتا ہے، یہ بہت بری بات ہے۔ ہر غیر عورت کی مرد کو عزت کرنی چاہئے۔

عبدل: ارے یار! یہ عورت مرد کا جھگڑا تو ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔ عورت نہیں کرے گا تو مرد جھگڑا کرے گا مرد نہیں کرے گا تو عورت جھگڑا کرے گا۔ تم خالی پیلی بوم مارتا ہے ادھر۔ اچھا بھئی اب سنبھالو رکشا۔ اپن بہت تھک گیا ہے سالا ہم۔ ابھی ذرا میری بار جائے گا۔ خیر لوبر کی اسکاچ وہسکی کا ادھا پی کر کوئی پنجابی فلم دیکھنے جائے گا۔ اچھا بھئی چیرلو!

**اعظم** : بریک وریک سب ٹھیک ہے نا ۔

**عبدل** : بتی گھنٹی ۔ بریک آل رائٹ ۔ ڈبری ٹائٹ کیا ہوں آں ۔ آج باڈی میں جان نئیں سالا اگھاڑن ابھوتڑ کا ہوا مار ا رہا ہے سالا ۔

( تھوڑی دُور جاکر )

آجم بابو ! دیکھو سالا تم اِدھر میں کھڑا ہو ۔ اُدھر میں عورت لوگوں کا جو کالج ہے نا ۔ اس میں کوئی جلسہ ملسہ ہوتا پڑا ہے ۔ ایچھے میں اچھا سواری مل جائیں گا ۔ اچھا اب میں جاتا ہوں ۔

( اپنے کے انداز میں چلتے ہوئے گاتا ہے

میں لاکھ جلون ری گوری تھم تھم کے

اور اسٹیج سے باہر چلا جاتا ہے ۔ اتنے میں نورافشاں دوسری طرف سے آتی ہے ۔ اعظم جلدی سے منہ پھیر کر گلے میں پڑے ہوئے رومال سے چہرہ چھپالیتا ہے ۔ نورافشاں آواز دیتی ہے ۔

**نورافشاں** : رکشا ! خالی ہے !!

**اعظم** : ( منہ دوسری طرف کیے ہوئے ) بیٹھئے میم صاب !

**نورافشاں** : کوئنس روڈ کا کیا لوگے ؟

**اعظم** : جو مرضی میں آئے دے دیجئے !

**نورافشاں** : نہیں بھی بتادو ۔ بعد کی تکرار مجھے پسند نہیں ۔ رکشا والے بڑے جھگڑالو ہوتے ہیں ۔ میں چھ آنے دوں گی ۔

**اعظم** : بیٹھ جایئے ۔

( نورافشاں رکشا میں بیٹھ جاتی ہے )

( اسٹیج پر رکشا کا ایک چکر ۔ پھر رکشا پردے کے پیچھے سے گھوم کر پھر اسٹیج پر آتا ہے )

نورافشاں : رکشا والے! بس یہیں روک لو۔ مجھے یہاں سے گلی میں جانا ہے۔ وہاں رکشا نہیں جاسکتی۔

(اعظم رکشا روک لیتا ہے۔ نورافشاں اُترتی ہے۔ جب پیسے
دینے لگتی ہے تو اعظم چہرے کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے اور
پیسے اس کے ہاتھ سے گر جاتے ہیں۔ وہ جب اٹھانے کے لیے
جھکتا ہے تو اس کے منہ کا ڈھاٹا کھل جاتا ہے۔ نورافشاں اسے دیکھ
لیتی ہے اور چیختی ہے)

نورافشاں : اعظم!

(وہ اس کے قریب ہو جاتی ہے)

اعظم : (گھبرا کر اسے الگ کرتے ہوئے) نور! یہ کیا بچپن ہے۔ یہ سڑک ہے۔ رات کا وقت ہے۔ کوئی دیکھ لے گا۔ تو کیا کہے گا۔

نورافشاں : اب میں لوگوں سے نہیں ڈرتی۔ مجھے تمھیں اس حال میں دیکھ کر بہت تکلیف پہنچی ہے۔

اعظم : اب گھر جاؤ نور! کل صبح باتیں کریں گے۔

نورافشاں : میرے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ رات کے اندھیرے میں تم یہ ذلیل پیشہ کرتے ہو۔

اعظم : ذلیل پیشہ! لیکن میں اسے بہت معزز پیشہ سمجھتا ہوں۔ میں تمھارے شرفا کی طرح غریبوں کے نوالے چھین کر ان کے جسموں کے کپڑے اتار کر زندگی کو بھرے بازار میں لے جا کر عورت کا بیوپار کر کے پیسہ نہیں کماتا۔ محنت کرتا ہوں۔

نورافشاں : لیکن میں تمھیں یہ کام ہرگز کرنے نہیں دوں گی۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور اب بھی کہہ رہی ہوں۔ جب تک تمھیں کوئی اچھی نوکری نہیں ملتی۔ میں تمھارے گھر کا سارا خرچ برداشت کروں گی۔

اعظم : اس تکلیف کی میں آپ کو اجازت نہیں دے سکتا میڈم۔ میرے ہاتھ پاؤں بہت مضبوط ہیں۔

نورافشاں : یہ جھوٹی خودداری ہے۔ حماقت ہے۔ بیوقوفی ہے۔ تمھیں شرم نہیں آتی۔ ایسا ذلیل کام کرتے ہوئے

اعظم : ذلیل کام ——— ذلیل کام ——— ! میڈم جب تک اس زمین پر چاندی کے سکے ؟

انقوال تک ان پھیلا ہوا ہے اس زمین پہ اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہے گا اور اس اندھیرے میں ہم جیسے لاکھوں ۔ کروڑوں مظلوم انسان ۔ اسی طرح بے عزت ہوتے ۔ رینگتے ۔ سسکتے مر جائیں گے اور میں پوچھتا ہوں کہ کون انسان ایسا ہے جو اس اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر ذلیل کام نہیں کرتا میڈم !

اندھیرا پھیلتے ہی سارے انسان بے شرم ہو جاتے ہیں ۔ ذلیل سے ذلیل کام کرتے ہیں کیونکہ اندھیرے میں دنیا اندھی ہو جاتی ہے ۔ انسان صرف دنیا کی آنکھوں سے ڈرتا ہے ۔ اس لیے وہ شرافت اور شرم کے رنگ برنگے لبادے اوڑھ کر اپنی مظلومیت ۔ اپنی مجبوری ۔ اپنی بے بسی ۔ اپنے بھوکے پیٹ اور ننگے جسم کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتا ہے ۔

**نور افشاں :** یہ سب باتیں میں خود بھی جانتی ہوں ۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ اس رکشا کے پہیوں میں تمہاری صحت گھل کر نہ رہ جائے ۔

**اعظم :** اچھا اب تم جاؤ ۔ یہ باتیں پھر بھی ہو سکتی ہیں ۔

**نور افشاں :** میں اپنی بات منوائے بغیر نہ جاؤں گی ۔

**اعظم :** میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا ہے نور کہ اس معاشرے میں کرٹ کھاتا اور ساڑھی بیٹھ کر کھاتی ہے ۔

**نور افشاں :** پاگل آدمی کیسی فرسودہ باتیں کرتے ہو ؟

**اعظم :** یہ سٹرک ہے ۔ رات آدھی کے قریب بیت چکی ہے ۔ آپ نے کرایہ دیدیا ہے ۔ میں اعظم نہیں صرف ایک رکشا والا ہوں ۔ اب آپ گھر جا سکتی ہیں میڈم ۔

**نور افشاں :** تم بے وقوف اور ضدی ہو ۔ جاہل جھگڑالو !

**اعظم :** رکشا والے بڑے جھگڑالو ہوتے ہیں میڈم !

(یہ کہہ کر رکشا پر سوار ہو جاتا ہے اور رکشا چلاتا ہے ۔ نور پکارتی ہے ۔ "اعظم !")

**اعظم :** گڈ نائٹ میم صاحب !

( اعظم اسٹیج سے باہر ہو جاتا ہے ۔ نور افشاں بھی مایوس ہو کر چلی جاتی ہے )

پردہ

O

# نواں منظر

(ایک ہوٹل یا نائٹ کلب۔ ایک رقاصہ سیاہ رنگ کے لباس
میں رقص کر رہی ہے اور گا رہی ہے۔ اطراف میزوں پر مرد اور
عورتیں بیٹھے شراب پی رہے ہیں۔ ایک میز پر مسعود علی خاں بیٹھا
ہے۔ جب گانا اور رقص ختم ہوتا ہے تو مجید داخل ہوتا ہے)

مسعود: اوہ! آئیے مجید صاحب۔ بڑی دیر کر دی آپ نے!

مجید: مسعود صاحب۔ آپ ٹھہرے کار والے اور ہم بے کار۔ بس نے بے بس کر رکھا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو کافی انتظار کرنا پڑا۔

مسعود: کوئی بات نہیں۔ دیر آید درست آید۔ فرمائیے آپ کیا پئیں گے؟

مجید: صرف ایک گلاس ٹھنڈا پانی۔

مسعود: بس! یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ جس جگہ بیٹھے ہیں۔ وہاں بے رنگ پانی تو حرام سمجھا جاتا ہے تکلف چھوڑیئے۔ بتائیے کیا پئیں گے؟ وہسکی۔ برانڈی۔ رم۔ شیمپین۔ پورٹ۔ شیری۔ بیئر!

مجید: آپ اپنے لیے منگوا لیجئے۔ میں تو پیتا نہیں۔

مسعود: مجید صاحب مثل مشہور ہے کہ جو پیتا نہیں وہ جیتا نہیں۔ اچھا خیر! ہاٹ ڈرنک نہ سہی کولڈ ڈرنک سہی!

مجید: تو پھر میرے لیے آئس کریم سوڈا منگوا دیجئے۔

مسعود: ایسی بھرپور جوانی۔ یہ دسمبر کی خنک اور رنگین رات اور صرف آئس کریم سوڈا۔ بھئی آپ کو تو نمونیہ ہو جائیگی آپ وہسکی پی رہے ہیں۔ کیا سمجھے؟

مجید: جی ہاں سمجھ گیا۔ میں وہسکی پی رہا ہوں۔

مسعود : گڈ شاٹ (ویٹر کو آواز دیتا ہے) ویٹر!

(ویٹر آتا ہے)

مسعود : وہل ٹو پیگس بلیک اینڈ وہائٹ لارج۔

(ویٹر آرڈر نوٹ کر کے چلا جاتا ہے)

ہاں تو مجید صاحب مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ بیتے بھی ہیں۔

مجید : لیکن میں اس کا عادی نہیں ہوں یہ تھرڈ پینٹ تو کبھی کبھار ہی ہو جاتا ہے۔

مسعود : کچھ عرصہ پہلے میں بھی اس کا عادی نہیں تھا لیکن بقول قمر شرحانی ؎

میرے حالات ہی کچھ ایسے ہیں
میرے حالات ہی کچھ ایسے ہیں

مجھ کو لینا پڑا اشراب سے کام
اتفاقات ہی کچھ ایسے ہیں

مجید : آپ کو شاعری سے بھی بڑا شغف معلوم ہوتا ہے۔

مسعود : صرف وہی اشعار یاد ہیں جو شراب و کباب سے متعلق ہوں۔ میں نے وہ اشعار کسی دیوان میں نہیں پڑھے البتہ شراب خانوں میں یاد کیے ہیں۔

مجید : میرا حافظہ اس معاملہ میں بڑا کمزور ہے۔ مجھے اشعار بالکل یاد نہیں رہتے ساری زندگی صرف تین شعر یاد رہ گئے ہیں۔

مسعود : تب تو وہ تین اشعار ساری اردو شاعری کا نچوڑ ہوں گے۔ مجھے مستفید نہیں فرمایئے گا۔

مجید : کیوں نہیں۔ سنیئے۔ کسی نے فرمایا ہے ؎

ترے دستِ حنائی کو جو میں نے کبھی تھام لیا تھا
اگر پہنچی ہے وہ پہنچی تو لکھ دے وہ کہ آ پہنچی

خبر پہنچی تو یہ پہنچی کہ وہ پہنچی نہیں پہنچی
مرے محبوب کی پہونچی خدا جانے کہاں پہنچی
یہیں رکھی تھی وہ پہونچی کہ اک کمبخت آ پہنچی
اٹھا پہونچی وہ یہ پہنچی، خدا جانے کہاں پہنچی

(دونوں ہنستے ہیں۔ ویٹر ڈرنک لاتا ہے۔ مسعود پیگ اٹھاتا ہے)

مسعود : ہماری آج کی دوستی کی یاد میں۔

(مجید بھی پیگ اٹھاتا ہے دونوں ایک ایک گھونٹ پیتے ہیں)

مسعود : اب جسم میں کچھ جان پڑی ہے۔ اچھا مجید صاحب! ایک بات بتایئے۔ آپ اور اعظم فرسٹ کلاس گریجویٹ ہیں؟

مجید : معاف کیجئے۔ اعظم فرسٹ کلاس گریجویٹ ہیں میں نے رائل کلاس میں بی اے پاس کیا ہے۔

مسعود : (دوسرا گھونٹ چڑھاتے ہوئے) رائل کلاس کا کیا مطلب؟

مجید : (دوسرے گھونٹ میں گلاس خالی کرتے ہوئے) اجی وہی تھرڈ ڈویژن۔

(مسعود مجید کا گلاس خالی دیکھ کر خود بھی اپنا گلاس خالی کرتا ہے اور ویٹر کو بلاتا ہے)

مسعود : دیکھو ویٹر۔ تم ہمارے آرڈر کا انتظار نہ کیا کرو۔ جیسے ہی ہمارے گلاس خالی ہوں۔ فوراً انہیں بھر جانا چاہیئے۔

ویٹر : آل رائٹ سر!

مسعود : ہاں تو مجید صاحب، اپنی چونکہ ایک نوجوان سرمایہ دار ہوں۔ اس لیے مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ قوم کے اتنے ذہین نوجوان بے کاری کے چکر میں پھنس کر کس طرح تباہ ہو جاتے ہیں۔

مجید : اجی صاحب! یہ سب انگریز کی چھوڑی ہوئی لعنت ہے۔ اس نے ہندوستان پر اپنا تسلط جمانے کے لیے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ ساری نوجوان نسل کو کلرک بنا دو۔ وہ فائلوں کے انبار میں اس طرح پھنس کر رہ جائےگی کہ کبھی نہ ابھر سکے گی۔

بسیرا اور پیگ لاکر میز پہ رکھدیتا ہے

مسعود : اٹھایئے گلاس اور غرق کیجیئے پالٹیکس کو اس میں ۔

(دونوں ایک ساتھ گلاس اٹھاتے ہیں اور مجید آدھا گلاس

چڑھا جاتا ہے)

مسعود : (مجید کو اس طرح تیز پیتے دیکھ کر) ماشاء اللہ ماشاء اللہ ! پرانے بادہ کش معلوم ہوتے ہیں آپ۔

(مجید کو مدہکا مدہکا سا نشہ ہو رہا ہے ۔ اس لیے وہ اچانک قہقہہ

لگاکر کہتا ہے :

مجید : بہت پرانا حضرت آدم سے بھی پرانا ۔ میں وہ تاریخی انسان ہوں جس نے دنیا میں سب سے پہلے شراب پی۔

مسعود : (گھبرا کر) آپ بہک تو نہیں رہے مجید صاحب !

مجید : (جھوم کر) اوہ آپ فکر نہ کیجئے ۔ میں بہکتا نہیں صرف جھکتا ہوں ۔ پی کر آدمی کو صرف جھکنا اور جھکنا چاہیئے ۔ بہکنا ہرگز نہیں آپ اگر میرا امتحان لینا چاہتے ہیں تو آپ موضوع چھیڑ دیجئے جس کے لیے آپ نے مجھے بلایا ہے ۔ دیکھیئے پھر میں بہکا ہوا ہوں یا صوفی ہوں۔

(یہ کہہ کر مجید دوسرا گلاس بھی پی جاتا ہے)

اور ساتھ ہی ویٹر آتا ہے ۔ مسعود اسے اشارہ کرتا ہے

کہ ایک اور لایئے)

مسعود : مجید صاحب ! یہ عظیم اور نور افشاں کا کیا معاملہ ہے ؟

مجید : کیوں آپ کو کیا تکلیف ہے ؟

مسعود : تکلیف ! جی ہاں بہت تکلیف ہے ۔ دیکھیئے نا مجھے جہاں تک معلوم ہوا ہے عظیم کی ایک ماں ہے ۔ چھوٹی بہن ہے ۔ جس مکان میں وہ رہتا ہے وہ کرایہ کا ہے ۔ ایک چھوٹے سے ٹیوشن کے علاوہ کوئی ذریعہ آمدنی نہیں اس پر طبیعت عاشق مزاج پائی ہے ۔

(ویٹر مجید کے لیے تیسرا پیگ لاتا ہے)

مجید : (تیسرے پیگ کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے) میں کچھ کچھ آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں مسعود صاحب!

مسعود : (ذرا مسکراکر) جی!

مجید : مسٹر مسعود کھل کر بات کیجئے نا۔ صاف صاف یہ کہہ دیجئے کہ میں بھی نورافشاں کی زلفوں کا اسیر ہوں۔ آجکل اظہار عشق کے لیے لمبی تمہید تصنع اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس ملک کے انسان کی زندگی بڑی مختصر ہے مسعود صاحب! کیوں میں نے ٹھیک کہا نا۔

مسعود : جی ہاں، جی ہاں!! بات کچھ ایسی ہے۔ لیکن میرے پاس اعظم کی طرح صرف خالی خولی محبت بھرا دل نہیں ہے بلکہ میری جیب بھی بھری ہوئی ہے اور جہاں تک عورت کا تعلق ہے خواہ وہ نورافشاں ہی کیوں نہ ہو۔ وہ صرف سوکھی محبت کی خواہاں نہیں۔ بلکہ وہ ایک عالیشان کوٹھی، ایک آہنی تجوری، اور ایک پیکار ڈکار کی چابیوں کی زنجیر کو بھی اپنی انگلی پر گھمانا بہت پسند کرتی ہے۔

مجید : (پیگ چڑھاتے ہوئے) لیکن میں آپ کی اس سلسلہ میں کیا خاطر تواضع کر سکتا ہوں۔

مسعود : آپ۔ آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ مجید صاحب! وقت اعظم سے اس کی بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن کے لیے پیار کی قربانی مانگ رہا ہے۔ اسے اس وقت خود غرض نہیں بننا چاہیئے اور پھر آپ ہی کہیئے ماں اور بہن کا پیار پائدار ہے یا محبوبہ کا پیار۔ محبوبہ کا پیار تو صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ رگوں میں لہو دوڑ رہا ہے۔ لیکن ماں کی ممتا اور بہن کے پیار کے پھول سدا مہکتے رہیں۔

مجید : (پیگ ختم کرتے ہوئے ہنستے ہیں) اگر اعظم آپکے اور نورافشاں کے راستے سے ہٹ جائے تو آپ کیا معاوضہ ادا کریں گے؟

مسعود : آئی لائیک دس بزنس ڈیل۔ میرا آفر ہے۔ آپکے اور اعظم کے لیے اپنی فرم میں تین تین سو روپے ماہوار کی ملازمت۔ جس مکان میں آپ رہتے ہیں وہ اعظم کی چھوٹی بہن کے نام خرید لیا جائے گا۔ آپ لوگوں کے چھوٹے موٹے قرض میں ادا کروں گا اور آج آپنے جو تکلیف اٹھائی ہے اس کے لیے

(یہ کہہ کر وہ جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل مجید کی طرف بڑھاتا ہے)

مجید : (آنکھیں پھیلاکر) اتنے بہت سے روپے۔ کتنی طویل مدت کے بعد میں اتنا روپیہ اکٹھا دیکھ رہا ہوں۔

(ہاتھ بڑھاکر روپے لیتا ہے اور اندر کی جیب میں رکھ لیتا ہے)

بہت بہت شکریہ مسعود صاحب! مجھے آج روپوں کی شدید ضرورت تھی۔ آپ مطمئن رہیں۔ اب اعظم آپ کے اور نور افشاں کے درمیان کبھی نہیں آئے گا۔

مسعود: (خوش ہوکر) از اٹ اے جنٹلمین پرامیز؟

(ہاتھ بڑھاتا ہے)

مجید: (ہاتھ ملاتے ہوئے) آف کورس اِٹ از۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔ میں چلتا ہوں

مسعود: اور بیٹھئے نا!

مجید: (اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے) جی نہیں بس! میں آپ سے کل شام ہی میں ملوں گا!

مسعود: (اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے) اچھا! آپ کا بہت بہت شکریہ۔

مجید: بائی۔ بائی!

(مجید چلا جاتا ہے)

پردہ

○

# دسواں منظر

(گڑک ——— رات کا وقت ——— اعظم رکشا

پیے کھڑا ہے ——— ادھر سے مجید نشہ میں دُھت

جھومتا جھومتا آتا ہے ——— وہ گنگنا رہا ہے ———

دل توڑنے والے دیکھ کے چل

ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

اعظم اسے پریشانی سے دیکھتا ہے اور آواز دیتا ہے)

**اعظم**: مجید!

**مجید**: کون؟ ——— مابدولت کو کس نے پکارا۔ فریادی! تم کون ہو۔ کیا ہماری ملکہ عالیہ نے تمہاری دھوبن بیوی پر تیر چلایا ہے

**اعظم**: (اس کے قریب جا کر غصے سے) تم کہاں سے آ رہے ہو مجید؟

**مجید**: اس جگہ سے جہاں مصیبت زدہ انسان اپنے سالے غم بوتلوں میں بھر بھر کے بیٹھے ہیں اور ماتھ رم میں اُن دکھوں اور غموں کو بہا دیتا ہے۔

**اعظم**: مجھے تمہاری یہ حالت دیکھ کر نہایت دُکھ ہوا۔ مجھے سخت تکلیف ہوئی ہے۔

**مجید**: تو پھر تم بھی پیو!

جو اور پیو اور پیو اور پیو۔ لگے رَم۔ مٹے غم۔ چلو میں تمہیں پلا تا ہوں چلو۔ دیکھو میرے پاس کتنے پیسے ہیں۔

(یہ کہہ کر وہ اعظم کو نوٹوں کا بنڈل دکھاتا ہے)

**اعظم**: (حیرت سے اور تیز لہجے میں) یہ روپیہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟

**مجید**: خدا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔

**اعظم** : مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تم نے یہ روپیہ جائز طریقے پر حاصل نہیں کیا! ضرور تم نے کوئی ایسی حرکت کی ہے جس سے ہم پر مصیبت آسکتی ہے!

**مجید** : محترمہ مصیبت بی بی اب ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو جائے گی اعظم! مصیبت بی بی عرف نُورافشاں!!

**اعظم** : کیا بک رہے ہو مجید!

**مجید** : (نشے میں) اعظم تم نے مکان کا کرایہ تین مہینے سے ادا نہیں کیا۔ میری ماں دس نمبری عینک لگا رہی ہے تمہاری ماں بیمار ہے۔ بانو کا نام اسکول سے کٹ گیا۔ نوکری سالے بہنوئی کو مل رہی ہے۔ میں نے سوچا نورافشاں کو بیچ دو ——————

**اعظم** : معلوم ہوتا ہے تمھیں سخت نشہ ہو گیا ہے۔ تم میری محبوبہ اور ہونے والی بھابی کے بارے میں ایسی بیہودہ باتیں کر رہے ہو ——————!

**مجید** : (قہقہہ لگا کر) محبوبہ! —————— بھابی! —————— دنیا کے بازار میں ذلیل انسان خدا تک کو بیچ دیتا ہے۔ میرے بھائی۔ نُورافشاں تو لڑکے کی بیٹی ہے۔

(اعظم مجید کے گال پر ایک زور دار طمانچہ لگاتا ہے اور مجید لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور رونے کے لہجے میں کہتا ہے)

**مجید** : تم مجھے مارتے ہو۔ کمینے خود غرض انسان! وقت تم سے قربانی مانگ رہا ہے! اپنی ماں۔ اپنی چھوٹی بہن! اور ایک خوشگوار زندگی کے لیے تمھیں اپنی محبت کی قربانی دینی پڑے گی۔ مسعود علی خاں نُورافشاں کو خریدنے کے لیے تیار ہے۔ تم اس کے راستے سے ہٹ جاؤ وہ یہ مکان تمھیں خرید دے گا۔ تمھیں اور مجھے نوکریاں دے گا۔

**اعظم** : (بات کاٹ کر) میں سمجھا یہ بات ہے۔

(افسوس کے لہجے میں)

اچھا اس وقت تو تم نہ صرف شراب کے بلکہ پیسے کے نشے میں بھی بدمست ہو (تیز لہجہ میں) لیکن صبح تمہارا نشہ

ٹوٹ جائے گا تو تمہیں فوراً میرا گھر چھوڑ دینا پڑے گا۔

مجید : (جس کا ——— جانا تھا نے اور اس الٹی میٹم نے تشکانی حد تک کافور ہو چکا ہے سنبھل کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے) اب میرا نشہ ٹوٹ چکا ہے۔ مجھے صبح تک انتظار کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی تمہارا گھر چھوڑ دوں گا اسی وقت اور جاتے جاتے ایک بار پھر میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ سب میں نے تنہا اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے اور میرے زیر پرورش مجبور افراد کے لیے کیا تھا؟ اگر یہ غلطی ہے یا یہ میری لغزش ہے تو ایک مجبور اور مفلس انسان سے ایسی لغزش کی امید نہ کرنا بھی ایک غلطی ہے (جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکال کر) میں نواب مسعود سے شاید ہی مل سکوں۔ تمہاری مہربانی ہوگی اگر تم کل یہ روپے اسے لوٹا دو۔ خدا حافظ!

(یہ کہہ کر مجید جانے لگتا ہے ——— اعظم کے ہاتھوں
میں نوٹوں کا بنڈل ہے وہ کچھ سوچتا ہے اور پھر مجید کو آواز
دیتے ہوئے دوڑ کر اس کے قریب جاتا ہے اور کہتا ہے)

اعظم : میرے بیس برس پرانے ساتھی! تم بھی مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو۔ میں تم سے معافی چاہتا ہوں کہ غصہ میں مجھ سے ایسی ذلیل بات منہ سے نکل گئی کہ تم میرا گھر چھوڑ دو (گلوگیر لہجے میں) میں جانتا ہوں مجید! اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ قصور سارا ہماری اس زندگی کا ہے جو غریبی کے اندھیرے میں سیدھے راستے کی تلاش میں بھٹک رہی ہے۔ یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ جب مفلسی گھر کے بڑے دروازے سے داخل ہوتی ہے تو عقل، خودداری، جرأت، اخلاق سب کے سب کھڑکیوں سے کود کر فرار ہو جاتے ہیں۔

(اعظم مجید کو گلے سے لگا لیتا ہے)

: مجید! میری بات کو بھول جاؤ۔ میں بھی تمہاری باتوں کو بھول جاؤں گا۔ یہ کمبخت روپیہ ہماری بیس سالہ دوستی کو ہرگز نہیں خرید سکتا اور نہ ہی اس روپے میں اتنی قوت ہے کہ وہ نوجوانوں کو خرید سکے۔ تم گھبراؤ نہیں ہم نوجوان ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں۔ ہم کو برے سے برے حالات سے لڑنا چاہیے۔ ہم نوجوان ہیں پڑھے لکھے ہیں۔ جدوجہد ہی زندگی ہے ورنہ ایسی بھرپور جوانی اور ایسی تعلیم پر لعنت ہے۔

مجید : (معذرت کے لہجے میں) مجھے افسوس ہے اعظم۔ میں کل صبح ہی مسعود کے یہ روپے اسے واپس کر دوں گا۔

**عظم** : ہاں اور کل صبح ہی حاکم علی خان کا رقعہ لیکر سیٹھ دولت خان کے پاس جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کوئی نوکری مل جائے۔ اگر وہاں بھی نہ ملے تو کہیں نہ کہیں ضرور ملے گی۔ آخر کب تک ہم سے چھپتی پھرے گی ——— ! آؤ۔ آج میں تمہیں رکشا میں بٹھا کر گھر لے جاؤں !

(عظم مسکراتا ہے اور حمیدہ بھی۔ دونوں اسٹیج سے باہر نکل جاتے ہیں ——— ——— )

پردہ

○

۹

# گیارھواں منظر

(صبح کے گیارہ بجے کا وقت ــــ سیٹھ دولت خاں

کا ڈرائنگ روم. جو جدید طرز سے فرنیچر سے سجا ہوا ہے ـــ

سیٹھ دولت خاں کے علاوہ ایک دبلے پتلے ، دھان پان داڑھی

والے مولانا ململ کا کرتہ ــــ تنگ موریوں کا پاجامہ ـ

پیروں میں سلیم شاہی جوتی پہنے اور سر پر دوپلی اوڑھے بیٹھے ہیں

جب پردہ اٹھتا ہے تو ان دونوں میں گفتگو جاری ہے ـــ

داڑھی والے مولانا کا نام میر قدرت اللہ ہے )

**سیٹھ دولت خاں :** ہاں تو میر صاحب ! میں کہہ رہا تھا کہ میری یہ خواہش ہے کہ اپنی لڑکیوں کا بیاہ تعلیم یافتہ لڑکوں سے کروں . یہ زمانہ تعلیم کا ہے اور میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے ـــــ اب چونکہ اپنی حکومت میں زیادہ لوگ جاگ رہے ہیں . اس لیے تعلیم یافتہ داماد وں کی شدید ضرورت ہے ـ

**میر صاحب :** مگر سیٹھ دولت خاں صاحب ! مجھے آپ سے اختلاف رائے ہے جناب ـــ پوچھیے کیوں ؟

( سیٹھ دولت خاں خاموش رہتے ہیں تو میر صاحب ذرا اور بلند

آواز سے کہتے ہیں )

**میر صاحب :** سیٹھ صاحب پوچھیے کیوں ؟

**سیٹھ دولت خاں :** ( تیوری چڑھا کر ) کیوں پوچھوں آخر ؟

**میر صاحب :** اس لیے کہ تعلیم یافتہ لڑکے کبھی اچھے شوہر ثابت نہیں ہوتے . میں نے آپ سے زیادہ زمانہ دیکھا ہے آپ کیوں اپنے ہاتھوں اپنی لڑکیوں کو کنوؤں میں دھکیلنے پر تل گئے ہیں .

**سیٹھ صاحب :** میر صاحب ! آپ ٹھیرے نا پرانے خیال کے آدمی ـــــ بھائی میرے

یہ نیا زمانہ ہے۔ نیا زمانہ ——— میری لڑکیاں پڑھی لکھی تو نہیں البتہ نئے زمانے کے ساتھ چلتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری کوئی لڑکی بھی آپ کے صاحبزادے عزیزم صبغۃ اللہ طول عمرہٗ سے بیاہ کرنے پر رضامند نہیں ہوگی۔

**میر صاحب** . (اچانک گرم ہوکر) کیوں؟ صرف اس لیے کہ میرا لڑکا انگریزی پڑھا ہُوا نہیں ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ داڑھی رکھتا ہے۔ شرعی پاجامے پہنتا ہے۔ مٹی کے ڈھیلوں سے استنجا کرتا ہے اور آنکھوں میں سُرمہ لگاتا ہے۔ (لہجہ بدل کر) لیکن یہ بھی تو دیکھیے سیٹھ صاحب! اس کی آمدنی کیا ہے؟

(سیٹھ صاحب خاموش رہتے ہیں)

**میر صاحب** : (اور زیادہ گرم ہوکر) پوچھیے نا سیٹھ صاحب کہ اس کی آمدنی کیا ہے؟

**سیٹھ صاحب** : (جزبز ہوکر) عجیب مصیبت ہے! اچھا چلیے بتائیے کیا ہے؟

**میر صاحب** : (فخریہ لہجے میں) لنڈا مارکیٹ میں، ڈیڑھ سٹیرکٹرول اور پرانے امریکن کوٹوں کی دکان ہے اُس کی ——— روز پچاس ساٹھ روپے کماری لیتا ہے کیا سمجھے ——— پچاس ساٹھ روپے روز ——— دل لگی نہیں کچھ ——————— !!

**سیٹھ صاحب** . (سمجھانے کے انداز میں) سیٹھ صاحب! آپ میرے بڑے پرانے دوست ہیں۔ آپ کا بچہ میرا بچہ ہے وہ ... ——— ———

**میر صاحب** . (اچانک غصہ سے کھڑے ہوکر اور بات کاٹتے ہوئے) ہائیں ہائیں . ——— سیٹھ صاحب ——— زبان سنبھالیے زبان ——— یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔ میرا بچہ آپ کا بچہ ہے ——— میرا بچہ آپ کا بچہ کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ بھی خوب رہی۔ آپ تو میرے بچے کی ولدیت کے خانے میں بھی گھس آئے ہیں۔

**سیٹھ صاحب** : (بوکھلاکر) ارے میر صاحب! کیا ہوگیا آپ کو ——— میں نے صرف ایک محاورہ استعمال کیا تھا ——— خدانخواستہ آپ کا بچہ میرا بچہ کس طرح ہوسکتا ہے!

——— میں تو ——— ———

**میر صاحب** : (اور زیادہ گرم ہو کر دوبارہ بات کاٹتے ہوئے) جی! پھر وہی بات! تو کیا آپ میرے بچے کو کسی غیر کا بچہ سمجھ رہے ہیں۔ توبہ توبہ استغفر اللہ ——— کس قدر توہین ——— !

**سیٹھ صاحب** : آپ میری بات نہیں سمجھ رہے میر صاحب۔

**میر صاحب** : اجی میں خوب سمجھ رہا ہوں ——— سب کچھ سمجھ رہا ہوں ——— اُلّو کا پٹھا نہیں ہوں۔

**سیٹھ صاحب** : (غصہ سے) جی! کیا فرمایا؟

**میر صاحب** : اجی میں نے عرض کیا۔ میں اُلّو کا پٹھا نہیں ہوں۔

**سیٹھ صاحب** : آپ خواہ مخواہ گرم ہو رہے ہیں میر صاحب! اگر یہ بات ہے تو پھر تیار ہو جائیے۔ میں بھی گرم ہوتا ہوں۔ میں آپ کا کوئی دبیل تو نہیں ہوں۔ میں خاموش بیٹھا ہوں۔ اور آپ سر چڑھتے جا رہے ہیں۔

**میر صاحب** : (سیٹھ دولت خاں کے اس طرح گرم ہونے سے اچانک پریشان سے ہو جاتے ہیں اور جیب سے رومال نکال کر چہرے اور گلے کا پسینہ پونچھتے ہوئے اچانک مسکراتے ہیں اور مصالحت کے انداز میں کہتے ہیں) سیٹھ صاحب، نہ میں گرم ہو رہا ہوں اور نہ آپ۔ آج اصل میں کچھ گرمی ہی زیادہ ہے۔

(یہ کہہ کر میر صاحب پھر صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پان کی ڈبیا نکال کر خوشامدی انداز میں سیٹھ صاحب کی طرف بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں)

**میر صاحب** : لیجئے شوق فرمائیے

**سیٹھ صاحب** : شکریہ! میں پان نہیں کھاتا

**میر صاحب** : پان نہیں کھاتے ——— حیرت ہے! شاعر نے کہا ہے ؎

پان کھانے سے لے مرے مولا
دانت بنتے ہیں ناصر الدولہ

اچھا خیر چلئے۔ آپ کی طرف سے بھی ایک پان اور کھاؤں ———

(یہ کہہ کر ایک کے بجائے دو پان کھاتے ہیں اور انگلیوں پر پان کا جو کتھا لگا ہوا ہے اسے قیمتی صوفہ سیٹ کے غلاف سے پونچھتے ہیں۔)

اور سیٹھ صاحب ان کی اس حرکت پر غصہ سے کھنکارتے ہیں اور
میر صاحب سہم جاتے ہیں۔ پھر سکراتے ہیں اور بات کا آغاز کرتے ہیں )

**میر صاحب** : ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ میرے لڑکے صبغتہ اللہ کی لنڈا بازار میں کپڑوں کی ایک بہت بڑی دکان ہے۔

**سیٹھ صاحب** : میر صاحب! میں نے ایک بار آپ سے کہہ دیا ہے اب کس طرح بار بار کہوں کہ میری بیٹیاں لنڈے بازار کے دکانداروں کی بیویاں ہرگز نہیں بن سکتیں۔

**میر صاحب** : اجی قبلہ! میں یہاں لنڈے بازار کے دکانداروں کے بیٹوں کے پیغام لے کر نہیں بلکہ صرف اپنے صبغتہ اللہ کا پیغام لیکر آیا ہوں۔

**سیٹھ صاحب** : آپ کا بیٹا بھی لنڈے بازار کا دکاندار ہے۔ سمجھ گئے آپ۔ اب اس موضوع پر آپ مجھ سے بات نہ کریں۔

( میر صاحب یہ سنکر پریشان سے ہو جاتے ہیں کچھ بوکھلائے جیسے
حرکات کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں )

**میر صاحب** : کیا آپ اپنے اس فیصلہ پر نظر ثانی نہیں کر سکتے سیٹھ صاحب ؟

**سیٹھ صاحب** : ہرگز نہیں۔

**میر صاحب** : اپنے سولہ سالہ پرانے اور مخلص دوست کی درخواست پر بھی نہیں۔

**سیٹھ صاحب** : ہر باپ اپنی بیٹی کے مستقبل کے معاملے میں بڑا خود غرض ہوتا ہے میر صاحب !

**میر صاحب** : تو اس کا مطلب یہ ہے مجھے مایوس ہو جانا چاہیئے سیٹھ صاحب۔

**سیٹھ صاحب** : جی ہاں! جی ہاں! بالکل۔

**میر صاحب** : ( استفسار کے لہجہ میں ) لیکن سیٹھ دولت خاں صاحب بھلا مجھے کیوں مایوس ہونا چاہیئے۔

**سیٹھ صاحب** : ( حیرت سے ) پھر کس کو ہونا چاہیئے۔

**میر صاحب** : مایوس تو میرے لڑکے صبغتہ اللہ کو ہونا چاہیئے۔ شادی میری تھوڑی ہی ہونے والی تھی۔

**سیٹھ صاحب** : میر صاحب! آج پتہ نہیں آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ عجیب الٹی سیدھی اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو آپ۔

**میر صاحب:** الٹی سیدھی اور ٹیڑھی بانگ باتیں! اس لیے کہ میں آپکے پاس ایک توقع لیکر حاضر ہوا ہوں۔ اگر یعنی کسی غرض سے آتا تو آپ اپنی باتوں پر سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے ڈونگرے برساتے! اچھا خیر! اب مجھے اجازت دیجیے۔ اب میں جاتا ہوں۔

**سیٹھ صاحب:** بصد شوق تشریف لے جائیے۔

**میر صاحب:** (اٹھ کھڑے ہوتے ہیں) یاد رکھیے سیٹھ صاحب۔ آپ کی اور میری سولہ سالہ دوستی ختم ہو رہی ہے

**سیٹھ صاحب:** میں اپنی اولاد کی بھلائی کی خاطر قیمتی سے قیمتی دوست کی دوستی کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوں

**میر صاحب:** میں ایک بار بلکہ آخری بار پھر بحیثیت ایک مخلص دوست کے آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ ایک بار پھر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔

**سیٹھ صاحب:** کیوں آخر؟ کیا مجھے اندھا سمجھ رکھا ہے۔

**میر صاحب:** یاد رکھنا؟ اچھا سیٹھ صاحب۔ آج آپ سے مل کر مجھے بہت بہت کوفت ہوئی۔ جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔

**سیٹھ صاحب:** بسم اللہ! بسم اللہ!

(میر صاحب تھوڑی دور تک جا کر رکتے ہیں اور بسم اللہ کے الفاظ سنکر ٹھٹک کر رک جاتے ہیں اور بڑی مخصوص آواز میں کہتے ہیں "آمین" اور پھر لوٹ کر صوفے کے قریب جاتے ہیں مسکرا کر سیٹھ صاحب کو دیکھتے ہیں اور سر پر سے دوپلی اتار کر صوفے پر آرام سے بیٹھ جاتے ہیں سیٹھ دولت خان بڑی حیرانی کے ساتھ انھیں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ میر صاحب صوفے پر بیٹھنے کے بعد پورا خود سکوت توڑتے ہیں)

**میر صاحب:** سیٹھ صاحب! آپ نے بسم اللہ کہا۔ یعنی اللہ کا نام لیا تو اب ساری بات از سر نو اللہ کے نام سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ساری گڑبڑ اسی لیے ہوئی کہ میں بات چیت کا آغاز اللہ کے نام سے نہیں کر سکا تھا

خیر اب سہی ۔ ۷۸۶/۴۹۲ میں عرض کر رہا تھا کہ میرے لڑکے صبغۃ اللہ کی لنڈے بازار میں تیار شدہ کپڑوں اور پرانے امریکن کوٹوں کی ایک دکان ہے ۔

**سیٹھ صاحب** : (انتہائی غصہ کے عالم میں) میر صاحب ! میں نے آپ کو صاف صاف بتا دیا ہے کہ جہاں تک میری دختر کی لنڈے بازار کے کسی کباڑیئے سے شادی کا تعلق ہے تو آپ یہ یقین کر لیجئے کہ دنیا میں لاہور شہر کا کوئی وجود نہیں ہے ۔ اگر لاہور شہر ہے تو پھر اس میں لنڈا بازار نہیں ہے ۔ اگر لنڈا بازار ہی ہے تو میری کوئی دختر ہرگز نہیں ہے ۔

**میر صاحب** : یہ کہہ کر تو آپ دنیا کو شک و شبہ میں ڈال دیں گے ۔ ایسی نازیبا بات کہنے سے پہلے بھائی صاحبہ کا تو خیال کیجئے ۔

**سیٹھ صاحب** : (غصہ سے بے قابو ہو کر) میر صاحب آپ اس طرح یہاں سے نہیں جائیں گے ۔ مجھے اپنے نوکروں کی خدمات حاصل کرنا ہی ہونگی ۔

**میر صاحب** : (غصہ سے اٹھ کر) یہ نوبت ! استغفراللہ ۔ یہ توہین جزاک اللہ ۔ اُف لاحول ولا ! اجی لیجئے ۔ میں خود چلا جاتا ہوں ۔

(یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

**سیٹھ صاحب** : میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ آپ خود چلے جائیں ۔

**میر صاحب** : (پھر بیٹھ جاتے ہیں) لیکن سیٹھ صاحب ! آپ عمر بھر پچھتائیں گے ۔ لنڈے بازار میں دکان کوئی معمولی بات نہیں ہوتی ۔

**سیٹھ صاحب** : (بیزار ہو کر) اُف کیا مصیبت ہے یہ !

(اتنے میں ایک نوکر داخل ہوتا ہے اور ایک وزیٹنگ کارڈ سیٹھ دولت خاں کو دیتا ہے ۔ میر صاحب نوکر کو دیکھ کر پہلے پہل تو بڑے سٹپٹاتے جاتے ہیں ۔ لیکن جب وزیٹنگ کارڈ سیٹھ دولت خاں کو دیتا ہے تو دوبارہ اطمینان کا سانس لیتے ہیں)

سیٹھ صاحب : (بہ آواز بلند وزیٹنگ کارڈ کا نام پڑھتے ہیں) محمد اعظم بی۔اے علیگ۔ فرستادہ۔
حاکم علی خاں صاحب پروپرائٹر گوٹ اینڈ شیپ ہائیڈ اینڈ اسکن فرم" اچھا سمجھ گیا۔

(پھر وہ میر صاحب سے مخاطب ہوتے ہیں)

دیکھیے میر صاحب! ایک اجنبی آ رہا ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ تشریف لے جائیں یا پھر میری
درخواست ہے کہ جب تک وہ یہاں بیٹھا ہے آپ بالکل خاموش رہیں۔

میر صاحب : (بگڑ کر) اجی واہ! کیا میں آداب مجلس نہیں جانتا۔ کیا سمجھتے ہیں آپ مجھے؟

سیٹھ صاحب : اچھا! مجھے معاف کرو۔ (نوکر سے مخاطب ہو کر) ملاقاتی کو اندر بھیج دو۔

(نوکر جاتا ہے۔ دوسرے لمحے اعظم اندر داخل ہوتا ہے۔ سیٹھ صاحب
اس کی شخصیت سے فوراً متاثر ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں میر صاحب
بھی مختلف زاویے بنا کر اعظم کو دیکھتے ہیں۔ سیٹھ صاحب کھنکارتے
ہیں تو میر صاحب سہم کر سیدھے ہو جاتے ہیں۔ سیٹھ صاحب فوراً مسکراتے
ہوئے اعظم سے مخاطب ہوتے ہیں)

آیئے آیئے تشریف لایئے۔ یہاں تشریف رکھیے۔

(اعظم بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے)

اعظم : مجھے جناب حاکم علی خاں صاحب پروپرائٹر گوٹ اینڈ شیپ ہائیڈ اینڈ اسکن فرم نے آپ کے پاس
بھیجا ہے اور ان کا یہ رقعہ آپ کے نام ہے۔

(رقعہ سیٹھ کی طرف بڑھاتا ہے)

(سیٹھ دولت خاں عینک لگا کر رقعہ پڑھتے ہیں۔ رقعہ پڑھتے
ہوئے ان کی آنکھیں سی کھل جاتی ہیں اور رقعہ ختم کر کے وہ بڑی میٹھی
میٹھی نظروں سے اعظم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھتے ہیں)

سیٹھ صاحب : تو آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔اے اول درجے میں کامیاب کیا ہے!

**اعظم** : جی ہاں! اگر آپ کہیں تو میں اپنی بی۔ اے کی ڈگری آپ کو دکھا دوں۔ میں ڈگری ساتھ لایا ہوں۔

**سیٹھ صاحب** : نہیں نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن اگر آپ دکھا ہی دیں تو بہتر ہے۔

**میر صاحب** : (چونک کر) ہاں نوجوان کیا کہا۔ کیا ڈگری لائے ہو تم؟

(اعظم حیرت سے انہیں دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے)

**سیٹھ صاحب** : میر صاحب یہ عدالت کی ڈگری نہیں۔ بی۔ اے کی ڈگری ہے۔

(اعظم سے مخاطب ہو کر)

یہ میرے بڑے دوست ہیں۔ میر قدرت اللہ۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں

**اعظم** : (میر صاحب کی طرف ہاتھ بڑھا کر) آپ کے ایک ہی جملے سے میں پوری طرح آپ کی شخصیت سے متعارف ہو چکا ہوں۔ بہر حال مجھے آپ سے مل کر واقعی لطف آیا۔

**میر صاحب** : جیتے رہو برخوردار۔

(اعظم اپنی ڈگری اور دوسرے اسناد ان سیٹھ صاحب کی طرف بڑھاتا ہے سیٹھ صاحب ڈگری اور اسناد کو غور سے دیکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں)

**سیٹھ صاحب** : خیر سے آپ کنوارے تو ہیں!

**اعظم** : صاحب! اس زمانے میں پہلے بی۔ اے پاس ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بعد کہیں بی۔ ٹی پاس کی ڈگری ملتی ہے

**سیٹھ صاحب** : (مسکراتے ہوئے) ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ بڑے خوش مزاج اور فقرہ باز نوجوان ہیں آپ۔ یقین ہے کہ خوبصورت و تندرست ہونے کے علاوہ خوب سیرت بھی ہوں گے۔

**اعظم** : لیکن قبلہ! یہ ساری خصوصیات تو ساتھ ہیں لیکن صرف ایک کسر رہ گئی ہے کہ اگر اس بی۔ اے کی ڈگری اس صحت مند جسم اور مضبوط کردار کے بجائے لنڈے بازار میں اگر کوئی پرانے کپڑوں کی دکان وہ اتنا ہی کما پاتا کہ میر صاحب۔ میز پر زور سے ہاتھ مار کر اچھل پڑتے ہیں اور چیختے ہیں)

میر صاحب : لنڈے بازار میں کپڑے کی دکان - واہ واہ وا - یہ کمی نا سو بات کی ایک - سن لیجئے -
سیٹھ صاحب ! آپ کا تعلیم یافتہ داماد میں لنڈے بازار کا دکاندار بننا چاہتا ہے۔

اعظم : ( حیرت سے ) دکاندار -

سیٹھ صاحب : ( غصے سے کھڑے ہو کر ) اومیر کے بچے - نکل جا یہاں سے - ابھی وقت -

اعظم : ہیں ہیں - یہ سب کیا ہو رہا ہے - بزرگو - آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں -

سیٹھ صاحب : نوجوان - آپ معاف کریں - یہ بڈھا سٹھیا گیا ہے - آپ بیٹھ جائیں - میں اسے نکلوا کر آپ
سے باتیں کروں گا -

میر صاحب : اماں تم مجھے کیا نکلواؤ گے - میں اس نوجوان کو یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا تاکہ تم اپنی لڑکی کا
بیاہ اس سے کر کے اس کو جیتے جی اندھے کنویں میں نہ دھکیل سکو -

( اعظم سے مخاطب ہو کر )

نوجوان ! میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں - تم اتنے خوبصورت اور تعلیم یافتہ ہو کر کیا کسی کالی بھجنگ
اور بدصورت لڑکی سے صرف اس لیے شادی کرنا پسند کرو گے - کہ اس کا باپ ایک مالدار ہے -

سیٹھ صاحب : زبان سنبھال او میر کے بچے !

میر صاحب : چپ او سیٹھ کے بچے -

( اعظم سے مخاطب ہو کر )

نوجوان ! اگر تم شادی کے لیے ایسے ہی بے قرار ہو تو آؤ میرے ہمراہ آؤ - میری ایک لڑکی ہے
صبغۃ اللہ کی ہمشیرہ - خوبصورت - سلیقہ شعار ہر قسم کے گھریلو کام کی ماہر - حافظِ قرآن -

( یہ کہہ کر وہ اعظم کا ہاتھ زبردستی اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور اسے
گھسیٹے لئے جاتے ہیں - سیٹھ صاحب غصے سے اپنے نوکروں کو آوازیں
دینے لگتا ہے )

سیٹھ صاحب : مجو - فضلو - تین - ارے کوئی ہے -

( اتنے میں نوکروں کی ایک فوج اندر داخل ہوتی ہے۔ میر صاحب
گھبرا کر اعظم کا ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ سیٹھ صاحب زخمی شیر کی طرح چیختے
ہیں )

سیٹھ صاحب: اس خبیث بڈھے کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔

( نوکر میر صاحب کی طرف بڑھتے ہیں۔ اعظم موقع پا کر گھبراہٹ میں
اپنی بی اے کی ڈگری، تصویر اور اسناد ات چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے
سیٹھ دولت خان اُسے آوازیں دیتے۔ اس کے پیچھے لپکتے ہیں
اور ادھر میر صاحب نوکروں کے سامنے کبڈی کے کھلاڑی
کی طرح بچ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں )

پردہ

○

# بارھواں منظر

( وہی کمرہ جو گیارھویں منظر میں دکھایا گیا ہے۔ سیٹھ دولت خاں
بڑبڑاتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں )

**سیٹھ صاحب** : کمبخت میرے بچے نے سارا معاملہ بگاڑ دیا۔ اب اس نوجوان کو کہاں ڈھونڈوں۔

( غصے کے عالم میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ اچانک ان کی نظر میز پر رکھے
ہوئے کاغذوں کے پلندے پر پڑتی ہے۔ وہ رکتے ہیں اور حیرانی
کا اظہار کرتے ہوئے اس پلندے کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس نوجوان
کی بی اے کی ڈگری کی تصویر اور اسناد دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں )

**سیٹھ صاحب** : چلو اچھا ہوا کہ وہ سب کاغذات وغیرہ یہیں چھوڑ گیا۔ اس سلسلے میں بیگم سے بھی مشورہ کرنا نہایت
ضروری معلوم ہوتا ہے۔

( بیگم ——— او بیگم سنتی ہو ——— اماں بیگم
سنتی ہی ہو نا ——— ایک بہت بھاری بھر کم معمر سفید
رنگ خاتون داخل ہوتی ہیں اور کہتی ہیں )

**بیگم** : کیا گھر کو سر پر اٹھا رکھا ہے؟ ——— کیا مصیبت پڑ گئی ہے آخر؟

**سیٹھ صاحب** : مصیبت ——— ! مصیبت پڑے تمہارے دشمنوں پر بیگم۔ میں تو تمہیں ایک خوشخبری سنانے
والا ہوں۔ سنو گی تو باغ باغ ہو جاؤ گی۔

**بیگم** : اچھا جی ! ——— تو پھر بتاؤ جلدی سے مجھے باغ باغ

**سیٹھ صاحب** : اس طرح نہیں پہلے مٹھائی کھلاؤ

**بیگم** : ہے ہے۔ وقت نہ سعت۔ بڈھا چڑھا تخت۔ تم نے مجھے بھی کوئی حلوہ مرچنٹ سمجھ رکھا ہے کہ

سر وقت مٹھائی تیار رکھوں۔ پہلے خوشخبری سناؤ۔ اگر واقعی وہ خوشخبری ہوئی تو مٹھائی بھی آجائے گی۔

سیٹھ صاحب: وعدہ کرتی ہو۔

بیگم: اب یہ بڑھے چونچلے ختم کرو ——— اور بتاؤ کیا بات ہے؟

سیٹھ صاحب: میرے دوست ہیں نا حاکم علی خاں۔ آج انھوں نے ایک بہت خوبصورت صحت مند اور خوش مزاج نوجوان میرے پاس بھیجا تھا

(بیگم چونک پڑتی ہے اور بڑی دلچسپی سے باتیں سننے لگتی ہے۔ اُن کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں)

سیٹھ صاحب: مگر ———

(ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں)

(بیگم پریشان ہوکر پوچھتی ہیں)

بیگم: مگر کیا ——— یہ مگر کیوں؟

سیٹھ صاحب: (غصے سے دانت چباتے ہوئے) مگر وہ کمبخت میر قدرت اللہ کا بچہ ——— اُس پر بلا کا ایسا رعب ڈالا کہ بس سارا کھیل بگاڑ ڈالا۔ اس سے گھبرا کر وہ نوجوان بھاگ گیا ———

بیگم: (اچانک منہ پیٹ کو پیٹنے کی نقل کرتے ہوئے) ہائے ہائے، پتہ نہیں میری بچیوں کے سہرے کے پھول کب کھلیں گے آخر پروردگار —

سیٹھ صاحب: (فاتحانہ انداز میں مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے) یہ رونا دھونا کیا فضول حرکت ہے بیگم گھبراؤ نہیں۔ ابھی وہ لڑکا ہمارے ہاتھ سے نہیں نکل سکا ہے۔ میری اور میری بچی کی قسمت۔ میں میں میں اپنی بی۔اے کی ڈگری، اسنادات اور تصویر وغیرہ سب بھول گیا ہے۔ انھیں لینے تو ضرور آئے گا وہ۔

بیگم: (چہرے پر اطمینان کے آثار ——— تنبیہ کے انداز میں کہتی ہے) مگر یاد رکھنا ——— اب کی بار وہ لڑکا ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔

سیٹھ صاحب: ابھی ایسا ہو سکتا ہے کبھی ——— میرا نام دولت خاں ہے دولت خاں۔ دولت خاں

کے معنی سلیس اُردو میں طاقت خاں کے ہوتے ہیں۔ سمجھیں۔

بیگم : میرے سامنے ڈینگیں نہ مارا کرو اس طرح۔

سیٹھ صاحب : اپنے ہونے والے داماد کی تصویر دیکھو گی بیگم ؟

بیگم : کیوں نہیں ——— کیوں نہیں !

(سیٹھ صاحب بغل کے کاغذات کے پلندے سے ایک تصویر
نکال کر چھپا لیتے ہیں اور چہل کے انداز سے بیگم سے کہتے ہیں)

سیٹھ صاحب : نہیں اس طرح نہیں۔ پہلے آنکھیں بند کرو

بیگم : توبہ یہ کیا چہل سوجھی ہے تمہیں ؟

(سیٹھ صاحب نہیں مانتے ——— خود بیگم کے پیچھے جاکر
ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔ بیگم جھنجھلا کر ان کا ہاتھ
ہٹا دیتی ہے اور تھوڑی دیر تک تصویر کو بغور دیکھ کر ایک
ٹھنڈی سانس بھرتی ہے جس سے سیٹھ صاحب چونک کر غور
سے بیگم کو دیکھتے ہیں اور غصیلے لہجے میں پوچھتے ہیں)

سیٹھ صاحب : بیگم ——— یہ لمبی ٹھنڈی سانس تم نے کیوں لی ؟

بیگم : (وہ بھی قدرے تلخ لہجے میں) اس سوال کا کیا مطلب ؟

سیٹھ صاحب : (اسی غصیلے لہجے میں) میں پوچھتا ہوں کہ تم نے یہ ٹھنڈی سانس کیوں لی؟

بیگم : کیوں سانس لینا بھی گناہ ہے ؟

سیٹھ صاحب : سانس لینا گناہ نہیں ——— لیکن یہ لمبی اور ٹھنڈی سانس ضرور کوئی معنی رکھتی ہے

بیگم : شک کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔

سیٹھ صاحب : (اسی غصیلے لہجے میں) باتیں نہ بناؤ بیگم ——— میں اس لمبی اور ٹھنڈی سانس کا مطلب جان
کر رہوں گا۔

**بیگم** : لڑنا چاہتے ہو!

**سیٹھ صاحب** : لڑائی اس ٹھنڈی اور لمبی سانس کا مطلب جاننے کے بعد شروع ہوگی۔

**بیگم** : تو پھر سنو! ——— اس ٹھنڈی لمبی سانس کا مطلب یہ ہے کہ کاش اپنی جوانی میں تم بھی ایسے ہی خوبصورت اور کڑیل نوجوان ہوتے!

**سیٹھ صاحب** : (گرج کر) کیا بکتی ہو تم ——— اب میں آگے کچھ نہیں سن سکتا۔ خدا کی قسم میں تمہیں گولی مار دوں گا۔

**بیگم** : کاش تم مجھے اسی روز گولی مار دیتے جس دن تم سے میرا بیاہ ہوا تھا۔ بجائے اس کے کہ تمہاری شکل و صورت کی یہ کالی کالی لڑکیاں جوان ہو کر یوں مونگ کی سلوں کی طرح میرے سینے پر رکھی جائیں۔

(چیخ چیخ کر روتے ہوئے)

تم مجھے گولی مار دیتے تو اچھا تھا۔

(سیٹھ دولت خان بیگم کے اس طرح چیخ چیخ کر رونے سے ایکدم پریشان ہو جاتا ہے اور سر کے بال نوچ کر کہتا ہے)

اُفوہ! بھئی حد ہو گئی!

(اور پھر بیگم کے قریب جا کر نرم لہجے میں کہتا ہے)

**سیٹھ صاحب** : بیگم! یہ کیا بچپنا ہے۔ لڑکیاں گھر ہی میں ہیں۔ وہ کیا سوچیں گی۔ خدا کے لیے یہ رونا رلانا بند کرو۔

**بیگم** : (اور زیادہ مچل کر) نہیں جی۔ نہیں! آج تو تم گولی ہی مارو

(پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی ہے)

**سیٹھ صاحب** : (زچ ہو کر اور مکمل طور پر ہار مانتے ہوئے) اچھا بابا اچھا ——— میرا قصور معاف کرو میں اپنی گولی ——— ہونہہ ——— میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔

یہ کہہ کر بیگم کے دوپٹے سے بیگم کی بغیر آنسو والی
آنکھیں پونچھتا ہے۔ اور میز کے پاس سے اُگال دان اُٹھا کر
اس کے منہ کے قریب لاتا ہے اور کہتا ہے )

سیٹھ صاحب : لو اب غصہ تھوک دو۔

بیگم : من جانے کے انداز میں اُگال دان میں "آخ تھو" تھوکتے ہوئے کہتی ہے۔

بیگم : (نخرے سے) تم ہی تو مجھے چھیڑتے ہو۔

سیٹھ صاحب : ابھی بس رہنے بھی دو۔ اب کیا خاک چھیڑوں گا۔ کہو لڑکا پسند آیا!

بیگم : بہت پسند آیا۔ اگر وہ میری پیاری بیگم کو بھی پسند کرے تو داتا کے مزار پر نیاز چڑھاؤں گی۔
پانچ سو فقیروں کو کھانا کھلاؤں گی۔

(اسی اثنا میں نوکر اندر داخل ہوتا ہے اور کہتا ہے)

نوکر : سیٹھ جی! آپ کا ٹیلیفون!

سیٹھ صاحب : اچھا! کہیں اس لڑکے کا نہ ہو!

بیگم : چلو میں بھی چلتی ہوں۔

سیٹھ صاحب : آؤ۔

(سیٹھ اور بیگم باہر چلے جاتے ہیں۔ ایک لمحے
کے لیے اسٹیج خالی رہتا ہے۔ اس کے بعد ایک نہایت
فربہ اندام بے ہنگم سیاہ رنگ نوجوان لڑکی دبے
دبے پاؤں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے داخل ہوتی ہے۔ میز
کے قریب جا کر اسلم کی تصویر اٹھاتی ہے اور غور سے
اسے دیکھتی ہے اور آنکھیں بند کر کے تصویر کو اپنے سینے
سے لگا لیتی ہے اور اسی اثنا میں ڈاکٹر کرے

سے بیگم کی آواز آتی ہے ۔

ماہ پارا ——— بیٹی ماہ پارا ———

یہاں تو آئیو ——— !

وہ لڑکی بلند آواز سے جواب دیتی ہے

ماہ پارا : جی آئی امی !

یہ کہہ کر وہ بھی کمرے سے باہر چلی جاتی ہے

پردہ

O

# تیرھواں منظر

پبلک گارڈن ———— لان ———— ایک

شخص ایک تیل مالشیئے سے بدن کی مالش کر رہا ہے۔

ان سے قریب ایک بے فکرا نوجوان لان پر بیٹھا اپنی ترنگ میں

ایک غمناک گیت گا رہا ہے۔ جس سے کچھ فاصلے پر اعظم تھکا ہارا

اور مغموم بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔ اعظم سیاہ رنگ کی شیروانی

میں ملبوس ہے۔

(گانا)

جب گانا ختم ہوتا ہے۔ عبدل گاتے ہوئے داخل ہوتا ہے۔

چل چل چنبیلی باغ میں پتنگ اڑائیں گے

اعظم کے قریب جا کر بے فکرے اور مسخرے انداز میں بولتا ہے۔

**عبدل** : ہل لو گڈ ایوننگ اینڈ گڈ نائٹ مسٹر ڈیوی ٹائیٹ۔ ہم سالا ادھر تمہارا پاک بلوچ سکن ہوٹل میں انتظار کرتا پڑا ہے اور سالا تم ادھر میں دلیپ کمار کا مافک روتا بیٹھا ہے۔ چلو اٹھو نی۔ آج کچھ پکچر مکچر دیکھتے کو طبیعت مالش کرتا ہے۔

**اعظم** : (بیزاری سے) تم جاؤ عبدل۔ آج میں نہیں جا سکتا۔

**عبدل** : واہ ہم اپنا فرینڈ کو چھوڑ کر اکیلا پکچر کیسا دیکھ سکتا ہے۔ تم کو بھی ہمارے سنگمات چلنا پڑیں گا۔

**اعظم** : نہیں یار! آج میں ایک بڑی پریشانی میں پھنسا ہوا ہوں۔

**عبدل** : واہ رے واہ ———— اوپر شیروانی اندر پریشانی ———— سالا ہم کو بھی بتاؤ۔ کیا پریشانی ہے خدا قسم ہم ابھی پریشانی کی ڈیوی ٹائیٹ کر دیں گا۔

**اعظم** : عبدل ——— بانو سخت بیمار ہے۔ غالباً اسے ٹائی فائڈ ہو گیا ہے اور تم تو جانتے ہی ہو آج میرے پاس بالکل پیسہ نہیں ہے۔

**عبدل** : سالا تم نے ہم کو کل کیوں نہیں بولا۔ آج صبوں (صبح) کو کیوں نہیں بولا۔ ارے پیسہ کیا ہے۔ ہاتھ کا میل ہے۔ ہاتھ میلے کرنا اون ساؤنی کلٹ کا ہے۔ ہم ابھی ہاتھ میلے کر کے پیسہ کا بندوبست کرتا ہے

**اعظم** : نہیں عبدل نہیں ——— اس وقت میں کسی کی مدد عا نہیں لینا چاہتا۔ تم جانتے ہو مجھے اپنی بہن سے کتنی محبت ہے۔

**عبدل** : تمہارا بہن ہمارا بھی سسٹر ہے۔ ہم اس کو بیمار کیسے دیکھ سکتا ہے۔ تم ڈرتا ہے۔ تم ہمارے ساتھ مت آؤ۔ ہم اکیلا ہی جائے گا۔ پیسہ کا بندوبست کرے گا۔ اور ابھی ٹیکسی کار سے بڑا ڈاکٹر لے جائے گا۔

(اتنے میں مجید اعظم کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا وہاں پہنچتا ہے اور تیزی سے اعظم کی طرف بڑھتا ہے اور بڑے سخت پریشانی کے لہجے میں بولتا ہے)

**مجید** : اعظم۔ چلو جلدی چلو۔ بانو بے ہوش ہو گئی ہے۔

(اعظم پریشانی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

**عبدل** : اعظم بابو تم گھر جاؤ۔ ہم ابھی ڈاکٹر لے کر گھر پہنچتا ہے۔

(اعظم مجید کے ساتھ چلا جاتا ہے)

**پردہ**

○

# چودھواں منظر

(سڑک ــــــ عبدل اپنے شکار کی
تلاش میں سڑک پر ٹہل رہا ہے ــــــ اتنے میں ایک
موٹا توندیل سیٹھ چھتری بغل میں دبائے گذرتا ہے
عبدل تیزی سے اس کے قریب سے دھکا دیتے ہوئے گذرتا
ہے۔ دونوں ٹکرا جاتے ہیں ــــــ سیٹھ کچھ کہنا چاہتا ہے
لیکن عبدل خوفناک آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے ڈانٹتا ہے)

**عبدل:** سیٹھ جی! کیوں دولت کی چربی آنکھوں پر بھی چڑھ گئی ہے کیا؟

سیٹھ اسے دیکھ کر سہم جاتا ہے اور بولتا ہے)

**سیٹھ:** بھئی! تم ہی تو ہم کو ٹکر دیا۔

**عبدل:** (غصہ سے) ہم نے تم کو ٹکر دیا۔

**سیٹھ:** (سہم کر) نہیں بابا ــــــ ہم کو معاف کرو۔ ہم نے تم کو ٹکر دیا ــــــ ہماری آنکھوں
پر چربی چڑھی ہے۔

**عبدل:** بس اب اپنا روڈ پکڑو۔ جیاستی ٹرٹر ہم نہیں سن سکتا!

(سیٹھ خاموشی سے اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اس کے
جانے کے بعد عبدل اُس کی جیب سے اڑایا ہوا بٹوہ کھولتا ہے تو
اس میں صرف پانچ آنے۔ ایک ناس کی ڈبیا اور دو بیڑیاں نکلتی ہیں)

**عبدل:** ہت تیری پاپڑ والے سیٹھ۔ کیا چار مجسم کا خزانہ کھیلا ہے پاکٹ میں۔

یہ کہہ کر ناس کی ڈبیا میں سے ناس نکالتا ہے۔ ناس چڑھا کر نعد

سے چھینکتا ہے اور پھر بیڑی سلگا کر کہتا ہے)

عجیب ٹائم آگیا ہے۔ آجکل سالا سیٹھ لوگ بھی کڑکا رام دیوالیہ ڈکس ہے۔

اتنے میں ایک ٹھیلے والا جس کے ٹھیلے پر سیر مال دو دو آنے
والا سجا ہوا ہے۔ ٹھیلہ دھکیلتا آتا ہے۔ دوسری طرف سے ایک
پولیس کانسٹبل آتا ہے وہ ٹھیلے والے کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھتا
ہے اور غصہ سے کہتا ہے)

**کانسٹبل**: لات کا بھوت بات سے نہیں مانتا۔ ہم تجھ کو کتنی بار بولا کر ٹھیلہ اس روڈ پر نہ لایا کرو۔ ہم تم کو تین بار معاف کیا۔ لیکن آج تمھارا چالان کرے گا

**ٹھیلے والا**: (معافی مانگنے کے انداز میں گڑگڑا کر) آج آخری بار معاف کر دیو سنتری جی! پھر کبھی نہیں آئے گا یہ پیٹ بڑا لالچی ہوتا ہے سنتری جی!

(عبدل بھی قریب جاتا ہے اور سفارش کرتا ہے)

**عبدل**: چلو معاف کر دیو سنتری جی! یہ غریب ٹھیلے والے بال بچے والے ہوتے ہیں۔

**کانسٹبل**: تو کون ہے بے لاٹ صاب! سفارش کرنے والا۔ دفان ہو یہاں سے۔

یہ کہہ سنتری جیب سے نوٹ بک اور پنسل نکال کر ٹھیلے والے کا
نام اور پتہ لکھتا ہے)

**کانسٹبل**: نام؟

**ٹھیلے والا**: فقیر محمد!

**کانسٹبل**: باپ کا نام؟

**ٹھیلے والا**: غلام محمد!

**کانسٹبل**: گھر اور محلہ؟

**ٹھیلے والا**: جھگی نمبر ۲۰۴ غریب آباد کالونی۔ قصائی گلی۔ پیپل کے جھاڑ کے پاس۔

کانسٹیبل نام و پتہ وغیرہ لکھ کر ٹھیلے والے کو حکم دیتا ہے )

**کانسٹیبل**: کل ٹھیک دس بجے ترکاری منڈی کے تھانے پر پہنچ جائیو۔

**ٹھیلے والا**: سنتری جی معاف کر دیو۔ پاؤں پڑتا ہوں۔

**کانسٹیبل**: نہیں نہیں قانون، قانون ہے کل اگر نہیں آئے گا تو جیل میں سڑے گا۔

عبدل سنتری کے بالکل متصل کھڑا ہے۔ سنتری یہ حکم دے کر

چلا جاتا ہے ——— جب سنتری آؤٹ آف فیلڈ ہو

جاتا ہے تو ٹھیلے والا آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہتا ہے )

**ٹھیلے والا**: پاک پروردگار! کیا تو یہ ظلم نہیں دیکھ رہا ہے!

**عبدل**: کیوں نہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ خدا ہے۔ وہ گاڈ ہے۔ آل مائٹی گاڈ ہے۔ اس نے مجھ کو تیری مدد کے لیے بھیجا ہے۔ بول کیا تو کل تھانے نہیں جانا چاہتا؟

**ٹھیلے والا**: اب تو جانا ہی پڑے گا بھیا

**عبدل**: بالکل نہیں جانا پڑے گا!

**ٹھیلے والا**: بھیا تو ان پولیس والوں کو نہیں جانتا شاید!

**عبدل**: ارے خوب جانتا ہوں۔

( جیب سے کانسٹیبل کی جیب سے اڑائی ہوئی نوٹ بک اور پنسل نکال

کر ٹھیلے والے کو دکھاتا ہے اور پوچھتا ہے )

**عبدل**: کیوں رے۔ یہی ہے نا وہ سنتری کی نوٹ بک جس میں اس نے تیرا نام اور پتہ لکھا ہے۔

( ٹھیلے والا حیرت سے عبدل کو دیکھتا ہے اس کے چہرے

پر خوشی کی لہر آ جاتی ہے اور وہ ہاتھ بڑھا کر عبدل سے ہاتھ

ملا کر کہتا ہے )

**ٹھیلے والا**: واہ میرے شیر! مانتا ہوں سلیمان! کیا ہنر پایا ہے تو نے!

**عبدل:** تو اب زیادہ بک بک نہ کر۔ فوراً ہو جا یہاں سے رفوچکر۔ ورنہ پھر آجائے گا۔ وہ سنتری یہاں اور پکڑ کرلے جائے گا تجھے وہاں۔

**ٹھیلے والا:** شکریہ بھیا! السلام علیکم!

**عبدل:** وعلیکم السلام!

(ٹھیلے والا چلا جاتا ہے۔ ایک اور سیٹھ سڑک پر آتا ہے۔ عبدل اسے گہری اور تنقیدی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کی طرف بڑھتا ہے اور تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھتا ہے اور پہلے کی طرح ٹکر دے کر اسے بھی گرا دیتا ہے۔ لیکن یہ سیٹھ چالاک آدمی ہوتا ہے۔ وہ ایکدم شور مچا دیتا ہے)

"میں لٹ گیا۔
تباہ ہو گیا۔
چور
چور"

(پبلک اکٹھی ہو جاتی ہے۔ اتنے میں وہی کانسٹبل جس نے ٹھیلے والے کا چالان کیا تھا وہ بھی وہاں آجاتا ہے۔ عبدل کو پکڑ لیا جاتا ہے)

**سیٹھ:** اس نے میری پاکٹ ماری ہے۔ میری پاکٹ میں پورا چار ہزار روپیہ ہے۔ دن دہاڑے یہ لوٹ دھاڑ ہے۔ گورنمنٹ کی دھاندلی ہے۔

**کانسٹبل:** اچھا تو تُو ہے ذاتِ شریف! میری نوٹ بک اور پنسل بھی تُو نے اڑائی ہے چل دکھا تلاشی۔

(عبدل کو لوگوں نے پکڑ رکھا ہے۔ اس کی جیب کی تلاشی لی جاتی ہے۔ تو ایک خالی پاکٹ۔ سوا پانچ آنے۔ بس کی ٹکٹ یا۔ کانسٹبل کی نوٹ بک اور پنسل اور دوسرا

ٹرہ جس میں واقعی چار ہزار روپوں کے نوٹ ہیں
برآمد ہوتے ہیں ۔)

عبدل : چھوڑ دو مجھے ۔ میری چھوٹی بہن بہت سخت بیمار ہے ۔ میں نے چوری نہیں کی ۔ میں نے اپنا حق
چھینا ہے ۔ چھوڑ دو مجھے

لیکن کانسٹیبل اور لوگ باگ اسے دھکے دے کر
لے جاتے ہیں )

پردہ

○

۱۱

# پندرھواں منظر

(اعظم کی والدہ کا کمرہ ——— جس میں دو چارپائیاں
بچھی ہیں ——— اور ضروریات کا کچھ معمولی سامان
جس میں صندوق اور ایک چھوٹی سی الماری میں برتن وغیرہ
رکھے ہیں ——— ایک چارپائی پر بانو بخار میں کراہ
رہی ہے۔ اعظم اور مجید ایک ڈاکٹر کو لیے داخل ہوتے ہیں
ماں ڈاکٹر کی وجہ سے جلدی سے اندر چلی جاتی ہے
ڈاکٹر اسٹیتھسکوپ لگا کر بانو کی حالت دیکھتا ہے اور کہتا ہے)

ڈاکٹر: ٹائیفائڈ کا حملہ ہے۔ لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں چند دوائیاں اور انجکشن لکھے دیتا ہوں۔ کسی
کیمسٹ کی دکان سے لے آئیے۔ شام کو میں انجکشن لگا دوں گا۔

(ڈاکٹر ایک پرچے پر دوائیوں اور انجکشن کے نام لکھ کر اعظم
کو دیتا ہے۔ اعظم پوچھتا ہے)

اعظم: ڈاکٹر صاحب یہ دوائیاں اور انجکشن کتنے تک مل جائیں گے؟

ڈاکٹر: یہی کوئی پچیس تیس روپے تک!

مجید: (حیرت سے) پچیس تیس روپے!!

ڈاکٹر: اور کیا؟ ——— یہ دوائیاں اور انجکشن باہر سے آتے ہیں۔ یہاں تھوڑی بنتے ہیں۔

مجید: (قدرے غصے سے) تو پھر یہاں کیا بنتا ہے ڈاکٹر صاحب؟

ڈاکٹر: جی ——— کیا؟

اعظم: (طنزیہ انداز سے ہنستے ہیں) یہاں صرف بیمار بنتے ہیں مجید۔

ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر

ڈاکٹر صاحب! آپ کی وزٹنگ فیس تو پانچ روپے ہے۔ لیکن اس وقت میرے پاس صرف تین روپے ہیں۔ انشا اللہ شام کی وزٹ میں۔ میں ساری فیس ادا کر دوں گا

ڈاکٹر : دیکھیے مسٹر! یہ بڑی غلط بات ہے۔ اس وقت تو میں تین روپے لے جا رہا ہوں مگر دیکھیے شام کو مجھے پوری فیس اور بیلنس کے دو روپے ضرور مل جانے چاہئیں۔ اس طرح اگر ہم تھوڑی تھوڑی فیس لیتے رہے تو ہمارا دواخانہ کیسے چلے گا۔ بیسے بھی تو ہماں پہلے ہی بہت مجبور ہیں

اعظم : آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب! آپ بھی مجبور ہیں ہم بھی مجبور ہیں۔ یہاں سب ہی مجبور ہیں۔ لیکن آپ مطمئن رہیں۔ اگر شام تک میں آپ کی فیس کا بندوبست نہ کر سکا تو میں آپ کو تکلیف بھی نہیں دوں گا۔ یہ قبول فرمایئے۔

(تین روپے ڈاکٹر کو دیتا ہے)

(ڈاکٹر تین روپے جیب میں رکھ لیتا ہے۔ اعظم مجید سے کہتا ہے)

اعظم : مجید! ڈاکٹر صاحب کا بیگ اٹھاؤ اور انہیں ڈسپنسری تک چھوڑ آؤ۔
بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر : گڈ نائٹ!

اعظم : گڈ ـــــــ نائٹ

(تھکا ہوا آرام کرسی پر گر پڑتا ہے۔ ایک لمحے کے بعد آواز آتی ہے)

آواز : میں اندر آسکتی ہوں؟

(نور افشاں گھبرائی اور پریشان اندر داخل ہوتی ہے اور تیزی سے اعظم کے قریب جا کر اس کے دونوں شانے جھنجھوڑ کر کہتی ہے)

نورافشاں: اعظم ——— اعظم! میرے لالچی باپ نے میرے نیلام کی تاریخ مقرر کر دی ہے اب بولو کیں ———

اعظم: (ہونٹوں پر انگلی رکھ کر) ششش!

(بانو کی چارپائی کی طرف اشارہ کرتا ہے)

آہستہ بولو۔ بانو سخت بیمار ہے۔

(نورافشاں بانو کی چارپائی کی طرف دیکھتی ہے اور اٹھ کر اس کی چارپائی کی طرف جاتی ہے۔ بانو کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھتی ہے۔ بانو پر نیم بیہوشی کا عالم طاری ہے۔ نورافشاں وہاں سے پھر اعظم کے پاس آتی ہے اور پوچھتی ہے)

نورافشاں: ڈاکٹر اور دوائی کا بندوبست کیا تم نے؟

اعظم: تم جانتی ہو نور! اسکول کی فیس نہ دینے کے باعث اسکول سے بانو کا نام کٹ گیا۔ اور اب ڈاکٹر کی فیس نہ دینے کے باعث اس کا نام دنیا سے بھی کٹ جائے گا۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔

نورافشاں: اعظم! تم دن بدن جانور بنتے جا رہے ہو۔ میں پوچھتی ہوں کہ تمھارے پہلو میں انسان کا دل کیوں نہیں ہے؟

اعظم: دنیا کا ہر غریب آدمی جانور ہی ہوتا ہے بس نورافشاں! دنیا بھر کا بوجھ اٹھانے والا بے زبان اور مظلوم جانور۔ پھر تم یہ کیوں پوچھتی ہو کہ میرے پہلو میں انسان کا دل نہیں ہے۔

نورافشاں: تمھیں شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے۔ مجھ سے تمھاری بے رخی تو خیر گوارا کی جا سکتی ہے لیکن تم اپنی معصوم بہن کو اسی طرح بے پروائی سے موت کے کھڈ میں گرتا دیکھ سکتے ہو۔ تمھاری بہن مر رہی ہے اور تم آرام سے بیٹھے اس کی آخری سانسیں گن رہے ہو۔

اعظم: نور! ——— میں کبھی نہیں چاہتا کہ بانو مر جائے۔

نورافشاں: تو پھر جاتے کیوں نہیں۔ ڈاکٹر کو بلاتے کیوں نہیں۔ یہ لو روپے میں دیتی ہوں۔

(یہ کہہ کر وہ اپنا منی پرس کھولنا چاہتی ہے لیکن اعظم اس کی طرف سے ہٹ کر پیٹھ موڑ کر اس سے کہتا ہے)

اعظم : تم نے میری بات نہیں سمجھی نور۔ میں بانو کی موت اس لیے نہیں چاہتا کہ میری یہ اکلوتی قمیض بہت بوسیدہ ہو گئی ہے۔

نورافشاں : قمیض بوسیدہ ہو گئی ہے؟ کیا بک رہے ہو۔ تمھاری بوسیدہ قمیض اور بانو کی بیماری کا آپس میں کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

اعظم : بہت بڑا تعلق ——— یعنی اگر بانو مر جاتی ہے تو جو کپڑا میں اپنی نئی قمیض کے لیے خریدنا چاہتا ہوں وہ بانو کے کفن کے لیے استعمال ہوگا اور میں یہ نہیں چاہتا۔

( نور غصے سے بے قابو ہو کر اعظم کے گال پر ایک زوردار چانٹا رسید کرتی ہے اور کہتی ہے )

نورافشاں : وحشی درندے!

( اور وہ اس کے دونوں شانے پکڑ کر جھنجھوڑتی ہے اور پھر اچانک خاموش ہو جاتی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگتی ہے اور اچانک اعظم کے سینے پر سر ٹیک کر گڑگڑا کر روہانسی آواز میں کہتی ہے )

مجھے معاف کرو اعظم! ——— میں نے تمھارے ساتھ یہ بڑی زیادتی کی ہے۔ تم بھی مر چکے ہو اعظم! بحیثیت انسان تم زندہ نہیں ہو۔ مجھے معاف کرو کہ میں نے ایک لاش کے گال پر طمانچہ لگا کر لاش کی توہین کی ہے۔

( پھر وہ آہستہ سے اس سے الگ ہوتی ہے اور بڑے عزم کے ساتھ کہتی ہے )

نورافشاں : اچھا! میں بانو کو موت کے منہ سے بچاؤں گی۔ میں عزرائیل سے لڑوں گی۔ میں خدا کی منتیں کروں گی۔ میں بانو کو بچاؤں گی۔

( یہ کہتی ہوئی وہ کمرے سے باہر نکل جاتی ہے )

(اعظم پھر آرام کرسی پر دراز ہو جاتا ہے۔ اچانک بانو بلند آواز سے بڑبڑانے لگتی ہے)

**بانو** : امی ——— ! بھائی جان ——— !! وہ دیکھو ! وہ سفید سفید لمبی داڑھی والا بوڑھا مجھے اپنے پاس بلا رہا ہے ——— بھائی جان ! ——— امی ——— اس بوڑھے کی پیٹھ میں وہ بڑے بڑے پر نکلے ہوئے ہیں۔ امی مجھے اس بوڑھے سے ڈر لگ رہا ہے۔ امی ——— بھائی جان !!

(اعظم چونک پڑتا ہے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے دیکھنے لگتا ہے۔ اعظم کی والدہ جو پہلے نماز پڑھ رہی تھی دوڑی دوڑی کمرے میں آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح ہے اور سر دوپٹے سے پوری طرح ڈھکا ہوا ہے۔ وہ روتے ہوئے بانو پر جھک کر یٰسین شریف پڑھنے لگتی ہے

یٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۔ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

لیکن آواز بھرا جاتی ہے وہ آگے نہیں پڑھ سکتی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ اعظم آب دیدہ کرسی سے اٹھتا ہے اور بانو کی چارپائی کے سرہانے زمین پر گھٹنے ٹیک کر دونوں ہاتھوں میں اپنا سر چھپا لیتا ہے۔ بانو پھر ہذیان بکنے لگتی ہے)

**بانو** : کتنا اچھا باغ ہے کیسی رنگین تیتریاں اڑ رہی ہیں۔ امی وہ دیکھو ادھر دودھ کی ندی بہہ رہی ہے لیکن وہ بوڑھا ——— اس کے بال ———

(وہ زور سے چیخ پڑتی ہے)

اس کے بال مجھے کھینچے لیے جا رہے ہیں ——— مجھے بچاؤ ——— مجھے بچاؤ ———

(اعظم گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کی والدہ سسک کر کہتی ہے)

ماں : اعظم —— بیٹے جاؤ —— ڈاکٹر کو بلاؤ۔ ممکن ہے ڈاکٹر کو میری بچی پر ترس آ جائے۔
ممکن ہے ایسا ہو —— ممکن ہے —— تم جاؤ —— تم کوشش تو کرو۔
میرے بچے ——

(اعظم بُت بنا کھڑا رہتا ہے اور ماں اسے دیکھ کر نہایت دھیمے
لہجے میں کہتی ہے)

ماں : کاش کہ میں ایک جوان عورت ہوتی۔

(یہ جملہ اعظم کے دل پر تیر کی طرح لگتا ہے اور بڑی بھیانک اور
بلند آواز چیختا ہے)

ماں —— !

اور پھر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے
نرم لیکن طنزیہ لہجے میں کہتا ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو
امی! کاش تم ایک جوان عورت ہوتیں!

ماں : (چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) میں اپنی بانو کو آسمانوں پر ہرگز نہیں جانے دوں گی۔
اے پروردگار! —— میرے پاس میرے بچوں کے سوائے کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں
ہے —— تو وہ بھی چھین لینا چاہتا ہے معبود!

(اعظم ایک لمحہ کے لیے ماں کو اور بانو کو دیکھتا ہے اور
سکتہ ماں توڑ کر نہایت غضبناک آواز میں کہتا ہے)

ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ ہرگز نہیں ہوگا۔

یہ کہتا ہوا وہ باہر چلا جاتا ہے

پردہ

O

# سولھواں منظر

سڑک کا منظر ——— مسعود علی خاں

مردوسی لباس پہنے ——— سر پر سہرا بندھوائے

ایک گھوڑے پر سوار داخل ہوتا ہے ———

اس کے سامنے بینڈ باجوں کا اوردی یونٹ ہے ———

اور اس کے ساتھ براتی رنگ برنگے کپڑے پہنے

شریک ہیں ——— بینڈ باجے کے یونٹ کے

آگے دو تلوار باز تلوار بازی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

## نوٹ

تلوار بازی کا یہ مظاہرہ اُس وقت تک جاری رہے

جب تک کرسٹروین منظر کا فرنیچر پردے کے پیچھے

جمانہ لیا جائے ———

تلوار بازی کے مظاہرے کے بعد برات آگے بڑھتی ہے

اور

اسٹیج سے باہر نکل جاتی ہے

پردہ

○

۱۷

# سترھواں منظر

( سیٹھ دولت خاں کا ڈرائنگ روم ———

سیٹھ دولت خاں اکیلے بیٹھے حقہ پیتے ہوئے — بہی

کھاتے دیکھ رہے ہیں ——— نوکر اندر داخل

ہوتا ہے اور ملاقاتی چٹھی ان کے حوالے کرتا ہے — چٹھی

پر نام دیکھ کر سیٹھ دولت خاں کی باچھیں کھل جاتی ہیں ۔ وہ

نوکر سے کہتے ہیں )

**سیٹھ صاحب** : اُسے جلدی سے اندر بھیج دو ۔

( اعظم داخل ہوتا ہے ۔ وہ نہایت مغموم اور اُداس ہے )

**اعظم** : السلام علیکم !

**سیٹھ صاحب** : وعلیکم السلام ——— آؤ بھئی آؤ ! تم تو ایسے غائب ہوئے کہ بس میں آج تمہارے ہی گھر جانے والا تھا ۔ بھلے آدمی ! اس دن تم اپنی بی ۔ اے کی ڈگری اور اسنادات بھی یہیں چھوڑ گئے ۔ پھر لینے تک نہیں آئے ۔ عجیب آدمی ہو اور ہاں یہ کھڑے کیوں ہو ۔ بیٹھتے کیوں نہیں ۔ بیٹھو بھئی ۔ بیٹھ جاؤ ۔

( اعظم بیٹھ جاتا ہے )

**سیٹھ صاحب** : بیٹے اس دن کے واقعہ کا مجھے بہت افسوس ہے وہ کمبخت میر کا بچہ

**اعظم** : ( بات کاٹ کر ) سیٹھ صاحب ! اس وقت میں بہت جلدی میں ہوں مجھے آپ سے ایک نہایت ضروری بات کرنی ہے ۔

**سیٹھ صاحب** : ہاں ہاں کہو ، شوق سے کہو ۔

اعظم : میں اپنے آپ کو بیچنے آیا ہوں۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ بی۔اے کی ڈگری اور چیک بک کی شادی میں دیر نہیں ہونی چاہیئے۔

سیٹھ صاحب : (حیران ہو کر) کیا کہہ رہے ہو بھئی۔ میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔

اعظم : سیٹھ صاحب! میں آپ کی لڑکی سے شادی کے لیے بالکل تیار ہوں۔

سیٹھ صاحب : (خوش ہو کر) اوہ —— اوہ! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے میں —— میں کوئی مناسب تاریخ —————

اعظم : (بات کاٹ کر) مگر سیٹھ صاحب! ایک شرط ہے۔ میری چھوٹی بہن سخت بیمار ہے۔ میں خالی جیب اس کو عزرائیل کے سامنے سے اٹھا کر واپس نہیں لا سکتا۔ (جیب سے ایک پرچہ نکال کر) یہ دوائیاں اور انجکشن اور ایک ڈاکٹر کا فوراً بندوبست ہونا چاہیئے۔ پھر میں ہمیشہ کے لیے آپ کی خدمت میں ہوں

سیٹھ صاحب : اوہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں ویسے بھی یہ میرا انسانی فرض ہے۔ میں ابھی اپنے فیملی ڈاکٹر کو ساتھ لے چلتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اچھا میں ذرا کپڑے پہن آؤں۔

(یہ کہہ کر سیٹھ اندر چلا جاتا ہے۔ اور اعظم کہتا ہے)

اعظم : کتنا خود غرض ہے انسان۔ اگر میں یونہی اس کے پاس چلا آتا اور اس سے یہی بات کہتا تو شاید یہ مجھے کسی خیراتی شفاخانے کا بھی پتہ نہ بتاتا۔ واہ رے انسان!!

(سیٹھ کپڑے پہن کر آتا ہے اور کہتا ہے)

سیٹھ صاحب : آؤ آؤ جلد!

(اعظم اور سیٹھ باہر چلے جاتے ہیں)

پردہ

○

# اٹھارھواں منظر

(سڑک ——— تین آدمی ایسے لباس میں کھڑے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ کسی برات میں شریک تھے۔ ——— وہ ایک دوسرے کو سگریٹ آفر کرکے سگریٹیں جلا رہے ہوتے ہیں کہ ایک شخص دوڑا دوڑا آتا ہے اور کہتا ہے)

اندر سے آنے والا شخص

یار غضب ہو گیا غضب۔ دلہن کا کہیں پتہ نہیں ہے۔

**ایک شخص**: یہ اندر کیا گڑبڑ ہو رہی ہے بھئی؟

**اندر سے آنے والا شخص**: سیٹھ حاجی رحمت اللہ اور کرنل ارباب خان میں بڑی تو تو۔ میں میں ہو رہی ہے۔

**دوسرا آدمی**: توبہ توبہ کیا زمانہ آگیا ہے۔ دلہنیں تک گھروں سے بھاگنے لگی ہیں۔

**تیسرا آدمی**: بھیا! تمہیں پتہ نہیں آج کل لڑکیوں کے اسکولوں میں بھی اسپورٹس ہوتے ہیں۔ وہاں لڑکیوں کی دوڑ کے مقابلے ہوتے ہیں یہ بھاگنے کی عادت وہیں سے پڑتی ہے۔

**چوتھا آدمی**: (ٹھنڈی سانس لے کر) یار یہ عشق کا چکر بڑا خوب ہوتا ہے۔

**پانچواں آدمی**: آہو جی۔ یہ عشک سالا ہوندا ای بڑا خانہ خراب ہے!

**چوتھا آدمی**: اب کیا ہوگا؟

**تیسرا آدمی**: کرنل ارباب خان کی ناک کٹ گئی ناک!

**دوسرا آدمی**: اسی لیے بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو صرف بہشتی زیور اور کشیدہ کاری جیسی کتابوں سے آگے نہیں جانا چاہیئے۔

**پہلا آدمی**: ہاں نہیں یار! اس میں تعلیم کا کوئی قصور نہیں۔ تعلیم تو بڑی اچھی چیز ہوتی ہے۔ انسان کی

زندگی بنا دیتی ہے۔

**دوسرا آدمی :** یہ بھی اس تعلیم والے کو دیکھو۔

**پہلا آدمی :** بیٹا۔ غریبی کی وجہ سے نہیں پڑھ سکا۔ اگر پڑھنے کا موقع ملتا تو وزیر یا کم سے کم وزیر علم۔

(اتنے ہی میں چاپے کے پیچھے سے پستول چلنے کی آواز آتی ہے۔ سب لوگ چونک پڑتے ہیں گھبرا سے جاتے ہیں۔ ایک کہتا ہے)

یار۔ جاؤ جاؤ ذرا اندر جا کر معلوم تو کرو کیا بات ہے؟

(اندر سے آنے والا آدمی دوڑا ہوا پھر اندر جاتا ہے۔ دو تین لمحوں کے بعد وہ دوڑا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے)

**اندر سے آنے والا آدمی :** یار وہی ہوا جو ہونا تھا۔

(سب آدمی اسے گھیر لیتے ہیں اور پوچھتے ہیں)

کچھ بتاؤ تو سہی کیا ہوا؟

**اندر سے آنے والا آدمی :** کرنل ارباب خاں نے خودکشی کر لی۔

**سب کے سب :** ہیں!!

**ایک شخص :** توبہ توبہ! کبھی کبھی ایک جوان لڑکی کی ذرا سی غلطی سارے خاندان کو تباہ کر دیتی ہے۔

**دوسرا آدمی :** خدا کسی کو دے مگر ایسی بیٹی نہ دے۔

**چوتھا آدمی :** آؤ یار اندر چلتے ہیں۔ آؤ آؤ یار!

(سب کے سب آؤٹ آف فیلڈ ہو جاتے ہیں)

**پردہ**

O

# انیسواں منظر

اعظم کا کمرہ ——— جو پہلے منظر میں تھا
بانو بستر مرگ پر لیٹی ہے۔ اعظم کی والدہ اور مجید اس کی چارپائی
پر بیٹھے ہیں۔ ——— اعظم کی والدہ روتی جا رہی ہے
——— اور اتنے میں نور افشاں جو عروسی
لباس میں ملبوس ہے۔ ایک ڈاکٹر کو لیے داخل ہوتی ہے ———
ڈاکٹر اسٹیتھسکوپ لگا کر بانو کو دیکھتا ہے۔ ——— اسی
اثنا میں اعظم، سیٹھ دولت خاں اور ان کا فیملی ڈاکٹر
دروازے میں داخل ہوتے ہیں جیسے ہی وہ داخل ہوتے ہیں ڈاکٹر سر جھکائے
آہستہ سے چارپائی سے اٹھتا ہے اور چادر سے بانو کا چہرہ ڈھانک دیتا
ہے اعظم یہ منظر دیکھ کر زور سے چیختا ہے )

بانو ——— !

اس کے ہاتھ سے دوائیوں کی شیشیاں اور انجکشن فرش پر
جھٹکے کے ساتھ گر کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اعظم کی والدہ غضبناک
شیرنی کی طرح آگے بڑھتی ہے اور چھت کی طرف دونوں ہاتھ
اٹھا کر چیختے ہوئے کہتی ہے۔

بانو! ——— میری بچی ——— تو مت گھبرا ——— کوئی
تجھے مجھ سے نہیں چھین سکتا ——— میں تیرے پاس تو ہی ہوں بیٹی! میں تیرے بغیر
ہرگز نہیں جی سکتی بیٹی!

یہ کہہ کر اعظم کی والدہ ایک چھری کا اپنے سینے میں بھونک

لیتی ہے )

اعظم : (چیختا ہے) اماں ——— !

نور افشاں دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیتی ہے دونوں

ڈاکٹر اور سیٹھ دولت خاں اعظم کی والدہ کی اس حرکت

سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً سیٹھ دولت خاں

" باپ رے باپ "

کہتا ہے اور تیزی سے ونگ میں غائب ہو جاتا ہے

اعظم دیوانے کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھتا

ہے۔ مجید اعظم کی ماں کی طرف بڑھتا ہے جو فرش پر تڑپ

رہی ہے اور اس کا دم آخر ہے۔ اعظم مجید کو اپنی ماں کے

پاس دیکھ کر دیوانے کی طرح چیختا ہے۔

مجید ——— ! ہٹ جاؤ اس عورت کے پاس سے اسے بھی مر جانے دو۔ اس

کمبخت عورت کو اسی دن مر جانا چاہیئے تھا جس دن اس کا شوہر مر گیا تھا جس دن اس نے مجھے اور

جس دن اس نے بانو کو جنم دیا تھا ——— ہٹ جاؤ مجید ——— ورنہ میں

تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔

نور افشاں دوڑ کر اعظم سے چمٹ جاتی ہے۔ لیکن اعظم

اسے فرش پر دھکیل دیتا ہے اور پکارتا ہے )

مجید! کس کا انتظار کر رہے ہو اب۔ اٹھاؤ ان لاشوں کو یہاں سے۔ ایسی لاشوں کا کوئی جنازہ

نہیں ہوتا۔ ان لاشوں پر کوئی مقبرہ نہیں بنایا جاتا۔ ان پر کسی کے آنسو نہیں ٹپکتے۔ کوئی ان پہ پھول نہیں

چڑھاتا۔ اٹھاؤ ——— اس کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کو اٹھاؤ یہاں سے ——— انہیں

ہم دنیا کے باہر پھینک آئیں تاکہ یہ زمین پاک اور صاف ہو جائے۔

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھتا ہے اور اپنی چھوٹی بہن بانو کی لاش

اپنی دونوں بانہوں میں اٹھا لیتا ہے اور اس کی پیشانی کو چوم

کر کہتا ہے

گڈ بائی مائی ڈیئرسٹ بانو ——— تم چاکلیٹ کے ڈبے کی تلاش میں بہت دور

چلی گئی ہو ——— میں جانتا ہوں کہ اب تم کبھی واپس نہیں آؤ گی ——— اپنی

ننھی ننھی بانہوں کا ہار میرے گلے میں کبھی نہیں ڈالو گی۔

اچھا پیاری بانو! ——— تم اس وقت زمین کو چھوڑ کر نرم نرم آسمانوں پر چلی گئی ہو

اب تمہارے ننھے ننھے ہاتھ آہستہ آہستہ گوند ھتے گوند ھتے کبھی نہیں تھکیں گے ——— آؤ! میں تمہیں دنیا

کے آخری دروازے تک چھوڑ آؤں۔

میری ننھی گڑیا! میں تمہیں دفن کرنے نہیں بلکہ میں تو مفلسی۔ بے چارگی اور ایک موت سے زیادہ بدتر

زندگی کو دفن کرنے جا رہا ہوں۔ میں تمہیں دفن کر کے مطمئن ہو سکتا ہوں کہ میں نے مفلسی۔ بیماری اور

ایک مجبور زندگی کو دفن کر دیا ہے

(چیختے ہوئے)

اور اگر بس اسی طرح ہر روز سیکڑوں کی تعداد میں مفلسیوں۔ بیماریوں اور مجبور زندگیوں کو دفن کیا جاتا

رہا تو مجھے یقین ہے کہ ایک دن ——— ایک دن یہ زمین ——— یہ زمین بالکل

پاک و صاف ہو جائے گی۔

(یہ کہہ کر وہ تیزی سے روتا ہوا دُکھ میں لاش اٹھائے

بھاگ جاتا ہے)

پردہ

○

# آخری منظر

اعظم کا کمرہ ــــــــــ وہی سیٹنگ

جو اس سے پہلے کے منظر میں تھی ــــــــ اعظم

اکیلا اور نہایت مغموم سٹول پر بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے

اس کی آنکھیں خوفناک طور پر پھٹی ہوئی ہیں ــــــــ

اتنے میں نورافشاں دبے پاؤں اندر داخل ہوتی ہے۔ اعظم

اسے دیکھتا ہے اور اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے نورافشاں

اس کے قریب جاتی ہے اور اس کی ایک بانہہ کو مضبوطی سے

پکڑ لیتی ہے اور کہتی ہے

نورافشاں : اعظم ! اب میں تمہارے ساتھ چلنا چاہتی ہوں ــــــــ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی

اعظم ! ــــــــ میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی اعظم ! ــــــــ غم کی اس اندھیری

رات کی ضرور کہیں صبح ہو گی۔ اس راستے کی ضرور کوئی منزل ہو گی۔

اعظم : کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں بھی اس دنیا سے چلا جاؤں گا ؟ کیا تم نے مجھے اتنا بزدل سمجھ رکھا ہے کہ میں اپنی ماں اور

اپنی بہن کے قاتل کا بدلہ لیے بغیر یہاں سے چلا جاؤں گا ؟

( بڑے عزم کے ساتھ )

نور ! ــــــــ میں زندگی کے راستے پر اسی طرح چلتا رہوں گا۔ ہمیشہ چلتا رہوں گا۔

شکست کبھی نہیں مانوں گا ــــــــ کبھی نہیں۔

یہ کہہ کر وہ نورافشاں کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

اسٹیج پر اچانک اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور پس منظر سے

دردناک لے میں کوئی گاتا ہے)

(بطرز زہیر)

کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

○

آخری مصرعہ کے اختتام پر ہال میں اُجالا

پردہ

○

اپندر ناتھ اشک

# کردار

احسان ریاض

سلطان سرور

عقیل نعیم

ذکیہ نجمہ رحمن بیگاں نسو جمی

## مقام

جموں سے اٹھارہ میل دور اکھنور کے قصبہ میں ذکیہ کا گھر

## وقت

صبح سے شام تک

○

# پہلا منظر

(ذکیہ کا گھر اکھنور کے قدیم قصبہ میں دریائے چناب کے کنارے ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ چونکہ اکھنور کا قصبہ جموں (کشمیر) سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر ہمالیہ کی ترائی میں واقع ہے اور ذکیہ کا گھر اس قصبہ میں سب سے اچھی جگہ بنا ہوا ہے۔ اس لیے اس کی کھڑکیوں سے دریا اور پہاڑوں کے نہایت دلچسپ اور دلفریب مناظر دکھائی دیتے ہیں۔

پردہ اسی گھر کے سونے کے کمرے میں اٹھتا ہے اور پہلی نظر میں کمرے کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ باہر سے گھر کی شان کو دیکھ کر کبھی خواب میں بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ اندر سے اتنا پذزیب ہوگا۔

لیکن قصور شاید مکان بنانے والے کا نہیں۔ کیونکہ یہ کمرہ بھی کافی کشادہ ہے اور پرانی وضع کا ہونے کے باوجود کافی ہوادار اور روشن ہے۔ سامنے کی دیوار میں تین دروازے ہیں جو آنگن کی بالکونی پر کھلتے ہیں۔ ان دروازوں میں سے بالکونی کا جنگلہ اس سے پرے نیلا آسمان ویشنو دیوی کی تینوں چوٹیاں اور ہمالیہ کے برفانی پہاڑ نظر آتے ہیں۔ بالکونی سے ایک طرف باورچی خانے اور سیڑھیوں کو اور دوسری طرف غسل خانے اور دوسرے کمروں کو راستہ جاتا ہے۔ ادھر سے آنے جانے والے۔ ان تینوں دروازوں سے نظر آجاتے ہیں۔ بائیں دیوار میں دو کھڑکیاں اور ان کے درمیان ایک الماری بنی ہوئی ہے۔ یہ کھڑکیاں دریا کی طرف کھلتی ہیں۔ ان سے نہ صرف دریا کا نظارہ کیا جا سکتا ہے بلکہ ہر وقت ٹھنڈی ہوا کا لطف بھی اٹھایا جا سکتا ہے

دائیں دیوار کے پرے کونے میں ایک دروازہ ہے جو دوسرے کمرے کو جاتا ہے
اس کے درے کو دیوار میں ذرا اونچے دو مجھوٹے بڑے طاق بنے ہوئے ہیں۔
انہیں طاقوں کے نیچے ذکیہ کا پلنگ لگا ہوا ہے ـــــ دروازوں اور
کھڑکیوں کے درمیان دیواروں میں کھونٹیاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ لیکن ان دروازوں۔
کھڑکیوں۔ الماریوں اور کھونٹیوں کے باوجود کمرہ تنگ اور تاریک نظر آتا ہے
پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس وقت کھڑکیاں اور سامنے کی بالکونی پر کھلنے والے دو
دروازے بند ہیں۔ درمیان کا بھی آدھا کھلا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کھونٹیوں
طاقوں اور الماری کے باوجود اتنی چیزیں ایک ساتھ کمرے میں گڈمڈ پڑی ہیں کہ
کمرے کی وسعت اس بے ترتیبی میں گم ہو کر رہ گئی ہے ـــــ معلوم ہی نہیں
ہوتا کہ یہ کمرہ سونے کا ہے۔ کھانا کھانے یا نہانے کا ـــــ بالکونی
پر کھلنے والے بائیں طرف کے دروازے کے نزدیک موری اور چھوٹا سا گھڑا بنا ہوا
ہے۔ اس گھڑے کے برابر لوٹے اور بالٹیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ادھر کو بائیں دیوار
کے ساتھ الماری کے برابر چرخہ اور کاتنے اٹیرنے کا دوسرا سامان پڑا ہے۔
الماری کے پٹ کسی بے شرم کی بے پلک آنکھوں کی طرح کھلے ہوئے ہیں اور
اس کے خانے ٹائلٹ سے لے کر سینے پرونے کے سامان تک بے شمار
چیزوں سے اٹے پڑے ہیں ان سب پر مٹی کی ایک ہلکی تہہ جمی ہوئی ہے کونے
میں موری کے اوپر چھت کے ساتھ ٹنگنا ہے۔ جس پر رضائیاں اور دلائیاں
بے ترتیبی سے ایک دوسری کے اوپر ٹنگی ہوئی ہیں۔ کھونٹیاں اور طاق بھی
اسی طرح مختلف چیزوں سے اٹے پڑے ہیں۔ ذکیہ کے پلنگ کی بائیں طرف
کو کمرے کے درمیان ایک اور چارپائی بچھی ہوئی ہے جس کا بستر آدھا الٹ
دیا گیا ہے۔ ذکیہ کے اپنے پلنگ پر بستر تکیہ اور چادریں ریشمی ہونے کے باوجود

گندی اور میلی کچیلی ہیں۔ چارپائیوں کے علاوہ جو فرش خالی ہے۔ اس میں تپائی اور چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی ہیں۔ فرش پر بچوں کے کھلونے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس سب بے ترتیبی نے کمرے کو اور بھی تنگ بنا دیا ہے۔

اگرچہ دن کے دس بج چکے ہیں اور کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کے باوجود کمرہ خاصہ روشن ہے۔ لیکن ذکیہ ابھی تک اپنے پلنگ پر پڑی کروٹیں بدل رہی ہے۔

پردہ اٹھنے کے کچھ لمحے بعد بائیں طرف کے بند دروازے کو دھڑا خ سے کھولتے ہوئے نسّو اور مجّی بے تحاشہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز سے ذکیہ چونکتی ہے۔ لیکن اٹھتی نہیں کروٹ بدل کر لیٹی رہتی ہے۔

نسّو اور مجّی میں ایک ڈیڑھ سال کا فرق ہے۔ مجّی سات برس کا ہے اور نسّو چھ کی۔ لیکن دونوں ہم عمر دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں کے کپڑے میلے اور چہرے ناصاف ہیں۔ نسّو کے ہاتھ میں ایک گیند ہے۔ جسے سینے سے لگائے وہ مجّی کے آگے آگے بھاگی آتی ہے)

مجّی : میرا گیند ——— میرا گیند ———

نسّو : کیوں ہم نہ کھیلیں گے۔

مجّی : تم کیوں کھیلو گی۔ میں تمہاری گڑیوں سے کھیلتا ہوں۔

(زبردستی گیند چھین لیتا ہے)

نسّو : میرا گیند ——— دے میرا گیند ———

(مجید کو پیٹتی ہے)

مجّی : (برابر پیٹتا ہوا) اے ہے ——— ہو ہے ——— پھر پیٹے گی۔

(انتو رونی ہے)

ذکیہ : (صرف کروٹ بدل کر) اسے کوئی ہے! ان کمبختوں کو نکالے۔ میرے کمرے سے۔ پل بھر کا چین حرام ہوگیا۔ ان بدذاتوں کے مارے۔ خدا ایسی اولاد دشمن کو بھی نہ دے۔

(احسان صاحب داخل ہوتے ہیں۔ دوہرے جسم کے بھاری بھر کم آدمی ہیں۔ لیکن انھیں مضبوط اور توانا نہیں کہا جا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے۔ جیسے جسم نے بے دل ہوکر گوشت چھوڑ دیا ہے۔ ان کی چال میں ایک عجیب طرح کا اضمحلال ہے۔ کپڑے بھی صاف نہیں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اُن کا وجود بھی اسی کمرے کا ایک حصّہ ہے۔ اُس پر بھی وہی بے دلی اور بے حسی طاری ہے۔ جو کمرے پر)

احسان : (بچوں کو دبے لہجے میں سرزنش کرتے ہوئے) جاؤ بیٹا بھاگو ——— ادھر جاکر کھیلو۔
(نزدیک آکر) ارے بھئی۔ ابھی تک لیٹی ہوئی ہو پھر طبیعت کچھ خراب ہے آج؟

ذکیہ : (اسی تھکی تھکی آواز میں) یونہی سر میں ہلکا ہلکا درد تھا جسم ٹوٹ سا رہا تھا۔

(احسان آکر اس کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کے بکھرے بالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہیں)

احسان : (لمبے سانس کو دباتے ہوئے) وہ دن کتنی خوشی کا ہوگا۔ ذکیہ! جب میں تمھیں تندرست دیکھوں گا۔ پیٹ درد۔ کمر درد۔ کوئی نہ کوئی درد لگا ہی رہتا ہے تمھیں۔

ذکیہ : اب بیماری پر انسان کا کیا زور ہے۔

احسان : لیکن جہاں بیماری ہے وہاں علاج بھی تو ہے تمھاری بیماری کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ کاش تمھارے درد کی دوا میرے بس میں ہوتی!

ذکیہ : آپ ——— تو بھلا ——— آپ ———

( اُٹھنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن بیٹھی رہتی ہے )

احسان : (لمبا سانس بھرتے ہیں) کاش! میں تمھیں خوش رکھ سکتا!

ذکیہ : بھلا مجھے کیا غم ہے۔ میں ہر طرح خوش ہوں۔

احسان : خوش رہو (درد سے ہنستا ہے) خوشی کی کوئی علامت تو تمھارے چہرے پر دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے ساون کی وہ شام یاد ہے۔ جب میں رضیہ کی موت کے بعد دلّی گیا تھا۔ تمھی نے قطب چلنے کی تجویز کی تھی۔ میں نکہت۔ تم اور رہامن جا بیروں قطب دیکھنے گئے تھے۔ کتنی خوش تھیں تم اُن دنوں کتنی شوخ اور چنچل؟ کتنا ہنسا کرتی تھیں۔ تمھارے گالوں کے گلاب ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ (لمبا سانس بھرتا ہے) یہاں آکر نہ جانے وہ کیوں مرجھا گئے؟

ذکیہ : (چپ رہتی ہے)

احسان : اور میں سوچتا تھا۔ یہاں آکر ان کی سُرخی میں اضافہ ہوگا۔ یہ خوبصورت فضا یہ ہرا۔ یہ پہاڑ۔ یہ ندیا ——— صبح و شام ہم سیر کو جایا کریں گے۔

ذکیہ : آپ جانتے ہی نہیں۔ میں کتنی بار کہہ چکی ہوں۔

احسان : میں نہیں جاتا (طنز سے ہنستے ہوئے کمرے میں گھومتے ہیں) میں سیر کو جایا کرتا تھا جب تمھاری بہن زندہ تھی

ذکیہ : (کروٹ بدل کر) آپ اب بھی جا سکتے ہیں مگر آپ کو فرصت بھی ملے۔

احسان : فرصت (پھر طنز سے ہنستے ہیں) تمھارے آنے کے بعد (تمھیں شاید یاد بھی نہیں) میں نے تمھارے ساتھ صبح صبح سیر کو جانے کی کوشش کی تھی ——— سورج نکلنے سے کہیں پہلے دریا کے نیلگوں پانی میں سونا گُل جاتا۔ کنول کے پیلے پیلے پتوں سے دائرے ندیا کی لہروں میں بنتے مٹتے چلے جاتے۔ ادھر سورج کی پہلی کرن جھانکتی اُدھر اس زردی میں سُرخی تحلیل ہونے لگتی۔ (کھڑکی میں جا کھڑے ہوتے ہیں) صبح کی اس پاکیزہ کنواری فضا میں میرا دل ایک عجیب مسرت سے معمور ہو جاتا۔ یوں محسوس ہوتا۔ جیسے دنیا نے پہلی بار نہ جانے کتنے لمبے نیند کے بعد آنکھیں کھولی ہیں اور صرف ہمیں دو اس بے پناہ حسن کو دیکھنے کے لیے پہنچ گئے ہیں (ذکیہ کی طرف مڑ کر) لیکن میری غلطی یہ تھا۔ وہ نہیں۔ اس خوبصورتی کا نظارہ کرنے والا تو میں صرف

میں اکیلا ہوتا تم تو نہ جانے کہاں ہوتی تھیں۔ مگر شمیم سی مٹھی نہ جانے ماضی کا کون سا خواب دیکھا کرتی تھیں۔
پھر میں سبزہ چھوڑ کر مصروف رہنے کی کوشش کیوں نہ کرتا۔

ذکیہ : مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔ آپ جایا کیجئے۔ مجی اور نسو کو لے جایا کیجئے۔

احسان : مجی اور نسو (درد سے ہنستے ہیں) اب تو کبھی سبزہ کو جانے کی خواہش ہی نہیں ہوتی۔ ایک عجیب طرح کی بے حسی طاری رہتی ہے۔ زندگی سردیوں کے اس چناب کی طرح اپنی جوانی کھو چکی ہے۔ کہا سوکھا سمٹا کھویا سا بے آواز بہہ رہا ہے۔ نہ جانے اس کو جوانی کی یاد آتی ہے یا نہیں؟ (واپس ذکیہ کی چارپائی کی طرف آتے ہوئے) میں تو قریب قریب بھول ہی گیا ہوں۔ یہ تو ریاض کے آنے کی خبر سن کر کچھ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔

(لمبا سانس لے کر برابر کی چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ رضیہ اچانک چونک کر اٹھتی ہے)

ذکیہ : ریاض! کون ریاض؟ ریاض بھائی کیا یہاں آئے ہیں۔

احسان : سنا ہے جموں آئے ہیں۔

ذکیہ : (چارپائی چھوڑ کر ان کے قریب آجاتی ہے) جموں۔ کیوں؟ آپ کو کیسے پتہ چلا۔

احسان : (اس کی بات کا جواب دیئے بغیر اپنے جذبات کی رو میں) میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں ذکیہ۔ پچھلے آٹھ برس میں۔ میں برابر سوچتا چلا آیا ہوں ——— اگر میں تمہاری بہن کی موت کے بعد۔ دلی نہ گیا ہوتا تو تمہاری ننھی خوشی کا سوتا بھی یوں نہ سوکھ جاتا اور میری زندگی کی بہاریں بھی یوں دھندلاہٹوں کی گرد میں دبا سوتی۔

ذکیہ : رضیہ آپا اتنی اچھی تھیں۔ ان کی جدائی کسے محسوس نہیں ہوتی۔ میں پوچھتی تھی کر رہا ———

احسان : اور خالہ نے کہا تھا۔ ذکیہ رضیہ کے غم کو تمہارے دل سے بھلا دے گی۔ اگر خالہ میرا حوصلہ نہ بڑھاتیں تو میں شاید کبھی تمہیں مانگنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا۔

ذکیہ : (دوسری چارپائی کا بستر اکٹھا کرنے لگتی ہے) یہ آج آپ کیا گڑے مردے اکھیڑنے لگے ہیں ———

آٹھ برس ہو گئے ہماری شادی کو۔ جیسی پہلی بسر ہو رہی ہے۔ میں اگر بیمار نہ ہو جاتی۔

(بستر ہی چارپائی پر رکھ کر چارپائی اٹھانا چاہتی ہے۔ احسان صاحب

اس کی چارپائی پر جا بیٹھتے ہیں)

احسان: تم کبھی بیمار نہ ہوتیں۔ اگر تم یہاں نہ آتیں۔ آج ریاض کے جموں آنے کی خبر سن کر میرے سامنے قطب کی وہی

شام اور اس شام کی وہی ذکیہ گھوم گئی ہے۔

ذکیہ: (چارپائی اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے) یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ چھوڑیئے بھی اس قصے کو۔ دیکھئے میں

اٹھ تو بیٹھی ہوں۔ طبیعت خراب تھی۔ نہیں تو مجھے کیا لطف آتا ہے دن دن بھر لیٹے رہنے میں۔ میں

ریاض کی بابت پوچھ رہی تھی اور آپ ۔۔۔۔۔۔۔

(تنکتی ہوئی الماری ٹھیک کرنے چلی جاتی ہے)

احسان: اب تم تو یونہی ناراض ہوتی ہو۔ میں نے کبھی کچھ کہا ہے۔ میری طرف سے آٹھوں پہر لیٹی رہو۔ ریاض

کے آنے کی خبر سن کر یونہی خیال آ گیا کہ جموں آیا ہے۔ تو ہو سکتا ہے یہاں بھی چلا آئے۔

ذکیہ: (الماری صاف کرنا چھوڑ کر واپس آتے ہوئے) یہی تو پوچھ رہی ہوں گھر بھر سے اور آپ ہیں کہ بات کا

جواب ہی نہیں دیتے۔

(پھر واپس الماری کی طرف جاتی ہے)

احسان: (اس کے پیچھے جاتے ہوئے) یہی تو بتانے آیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں تمہیں بیمار اور پژمردہ دیکھ کر

مجھے افسوس سا ہونے لگتا ہے۔

ذکیہ: اب تو میں اٹھ بیٹھی ہوں۔ کام بھی کرنے لگی ہوں۔ طبیعت جب ٹھیک نہ ہو تو ——— کیا

کرنے آئے ہیں ریاض بھائی جموں؟ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ ان کے آنے کا؟

احسان: رات قسیم آیا ہے وہاں سے، کہہ رہا تھا کہ ریاض میاں جموں آئے ہوئے ہیں۔ ان کے تو خوب چرچے

ہیں وہاں۔ پرسوں ان کے اعزاز میں پارٹی ہوئی۔ مشاعرہ بھی ہوا۔ اور وہ کہتا ہے جموں کے تینوں مقامی

اخباروں میں ان کا تذکرہ ہے۔

(ذیل کے مکالمے میں ذکیہ نادانستہ طور پر کمرے کی بکھری ہوئی چیزوں
کو ترتیب سے رکھنے لگتی ہے۔ جوں جوں وہ ریاض کا ذکر کرتی ہے اس
کی بے چینی دور ہوتی جاتی ہے اور ترتیب سے کام کی رفتار بڑھتی جاتی ہے)

**ذکیہ**: کتنی عزت حاصل کی ہے ریاض نے ان خالو ہمیشہ کوسا کرتے تھے کہ خاندان کے نام کو داغ لگائے گا۔

**احسان**: آوارہ جو تھے بچپن میں۔

**ذکیہ**: نہیں آوارہ تو کیا تھے۔ الٹے آٹھوں پہر گھر میں پڑے رہتے تھے۔ لیکن درسی کتابوں سے انہیں چڑ تھی۔

**احسان**: تو پھر پڑھتے کیا تھے؟

**ذکیہ**: پریوں اور دیووں کے قصے کہانیاں اور کیا — نہ جانے کہاں کہاں سے خرید لاتے۔ خالو کو چڑ تھی۔ ان سب کتابوں سے۔ وہ انہیں مخربِ اخلاق سمجھتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے بھائی ریاض کے دشمنوں کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ خالو انہیں دیکھنے گئے تو الف لیلیٰ پڑھ رہے تھے۔ خون ہی تو اتر آیا ان کی آنکھوں میں۔ باہر سے تو آئے ہی تھے۔ چھڑی ہاتھ میں تھی۔ دھڑا دھڑ پیٹنے لگے۔

**احسان**: بڑے جابر تھے تمہارے خالو۔

**ذکیہ**: اگر یہ معافی مانگ لیتے تو ان کا غصہ فرو ہو جاتا۔ دودھ کا ابال ہی تو ہوتا تھا۔ ان کا غصہ آیا اور اتر گیا۔ لیکن ریاض میاں تو گویا پتھر کے تھے۔ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آنکھوں میں آنسو تک نہ آئے جھلا کر خالو جان نے کان سے پکڑ کر باہر کر دیا۔

**احسان**: خالہ نے نہیں روکا۔

**ذکیہ**: خالو جان غصے میں ہوں تو کس کا حوصلہ تھا کہ ان کے سامنے دم مارے لیکن ریاض بھائی بھی نہ جانے کس مٹی کے بنے تھے۔ نہ روئے نہ چلائے۔ جا کر نیم کے تلے بیٹھ گئے جب رات کے بارہ بجے۔ خالو جان باہر سے لوٹے تو انہیں کان سے پکڑے ساتھ لیتے آئے۔ لا کر بستر پر پٹک دیا اور بولے۔ "بدبخت خاندان کے نام کو داغ لگائے گا"۔ خدا کی شان دیکھو۔ وہی خاندان کے نام کو روشن کر رہے ہیں۔

**احسان**: بڑا نام حاصل کیا ہے ریاض میاں نے۔

ذکیہ : لیکن چھوڑ تھوڑی دیا تھا ان حضرت نے ان قصوں کا پڑھنا۔ پڑھتے رہے اور بیچ کھیت پڑھتے رہے
ایک بار خالہ نے امی جان سے ریاض کو اپنی غلامی میں لینے کے لیے کہا۔

احسان : (ہنس کر) خالہ کی نظر تھی تم پر !

ذکیہ : امی تو شاید تیار ہو جاتیں۔ لیکن خالو یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے۔ بولے
"کیوں اس غریب لڑکی کا گلا کاٹنے کے درپے ہو۔ جو آدمی چار پیسے نہیں کما سکتا۔ وہ بیوی کی ناز برداری
کیا کر سکتا ہے اور ابا جان خالو سے متفق تھے۔

احسان : (ذرا ہنس کر) تمھارا کیا خیال تھا ؟

ذکیہ : میرا ——— تو بھلا میں ——— بڑی اچھی ہوں جیسی ہوں۔

احسان : لیکن شادی تو پھر ریاض نے نہیں کی۔

ذکیہ : خالہ تو کسی جگہ بات پکی کر آئیں۔ لیکن پہلے خالو جان کی رائے میں ان کے طور نہ بدلے اور پھر جب
طور بدلے تو سنتی ہوں ریاض بھائی نے شادی سے ہی انکار کر دیا (لمبا سانس بھر کر) خالہ اور خالو
دونوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

احسان : لیکن وہ کسی نجمہ کے متعلق ——— کچھ بھنک ——— کان میں پڑی تھی۔

ذکیہ : ایک نجمہ کیا بیسیوں نجمہ ان کے قدموں پہ نثار ہونے کو تیار ہیں۔ وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں
بھی۔ نکہت آئی تھی تو شکایت کر رہی تھی۔ رنگ ڈھنگ ہیں بھائی جان کے۔ عام لوگوں کی طرح
رہتے ہی نہیں۔ بس شعر و نغمہ کی خیالی دنیا میں بستے ہیں ——— اب جموں کیا کرنے آئے ہیں۔

احسان : ہو سکتا ہے کسی مشاعرے اشاعرے میں آئے ہوں۔

ذکیہ : جموں آ گئے، لیکن یہاں نہیں آئے۔

احسان : وہ مصروف آدمی ہیں۔ ان کا پل پل بندھا ہو گا۔

ذکیہ : ہاں مصروف آدمی ہیں۔

احسان : یہی تو میں کہتے آیا تھا کہ آ نہ جائیں یہاں ! جب جموں آئے ہیں تو یہاں بھی آ سکتے ہیں اور گھر میں اتنی

بے ترتیبی پھیلی ہوئی ہے

ذکیہ : (امید و بیم کے ملے جلے جذبات سے) اں! ۔ ——— اس آٹھ برس کے عرصے میں کتنی بار لکھا ۔ نزہت ۔ نکہت ۔ ارشد سب کے ہاتھ کہلا بھیجا خطوں کی تو کبھی رسید نہیں دی اب آئیں گے ۔

(رحیمن دروازہ سے جھانکتی ہے)

رحیمن : سرکار ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں ۔ سلطان انھیں دفتر میں بٹھا آیا ہے ۔

احسان : میں جا تا ہوں ۔ تم ذرا یہ جگہ صاف کر دو رحیمن ۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی یہاں بھوت ناچ کر گئے ہیں تم لوگ کرنے کیا ۔ ہتے ہو سارا دن ؟ جانتی ہو بیگم کی طبیعت خراب رہتی ہے (جاتے جاتے زمین پر پڑی ہوئی ایک دو چیزوں کو ٹھوکر مارتے ہیں) اٹھاؤ یہ سب کوڑا کرکٹ اور صاف کرو اس کمرے کو (چلے جاتے ہیں ۔ لیکن ہتھنر آمیز بڑبڑاہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے ان کے الفاظ برابر کان میں پڑتے ہیں)

میں یہاں کا ریچھ ہوں ۔ میرے تین تین لازم ہیں اور میرے گھر کی یہ حالت ہے ۔

(رحیمن ذکیہ کے ساتھ کمرہ صاف کرنے میں مدد دیتی ہے کچھ لمحے بعد مجی ہنستا ہوا بھاگتا آتا ہے ۔ نسو چیختی چلاتی اس کے پیچھے بھاگتی داخل ہوتی ہے)

نسو : دے میری گڑیا ۔ دے میری گڑیا (اسے پکڑ کر پیٹتے ہوئے) دے میری گڑیا ——— دے ——— دے ——— دے !

مجی : (برابر اسے پیٹتا ہوا) پھر مارے گی مجھے ۔ لے ——— یہ لے ——— یہ لے ! ۔

ذکیہ : (کام چھوڑ کر) ایں ہیں نسو ۔ مجی یہ کیا ہو رہا ہے ؟

نسو : (سسکتے ہوئے) گڑیا چھین لی میری ۔

مجی : پھر مجھے چڑاتی کیوں تھی ۔

ذکیہ : چڑاتی تھی تو پھر کیا ہوا۔ تیری چھوٹی بہن ہے۔ اچھے لڑکے اپنی چھوٹی بہنوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہوں گے۔ تیرے ماموں جان ہمیشہ پیار کرتے تھے کبھی نہ پیٹتے تھے۔

نسو : (سسکنا کچھ کم کر کے) نسیم ماموں جان امّی

ذکیہ : وہ تو اسی مجی کی طرح تھے۔ میں تمھارے ریاض ماموں جان کا ذکر کر رہی ہوں۔

نسو : (سسکنا اور بھی کم کر کے) بڑے امیر آدمی ہیں۔

ذکیہ : نہیں بیٹی۔ ان کا نام بڑا ہے۔ وہ شاعر ہیں۔ ملک بھر میں ان کی عزت ہے۔ جہاں وہ جاتے ہیں لوگ ان کے راستے میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔ ابھی تمھارے ابا کہہ رہے تھے۔ کہ جیوں آئے ہوئے ہیں (مجید سے) اگر وہ تمہیں دیکھ لیں۔ مجی تو کیا کہیں؟ شکل تو دیکھو کیسی بھنگیوں سی بنا رکھی ہے (رحیمن سے) رحیمن یہ کمرہ پھر صاف کرنا۔ پہلے اسے لے جا کر نہلا اور اس کے کپڑے بدل۔ یہ بالٹیاں اور لوٹے اٹھالے جا یہاں سے۔

مجی : (ماں کے اس اچانک جاگ اٹھنے والے پیار سے فائدہ اٹھا کر سہنا تا ہوا) امّی — ی — ی

ذکیہ : (ڈانٹ کر) جا بھی کمبخت! (پھر سنبھل کر) جا جا بیٹا۔ تیرے ماموں جان آئیں گے تو تجھے اس طرح میلے کپڑے پہنے دیکھ کر ناراض ہوں گے اور مٹھائی نہ دیں گے — جا — جا میرا راجہ بیٹا!

مجی : پھر میں دو پیسے کی برفی لوں گا۔

ذکیہ : (دانت پیستے ہوئے۔ لیکن پیار سے) ہاں ہاں لیسنا برفی!

رحیمن : چلو۔ چلو۔

(رحیمن مجید کو لے جاتی ہے اور ذکیہ نسیمہ کو گود میں لے کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

ذکیہ : (بڑے پیار سے) اور کیوں نسو بیٹا۔ اس طرح بڑے بھائیوں سے پیش آتے ہیں۔

(ماں کے اس غیر متوقع سلوک سے چونک کر نسیمہ چپ رہتی ہے)

کہو بیٹا!

**نسو** : چھینی کیوں اُس نے میری گڑیا ؟

**ذکیہ** : گڑیا چھین لی تھی تو تُو مجھ سے کہتی ۔ یہ کیا کہ رونا دھونا شروع کر دیا ۔ یہ تو چمنی کے بچپن میں ۔ منی بھی ایسا نہ کرتی ۔

**نسو** : (فطری تجسس سے) منی کون تھی امی ؟

**ذکیہ** : منی چمنی کی چھوٹی بہن تھی ۔ کہنے کو دو منی تھی ۔ لیکن بڑی بہن کے مقابلے میں اتنی ہوشیار ۔ سمجھ دار اور نیک کہ سب اس سے پیار کرتے تھے ۔ چمنی دن بھر ٹھسے سے کھٹولی رہتی اور جب اٹھتی تو بہن بھائیوں سے لڑتی ۔ لیکن منی بہن بھائیوں سے پیار کرتی اور اماں ابا کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی ۔ گھر تو گھر محلہ بھر اس سے پیار کرتا تھا ——— اب میری نسو بیٹی چمنی بنے گی یا منی ؟

**نسو** : (ماں کی گود میں اچھل کر) میں تو منی بنونگی ۔

**ذکیہ** : لے پھر اپنی گڑیا کے جوڑے اور کھلونے سنبھال کر رکھ لے ۔ تیری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں اور دیکھ تو کمرے کو کس طرح گندہ کر دیتی ہے ۔

(نسو کو پیار سے چوم لیتی ہے)

**نسو** : (محجوب ہو کر) ابھی اٹھا لیتی ہوں ۔

**ذکیہ** : (نسو کو ایک بار پھر پیار سے چوم لیتی ہے) بڑی اچھی ہے میری ننھی بیٹی !

**سلطان** : (باہر سے) دلہن بیگم ! سرکار نے کہلا بھیجا ہے کہ ریاض میاں جہلم سے آئے ہیں ۔

**ذکیہ** : (بیٹی کو پیار کرنا بھول کر اسے فوراً گود سے اتارتے ہوئے) ریاض بھائی آ گئے ——— رحیمن (اور بھی زور سے) رحیمن !

**رحیمن** : (غسل خانے سے) جی بیگم آئی ! گیلے ہاتھ لیے بھاگی آتی ہے) جی !

**ذکیہ** : (مسرت بھرے جوش سے) دیکھو بچی کو چھوڑ دو ! اسے میں نہلاتی ہوں ۔ ریاض بھائی آ رہے ہیں تم اس کمرے کو فوراً صاف کر ڈالو ۔ یہ چارپائی ہٹاؤ ۔ جتنی فالتو چیزیں یہاں پڑی ہیں ۔ سب اٹھا کر ادھر کمرے میں رکھ دو ۔ میں نئی دری اور چادر نکال دیتی ہوں ۔ تم کمرہ جھاڑ کر پلنگ پر نیا بستر بچھا دو ۔

سونے کے لیے نہ جانے وہ کون سی جگہ پسند کریں گے۔

(سوچتی ہے)

رحیمن : بارہ دری اچھی رہے گی۔

ذکیہ : ہاں بارہ دری اچھی رہے گی۔ تم ذرا جلدی جلدی اس کمرے کو صاف کر کے اوپر جاکر
بارہ دری کا فرش دھو ڈالو۔ نیچے فرش پر دری ولائی اور جا نماز بچھا دینا اور کھڑکی کے برابر میز کرسی لگا دینا
میز کے لیے میز پوش اور کرسی کے لیے گدی میں ابھی دیتی ہوں۔

رحیمن : (اتنا کام سن کر ٹال دینے کی غرض سے) لیکن رات بڑی برف پڑی ہے پہاڑوں پر۔ بارہ دری میں سردی
نہ ہو۔

ذکیہ : تم بارہ دری صاف کرو میں سلطان سے نچلی بیٹھک صاف کرنے کو کہتی ہوں ——— معلوم
نہیں وہ کون سی جگہ پسند کریں گے ——— ذرا سلطان کو آواز تو دو۔

رحیمن : (بالکونی کے دروازے پر جاکر سلطان کو آواز دیتی ہے) سلطان ——— سلطان ——
سلطان! (نیچے آنگن سے) کیا بات ہے۔ چلائے جاتی ہو۔

رحیمن : بیگم بلا رہی ہیں

سلطان: آیا!

ذکیہ : (رحیمن کے اترے ہوئے چہرے کی طرف دیکھے بغیر بالکونی پر جاتے ہوئے) اور دیکھو بارہ دری کو صاف
کر کے ذرا انگنائی کو بھی ٹھیک کر دو۔ یہ چھلکے جو کمبخت پڑے ہیں انھیں کوٹھری میں بند کرو۔ مرغیوں کو
ڈربوں میں ٹھونسو۔ بدبختوں نے جگہ جگہ گڑھے کھود رکھے ہیں (مدھم آواز میں) اور دیکھو ریاض بھائی
کو پھول بے حد پسند ہیں۔ سلطان کے چھوکرے کو بیگاں کے باغ میں بھیج کر گلدستے منگا لو۔ شیشے کے گلاس میں
دے دوں گی۔ ایک اوپر بارہ دری میں اور دوسرا نیچے بیٹھک کی میز پر لگا دینا ——— ذرا
سی بھی سستی سے کام لیا تو دیکھنا۔

رحیمن : جی ابھی بھیجتی ہوں۔

ذکیہ : (درمیان کے دروازے میں ذرا پیچھے ہٹ کر) بھائی ریاض آئے ہیں سلطان اور میں پریشان ہوں کہ ان کے لیے کون سی جگہ اچھی رہے گی بارہ دری یا بیٹھک!

سلطان : جی --- جی

ذکیہ : میں نے رحیمن ماما سے صاف کرنے کے لیے کہا ہے تو ذرا نیچے بیٹھک میں جاکر فرش دھو دے۔ تخت جھاڑ پونچھ کر صاف کرا دے اور میز پوش بدل ڈال۔ بس اب بھاگ جا۔ تخت کی چادر اور میز پوش بھیجدوں گی۔

(سلطان جانے لگتا ہے)

اور سُن! ذرا ان سے جاکر کہنا کہ ریاض بھائی کو کچھ دیر کے لیے دفتری میں بٹھائیں۔ اتنے میں ذرا یہ صفائی وغیرہ ہوجائے۔ باہر بلاکر کان میں کہنا ان کے یہ بات!

سلطان : جی بہتر۔

ذکیہ : اور دیکھ وہیں نہ بیٹھ رہنا۔ آکر جلدی سے بیٹھک صاف کر۔ میں اتنے میں بچوں کو نہلاتی دھلاتی ہوں۔ (نسیمہ سے) چل نسو تو بھی نہاکر کپڑے بدل۔ (رحیمن سے) تو اب تم جاؤ اور جلدی سے یہ کام نمٹا ڈالو۔ ماما کو ساتھ لے لو اور ریاض بھائی کے آنے تک اس جگہ کو بیٹھنے کے لائق بنادو (جاتے جاتے) کنویں سے پانی اور بیگماں کے باغ سے پھول منگانا مت بھولنا۔

(نسیمہ کو ساتھ لے کر چلی جاتی ہے۔ رحیمن چپ چاپ کمرے کی صفائی کرنے لگتی ہے)

○

# دوسرا منظر

## ایک گھنٹہ بعد اسی کمرے میں

اِس ایک گھنٹے میں اگرچہ اس بے ترتیب کمرے میں کوئی زبردست انقلاب پیدا نہیں ہو سکا۔ لیکن اس کی ظاہرہ صورت میں خاصی تبدیلی رونما ہو گئی ہے۔ چیزوں کی افراط میں کمی نہیں آئی (شاید ان سب کو دوسرے کمرے میں رکھنے کا وقت نہیں ملا) لیکن ان میں ایک ترتیب ضرور آ گئی ہے بستر پر دودھ جیسی سفید چادر بچھی ہے۔ تکیے کا غلاف بھی بدل دیا گیا ہے کھلونے طاق میں چن دیئے گئے ہیں۔ کپڑوں کی گٹھڑیاں باندھ کر کھونٹے سے لٹکا دی گئی ہیں۔ بالٹیاں اور لوٹے شاید باورچی خانے یا غسل خانے میں چلے گئے ہیں۔ چرخہ ایک کونے میں دھر دیا گیا ہے۔ تپائی اور چار کرسیاں ایک طرف سجا دی گئی ہیں۔ کرسیوں کی گدیاں اور تپائی کا کور سب کچھ بدل دیا گیا ہے۔ الماری کی چیزیں جھاڑ پونچھ کر سجا دی گئی ہیں غرضیکہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ قرینے سے چن دی گئی ہے۔

پردہ اٹھنے پر نسو اور ممی کتابیں لیے لا کر سیوں پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ برابر ہی تیسری کرسی پر بیٹھی ہوئی ذکیہ لیس بن رہی ہے۔

لیکن ——————— جس کا دھیان لیس بننے میں نہیں رہ رہ کر اس کی آنکھیں بالکونی کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ لیس بنتے بنتے اٹھ کر کبھی کمرے کا ایک چکر لگاتی ہے۔ اور پھر بیٹھ جاتی ہے۔

اس ایک گھنٹے کے عرصے میں خواہ کمرے میں کوئی خاطر خواہ
انقلاب نہ پیدا ہوا ہو۔ لیکن ذکیہ اور دونوں بچوں کی صورت شکل میں
زبردست تبدیلی آگئی ہے ———— وہ ایک گھنٹہ پہلے کی مغموم
اداس اور بیمار ای سے اوجھل ادھیڑ عمر کی نظر آنے والی ذکیہ جیسے بجلی
کی سی شوخی اور چمک پا گئی ہے ———— آٹھ برس پہلے جس جاں سوز
حسن کے ایک شعلے نے حسان صاحب کی مردہ خواہشوں میں
آگ بھر دی تھی۔ اس کی ایک جھلک اس وقت ذکیہ کے چہرے
پر لرزاں اور خنداں ہے۔

پردہ اٹھنے کے کچھ منٹ بعد ریشمی جمپر اور فرش کو چھوتا ہوا غرارہ
پہنے۔ کھسکتے ہوئے دوپٹے کو گردن کے بل دیتی ہوئی وہ بالکنی کے
بائیں دروازے کے پاس جا کر حسین کو آواز دیتی ہے)

**ذکیہ** : حسین ابھی آئے نہیں یا حسن بھائی؟

(اور بہ جواب سنے بغیر واپس آکر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن پھر
اٹھتی ہے اور کمرے میں گھومنے لگتی ہے۔ نسو اور مجی کتابوں کی طرف
نہ دیکھ کر کھڑکیوں میں دیکھتے ہیں)

: (انتظار سے جھنجھلا کر) اب اچھے بچوں کی طرح پڑھو بیٹھ کر۔

(نسو اور مجی پھر نگاہیں کتابوں پر جما لیتے ہیں)

(ان کے قریب جا کر ملائمت سے) دیکھو ابھی تمھارے ماموں جان آئیں گے۔ آتے ہی انھیں
سلام کرنا اور بہت شور نہ مچانا (مجی سے جو پھر کھڑکی میں دیکھنے لگا ہے) سنا ہے مجی!

**مجی** : پھر میں برف لوں گا ملائی کی!

**ذکیہ** : (دانت پیستے ہوئے) پاجی!

(مجی رونے کے لیے ہونٹ لٹکا تا ہے)

(جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال کر پیار سے) ارے ہاں لینا برفی۔ لینا برفی!

(احسان اور ریاض باتیں کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

(ریاض تیس بتیس برس کا نوجوان شاعر ہے۔ جذباتی۔ بے چین اور بے پروا۔
اس کے چلنے میں۔ باتیں کرنے میں پارے کا سا اضطرار ہے۔ اس کی آنکھوں
میں۔ چہرے میں اور بالوں میں ایسی کشش ہے جو بے طرح دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے
اس نے سوٹ پہن رکھا ہے۔ لیکن اس کا لاابالی پن اور اس کی بے پروائی اس میں
سے پھوٹی پڑتی ہے)

**احسان**: بھلا دہلی اور لاہور کے محلوں کے مقابلے میں آپ کو لکھنؤ کا یہ مکان کیا پسند آئے گا؟

**ریاض**: مجھے تو یہ چھوٹا سا قصبہ بے حد پسند آیا۔ پھر جو پاکیزہ ہوا اسے میسر ہے وہ لاہور اور دہلی کے نصیب میں
کہاں؟ (ذکیہ کو دیکھ کر) لو ذکیہ ابھی تو ہو۔

**ذکیہ**: سلام بھائی جان۔ آپ کی دعا ہے۔

**احسان**: یہ تو جب سے آئی ہیں۔ بیمار رہتی ہیں۔

**ریاض**: تم تو کافی کمزور ہو گئی ہو ذکی۔

**ذکیہ**: اپنے ماموں جان کو سلام کرو بیٹا۔

**نسو**: ماموں جان سلام۔

**مجی**: ماموں جان سلام۔

**ریاض**: (انھیں پیار کرتے ہوئے) سلام بھئی (نسیمہ کو گود میں اٹھا کر) کیا نام ہے تمھارا؟

**نسو**: نسو۔

**ریاض**: بیٹی تو آپ کی پیاری ہے (مجی سے) اور تمھارا کیا نام ہے؟

**مجی**: مجی۔

ریاض: پڑھتے ہو؟

مجی : دوسری جماعت میں پڑھتا ہوں۔

ریاض : (انسو کو گود سے اتارتے اور مجی کو پیار کرتے ہوئے) شاباش! بڑا اچھا بیٹا ہے۔

(سلطان بالکونی کے بائیں دروازے سے سنگتروں کی ٹوکری

اندر رکھتا ہے)

سلطان: سرکار یہ سنگترے رکھے ہیں۔

ریاض : اور کچھ ملا ہی نہیں۔ راستے سے۔

ذکیہ : اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟

ریاض : میں اور تکلف۔ راستے میں بس کھڑی ہوئی تو ایک سنگترے والا سر پہ سوار ہو گیا۔ سو بچوں کے لیے لیتا آیا۔

(انسو اور مجی اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک ایک سنگترہ اٹھا لیتے ہیں۔ ذکیہ

قہر کی نگاہوں سے بچوں کی طرف دیکھتی ہے اور پھر ضبط سے کہتی ہے)

ذکیہ : دیکھو بیٹا۔ یہاں نہ بکھیر نا چھلکے!

(نیچے آنگن سے رحیمن کی گھبرائی ہوئی آواز آتی ہے)

رحیمن : لے گیا ——— سلطان ——— سلطان ——— وہ جا بیٹھا منڈیر پہ!

(احسان۔ ریاض۔ ذکیہ اور بچے بھاگ کر بالکونی پر جاتے ہیں)

احسان: کیا بات ہے۔ کیا بات ہے۔

مجی : (جو سب سے پہلے بالکونی پہ پہنچا ہے) امی بندر چادر لے گیا ہے۔

ذکیہ : اُف یہ بندر! ناک میں دم آگیا۔ ان کے مارے (بالکونی کے جنگلے پہ جا کر رحیمن کو پکارتے ہوئے) کیسے

چھین کر لے گیا رحیمن!

رحیمن : (جو گھبرائی ہوئی اوپر بھاگی آتی ہے) میں اسے تخت پہ رکھ کے سلطان کو دری بچھانے میں مدد دے

رہی تھی کہ اٹھا کر لے گیا۔

ذکیہ : ٹھہرجی! اسے ڈرا مت۔ تار تار کرکے رکھ دے گا چادر۔ جا نسو بھاگ۔ باورچی خانے سے روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر لا۔

(نسو بھاگ جاتی ہے)

احسان : (ٹوکری سے ایک سنگترہ اٹھا کر ذکیہ کو دیتے ہوئے) ارے بھئی یہ سنگترہ اسے لو۔ اس وقت تک کہیں برابر ہی نہ کر دے چادر۔

ذکیہ : (سنگترہ بندر کو دکھاتے ہوئے) لے ــــ لے ــــ پچ پچ! ــــ بندر کیا کنگ کانگ ہے۔

احسان : کنگ کانگ ہے۔

ذکیہ : (بدستور بندر کو سنگترہ دکھاتے ہوئے) میں جب بھی اس کو دیکھتی ہوں مجھے کنگ کانگ کی یاد آجاتی ہے۔

احسان : کنگ کانگ؟

ریاض : ایک بھیانک فلم کا نام ہے۔ جس میں ایک بن مانس ایک خوبصورت لڑکی کو اٹھا کر لے جاتا ہے اسی جیسا بھیانک اور نڈر ہے یہ بھی (بندر سے) لے ــــ لے ــــ پچ ــــ پچ! ــــ

رحیمن : ایسا دلیر ہے موا کہ سامنے سے اٹھا کر لے گیا۔

ذکیہ : جانتی ہو کہ یہ وقت ہے ان کی چڑھائی کا۔ پھر بھی بے پروا ہو جاتی ہو

احسان : اسے بھی ہاتھ میں دکھانے سے کیا ہوگا۔ کچھ پھانکیں ادھر پھینکو تو چھوڑ کر جائے۔

(نسو روٹی کا ٹکڑا لے کر بھاگی آتی ہے)

نسو : امی یہ لو روٹی!

ذکیہ : (روٹی نسو سے لے کر بندر کو دکھاتی ہے) لے ــــ لے ــــ (روٹی کا ٹکڑا توڑ کر پھینکتی ہے) ہوئے (لمبا سانس لیتی ہے) چلا گیا۔ کتنا چالاک ہے۔

احسان : کنگ کانگ کا نام دیا ہے تم نے اسے۔

ذکی : نمی بیٹا! جا تو ذرا بھاگ کر چادر اٹھا لا۔

**مجی** : پھر میں چلغوزے لوں گا دو پیسے کے۔

**ذکیہ** : (بیزاری سے) ہاں ہاں لینا چلغوزے (جنگلے پر سے نیچے آنگن میں سلطان کو ڈانٹتے ہوئے) ابے سلطان اس طرح تو گرد نہ اڑا کہ سانس لینا مشکل ہو جائے۔

(سب کمرے میں واپس آجاتے ہیں۔ نسو اپنی کرسی پر جا کر کتاب لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن دھیان اس کا سنگترے میں ہے)

**احسان** : (واپس کمرے میں آتے آتے) اچھا بیگم تم ان کے نہانے دھونے کا انتظام کرو۔ میں ذرا دفتر ہو آؤں۔ دیکھو گرم پانی۔

**ذکیہ** : پانی تو بھئی یہاں دریا ہی کا آتا ہے۔ تمہیں شاید کچھ جھجک محسوس ہو۔ ہم تو پیتے بھی وہی ہیں۔ لیکن تمہارے لیے میں نے کنوئیں کا پانی منگوایا ہے۔ دو میل دور ہے کنواں۔ وہیں سے کہار لاتے ہیں۔

**احسان** : کہیے تو نہانے کے لیے بھی پانی وہیں سے منگا لیا جائے۔ ہم تو پھٹکری ڈال لیا کرتے ہیں۔

**ریاض** : جی آپ فکر نہ کیجیے۔ میں نہا کر چلا ہوں۔

**احسان** : اچھا چائے پانی پلاؤ (ریاض میاں کو) میں ہو آؤں دفتر تک۔

(چلے جاتے ہیں)

**ریاض** : (چارپائی پر بیٹھتے ہوئے) چائے میں صبح ہی پیتا ہوں صبح۔ پی کر چلا تھا۔ اب تو بارہ بجنے والے ہیں۔

**ذکیہ** : (کرسی کو چارپائی کے نزدیک کھسکا کر اس پر بیٹھتے ہوئے) تم تو اس طرح تکلف کر رہے ہو جیسے کسی دوسرے کا گھر ہو۔

**ریاض** : سچ میں پی کر چلا تھا۔ ورنہ کبھی آج تک تکلف کیا۔ جو اب کروں گا۔

**ذکیہ** : آج تک۔ جیسے بیسیوں دفعہ آچکے ہو یہاں۔

**ریاض** : بھئی میں چائے پی کر چلا تھا ذکی۔ اب تو کھانا کھانے کا وقت ہے۔

**ذکیہ** : کھانا بھی تیار ہوا جاتا ہے۔ گھر میں کچھ بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے نوکروں کو ادھر لگا دیا (نوکرانی کو آواز دیتی ہے) رحیمن —— رحیمن ——— (بالکنی پر جا کر نیچے جھانکتے ہوئے) رحیمن!

رحیمن : (نیچے آنگن سے) جی بیگم!

ذکیہ : صفائی وغیرہ سلطان پر چھوڑ دو۔ تم جا کر کھانا پکانے کا انتظام کرو۔ وہ کہار پانی لایا کنوئیں کا یا نہیں؟

رحیمن : ابھی دو گھڑے دے گیا ہے بیگم۔

ذکیہ : تو بس اب جھٹ سے باورچی خانے میں آگ داگ ٹھیک کرو۔ آٹا گوندھ کر رکھو۔ روٹیاں میں خود پکاؤں گی۔

ریاض : (اُٹھ کر اس کے پاس جاتا ہوا) کوئی ایسی جلدی نہیں زکی۔ میں تو یوں بھی ڈیڑھ دو بجے کھانے کا عادی ہوں۔ لیکن یہ لاری کمبخت جس راستے سے آتی ہے۔ اس میں اتنے ہچکولے لگتے ہیں کہ خدا کی پناہ مہینوں کے پیسے آنتوں کی ورزش ہو جاتی ہے۔ بھوک لگ ہی آئی ہے۔

ذکیہ : (ایک سنگترہ اٹھا کر چھیلتے ہوئے) تم تنے میں ایک دو سنگترے کھاؤ سالن تیار ہے۔ یہ رحیمن ذرا آٹا گوندھ دے۔ میں روٹیاں پکاؤں گی۔

(ریاض پھر چارپائی پر جا کر لیٹ جاتا ہے۔ مجی آتا ہے۔ اور چپ چاپ نسو کے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنا سنگترہ وہ ختم کر آیا ہے لیکن اس کی نگاہیں برابر نسو کے سنگترے پر لگی ہوئی ہیں۔ ذکیہ قہر بھری نظر سے دیکھتی ہے۔ مجی نگاہیں کتاب میں جما دیتا ہے)

: (کرسی پر بیٹھ کر سنگترہ چھیلتے ہوئے) تم ڈاک لاری سے نہیں آئے وہ تو نہر کے کنارے کنارے نظر آتی ہے۔

ریاض : سواریوں نے تو کہا تھا۔ نہر پر سے چلنے کے لیے۔ لیکن ڈرائیور بولا —— پل ٹوٹ گیا ہے وہاں سے لاری نہیں جا سکتی۔

ذکیہ : کوئی ٹدپوک ہو گا۔ برکت تو پچیس منٹ میں لے آیا کرتا ہے۔

ریاض : پچیس منٹ —— یہ تو پونے دو گھنٹے میں لایا ہے اور پھر ایسے راستے سے کہ ہڈیاں چٹخ گئیں۔

ذکیہ : ٹرک سے آئی ہوگی لاری۔

ریاض : اس اوبڑ کھابڑ راستے کو آپ سڑک کہتی ہیں۔ اتنے پتھر ٹیلے نالے راستے میں پڑتے ہیں لیکن کسی پر بھی پُل نہیں۔ میں سوچتا ہوں۔ برسات کے دنوں میں لوگ کیسے آتے جاتے ہوں گے۔ مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو میں کشتی میں آتا۔

ذکیہ : (الماری سے ایک پلیٹ اٹھا کر سنگترے کو اس میں رکھتے ہوئے) اور شام کو لکھنؤ پہنچے۔ امّیں قُل ہو اللہ پڑھتیں۔ لیکن جناب شاعر ہونے کے زعم میں اس طرف سے بے پروا لہریں گنتے۔ پُلوں کے اُوپر نیچے سے گزرتے ہوئے چلے آتے۔

(آنکھوں ہی آنکھوں میں نسّو اور مجّی اشارے کرتے ہیں اور نسّو اُٹھ کر امّی کے پاس آتی ہے)

نسّو : امّی! میں ذرا ہو آؤں صادقہ کے ہاں۔ اس کی گڑیا کی شادی ہے۔

ذکیہ : آ جانا اپنے آپ۔ چُنّی کی طرح تنگ نہ کرنا اپنی امّی کو۔

نسّو : ہاں ہاں میں آ جاؤں گی۔

(نسّو جاتی ہے اور جاتے جاتے مجّی کو چھیڑتی ہے)

مجّی : میں بھی گلی ڈنڈا کھیلنے جاؤں گا امّی!

ذکیہ : ہاں ہاں کھیل آؤ۔ لیکن آ جائیو جلدی۔

مجید : (جاتے ہوئے) ہاں ہاں بس جلدی آ جاؤں گا۔

(نسّو کے پیچھے بھاگ جاتا ہے)

ذکیہ : دیکھو!

(مجید بالکونی پر رُکتا ہے)

تمہارے ماموں جان کے ساتھ ہم سب مل کر اکٹھے کھانا کھائیں گے۔

(مجید بہت اچھا کہتا ہوا بھاگ جاتا ہے اور ذکیہ ایک سکھ کی سانس لیتی ہے)

ریاض : کتنے پیارے بچے ہیں، ذکیہ تم نے تو جنت بسا رکھی ہے۔

ذکیہ : (زہر خند کے ساتھ) جنت!

ریاض : (اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ارمان بھرے لہجے میں) آٹھ برس گذر گئے۔ جب ہم نے بھی ایک بار ایسی ہی جنت
بسانے کا عہد کیا تھا۔

ذکیہ : (ویسے ارمان بھرے لہجے میں) صدیوں سے آٹھ برس!

ریاض : تم نے اپنی جنت بسا لی ——— لیکن میں ——————— میں نہ جانے کن آزمائشوں میں سے
نکل گیا ——— تمہارا ایک گھر ہے۔ شوہر ہے۔ بچے ہیں ——— اور میں ——— میں

ذکیہ : آزادی کی آگ میں جل کر کندن ہو گئے تم اور نہ ٹوٹنے والی بیڑیاں میرے پاؤں میں بندھتی چلی گئیں۔

ریاض : (حیرت سے) بیڑیاں ——— ذکی ——— تم خوش نہیں ہو؟

ذکیہ : میں شاکر ہوں۔

ریاض : بھائی صاحب کہتے تھے تم بیمار رہتی ہو۔

ذکیہ : مجھے تم بیمار نظر آتے ہو۔

ریاض : میں تو اچھا خاصا ہوں۔ سفر سے آ رہا ہوں۔ اس لیے کچھ تھکن محسوس ہو رہی ہے۔

ذکیہ : (جیسے دوسری دنیا سے بول رہی ہے) مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں ایک لمبا سفر طے کر کے
آئی ہوں اور تھک گئی ہوں (ہنس کر) لیکن چھوڑو اس قصے کو۔ تھکے ہوئے ہو آرام کرو۔

ذکیہ : میں نے تمہارے ٹھہرنے کا انتظام اوپر بارہ دری میں بھی کیا ہے اور نیچے بیٹھک میں بھی۔ تمہیں جو جگہ پسند
آئے۔ وہیں تمہارا سامان رکھوا دوں۔

ریاض : سامان ہی کون سا ہے۔ بس یہی کپڑے ہیں۔ کوئی تہمد یا چادر دو تو انہیں بدل ڈالوں۔

ذکیہ : تو چلو اوپر بارہ دری میں جگہ پسند کر لو۔ تہمد نکالے دیتی ہوں۔ میں تو تمہارے آنے کی امید ہی کھو بیٹھی
تھی۔ صبح ہی سنا ——————— تم جیل آئے ہو۔ سوچا شاید ادھر بھی آنکلو۔ سو جلدی جلدی بارہ دری
ٹھیک کرائی۔ بیٹھک ٹھیک ہو رہی ہے چلو پہلے بارہ دری دیکھ لو۔

# تیسرا منظر

## (دو گھنٹے بعد اسی کمرے میں)

(کمرہ اور بھی دیدہ زیب ہو گیا ہے کپڑوں کی گٹھریاں ٹنگنے کے
کپڑے اور دوسری فالتو چیزیں اندر کمرے میں پہنچا دی گئی ہیں
سلطان چرخہ لیے دوسرے کمرے میں جا رہا ہے۔ جب رحیمن
داخل ہوتی ہے)

رحیمن: اب ختم بھی کر اس کام کو سلطان۔ نیچے آنگن میں کمبخت مرغیوں نے قیامت کا اودھم مچا رکھا ہے
انھیں ڈربوں میں بند کرنا ہے

سلطان: بس یہ چرخہ رہ گیا ہے۔ باقی سب چیزیں تو میں نے اٹھا دی ہیں۔ دیکھو تو کمرے کی کیا صورت نکل
آئی ہے۔

رحیمن: بیگم ادھر ہی آنے والی ہیں۔ اب چل آگے۔

سلطان: (چرخے کو دوسری زمین پر ٹکا کر) بس ابھی جاتا ہوں (سرگوشی میں) بیگم کا چہرہ روشن ہو گیا ہے ان دو
کوٹھڑیوں میں وہ ہمیشہ کی زردی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ یہ ریاض میاں اچھے آئے ہیں ... گھر
کی، بیگم کی، بچوں کی۔ سب کی کایا پلٹ گئی ہے۔

رحیمن: (اسی طرح سرگوشی میں) یہاں آنے سے پہلے انہی کے ساتھ چل رہی تھی بیگم کی بات چیت، لیکن صفیہ بیگم
خدا انھیں قدم قدم جنت نصیب کرے بچی کو چھوڑ کر رخصت کر گئیں اور نوابی کے خیال سے نانی نے ان
کو یہیں بیاہ دیا ہے۔

سلطان: دولت کا بھی تو خیال ہوگا۔

رحیمن: ہاں۔ اپنی آگ پرائے کیوں سینکیں۔

سلطانہ : لیکن نہ وہ دولت رہی اور نہ نوابی اور بیگم قید ہو گئیں اس سنسان جگہ میں۔ میں تو جب بھی ان کو دیکھتا ہوں مجھے ان پر ترس آجاتا ہے۔ کہاں دلّی اور کہاں یہ لکھنؤ —— قسمت رہی ہے نا۔ کہاں سے کہاں لا پھینکا۔

رحیمن : کیوں انھیں کس بات کی کمی ہے۔ اب خدا رکھے ہزاروں لاکھوں سے اچھے ہیں۔ بھائی مرگئی تو کیا ہوا اللہ اپنا بچہ بھی سلامت رکھے۔

( باہر بالکونی پر ریاض اور ذکیہ کے باتیں کرنے کی آواز آتی ہے )

ریاض : ارے بیٹی بیوی کا نٹوں میں گھسیٹتی ہو۔ اتنا لذیذ تھا کھانا —— مجھے تو مدت ہو گئی ایسا کھانا چکھے

رحیمن : ( سرگوشی میں ) اٹھاؤ چرخہ اور بھاگو۔ وہ ادھر آرہے ہیں۔

( سلطان چرخہ اٹھا کر دائیں دروازے سے نکل جاتا ہے اور
رحیمن اس کے پیچھے چلی جاتی ہے۔ بائیں دروازے سے ریاض
اور ذکیہ باتیں کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں )

ذکیہ : کیا کروں۔ یہاں کوئی نئی چیز ملتی ہی نہیں۔ وہی گنڈے ہیں دالی گاجریں اور وہی موا کرم کا ساگ ( جاتی ہوئی رحیمن سے ) رحیمن ذرا پاندان اٹھا لا۔ میں پان بنا دوں ریاض بھائی کے لیے۔

رحیمن : جی ابھی لائی بیگم۔

ریاض : ( پلنگ چارپائی پر لیٹتے ہوئے ) یہ کرم کا ساگ کیا بلا ہے۔ ہم نے تو کبھی نہیں چکھا۔

ذکیہ : ( اس کے پاس کرسی پر بیٹھ کر ہنستے ہوئے ) کھا لینا۔ شام کو پکا ہیں گوشت میں۔ کوئی ایسی سوغات کی چیز تو ہے نہیں تمھیں کیا پسند آئے گا۔ تم پر تکلف دعوتیں کھانے کے عادی۔ میں نے جب سنا کہ تم آرہے ہو برابر یہی ترکاریوں کی بابت سوچ رہی ہوں۔ موٹر ڈرائیور سے کہلا بھیجا ہے کہ جب وہ آتا آتا کچھ سبزیاں اور پھل لیتا آئے۔

ریاض : ارے بھئی تم خوا مخواہ پریشان ہوتی ہو۔ ذکی تم تصور ہی نہیں کر سکتیں مجھے باورچی خانے میں کھانا کھا کر کتنا لطف آیا۔ دسترخوان اور ڈائننگ ٹیبلوں پر کھا کھا کر تو جان ضیق میں آگئی ہے۔ باورچی خانے میں چولھے

کہ اگلے تمہارے سامنے بیٹھے ہوں۔ تم روٹی پکاؤ، ہم کھائیں ——— مجھے امید ہے تمہیں زندگی میں دوبارہ یہ مسرت حاصل ہوگی۔

ذکیہ : مجھے تو بھول ہی گیا سب کچھ۔ اب تمہارے آنے پر برسوں بعد آج روٹیاں بیلی ہیں۔

ریاض : (بیٹھ کر) لیکن تمہارے کھانے میں مٹھاس تو پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ ذکیہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کھانا پکانے میں تم نے پہلے سے بھی زیادہ مہارت حاصل کر لی ہے تو پہلے بھی ہوتا چلا آتا۔

ذکیہ : تم آنے ہی نہیں بیسیوں بار ہم نے بلا بھیجا۔

ریاض : (اس کی طرف ایک ٹک دیکھتا ہے۔ گویا اس کی آنکھوں میں ڈوب کر ان کی اتھاہ پانا چاہتا ہے۔ پھر لمبا سانس بھرتا ہے) ارے جیتی تم آ بیٹھیں یہاں کالے کوسوں دور ——— کہاں دلی، علیگڑھ اور کہاں ریاست جموں و کشمیر ——— اور پھر اس پر بھی یہ دور افتادہ قصبہ۔ جیسے ڈھب کی ایک سڑک بھی تو حاصل نہیں۔

ذکیہ : آ بیٹھی (درد سے مسکراتی ہے) جیسے خود اٹھ کر آ بیٹھی یہاں ——— ہم غریبوں کا کیا ہے اماں ابا نے جہاں بٹھا دیا۔ جا بیٹھیں۔

(رحیمن پاندان لے کر آتی ہے)

رحیمن : لیجئے بیگم پاندان۔

ذکیہ : لاؤ۔ اور جا کر دیکھو۔ وہ سلطان کا چھوکرا پھولوں کے گلدستے لایا ہے یا نہیں۔

(ریاض اٹھ کر بالکنی کے درمیانی دروازے میں جا کر کھڑا ہوتا ہے ذکیہ چارپائی پر بیٹھ کر پان بنانے لگتی ہے)

ریاض : (کچھ لمحے دور پہاڑوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر ایک لمبا سانس بھر کر مڑتا ہے) کچھ بھی ہو ذکیہ۔ اگر میں جانتا تم اتنی خوبصورت جگہ رہتی ہو تو سفر کی دقتوں کو بھول کر اڑ آتا (کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے) کتنا خوبصورت مقام ہے (بالکونی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) وہ تین طرف بیضوی دائرہ سا بناتے ہوئے پہاڑ اور یہ چوتھی طرف اپنی دھن میں مست سویا کھویا سا بہتا چناب۔

( دھاگا ختم ہو جاتا ہے ۔ الماری سے جا کر اور دھاگا لاتی ہے )

ریاض : ( اس کے پیچھے جاتا ہوا ) کتنے اچھے تھے وہ دن !

ذکیہ : تمھیں تو کبھی یاد بھی نہ آتی ہوگی ان کی ۔

ریاض : ( جذبات کو چھپانے کی کوشش میں بالکونی کی طرف جاتے ہوئے ) سچ کہتا ہوں ۔ اگر وہ یاد نہ رہتی تو آوارگی کی بیڑیاں برنا بیسکے پاؤں کو نہ جکڑے رکھتیں ۔

ذکیہ : ( اس کے پیچھے جاتے ہوئے ہمدردی ، درد اور محبت کے لہجے میں ) ریاض !

ریاض : ( جذبات پر قابو پاتے ہوئے ذرا ہنس کر ) وہ دیکھو ، کنگ کانگ کی طرح جیتا ناک لٹکا رہا ہے

( ذکیہ ریاض کے بالکل قریب جا کر اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے ۔ لیکن ریاض چند کی طرف دیکھ رہا ہے ۔ ایک لمبا سانس بھر کر وہ بھی اُدھر دیکھنے لگتی ہے ۔ اس کا لب و لہجہ ایک عجیب درد سے بھر جاتا ہے )

ذکیہ : کنگ کانگ ( مسکراتی ہے ) تمھیں یاد ہے نا جب ایک بار کنگ کانگ کا فلم دیکھنے گئے تھے ۔ میں اس لڑکی کو کبھی نہیں بھول سکی ۔ جسے کنگ کانگ اغوا کر کے لے گیا تھا ( لمبا سانس لیتی ہے ) وہ رہائی پا گئی تھی لیکن ——————)

( باہر سے احسان صاحب کی آواز آتی ہے )

احسان : ارے بھئی کدھر ہو ؟

( اندر داخل ہوتے ہیں ۔ ہاتھ میں مٹھائی کا دونا ہے )

ریاض : آئیے بھائی جان یہ کیا لائے ہیں ؟

احسان : ( اندر آتے ہوئے ) یہاں ملتا ہی کیا ہے ۔ میں نے کہا منہ میٹھا کرنے کے لیے مٹھائی ہی لیتا چلوں ۔

ریاض : ( ان کے پیچھے آتے ہوئے ) ارے بھائی جان اس کی کچھ کسر رہ گئی تھی ۔ گاجر کا حلوہ تو کھلایا ہے

ذکیہ : ( ان کے پیچھے آتے ہوئے ریاض کی بات کاٹ کر ) کالی گاجر کا حلوہ بھلا کیا پسند آیا ہوگا ۔

ریاض : (ہنستے ہوئے) وہ کسی نے کہا ہے نا — حسنِ صورت پہ نہ جا (احسان دونوں ہاتھ ریاض کے کاندھوں پر رکھ کر جاتے ہیں) ارے بھائی جان آپ کدھر جا رہے ہیں۔ بیٹھیے نا۔

احسان : نہیں مجھے دفتر کا کام ہے۔

ذکیہ : (چارپائی پر بیٹھے ہوئے) ذرا جلدی آئیے گا۔ ذرا گھما لائیں گے ریاض بھائی کو پاس کے گاؤں تک

احسان : کوشش کروں گا۔ لیکن نہ آسکا تو تم لوگ ہو آنا۔

(اٹھ جاتے ہیں)

ریاض : بھائی صاحب کی صحت تو پہلے سے کہیں بہتر ہے۔

ذکیہ : پھول گئے ہیں۔ انھیں روگ تو اندر لگا ہوا ہے۔

ریاض : یہ ان کے دانت کس طرح کے ہیں۔ اوپر کی قطار سفید ہے اور نچلی زرد۔

ذکیہ : دونوں زرد تھیں۔ پائیوریا تھا۔ اوپر کی نقلی لگوائی ہے۔ نیچے بھی نکلوانے کے لیے زور دے رہی ہوں۔ لیکن مانتے ہی نہیں۔ اپنی صحت کا کچھ خیال ہی نہیں رکھتے

ریاض : لیکن پائیوریا تو بڑا موذی مرض ہے۔

ذکیہ : (اب بہاؤ میں اس ذکر کو ٹالنے کے سے انداز میں) مانیں بھی۔

(ایک بندر تیزی سے آتا ہے اور مٹھائی کا دونا لے جاتا ہے)

ریاض : (بے طرح چونک کر) ارے — ارے — ارے — وہ لے گیا مٹھائی کا دونا۔ شاید اسی وقت سے تاک لگائے بیٹھا تھا۔

(اٹھ کر آنگن کے دروازے میں جاتا ہے)

وہی ہے کنگ کانگ — کس مزے سے جا بیٹھا ہے منڈیر پر۔

ذکیہ : (وہیں چارپائی پر بیٹھے بیٹھے) کنگ کانگ — میں نے کب کا بھگتا کر لیا ہے۔

ریاض : (دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے کھڑے دور پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے) یہ سامنے کے گیروے پہاڑ بادلوں کے سائے کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے یہ پُرسکون جگہ پاکر

سو گئے ہیں اور یہ چھکبری چارپائیاں بیٹھی۔ سوئی نیم غنودہ سی۔ کیسی بھلی لگ رہی ہیں۔ میں اگر وہ جاؤں

گر نہ جانے کن معرکۃ الآرا چیزوں کی تخلیق کروں۔

ذکیہ : (طعنہ اور امید سے) رہ گئے تم!

(درید ہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی ہے — نیچے

گلی سے اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز آتی

ہے)

ریاض : کتنا سکون ہے اس دوپہر میں۔ یہ نیچے گلی سے گزرنے والے اونٹوں کے گلے میں بندھے ہوئے

گھنٹوں کی آواز کیسی پیاری معلوم ہوتی ہے۔

(کبوتروں کی غٹرغوں کی آواز آتی ہے)

یہ بازار سے آنے والا مدھم سا شور اور یہ جنگلی کبوتروں کی غٹرغوں!

(ہندیا کے بچے کی کوں کوں کی آواز آتی ہے)

لیکن یہ کوں کوں کی آواز نہ جانے کس پرندے کی ہے؟

ذکیہ : (اٹھ کر ہنستی ہوئی کھڑکی کے پاس جاتی ہے) پرندے کی نہیں یہ ہندیا کے بچوں کی آواز ہے۔

ریاض : (اس کے پاس آتا ہوا) کہاں ہیں یہ ہندیا کے بچے۔

ذکیہ : وہ دیکھو ادھر چھت پر —— کیسی کوٹ کوٹ کر شوخی بھری ہوئی ہے۔ ان میں وہ دیکھو

وہ بندر کمبخت کس طرح بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ بندریا کس طرح اس کے جسم کو سہلا رہی ہے۔

ریاض : جی چاہتا ہے بس اسی طرح دوپہر کی میٹھی میٹھی دھوپ میں لیٹ جاؤں اور کوئی میرے جسم کو سہلائے۔

ذکیہ : تم اب چاہتے ہو! تم نے کبھی نہیں چاہا!

(لمبا سانس بھرتی ہے)

ریاض : کتنے شوخ اور چنچل ہیں یہ بندر اور ان کے بچے۔

ذکیہ : ہر طرح کی قید سے آزاد۔

ریاض : حیات کی قید میں تو یہ بھی بند ہیں۔ لیکن انھیں اس کا غم نہیں۔ شاید اس کا احساس بھی ان کو نہیں۔

ذکیہ : یہ احساس کا کانٹا آدمی ہی کی قسمت میں کیوں ہے؟ یہ احساس کند کیوں نہیں ہو جاتا۔ مر کیوں نہیں جاتا۔

ریاض : (لمبے سانس کو سینے ہی میں روکتے ہوئے) مر بھی جاتا ہے آدمی کا احساس

(آ کر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے)

ذکیہ : (اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے) مر کر بھی جی اٹھتا ہے۔ میں گھنٹوں ان پرندوں کو آزادی سے کودتے پھاندتے قلابازیاں لگاتے۔ درختوں کی شاخوں سے لٹکتے جھولتے دیکھتی ہوں۔ یہاں تک کہ اپنی قید کا احساس کئی گنا ہو کر میری رگ رگ میں جاگ اٹھتا ہے۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے جسم کی تمام رگوں میں کچھ سلگنے سا لگا ہے۔ اور کبھی ایسے کہ جسم کی ہر دھڑکتی ہوئی رگ گویا بجھی ہوئی بھیگی لکڑی کی طرح مردہ ہو گئی ہے۔

ریاض : (اچانک اٹھ کر ذکیہ کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر ذرا سا جھنجھوڑتے ہوئے) ذکیہ تم خوش نہیں ہو۔

ذکیہ : میں شاکر ہوں۔

ریاض : (اور بھی جھنجھوڑتے ہوئے) تم شاکر بھی نہیں ہو۔

ذکیہ : دنیا میں کون خوش ہے۔ کون شاکر ہے ——— تم خوش ہو؟

(ریاض کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک بادل سا آتا ہے۔ لیکن دوسرے لمحے میں وہ اپنے آپ پر قابو پا لیتا ہے)

ریاض : میں (ہنستا ہے) میں شاعر ہوں (اس کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے) اور تم ——— تم شاعر سے فلسفی بن گئی ہو۔

(خود بھی چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے)

ذکیہ : زندگی میں آدمی فلسفی بن جاتا ہے یا پتھر!

ریاض : دونو ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

ذکیہ : شاید تم سچ کہتے ہو۔ پتھر شاید سب سے بڑا فلسفی ہے

**ریاض:** (اُٹھ کر کمرے میں گھومتے ہوئے) لیکن زکیہ جب تک تم شاعر رہتیں۔ اپنی تمام نا اُمیدی اور اداسی کے باوجود شاعر کے دل میں، دل کے کسی نامعلوم گوشے میں اُمید چھپی رہتی ہے۔ تم سمجھ ہی نہیں سکتیں زکیہ! کل شام میں کتنا مایوس تھا۔ رات میں نے کس ذہنی اذیت سے گذاری۔ اپنے پرشور ماحول کو دیکھتے، ماحول کی اس دم گھونٹ دینے والی قید سے کس طرح بھاگ کر یہاں آیا ہوں۔ لیکن اس جھونپڑے سے خوبصورت تصویر کو دیکھ کر۔ تب سے دل کو تسکین اور مجھے ہوا کر تمہاری اس ننھی سی جنت کا تصور کر کے میں جیسے پھر اپنی اُمید اور مسرت پا گیا ہوں۔ لیکن اس جنت کی تخلیق کرنے والی تم غمگین اور اداس ہو۔

**زکیہ:** جنت!

(دردبھری ہنسی ہنستی ہے)

**ریاض:** (زکیہ کی اس زہریلی دردبھری ہنسی کی طرف دھیان دیئے بغیر اپنے جذبات کی رَو میں) اور میں سوچتا تھا۔ اگر میں یہاں کچھ دن بھی رہ جاتا تو نہ جانے کتنی خوبصورت چیزوں کی تخلیق کر دیتا۔ (پھر آکر چارپائی پر زکیہ کے سامنے بیٹھ جاتا ہے) جس دن دنیا میں خوبصورتی پیدا ہوئی تھی۔ زکیہ شاید اس کے ساتھ ہی بدصورتی نے جنم لیا تھا۔ فلسفی جب خوبصورتی کو دیکھتا ہے تو بدصورتی کو نہیں بھولتا۔ لیکن شاعر جب اس بدصورتی کو دیکھتا ہے تو خوبصورتی کو ملحوظ رکھتا ہے۔ کبھی بھی خوبصورتی کو ماضی کے تاریک غاروں سے نکال کر اپنے ماحول کی بدصورتی پر طاری کر دیتا ہے۔ یہیں شاید وہ فلسفی سے فائدے میں رہتا ہے۔

**زکیہ:** (لمبا سانس بھرتے ہوئے) شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ شاید یہ شاعری کا جذبہ ہے۔ جس نے اب تک مجھے زندہ رکھا۔ شاید میں بیتے دنوں کی خوشیوں میں اپنے موجودہ غم کو، ماضی کی خوبصورتی میں حال کی بدصورتی کو بھولے رہتی ہوں۔

**ریاض:** (مسرت سے) بخدا تم اب بھی شاعر ہو زکی۔ اگرچہ تم نے پچھلے آٹھ برس میں ایک بھی شعر نہیں کہا۔

**زکیہ:** تمہارے ساتھ رہ کر شاید میں پھر شاعر بن جاؤں۔ تم یہاں رہو تو شاید میں اپنی پرانی خوشی پھر واپس پا جاؤں۔

**ریاض:** (اُٹھ کر پھر کمرے میں چکر لگاتے ہوئے) میں رہوں گا مجھے برف باری سے کوئی دلچسپی نہیں۔

ذکیہ : برف باری؟

ریاض : ہم لوگ برف باری دیکھنے آتے تھے - لیکن جونہی پہنچ کر میں یہاں چلا آیا -

ذکیہ : (اٹھ کر اس کی آنکھوں میں مسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) تم کبھی آؤ گے شاید - میں اسی امید پہ زندہ تھی ——

(لمحہ بھر کے لیے دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہیں - ریاض کی آنکھوں میں ایک ثانیے کے لیے ایک چمک سی کوند جاتی ہے - معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ایک ہی بار ذکیہ کو اپنی آغوش میں بھر لے گا - لیکن پھر وہ بے پناہ ضبط سے (جس کے نشانات اس کے چہرے پر نمایاں ہو جاتے ہیں) اپنے پر قابو پا لیتا ہے اور اس کی آنکھوں کی وہ چمک جیسے پیدا ہوئی تھی - اسی طرح ختم ہو جاتی ہے - اس کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے - ذکیہ فوراً موضوع بدل دیتی ہے)

تمہیں اپنا کمرہ پسند آیا -

ریاض : (خوش ہے کہ ذکیہ نے موضوع بدل دیا - بڑے جوش و خروش سے) کمرہ —— پسند ——

(ہنستا ہے اور کمرے میں گھومتا ہے)

مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے اسی کمرے کی ضرورت تھی - میں یہیں بیٹھا بیٹھا سورج کے طلوع و غروب کا نظارہ کر سکتا ہوں - ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر کرنوں کی گلکاری کا لطف اٹھا سکتا ہوں - نیچے دریا کو کسی نہ ختم ہونے والی تلاش میں سرگرداں دیکھ سکتا ہوں - بیٹھا بیٹھا تھک جاؤں تو لیٹ سکتا ہوں - لیٹا لیٹا اکتا جاؤں تو گھوم سکتا ہوں -

ذکیہ : میں ڈرتی تھی، کہیں وہاں تمہیں رات کو سردی محسوس نہ ہو - بارش آئے تو بڑی ٹھنڈک ہو جاتی ہے بارہ دری میں -

ریاض : میں بارش کو پسند کرتا ہوں - باہر رم جھم، رم جھم بارش ہو رہی ہو - اور میں کمرے میں خاموش بیٹھا اس کا سنگیت سنوں - یا پھر باہر ہوائیں چل رہی ہوں - میرے کمرے کی دیواروں سے ٹکرا رہی ہوں اور میں بیٹھے

کمرے میں آرام سے بیٹھا۔ کھڑکیاں اور دروازے بند کرکے شعر کہوں۔ اونگھوں یا خواب دیکھوں اس سے
زیادہ مجھے کوئی چیز مرغوب نہیں۔

ذکیہ: مجھے سردی کا ڈر تھا۔ اس لیے میں نے نیچے کا کمرہ بھی ٹھیک کرا لیا تھا۔

ریاض: نہیں — نہیں — نہیں — یہ کمرہ پسند نہیں مجھے بارہ دری پسند آگئی۔

ذکیہ: میں دو چولہے رکھوا دوں گی۔ شاید تمہیں سردی محسوس ہو۔

ریاض: تم فکر نہ کرو۔ میری بے فکری میں ابھی تک کسی طرح کی کمی نہیں آئی۔

(باغیچے میں بیگاں کی آواز آتی ہے)

بیگاں: مجید کی ماں —— مجید کی ماں!

ذکیہ: (صوفے پر بیٹھے ہوئے) آؤ بیگاں۔ آجاؤ۔

(بیگاں کمرے میں داخل ہوتی ہے)

بیگاں: (ریاض کو سلام کرتے ہوئے) سلام دادی بیگاں — سلام حضور (پھر ذکیہ سے) ہاں بچے جئیں۔ سائیں جیتے دودھوں
نہاؤ۔ پوتوں پھلو

ذکیہ: کہو کیسے آئیں۔

بیگاں: سلطان نے بھیجا ہے کہ گلدستے مانگنے۔ میں نے کہا —— خود ہی لے جاؤں۔

ذکیہ: تمہارے بھائی جان آئے ہیں بیگاں۔ یہیں رہیں گے۔ ہر صبح نو ایک گلدستہ سلطان سے بنوایا کرو۔

بیگاں: سو بار حضور۔ بیسیوں گلدستے۔

ذکیہ: ہم آج تمہارا باغ دیکھنے آئیں گے

بیگاں: دھن بھاگ ہمارے جو آپ آئیں۔

ذکیہ: سرسوں کا ساگ اور مکئی کا ڈھوڈا کھلاؤ تو آئیں۔

بیگاں: ڈھوڈوں کی کیا کمی ہے سرکار

ذکیہ : اب تو نہیں۔ لیکن ہو ایک دن دیکھ کر بھیج دوں گی۔

میگاں : (اٹھتے ہوئے) اچھے جیئیں سرکار۔ آپ ہی کا آسرا ہے ——— سلام!

(چلی جاتی ہے)

ریاض : یہ ڈھوڈا کیا بلا ہے۔

ذکیہ : مکئی کی روٹی کو ادھر ڈھوڈا کہتے ہیں۔

ریاض : (قہقہہ لگا کر) لاحول ولاقوت ——— کیا نام رکھا ہے مکئی کی روٹی کا۔

(ببی بھاگی آتی ہے)

ببی : امی!

(نستو اس کے پیچھے بھاگی آتی ہے)

نستو : امی!

(اس کے دامن سے لپٹتی ہے)

ذکیہ : (ان کے میلے ہاتھوں سے دامن بچاتے ہوئے) ارے ——— رے ——— رے کمبختو۔

ببی : (نستو کے ساتھ امی کو گھیرتے ہوئے) پیسے دو ریوڑیاں لیں گے۔

ذکیہ : (اچانک غصہ اس ہاتھ سے دے کر) سارا دن تمہیں چرنے کے سوا (پھر سنبھل کر) اچھا اچھا لو۔ پیسے اور یہ سراپنڈا چھوڑو۔

(دونوں چلنے کو ہوتے ہیں)

اور بیٹے ابّی سے کہو نستو آ جائیں۔ ذرا گھما لائیں تمہارے ماموں کو بیگاں کے باغ تک۔

مجید : (جاتے ہوئے) دفتر میں آدمی بیٹھے ہیں۔

نستو : (جاتے ہوئے) میں نے پوچھا تھا وہ نہ آئیں گے۔

(بالکونی میں غائب ہو جاتے ہیں)

ذکیہ : چلو ریاض۔ بیگماں کے باغ تک گھوم آئیں۔ تمہیں ذرا یہاں کے گاؤں دکھا لاؤں۔

ریاض : چلو۔

ذکیہ : ٹھہرو میں ذرا برقع اوڑھ لوں۔

ریاض : برقع ؟

ذکیہ : یہ کوئی لندن شہر تو ہے نہیں۔ قصبہ ہے پرانے زمانے کا۔

(الماری سے نکال کر برقع پہنتی ہے۔ ریاض حیران کھڑا
دیکھتا ہے ——— پردہ گرتا ہے)

○

# چوتھا منظر

## شام کے وقت اسی کمرے میں

سورج شاید ابھی ابھی غروب ہوا ہے۔ اگرچہ اندر کمرے میں خاصا اندھیرا چھا رہا ہے۔ لیکن دائیں طرف کی کھڑکی میں ابھی تک جاتی ہوئی روشنی جھلک رہی ہے۔

کمرے میں سب کچھ قریب قریب وہی ہے جو تیسرے منظر میں صرف آنگن کے دروازے کے برابر دیوار کی کھونٹی میں ایک لالٹین لٹک رہی ہے جس کا شیشہ سیاہ ہو رہا ہے۔

پردہ اٹھنے کے کچھ لمحے بعد ذکیہ اور ریاض داخل ہوتے ہیں۔ ذکیہ برقعے کو اتارتی ہوئی آتی ہے)

ذکیہ: باہر قعے کو چارپائی پر پھینکتے اور خود اس پر دھنستے ہوئے) کتنا لطف آیا اس سیر میں۔ (سکھ کا سا سانس لیتی ہے)

ریاض: (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) نہ جانے کتنے عرصے کے بعد یہ حسین شام میسر ہوئی ہے۔

ذکیہ: یہی میں کہنے والی تھی۔

ریاض: میں کہتا ہوں ذکیہ یہ دیہاتی کتنے سادہ لوح۔ کتنے مہمان نواز ہیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی قدیم اور پرانی بستی میں پہنچ گیا ہوں (کرسی پر پیچھے کو لیٹ جاتا ہے) جہاں انسان نے شیطان ہونا نہیں سیکھا اور جہاں زندگی کی پاکیزہ ندی بھی کیچڑ کی آلائشوں سے پاک اپنے کناروں کے اندر آہستہ آہستہ بہتی ہے۔

ذکیہ: اردگرد ایسے بیسیوں گاؤں ہیں۔ میں شروع شروع میں جایا کرتی تھی۔ لیکن اب تو جیسے خواہش نہیں ہوتی۔ ایک عجیب طرح کی بےحسی چھائی رہتی ہے۔

ریاض: (مڑ کر اپنے ہمراز اور اس خوبصورت فضا سے پیدا ہونے والے رومانی جذبے کے زیر اثر) تمہارے
اردگرد کتنی خوبصورتی ہے۔

(کھڑکی میں جا کھڑا ہوتا ہے)

ذکیہ: لیکن قفس ہے اندر وہی کھیا کا دانہ پانی۔

ریاض: (مڑ کر) پھر وہی مایوسی! ذکیہ تم فلسفی بن گئی ہو۔ خوبصورتی کو قبول کر لی ہو۔ میں یہیں رہوں گا تمہیں
پھر سے اس خوبصورتی۔ اس لافانی حسن سے محظوظ ہونا سکھاؤں گا۔ کتنا حسن ہے تمہارے اردگرد۔
——— الطہر۔ پاکیزہ غیر فانی حسن ——— ابھی کچھ لمحے پہلے میں نے جو منظر دیکھا۔ وہ
مدتوں میرے دماغ سے محو نہیں ہو سکتا۔

ذکیہ: (چارپائی پر لیٹتے ہوئے) کون سا منظر!

ریاض: شام کے سایوں اور دھندلکوں کے غلاف میں لپٹی ہوئی نیلاہٹ آہستہ آہستہ ویشنو دیوی کے پہاڑ
پر نیچے سے اوپر کو اٹھ رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے سارے کے سارے پہاڑ پر نیلی نیلی دھند کا غلاف
چڑھ گیا۔ صرف چوٹی پر نیلی سی روشنی رہ گئی شاید وہ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری مسکراہٹ تھی۔

ذکیہ: اگر تم صبح دریا پر جاؤ تو ویشنو دیوی کی ان نیلاہٹوں کو نیچے اترتے دیکھو گے اور پہاڑ کی چوٹی پر
تمہیں طلوع ہوتے ہوئے سورج کی پہلی مسکراہٹ دکھائی دے گی۔ لیکن میں ان کی عادی ہو گئی ہوں۔
میرے لیے ان میں کوئی نیا پن نہیں۔

ریاض: کوئی نیا پن نہیں یہ تم کہتی ہو۔ اور پھر فلسفی کے نام سے تمہیں چڑ ہوتی ہے ——— میں
گر اس منظر کو اسی صورت میں قیامت تک دیکھتا رہوں تو نت نئے دن مجھے ایسا ہی نیا لطف حاصل
ہو۔ اس وقت جب میں اس نالے کے سفید و سیاہ پتھروں پر کھڑا تھا اور دھندلی نیلاہٹوں نے
نزدیک کے پہاڑوں کو اپنے دامن میں لے لیا اور دور برفانی پہاڑوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی کیسریا
چمک اقلیدس کی عجیب و غریب شکلیں بناتی ہوئی چاروں طرف سے بڑھے آنے والے۔ ان
وسیع و بے کنار دھندلکوں میں گم ہو گئی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے میں اس مادی دنیا سے

اُوپر ——— بہت اوپر ——— اُٹھ گیا ہوں۔ میرے دل کی ساری غلاظت دھل گئی ہے
تکلیف دکھ۔ اذیت غم، اب مجھے نہ چھو پائیں گے اور اس وقت میں سچ کہتا ہوں ذکیہ، اس وقت مجھے اس
عظیم۔ لامحدود۔ لاشریک ہستی کے قرب کا احساس ہوا تھا۔ اس وسعت و رفعت کا ایک کرامیں بیان
میں نہیں جانا جا سکتا۔ یہ کہیں پر اِل ہو سکتی ہے۔

ذکیہ : (ہنس کر اٹھتے ہوئے) شاید نئے اور پرانے کی تمیز ہی مجھے نہیں رہی۔ کتنا اندھیرا ہو رہا ہے یہاں۔
ان کمبختوں نے ابھی تک دیا نہیں جلایا (بالکونی پر جاکر) رحیمن ——— رحیمن ——— (پھر
جیسے اپنے آپ) وہ ابھی نہ جانے کیوں ابھی تک نہیں آئے۔ سیر کو نہ چلے گئے ہوں۔ تمہاری اس
شاعری میں۔ میں تو لیمپ جلانا ہی بھول گئی۔

(ہنستی ہوئی کھونٹی سے لیمپ اتار کر طاق سے دیا سلائی اٹھا
کر اسے روشن کرتی ہے)

چمنی تک نہیں صاف کی کمبختوں نے۔ اور بتی معلوم ہوتا ہے۔ جیسے برسوں سے نہیں کٹی (پھر بالکونی پر جاکر
اور کھڑے ہو کے رحیمن کو آواز دیتی ہے) رحیمن! ——— رحیمن!

رحیمن : (بھاگی آتی ہے) جی ——— بڑی بیگم!

ذکیہ : یہ لیمپ صاف نہیں کیا۔

رحیمن : سلطان سے پوچھ لو بیگم۔ میں نے تو بڑی اچھی طرح صاف کر کے جلایا تھا۔ شاید بجھ گیا۔

ذکیہ : بتی نہیں کاٹی۔

رحیمن : میں نے کوشش کی تھی۔ لیکن یہ مجھ سے ٹھیک نہیں ہوتی۔

ذکیہ : وہ قینچی اٹھا لا۔

(رحیمن طاق سے قینچی اٹھا لاتی ہے)

(قینچی لیتے ہوئے)

نسرین کے ابا کہاں ہیں؟

**رحیمن** : جی وہ آئے تھے لیکن آپ تو گئے ہوئے تھے۔ اس لیے شاید وہ بھی سیر کو نکل گئے۔

**ذکیہ** : (چمنی کو صاف کرتے اور بتی کاٹتے ہوئے) تم تو بجلی کی چکا چوند کے عادی ہو۔ یہاں تو لالٹینوں کی روشنی ہے جو ہر تاریکی کو اور بھی گہرا کر دیتی ہے۔

**ریاض** : دل کی تاریکی تو بجلی کے قمقمے بھی نہیں دور کر سکتے۔ لیکن یہ تاریکی سے مانوس ہوں ذکیہ۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوا کرتا ہے۔ جیسے میں اس تاریکی کے پہلو کو کبھی نہ چھیڑ سکوں گا۔ لیکن پھر کتنی ہی یادیں اپنی ملائم شعاعیں لیے ہوئے آ جاتی ہیں۔ یہ تاریکی آئینے کی طرح چمک اٹھتی ہے اور میں اس میں اپنے سپنے دیکھنے لگتا ہوں۔

**ذکیہ** : (لیمپ کو ٹھوڑی سے لگاتے ہوئے) تم اب بھی سپنے دیکھتے ہو۔

**ریاض** : جس دن سپنے نہ دیکھوں گا مر جاؤں گا۔

**ذکیہ** : توبہ توبہ کیسی باتیں کرتے ہو۔

(اس کے منہ پر ہاتھ رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن ہاتھ تیل والے ہیں۔ اس لیے رحیمن کو آواز دیتی ہے)

رحیمن ذرا پانی اور صابن لانا۔

**ریاض** : ابھی کل رات مجھے ایسا محسوس ہوا تھا ذکیہ جیسے یہ تاریکی اپنی پوری جمعیت کے ساتھ محصور کرنے آئی ہے۔ جیسے یہ میرے سارے سپنوں کا گلا گھونٹ دے گی۔ لیکن میں بھاگ کر یہاں تمھارے پاس آ گیا اور اس وقت میں محسوس کر رہا ہوں۔ جیسے اس لالٹین کی روشنی میں میرے دل کا تاریک سے تاریک گوشہ بھی منور ہو اٹھا ہے۔

(رحیمن پانی لاتی ہے اور ذکیہ صابن سے ہاتھ دھوتی ہے)

تم اس روشنی کو حقیر خیال کرتی تھیں۔ ذکیہ تم نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا۔

(رحیمن چلی جاتی ہے)

**ذکیہ** : (تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے) پہچانا! میں خود کئی بار ایک اتھاہ تاریکی میں بھٹکتی رہتی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے یہ تاریکی مجھے میرے سارے ارمانوں۔ آرزوؤں۔ سپنوں۔ یادوں کو نگل جائے گی۔

اور میں اس نعش کی طرح پڑی رہ جاؤں گی جس کا تمام خون کسی آسودہ نہ ہونے والی جونک نے چوس لیا ہو۔ (لمبا سانس بھرتی ہے) لیکن تم نے سوچا کہ آدمی تاریکی سے ہی نور ہو جاتا ہے اور جہاں پہلے تاریکی اس کا خون چوستی ہے۔ وہ تاریکی ہی سے خون حاصل کرتا ہے۔

**ریاض** : (اچانک اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر) خدا قسم زکی تم شاعر ہو۔ تم زبردست شاعر ہو۔ نہ جانے کون سے خیالات دل کے نہاں خانے میں مدفون۔ اظہار کا انتظار کر رہے ہیں۔

**زکیہ** : (مسرت سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے) میں خود محسوس کرتی ہوں جیسے میں ایک نغمہ گا رہی ہوں۔ جذبات کا ایک طوفان سا میرے دل میں مچل رہا ہے نہ جانے یہ تمہاری ہی آمد کا منتظر تھا۔ تم رہو تو شاید یہ طوفان لفظوں اور سطروں کی شکل اختیار کرے۔

**ریاض** : میں ضرور رہوں گا زکیہ۔

**زکیہ** : لیکن نجمہ۔

**ریاض** : نجمہ - - وہ مجھے فضول ہی اڑائے پھرتی ہے اور کبھی کبھی میں اپنے آپ کو اس کے پیچھے پیچھے خالی بادل کی طرح محسوس کرتا ہوں۔ جو فضائے آسمانی میں ہوا کے جھونکوں سے بے سود بے مطلب کبھی ادھر اڑتا ہے کبھی ادھر۔ لیکن اب میں زیادہ نہیں اڑوں گا۔ ایک بھری بھری گھٹا کی طرح ٹک کر بیٹھ جاؤں گا۔ نجمہ اب مجھے اور نہیں اڑا سکتی۔ میں اس سے دامن چھڑا کر بھاگ آیا ہوں۔ میری طرح آزادی چاہتی ہے۔ بالیدگی چاہتی ہے پرواز چاہتی ہے۔

(باہر آنگن میں کوئی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے)

**زکیہ** : کون؟

(پھر دستک کی آواز آتی ہے)

(اکھوں پر جاکر) رحیمن۔ دیکھو کون ہے۔

**رحیمن** : (جو ادھر ہی آ رہی ہے۔ باہر دروازے سے) ایک لڑکی ہے بیگم۔ جموں سے آئی ہے ریاض میاں کو پوچھ رہی ہے۔

ریاض: (گھبرا کر) نجمہ نہ ہو!

ذکیہ: گھبرا کیوں گئے۔ میں جا کر انھیں لے آتی ہوں۔

(بالکونی کے بائیں دروازے سے نجمہ آتی ہے)

ریاض: لانے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ہی آ رہی ہے۔

ذکیہ: آجائیے۔ آجائیے۔

(نجمہ اندر آتی ہے ——— پڑھی لکھی فیشن ایبل لڑکی

جس کے حسن کا شعلہ میک اپ کا مرہونِ منت ہے)

(نجمہ کے لیے کرسی پیش کرتے ہوئے)

نجمہ: (انہیں بیٹھتی اور ریاض کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکراتی ہے) آداب عرض!

ریاض: (کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ) تم دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرانے کی ضرورت تو نہیں۔

نجمہ: جی نہیں! (ذکیہ سے) میں نجمہ ہوں اور آپ کو میں جانتی ہوں۔

ذکیہ: بڑی مہربانی کی آپ نے (کچھ گھبرا کر) نہ جانے وہ آج کہاں چلے گئے ہیں (نجمہ سے) آپ ادھر تشریف رکھیے۔ دقت تو نہیں ہوئی آپ کو سفر میں۔

نجمہ: (ریاض کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے) نہیں آپ کی دعا سے پہنچ ہی گئے ہیں۔

ذکیہ: کیجیے چائے پئیں گی یا دودھ۔

نجمہ: آپ تکلیف نہ کیجیے۔

ذکیہ: (مسکراتے ہوئے) اس میں تکلیف کی کون سی بات ہے۔ میں ابھی لائی۔ آپ ذرا تشریف رکھیے۔

نجمہ: آپ تردد نہ کیجیے (ملائمت سے) دودھ میں پیتی نہیں اور چائے کا وقت نہیں۔ اور پھر مجھے ابھی جانا ہے۔

ذکیہ: (چلتے چلتے رک کر) بھلا یہ کوئی وقت ہے جانے کا۔ اب تو کوئی گاڑی بھی نہ جائے گی۔

نجمہ: ہم کار پر آئے ہیں۔

ذکیہ : تو بیٹھی چپکے تو پیتے جائیے۔ ہمارے تو کھانا کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔

نجمہ : کھانا تو ہم ذرا دیر سے کھاتے ہیں۔

ذکیہ : میں جانتی ہوں۔ اسی لیے صرف چائے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ بیٹھیے میں ابھی آتی ہوں۔ جمن ۔۔ رحیمن !

(چلی جاتی ہے)

نجمہ : ریاض !

ریاض : (چپ رہتا ہے)

نجمہ : بڑے ظالم ہو۔ یہاں بھاگ کر آ بیٹھے ہو۔ اور تمھیں اس بات کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں کہ تمھاری وجہ سے اتنے آدمیوں کو پریشانی اٹھانا پڑے گی۔ تمھارا لاابالی پن کبھی نہ جائے گا۔ تم کبھی ذمہ داری نہ سیکھو گے۔

ریاض : (چپ رہتا ہے)

نجمہ : اگر تمھیں یہیں آکر بیٹھنا تھا تو وہاں سے چلے کیوں تھے۔ (جواب کے لیے رکتی ہے۔ ریاض جواب نہیں دیتا) اب اٹھو صبح ہمیں سری نگر کے لیے چل دینا ہے۔ رات پہلی بار برف پڑی ہے۔ یہی وقت برف باری دیکھنے کا ہے۔

ریاض : مجھے کہیں نہیں جانا نجمہ۔ میں یہیں دور سے برف گرتے دیکھوں گا۔

نجمہ : پاگل ہو۔ یہاں سے تم (کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) کیسے برف گرتے دیکھ سکتے ہو؟

ریاض : میں سامنے کے پہاڑوں پر برف کی تہوں کو گہرا ہوتے ہوئے دیکھوں گا

نجمہ : (ہنستی ہے) تم بالکل بچے ہو۔ اب اٹھو۔ پریشان نہ کرو۔ میں رات بھر سو نہیں سکی۔

ریاض : میں ہی کب سو سکا ہوں۔

نجمہ : تم تو یہاں آکر ذکیہ کی گود ——————

ریاض : (اٹھ کر) نجمہ !

نجمہ : ذکیہ بی بہن کی گود میں آ بیٹھے ہو اور ہم تمھارے انتظار میں ——————

ریاض : نجمہ جاؤ! اب مجھے کچھ لمحوں کے لیے آرام کا سانس لینے دو! تم نے مجھے بہتیرا ستالیا۔

(پھر ضدی بچوں کی طرح بیٹھ جاتی ہے)

نجمہ : (گھبرائی ہوئی سی ہے) ریاض!

ریاض : (چپ رہتا ہے)

نجمہ : تم مجھے ستا رہے ہو یا میں ؟

ریاض : جاؤ! تم دیکھ آؤ آسمان سے برف گرتے۔ میں نے اولے گرتے دیکھے ہیں۔

نجمہ : ان باتوں سے حاصل! چلو یہاں سے۔ تمہیں تو آنا چاہیئے تھا۔ تمہیں برابر اس دن کی یاد ستائے گی جب تم نے پہلی بار اولے گرتے دیکھے۔ تم رہ گئے تو اس گھر کی پرسکون فضا میں بھی ژالہ باری ہونے لگے گی ——— چلو میرے ساتھ۔ برف کے نرم و نازک روئی کے گالوں کو گرتے ہوئے دیکھو۔

ریاض : میں جاؤں گا تو تمہارا لطف بھی کرکرا کر دوں گا۔ مجھ سے تمہاری باتیں نہ سہی جائیں گی۔ ہم پھر لڑنے لگیں گے۔

نجمہ : تم مذاق مذاق میں روٹھ جاتے ہو۔

ریاض : مذاق مذاق میں فرق ہوتا ہے۔ میں ذکیہ کی اتنی عزت کرتا ہوں

نجمہ : تو تم نے سبطے اور سراج کے متعلق اتنی کچی چھوٹی باتیں کہہ کر بدلہ تو لے لیا۔ تم نے ... وہ باتیں کہیں کہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اسے زندگی بھر معاف نہ کرتی (لمبا سانس بھرتی ہوئی ہنستی ہے) لیکن نہ جانے کیوں ریاض تمہاری گالیوں کا بھی مجھ پہ الٹا اثر ہوتا ہے۔

ریاض : میں نے تمہیں گالیاں دیں۔

نجمہ : گالیاں اور کیسی ہوتی ہیں۔

ریاض : اور تم نے جو مجھ سے کہا کہ ذکیہ ———

نجمہ : اب ہٹاؤ۔ اس طرح بحث کو نئے سرے سے شروع نہ کرو۔ تم جیتے میں ہاری۔ میں تم سے ہمیشہ ہار جاتی ہوں۔

ریاض : اس میں ہار جیت کا سوال نہیں۔

نجمہ : میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں۔ میں خود ذکیہ بہن کی عزت کرتی ہوں ——— میں نے صرف یہی کہا تھا کہ ان سب باتوں کے بعد جو تمہی نے مجھے سنائیں۔ تمہیں الکشورنہ آنا چاہیے تھا۔

ریاض : میں مجھوں تک آ کے اسے ملے بغیر چلا جاتا۔

نجمہ : خیر واپسی پر خواہ تم برس بھر کے لیے یہاں بیٹھے رہنا لیکن اب سامنے کا سارا پروگرام خاک میں نہ ملاؤ۔ دیکھو مجھے مایوس نہ کرو۔ ذکیہ آرہی ہے۔ کہو تو میں اس سے بھی معافی مانگ لوں (قدرے زور سے) ذکیہ بہن!

(ذکیہ آتی ہے)

ریاض : (سرگوشی میں) نجمہ ——— ؟

ذکیہ : کیسے آپ نے مجھے آواز دی۔

(ذکیہ کے پیچھے پیچھے ہی احسان اور ان کے پیچھے سرور، عقیل، نعیم وغیرہ الکوئی پہ آتے ہیں)

احسان : تم ذرا پردے میں ہو جاؤ (ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے) آجایئے صاحب آجایئے۔

(نسو اور مجی باہر سے بھاگتے آتے ہیں۔ اور امی۔ امی کہتے ہوئے ذکیہ کا دامن پکڑ لیتے ہیں)

ذکیہ : (دانت پیستے ہوئے سرگوشی میں) کہاں سے آئے ہو خاک چھانتے۔ کپڑے تو دیکھو کیسے میلے ہو رہے ہیں۔ ہٹو۔ دیکھو کون آئے ہیں۔

مجی : ہم ابا کے ساتھ سیر کرنے گئے تھے۔

(ذکیہ دامن چھڑا کر برابر کے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ سرور، نعیم، عقیل وغیرہ اندر آتے ہیں)

نعیم : (اندر داخل ہوتے ہی) ارے تم یہاں آ کر بیٹھ گئے اور ہم صبح سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ عجیب بے چند ہو تم!

سرور : صبح صبح بھی سری نگر کے لیے چل دینا ہے اور تم یہاں ایسے بیٹھے ہو گویا اب یہیں کٹیا بنا کے رہو گے۔

**عقیل**: ہم نوکروں کو تو پھر کالج بھی جانا ہے۔ تم تو آزاد ہو۔ تمہارا کیا ہے۔ پھر آگئے یہاں دھونی رما لینا۔

**ریاض**: مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں اب یہیں رہوں گا۔

**نجمہ**: سمجھائیے ذرا انہیں عقیل صاحب۔

**نعیم**: (عقیل کو پیچھے ہٹاتے ہوئے) ارے ہٹاؤ۔ عقیل انہیں کیا سمجھائیں گے۔ ان حضرت کے کپڑے کہاں ہیں؟ کیوں بٹیا۔ تمہارے ماموں جان کے کپڑے کہاں ہیں؟

**نسو**: (جواب نہیں دیتی)

**ریاض**: نعیم تنگ نہ کرو۔

**مسرور**: گویا ہم تنگ کر رہے ہیں۔

**نعیم**: (نسو کو گود میں اٹھا کر) کیوں ننھی کیا نام ہے تمہارا؟

**مجی**: (آگے بڑھ کر) اس کا نام ہے نسو اور میرا مجی۔

**نعیم**: (نسو کو اتار کر اور مجی کو اٹھاتے ہوئے) کیوں مجی میاں تمہارے ماموں جان کہاں ٹھہرے ہیں؟

**مجی**: اوپر بارہ دری میں۔

**نعیم**: چلو ہمیں ذرا دکھاؤ تو بارہ دری۔ تمہیں مٹھائی لے دیں گے۔

**نسو**: (مٹھائی کے نام پہ آگے بڑھ کر) میں چلوں گی۔

**مجی**: (اکڑ کر بہانہ بنا کر) نہیں میں چلوں گا۔

**نعیم**: (بالکونی کی طرف بڑھتے ہوئے) آؤ ——— آؤ ——— تم دونوں آؤ (جاتے ہوئے) کہرے، تم ذرا ذکیہ بہن سے معافی مانگ آؤ۔

(دونوں کو ساتھ لے کر چلا جاتا ہے۔ نجمہ برابر کے کمرے میں چلی جاتی ہے)

**مسرور**: لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ برف باری کی خوبصورتی اور تازگی کا نقشہ کھینچ کھینچ کر اتنی دور سے یہیں گھسیٹ لائے حضرت اور خود یہاں آ بیٹھے ہیں۔ بھلا کس کے پاؤں میں کھجلی ہوئی تھی جو اس سردی میں

اس سفر کو نکلتا۔

احسان : لیکن صاحب۔ میں کہتا ہوں۔ آپ اس وقت کہاں جائیں گے ؟ میرا خیال ہے۔ آج رات آپ یہیں قیام کریں۔

سرور : آپ کا بہت بہت شکریہ بھائی جان۔ لیکن ہمیں صبح چل دینا ہے۔ دو ایک دن سری نگر ٹھہر کر پھر واپس علیگڑھ پہنچنا ہے۔ ان دو ایک دنوں میں گلمرگ بھی دیکھنا ہے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔

ریاض : ( کرسی سے چپکتے ہوئے ) تو بھئی آپ لوگ جائیں۔ میں اگر نہ جاؤں گا تو کیا برف گرنا چھوڑ دے گی۔ میں ذرا سکون چاہتا ہوں۔ اور یہ جگہ مجھے پسند ہے۔

سرور : تمہیں کچھ بھی پسند نہیں۔ اور سب کچھ پسند ہے۔ دو دن میں اس سکون سے بھی اکتا جاؤ گے۔ اور ان ٹیلوں کی یاد ستانے لگے گی۔

احسان : میں کہتا تھا۔ آپ ریاض میاں کو تو ——————

عقیل : آتے آتے چھوڑ جائیں گے۔

احسان : لیکن صاحب اس وقت تو اندھیرا ہو گیا ہے۔ اور میں نے سنا ہے کہ نہر کی پٹڑی ٹھیک نہیں۔

عقیل : ہم آرام سے چلے جائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔

( نعیم ریاض کا سوٹ اور ٹائی اٹھائے ہوئے آتا ہے )

نعیم : لو بھئی سوٹ تو اٹھا لایا ہوں۔ اب اٹھا لاؤ ان حضرت کو دیر ہو رہی ہے۔ وہ سب لوگ انتظار کر رہے ہوں گے۔

( سرور ریاض کو ہاتھ پکڑ کر اٹھاتا ہے )

ریاض : ( کرسی سے چپکتے ہوئے ) میں کہتا ہوں ——————۔

عقیل : ( ریاض کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر )—— پیچھے سے دھکیلتے ہوئے ) تمہیں جو کہنا ہے راستے میں کہنا۔

ریاض : ( پھر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے ) ارے بھئی ——————

سرور : ( گھسیٹتے ہوئے ) وہاں چل کر۔

**ریاض** : مجھے ذکیہ سے تو رخصت ہو لینے دو۔

**نعیم** : (زور سے) آپا انھیں معاف کر دیجئے۔ ہم انہیں زبردستی لیے جا رہے ہیں۔ لیکن اس میں ہمارا قصور نہیں بھی حضرت ہمیں وہاں سے گھسیٹ کر لائے تھے۔

(ریاض کو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ ممی اور نسو ہنستے ہوئے
ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ احسان صاحب بھی مجبوراً ساتھ
ساتھ چلتے ہیں۔ نجمہ اندر کے کمرے سے آتی ہے۔)

**نجمہ** : چلو میں ذکیہ بہن سے معافی مانگ آئی ہوں۔

**نعیم** : (سوٹ کندھوں پر رکھ کر چلتے ہوئے احسان سے) یہ بدتمیزی معاف کیجئے گا بھائی جان۔ لیکن دوسرا چارہ نہ تھا۔ ارے ——— ارے ——————— آپ ٹھہریئے۔ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔

**احسان** : (لیمپ لے کر ساتھ چلتے ہوئے) نہیں نہیں تکلیف کیسی نیچے تک تو چھوڑ آؤں سیڑھیوں کے ذرا اندھیرا ہے۔

**ریاض** : (پورے زور سے بالکونی کے بائیں دروازے میں رک کر) ارے بھئی مجھے کپڑے تو بدل لینے دو۔

**سرور** : کپڑے تو جموں جا کر بدلنا۔ کل ہم یہاں بھجوا دیں گے۔

**ریاض** : (انتہائی مجبوری سے جاتے جاتے) ذکیہ بیگم! میں پھر آؤں گا۔ یہ لوگ بڑے ظالم ہیں۔ میری کوئی پیش نہیں چلنے دیتے۔

(سب چلے جاتے ہیں۔ کمرے میں شام کی بہت ہلکی سی
روشنی ہے۔ کچھ لمحے بعد اندر کے کمرے سے ذکیہ نکلتی ہے
جا کر کچھ دیر کھڑکی میں حسرت بھری نظر سے دیکھتی رہتی ہے
پھر آکر گرتی ہوئی دیوار کی طرح چارپائی پر لیٹ جاتی ہے۔
کچھ لمحے بعد ممی اور نسو خوش خوش داخل ہوتے ہیں)

مجّی : (نسیمہ کو دکھاکر) دیکھو جی ہمارے پاس کیا ہے؟ —— اٹھنی —— ہمیں
ماموں جان نے دی ہے۔

نسّو : (مجّی کو دکھاکر) ہمارے پاس روپیہ ہے۔ ہمیں بھی ماموں جان نے دیا ہے۔

مجّی : (اٹھنی کو ایک ہاتھ سے پیٹھ پیچھے کرتا ہوا) روپیہ؟ دکھاؤ تو!

نسّو : نہیں دکھاتے۔

مجّی : ذرا دور سے دکھا دو۔

نسیمہ : (ذرا دور سے) یہ دیکھو۔

(نسّو روپیہ دکھاتی ہے۔ اور مجّی جھپٹ کر اس سے
چھین لیتا ہے)

مجّی : (ہاتھ کو گھماکر جھوٹ موٹ روپیہ خلا میں پھینکتے ہوئے) وہ گیا پھر رر رر ——

نسیمہ : (رونے لگتی ہے) میرا روپیہ۔ ہائے میرا روپیہ۔ (وہیں زمین پر بیٹھ کر ایڑیاں رگڑتی ہے)
ہائے میرا روپیہ —— امی —— (پھر اچانک اٹھ کر دھڑا دھڑ مجّی کو
پیٹتے ہوئے) میرا روپیہ —— دے میرا روپیہ —— دے ——
دے —— ——

مجّی : (جواب میں پیٹتا ہے) پھر پیٹے گی —— لے —— یہ لے ——
یہ لے ——

ذکیہ : (اٹھ کر کھینچتے ہوئے) نسّو۔ مجّی۔ کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو۔ (دونوں بچوں کے جڑ
دیتی ہے) سارا دن لڑتے رہتے ہو تم!

(بچوں کو پیٹتے پیٹتے رونے لگتی ہے اور پھر سسکتی
ہوئی اندر کمرے میں چلی جاتی ہے —— ہاتھ میں
لالٹین لیے جہاں صاحب داخل ہوتے ہیں)

احسان : (باہر ہی سے) نسو کی ماں — نسو کی ماں (اندر آکر) نسو کی ماں! (بچوں کو
روتے ہوئے دیکھ کر) کہاں ہیں تمھاری اماں!

مجی : (اپنے گھٹنوں سے چمٹ کر زور زور سے رونے لگتا ہے) اندر کمرے میں ہیں۔

(احسان صاحب اندر کمرے میں جاتے ہیں۔ چوکھٹ ہی
سے ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔)

احسان : ذکیہ — ارے بات کیا ہے — رو کیوں رہی ہو — ذکیہ
ذکیہ — —

(مجی کو اٹھا کر جلدی سے اندر جاتے ہیں)

پردہ ایک دم گرتا ہے

O

آگرہ بازار
حبیب تنویر

# نظموں کی فہرست

# بازار کے لوگ

- کورس کا پہلا آدمی
- کورس کا دوسرا آدمی
- ککڑی والا
- تربوز والا
- لڈو والا
- برتن والا
- پتنگ والا
- کتب فروش
- مداری
- شاعر نما آدمی
- اس کا ہمجولی
- تذکرہ نویس
- پتنگ کا گاہک
- گھوڑوں کا تاجر
- ریچھ والا
- بندر

- ریچھ
- جھنسی
- کتاب کا گاہک
- خبیث (ایک دیہاتی مفلس الحال لڑکا)
- ایک لڑکی
- برف والا
- درزی
- نیواڑی
- راہگیر
- بچے
- گانے والوں کی ٹولی
- راہگیر گانے والے اور بیسیوں میلے کے آدمی
- قوال
- پنساری
- زچہ گیری گانے والیاں
- میلے والے

○

## مقام

آگرہ کے کناری بازار کا ایک چوراہا

## زمانہ

۱۸۱۰ء کے لگ بھگ

## وقت

ایک رات

## کھیل کی مدت

تقریباً دو گھنٹے

○

# پہلا ایکٹ

## پہلا منظر

(دو آدمیوں کا کورس "شہر آشوب" گاتے ہوئے ہال کی پشت سے داخل ہوتا ہے اور ہال میں سے گزرتا ہوا اسٹیج پر جاتا ہے۔ یہ لوگ فقیروں کے لباس میں ہیں۔ کفنی پہنے ایک ہاتھ میں کشکول اور تسبیح اور دوسرے میں ایک ڈنڈا اور لوہے کے کڑے۔ حاضرین کی صفوں میں سے ہوتے ہوئے پردے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور حاضرین کو مخاطب کر کے نظم سناتے ہیں اور تال پر کڑے بجاتے جاتے ہیں)

### کورس

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے اختیار بند　　رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ہے موج دار بند　　ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند

جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانہ جات　　سب پر پڑی ہیں آن کے روزی کی مشکلات
کس کس کے دکھ کو روئیے اور کس کی کہیے بات　　روزی کے اب درخت کا ملتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آ کے ہوئی ایک بار بند

کیا چھوٹے کام والے وہ کیا پیشہ ور نجیب　　روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے جب آ شام عنقریب　　اٹھتے ہیں سب دکان سے کہہ کر کہ یا نصیب

قسمت ہماری ہو گئی بے اختیار بند

حجام پر بھی بالائیں ہے مفلسی کا زور　　پیسہ کہاں جو سان پہ ہو استروں کا شور
کانپے ہے سر پکڑتے ہوئے اُس کی پور پور　　کیا بات ایک بال کٹے یا تراشے کور

یاں تک ہے اُسترے نہرنی کی دھار بند

بے واسطے ہے اگرہ ایسا ہوا تباہ　　پھوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ
ہوتا ہے باغباں سے ہر اک باغ کا نباہ　　وہ باغ کس طرح نہ لٹے اور نہ اجڑے آہ

جس کا نہ باغباں ہو نہ مالک نہ خار بند

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے　　ملا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے　　شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے

اس واسطے یہ اس نے لکھے پانچ چار بند

نظم پڑھتے ہوئے ایک دائیں طرف سے اور دوسرا بائیں
طرف سے اسٹیج کے باہر چلا جاتا ہے اور ساتھ ہی پردہ بڑی
تیزی سے اٹھتا ہے۔ بازار پر عجیب رونق ہے۔ تل کے لڈو
والا، ککڑی والا اور دوسرے پھیری والے آواز لگاتے ہیں لیکن
کہیں شنوائی نہیں ہوتی۔ بچے للچائی ہوئی نظروں سے خوانچہ والوں
کو دیکھتے ہیں مگر دم نہیں مارتے۔ ان میں سے دو تین کھیل کود میں
لگے ہوئے ہیں اور گاتے جا رہے ہیں ؎

کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

پس منظر میں ایک نسوانی آواز طبلے اور سارنگی پر غزل گا
رہی ہے۔ غالباً پان کی دکان کے اوپر کوٹھے آباد ہیں۔ کچھ
بھکاری بھیک مانگتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور کچھ راہ گیر

بات چیت کرتے ہوئے ان ملی جلی آوازوں سے بازار میں ایک
دھیما دھیما شور برپا ہے۔ جو مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے ملتا
جلتا ہے۔ پتنگ والے کی دکان بند ہے۔ کتب فروش کے
ہاں دو گاہک کھڑے کتابیں دیکھ رہے ہیں جب ککڑی والا
یہاں آکر ککڑی بیچنے کی کوشش کرتا ہے۔ گاہک کتاب
کی دکان سے نکل کر پان والے کے ہاں پہنچ جاتے ہیں اور
کتب فروش اپنے حساب کتاب میں گم ہو جاتا ہے)

ککڑی والا: (بائیں طرف سے داخل ہو کر لڈو والے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے) پھر تو میری جگہ پہ آبیٹھا؟

لڈو والا: ابے جا جا!

(ککڑی والا وہاں سے ہٹ کر کتب فروش کی دکان پہ آتا ہے
اور اس کے گاہکوں کو ککڑی بیچنے کی کوشش کرتا ہے)

ککڑی والا: تازہ اور مزے دار ککڑی پیسے کی چھے چھے! ککڑی۔ ہری بھری ککڑی پیسے کی چھے چھے
کھا کر دیکھو بھائی صاحب! ریشم کی طرح ملائم۔ گنے کی جیسی میٹھی۔ خاص اسکندرے کی ہے۔ پیسے کی چھے چھے

(کوئی ککڑی نہیں خریدتا)

لڈو والا: تل کے لڈو دھیلے کے دو دو۔ تل کے لڈو دھیلے کے دو دو۔ چکھو کے دیکھو میاں! ایک بتاشے
مصری کے سمان میٹھے۔ لو کھاؤ۔

(بچہ منہ پھیر لیتا ہے)

تربوز والا: تربوز۔ ٹھنڈا تربوز۔ تربوز ٹھنڈا تربوز۔ کلیجے کی ٹھنڈک۔ آنکھوں کی تری۔ شربت کے
کٹورے۔ ٹھنڈا تربوز۔ دل کی گرمی نکالنے والا۔ جگر کی پیاس بجھانے والا۔ شربت کے کٹورے۔
تربوز ٹھنڈا تربوز۔

(راہ گیر بے نیازی سے گزر جاتے ہیں)

(کچھ لوگ پیچھے کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ ککڑی والا آواز لگاتا ہوا ان کی طرف بڑھتا ہے اور ان کا رستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اتنے میں ایک مداری دائیں طرف سے بندر لیے ہوئے داخل ہوتا ہے اور اپنے تماشے سے عجیب رنگ جما دیتا ہے۔ پھیری والے، بچے، لڑکے اور راستہ چلنے والے سب اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ شور تھم جاتا ہے اور ریل اور مداری کے نقرے صاف صاف سمجھ میں آتے ہیں۔ مداری دائیں راستے سے داخل ہوتا ہے اور اسٹیج کے بیچوں بیچ اپنا کھیل جماتا ہے)

**مداری** : (بندر نچاتا ہے) ہاں جرا ناچ دکھا دو ناچ آگرے شہر میں۔ جرا ناچ دکھا دو! بچے لوگ جرا ہاتھ کا تال بجاؤ۔ اچھا بتاؤ تو جرا ہولی میں مردنگ کیسے بجاؤ گے؟ (بندر مردنگ بجاتا ہے) اور پتنگ کیسے اڑاؤ گے؟ (بندر نقل کرتا ہے) اور اپنے سسر مہادیو جی کے میلے کیسے جاؤ گے (بندر ٹیڑھی چال چلتا ہے) اور برسات آ گیا تو؟ (بندر پھسل جاتا ہے) پھسل پڑو گے! ارے بھئی واہ! اگر جاڑا لگی تو؟ (بندر بدن پر کپکپی پیدا کرتا ہے) اور بڈھا ہو گئے تو (بندر بڑھاپے کی نقل کرتا ہے) اور مر گئے تو؟ (بندر مر جاتا ہے) ہندو کو رام کی کسم اور مسلمان کو قرآن کی کسم ذرا ایک ایک قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔ اچھا اب بتاؤ بھلا نادر شاہ دلی پر کیسا جھپٹا تھا؟ (بندر مداری کو ایک لاٹھی مارتا ہے) ارے تم تو سارے دلی شہر کو مار ڈالو گے۔ بس کرو۔ بڑے میاں بس کرو۔ اچھا احمد شاہ ابدالی دلی پر کیسا جھپٹتا تھا۔ (بندر لاٹھی مارتا ہے) ہاں ہاں ہاں!!! اور سورج مل جاٹ آگرہ شہر پر کیسا جھپٹتا ہے (ویسی نقل) اور شہر میں کیا ہوا تھا۔ (بندر ادھر ادھر دوڑتا ہے) لوگ بھاگ گیا تھا (بندر لیٹ جاتا ہے) اور بہت سا آدمی مر گیا تھا؟ اور پھر فرنگی ہندوستان میں کیسا آیا تھا؟ (بندر جھک جھک کے چلنے کی نقل کرتا ہے) اور پلاسی کی لڑائی میں لاٹ صاحب نے کیا کیا تھا (بندر لاٹھی سے بندوق چلاتا ہے) فیر کر دیا تھا! اور پھر۔ اور بنگال میں کیا ہوا تھا؟ (بندر پیٹ بجاتا ہے۔ اور کمزوری کا اظہار کرتا ہے) اکال پڑ گیا تھا

(بندر لیٹ جاتا ہے) لوگ بھوک سے مر گیا تھا ———— اور ہمارا کیسا حالت ہے؟

بندر پھر پیٹ بجاتا ہے) اور کل ہمارا کیا حالت ہو جائیں گا (بندر گر جاتا ہے) پھر ہمارے کو کیا کرنا

چاہیئے؟ (بندر لوگوں کے پاس جاتا ہے اور پیروں پر سر رکھ کر لیٹ جاتا ہے) سلام کرو۔

(بندر سلام کرتا ہے۔ لوگ کھسکنے لگتے ہیں)

ککڑی والا: اسکندرے کی ککڑی۔ پیسے کی چھے چھے!

لڈو والا: ہاں کے لڈو۔ دھیلے کے لو دو۔ دھیلے کے دو!

تربوز والا: تربوز ٹھنڈا تربوز۔ تربوز ٹھنڈا تربوز!

مداری: سلام کرو۔

(بندر پان کی دکان پر جو دائیں راستے کے قریب ہے۔ ایک

آدمی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور سلام کرتا ہے)

ککڑی والا: (اسی آدمی سے) کھا کے دیکھیے صاحب۔ ہری بھری۔ کرکری ککڑی۔

(آدمی چلا جاتا ہے۔ مداری غصے میں جھپٹتا ہے اور ککڑی

والے کے ہاتھ سے ٹوکرا چھین کر پھینک دیتا ہے۔ ساری

ککڑیاں سڑک پر بکھر جاتی ہیں)

مداری: بڑا آیا ککڑی بیچنے والا۔ ہم ایک ککڑی دیں گا تو ککڑی وکڑی سب بھول جائیں گا۔

(ککڑی والا سر پیٹ کر وہیں بیٹھ جاتا ہے اور رونے لگتا ہے

ہے)

ککڑی والا: میری ککڑیاں؟

مداری: ابھی تیرا بندر بنا کر رکھ دیں گا۔ سالا آیلا ہے ککڑی بیچنے۔ ککڑی دکھا دکھا کے ہمارا سب

آدمی بھگا دیا۔

(مداری اسے ایک دھپ رسید کرتا ہے)

لڈّو والا : ارے کیا بات ہے۔ کاہے لڑ رہے ہو ؟

( مداری کی طرف بڑھ کر )

تربوز والا : مارو سالے اِس مداری کے بچے کو !

( لڈّو والے کے پیچھے )

مداری : ہمارا سب آدمی بھگا دیا

( بائیں راستے کی طرف پیچھے کو ہٹتے ہوئے )

ککڑی والا : میں تو اپنی ککڑی بیچ رہا تھا

( دائیں کونے پر اسٹیج کے سامنے )

مداری : ککڑی بیچ رہا تھا۔ یہی جگہ بچا تھا ککڑی بیچنے کے لیے ؟

لڈّو والا : ارے تو اتنا بگڑتا کاہے ہے۔ تیرا آدمی وہ کاہے بھگانے لگا۔ ایسا ہو ا سے آئے ہے

کہ پیسے کا نام سنتے ہی لوگ بھاگ جاتے ہیں۔ کس کے پاس پیسہ ہے بھیّا ؟

تربوز والا : ( لڈّو والے سے ) بھگوان جھوٹ نہ بلوائے بھیّا ! اس دن سے ایک تربوز بھی نہیں

بیچا ہے ہم نے۔

مداری : ابھی وہ آدمی ہم کو پیسہ دے رہا تھا کہ بیچ میں اپنی ککڑی گھسیڑ دیا۔

لڈّو والا ۔ اچھا بس جاؤ۔ اپنا راستہ لو۔

مداری : رستہ تمھارے اب کا ہے۔

لڈّو والا : ابے منہ سنبھال کر بات کرنا سمجھا !

مداری : ارے جا جا۔

تربوز والا : مار سالے کو۔

ککڑی والا : ( دائیں کونے سے ) لوگوں کے پاس کھانے کو تو پیسہ نہیں ہے۔ اس کا بندر دیکھنے کے

لیے پیسے دیں گے۔

**لڈو والا :** جاتا ہے یہاں سے کر دوں ایک ۔

(بائیں طرف بڑھتے ہوئے)

**تربوز والا :** چل نکل یہاں سے ۔

(لڈو والے کے ساتھ بڑھتے ہوئے)

**مداری ۔** (بائیں کونے سے) ایسے آدمی سے تو اپنا بندر ہی اچھا ہے ۔

(یہ کہتا ہوا چلا جاتا ہے ۔ لڈو والا اور تربوز والا دونوں اپنی اپنی جگہ پر بائیں طرف واپس آجاتے ہیں ۔ مداری کے جانے کے بعد جیسے ہی یہ مڑتے ہیں ۔ ککڑی والا بڑی تیزی سے بائیں راستے کی طرف بڑھ کر مداری کو گالی دیتا ہے اور واپس آجاتا ہے ۔)

**ککڑی والا :** سالا !

(دونوں فقیر پیچھے کے دروازے سے ایک ساتھ گاتے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور اسٹیج کے سامنے آکر حاضرین کو نظم سناتے ہیں ۔ آخری بند پر ایک دائیں راستے سے اور دوسرا بائیں راستے سے باہر چلا جاتا ہے ۔ آگے کی اکثر نظموں میں بھی یہ اسی راستے سے اندر آتے ہیں ۔ اسی انداز سے نظم سناتے ہیں اور انہی راستوں سے باہر جاتے ہیں)

## کورس

پیسہ ہی رنگ روپ ہے پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

تیغ و سپر اٹھاتے ہیں پیسے کی چاٹ پر
تیر و سناں لگاتے ہیں پیسے کی چاٹ پر
میدان میں زخم کھاتے ہیں پیسے کی چاٹ پر
یاں تک کہ سر کٹاتے ہیں پیسے کی چاٹ پر

پیسہ ہی رنگ و روپ ہے، پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

پیسہ جو ہو تو دیو کی گردن کو باندھ لائے
پیسہ نہ ہو تو مکڑی کے جالے سے خوف کھائے
پیسے سے لالہ بھاجی اور چودھری کہائے
بن پیسے ساہوکار بھی الّو سا دکھلائے

پیسہ ہی رنگ روپ ہے، پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

دنیا میں آدمی ہی کا سا بھی نام ہے
پیسہ جہاں کے بیچ دو قائم مقام ہے
پیسہ ہی جسم و جان ہے پیسہ ہی کام ہے
پیسے ہی کا تطہیر یہ آدم غلام ہے

پیسہ ہی رنگ روپ ہے، پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

(باہر چلے جاتے ہیں)

(گدڑی والا جواب تک سر پکڑے بیٹھا تھا یکایک اچھل پڑتا ہے ایک نئے خیال سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں)

ککڑی والا : ارے واہ رے میرے یار! کیا سوجھی ہے ؟

(پیچھے کے راستے سے جانا چاہتا ہے)

لڈو والا : ابے کیا سوجھی ہے ؟

ککڑی والا : بالکل نئی بات ۔

لڈو والا : آنم رتیبا کی تو نہیں سوجھی ؟

ککڑی والا : آنم رتیبا کرے مورکھ ۔ گیانی کے لیے سنسار میں بہت رستے کھلے رہیں

(دروازے کے پاس رُک کر)

تربوز والا : کون سی گیان کی بات سوجھی ہے تجھے ۔ ہم بھی تو سنیں ۔

ککڑی والا : جو سوچ نہیں سکتے ۔ وہ دیکھ بھی نہیں سکتے ۔

(بار بار لوٹتا ہے اور پھر پیچھے چلا جاتا ہے)

لڈو والا : جور لگا کے دیکھیں گے ۔

ککڑی والا : اب دیکھتا ہوں کیسے نہیں بکتی ککڑی ۔

تربوز والا : بند نچانے والے ہو کیا بھیا ؟

لڈو والا : بند نچانے کے لیے کدھر سے پیسے آئیں گے ۔ خود ناچ ناچ کر ککڑی بیچے گا

تربوز والا : کیا بات ہے ہم کو بتا دو گے تو جات میں پھرک آ جائے گا کیا بھیا ؟

ککڑی والا : بیوپار کی بات کسی کو بتاتے ہیں تو کما چکے پیسہ !

(تربوز والے کے پاس جا کر)

لڈو والا : بڑا تیس مار خاں بنتا ہے ۔ بتاتا کیوں نہیں کیا بات ہے !

(کھڑے ہو کر ککڑی والے کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

ککڑی والا : نہیں بتاؤں گا کیا کر لو گے ہو ۔ کر لو ۔

لڈو والا : اچھا تو پھر لے !

(ایک دھپ رسید کرتا ہے)

**تربوزوالا :** بڑا رعب گانٹھ رہا تھا۔ دنیا بھر کو نچاؤں گا۔

(ایٹیج کے سامنے داہیں کونے پر آجاتا ہے)

**ککڑی والا :** تو چپ رہ سمجھا!

(اس کی طرف بڑھ کر)

**تربوزوالا :** کیوں چپ رہوں؟

**لڈووالا :** یہ ہمارا آپس کا جھگڑا ہے۔ تم اس میں ٹانگ مت ڈالو جی۔

(دونوں کے بیچ میں آکر)

**تربوزوالا :** تم سمجھتے ہو زور آواز اٹھا کر ہر کسی کو دبا لوگے؟

**لڈووالا :** چپ رہتا ہے کہ تجھے بھی دوں ایک!

**تربوزوالا :** کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو؟

**لڈووالا :** تیرا باپ!

**تربوزوالا :** کیا کہا؟

**لڈووالا :** پھر کہوں؟

**تربوزوالا :** کہہ کر دیکھ۔

(پیچھے کے دروازے سے آتے ہیں)

## کورس

یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی
مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر
دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر

ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر
جس طرح کُتّے لڑتے ہیں اک استخواں پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

جو اہلِ فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں
مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اُسے بے بتاتے ہیں
وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سُلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

(دونوں دائیں بائیں طرف سے باہر چلے جاتے ہیں)

فقیر کی آواز آتے ہی جھگڑا رک گیا تھا۔ لڈو والا اور
زردہ والا دونوں اپنی اپنی جگہ پر اسٹیج کے دائیں حصے میں
بیٹھے ہیں اور ککڑی والا پان کی دکان کے سامنے والی بینچ
پر بیٹھا ہے۔ پان کی دکان پر ایک آدمی کھڑا ہے ککڑی
والا اس کے پاس جاتا ہے)

**ککڑی والا**: میاں آپ بُرا نہ مانیں تو —— آپ سے کچھ پوچھوں۔

**راہگیر**: کیا پوچھنا ہے؟

**ککڑی والا**: آپ شعر کہتے ہیں۔

راہگیر : نہیں تو ۔ کیوں ؟

ککڑی والا: نہیں ۔ پھر کچھ نہیں کہنا ہے ۔

راہگیر : عجیب پاگلوں سے واسطہ پڑتا ہے ۔

( بائیں رستے سے چلا جاتا ہے ۔ پیچھے کے دروازے سے

ایک شاعر نما آدمی داخل ہوتا ہے اپنے ہمجولی کے ساتھ )

شاعر نما آدمی : ( دروازے کے پاس رک کر ) کہتے ہیں اور کیا خوب کہتے ہیں ۔

نہ ہل بیٹر آب کے امیروں سے تو

بچتے ہیں فقیر اُن کی لالت سے ہم

ہمجولی : سبحان اللہ !

ککڑی والا : ( پاس جاکر ) واہ وا میاں ! واہ کیا کہنے ہیں ! میاں ایک چھوٹی سی عرض ہے میری !

شاعر نما آدمی : نہیں چاہیئے بھئی ہم کو ککڑی !

ککڑی والا : جی نہیں ۔ مجھے کچھ اور کہنا ہے ۔ اگر گھڑی بھر کے لیے میرے ساتھ

( ایک طرف آجاتے ہیں )

شاعر نما آدمی : کیا کہنا ہے ۔ یہیں کیوں نہیں کہتے ؟

ککڑی والا : آپ کو کشٹ تو ہو گا مگر بات کچھ ایسی ہے تیسرا آدمی کو ساتھ سے کراہئیے بالکل سامنے آتا ہے )

سوال میرے پیٹ کا ہے ۔ ککڑی بیچوں گا اور آپ کو جیون بھر دعا دوں گا ۔

شاعر نما آدمی : ( کچھ جھنجلا کر ) کیا کہنا چاہتے ہو ۔ کہتے کیوں نہیں ؟

ککڑی والا : اگر میری گڑلیوں پر آپ ۔ معاف کیجیے ۔ آپ کو کشٹ تو ضرور ہو گا پر —— مجھے ایک

بات سوجھی ہے ! سعد پھیری لگاتا ہوں ۔ صبح سے شام تک ! لکئی ہفتے ہو گئے ۔ دھیلے کی بکری

نہیں ہوئی ۔

شاعر نما آدمی : میں نے تو کہہ دیا مجھے نہیں چاہیئے تمہاری ککڑی ۔

**ککڑی والا :** میں کب کہہ رہا ہوں؟ بلکہ آپ میری یہ ساری ککڑیاں پھوکٹ میں ہی لے لیجئے۔

**شاعر نما آدمی :** تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟

**ککڑی والا :** میں نے سوچا ہے کہ گا گا کر ککڑیاں بیچوں گا تو خوب بکیں گی۔

**شاعر نما آدمی :** تو اس میں میں کیا کر سکتا ہوں؟

**ککڑی والا :** اگر آپ دو چار شعر میری ککڑی پر لکھ دیتے تو میں آپ کا بڑا احسان مانتا۔

(شاعر نما آدمی قہقہہ لگاتا ہے)

**شاعر نما آدمی :** اے بھائی ہماری کیا حقیقت ہے۔ کہو تو کسی استاد سے لکھوا دیں۔ تمہارے لیے ایک پورا قصیدہ۔

**ہمجولی :** (جو اب تک پیچھے کھڑا تھا۔ بڑھ کر دونوں کے بیچ کھڑا ہو جاتا ہے) کیا بات ہے؟

**شاعر نما آدمی :** کہتے ہیں کہ ہماری ککڑیوں پر دو چار شعر لکھ دیجئے۔ میں نے عرض کیا کہو تو استاد ذوق سے کہہ کر ایک نظم کیوں نہ لکھوا دوں۔ اس نایاب موضوع پر۔

**ہمجولی :** بجا فرمایا —— اے بھائی استاد ذوق کا نام سنا ہے؟

**ککڑی والا :** ہم کیا جانیں حضور گنوار آدمی!

**شاعر نما آدمی :** بات تو بڑی سمجھ بوجھ کی کرتے ہو۔ گنواروں کو یہ کہاں سوجھے گی؟

**ہمجولی :** بادشاہ سلامت کے استاد ہیں۔ اگر تعریف کریں تو ذرے کو آفتاب بنا دیں۔

**ککڑی والا :** اتنے بڑے شاعر۔ بھلا وہ مٹی کی ککڑی پر کیا شعر کہیں گے۔

**شاعر نما آدمی :** کیوں نہیں کہیں گے؟ شاعر جو ٹھہرے۔

**ککڑی والا :** ہماری دو بات تک کیا پہنچ ہو گی میاں!

**شاعر نما آدمی :** کہو تو ہم پہنچا دیں۔

**ککڑی والا :** آپ تو غریب آدمی کا مذاق اڑاتے ہیں۔

**شاعر نما آدمی :** بھئی صاف بات یہ ہے کہ ککڑی بیچنے جیسے موضوع پر جب تک کوئی پائے کا شاعر طبع

آزمائی نہ کرے۔ حق ادا نہ ہوگا اور ہم ٹھہرے خوش نوش! اس لیے ہمارے بس کا تو یہ روگ نہیں ہے۔

(ہنستے ہوئے دونوں کتب فروش کی دکان کی طرف بڑھ جاتے ہیں)

**تربوز والا:** (شاعر نما آدمی کی جانب بڑھتا ہے اور اسے راستے میں روک کر کہتا ہے) تربوز ٹھنڈا تربوز۔ شربت کے کٹورے! ذرا چکھ کے دیکھئے صاحب۔ ٹھنڈا میٹھا تربوز!

**شاعر نما آدمی:** بس بس دیکھو ایسے تو تمھارا مال بکے گا نہیں۔ ایسا کرو کہ تم بھی کسی مرزا یا میر صاحب سے کچھ شعر لکھوا لو اپنے تربوز پر۔ پھر اہل سخن کی دام میں ہم بھی خریدا کریں گے۔ تمھارے پاس سے تربوز۔

(ہنس کے آگے بڑھ جاتا ہے)

**تربوز والا:** (دائیں طرف۔ لڈو والے کے پاس جا کر) جانتے ہو کیا بات تھی؟ ککڑی پر شعر لکھوانا چاہتے ہیں کسی شاعر سے۔

**لڈو والا:** ارے تو دونی سعر کیوں نہیں یاد کر لیتے جو مدار ہی سے کہا تھا۔ کھالو ککڑی وکڑی نہیں تو دو دل کا ککڑی بس یہی گانے پھیر دے۔ بڑی بکری ہوگی۔

**تربوز والا:** ہاں اور کیا۔

(دونوں ہنستے ہیں)

**لڈو والا:** (ہنس کر) شاعر اگر ککڑی تربوج پر سعر کہنے لگے تو پھر شاعری چھوڑ کر ہم ہی تربوج نہ بیچنے لگیں۔

(برتن والا اور دوسرے لوگ ہنستے ہیں)

**تربوز والا:** اپنا تو وہ حال ہے۔ تربوج بیچنا چھوڑ کے کوتیا رچنا شروع کردیں (دونوں ہنستے ہیں) یا پھر یہ سہر ہی چھوڑ دیں!

**لڈو والا:** پر جاؤ گے کدھر۔ سوال تو یہ ہے! چاروں اور لوٹ مار مچی ہوئی ہے۔

**تربوز والا:** ایک جندگی نے کیا نہیں دکھایا۔ بڑے بڑے بادساہ در در کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں تو ہم کس کھیت کی مولی ہیں بھیا؟ چلیں بھی۔ دن پھیر پھیر تو ٹوٹا تو کرموں میں لکھا ہے۔

(تربوج ٹھنڈا تربوج! آہستہ آہستہ آواز لگاتا ہوا نکل جاتا ہے)

**شاعر نما آدمی** : (کتب فروش کی دکان پر ایک کتاب دیکھتے ہوئے) ملاحظہ کیجئے کہتے ہیں۔

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

**کتب فروش** : (اپنی مسند پر بیٹھے بیٹھے) واہ وا ! سبحان اللہ !

ہر چند میرؔ بستی کے لوگوں سے ہے نفور
پر اسے آدمی ہے دو خانہ خراب کیا

**ہیجولی** : (جو دکان کے سامنے والی بنچ پر بیٹھا ہے) اور ایک جگہ کہتے ہیں۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

**لڈو والا** : (آہستہ آہستہ آواز لگاتے ہوئے) تل کے لڈو دھیلے کے دو دو !

(باہر چلا جاتا ہے)

**کتب فروش** : سنا ہے جنون کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ان دنوں میرؔ صاحب پر !

**شاعر نما آدمی** : دم غنیمت سمجھئے۔ انہی سے اُدبِ جنونے کو آئی۔

**ہیجولی** : اور پھر کیا کیا زمانے دیکھے ہیں میرؔ صاحب نے ! اسی شہر میں عزیزوں کی بے وفائی دیکھی گھر چھوڑا وطن چھوڑا۔ دلّی چھوڑی کہ ایک زمانے میں سخن دانوں اور باکمالوں کا ٹھہا دار کی تھی۔ در در کی خاک چھانی، ایرانیوں اور تورانیوں کے حملے دیکھے۔ افغانوں۔ روہیلوں راجپوتوں۔ جاٹوں اور مرہٹوں کی دستبرد دیکھی۔ دیکھا کہ دلّی کی گلیوں میں خون کے دریا رواں ہیں۔ اور انسانوں کے سر گوڑوں کی طرح تیر رہے ہیں۔ اپنا گھر آنکھوں کے سامنے لٹتے دیکھا

"گھر جلا سامنے ایسا کہ بجھایا نہ گیا"

یہ سب دیکھا۔ اب لکھنؤ میں گوشہ نشین ہیں۔ اور فرنگیوں کی غارت گری دیکھ رہے ہیں۔

(شاعر نما آدمی دکان سے نیچے اترتا ہے اور بنچ کے پیچھے

(جماں کا ہجولی ٹیلیفون سے گھر سے رابطہ کرتا ہے)

**کُتب فروش:** سچ کہتے ہو بھائی! عجیب گردشوں کا زمانہ ہے مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سلطنتِ مغلیہ نہیں ہے۔ ایک زبردست قوی ہیکل شیر ببر ہے جس پر سیکڑوں کتے بلیوں نے حملہ کر دیا ہے اور اسے زخموں سے چور اور لاچار دیکھ کر آسمان سے چیل اور گدھ بھی جمع ہو گئے ہیں اور ٹھونگیں ارار کر اس کی تکا بوٹی کر رہے ہیں اور وہ شیر ہے کہ نہ تو اسے کراہنے کی مہلت ہے نہ مرنے کا یارا!

**شاعر نما آدمی:** (کتب فروش کی طرف بڑھ کر) وہ شیر ہے کہ نہ تو اسے کراہنے کی مہلت ہے نہ مرجانے کا یارا۔ واہ وا واہ وا۔ کیا کہنے ہیں۔ ایک زخمی اور لاچار شیر ببر کی تشبیہ سلطنت مغلیہ کے لیے کس قدر موزوں ہے۔ اور پھر حملہ آور قوتوں کے لیے کُتے بلی۔ چیل اور گدھ جیسے استعارے! بھئی بہت خوب! مولوی صاحب۔ واللہ! یہ آپ ہی کا حصہ ہے یہ زبان اور یہ اندازِ گفتگو! ایسے صاحب ہی کے لیے تو دو گھڑی یہاں آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم تو نام کے شاعر ہیں صاحب۔ آپ تو بات بات میں شاعری کرتے ہیں۔

**کُتب فروش:** یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہمیں بھلا شعر و شاعری سے کیا واسطہ! آپ صاحبان کی صحبت میں بات کرنے کا سلیقہ سیکھ لیا ہے بس!

**ہجولی:** آپ دونوں حضرات کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں۔

**شاعر نما آدمی:** (کتب فروش کے پاس بیٹھ جاتا ہے) ہماری کسرِ نفسی کہہ لیجیے یا اپنا حسنِ ظن! بہرحال صاحب ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ دیوان بھی چھپوا یا جائے۔ تو ایسے شخص سے جو سخن فہمی میں اپنا جواب نہ رکھتا ہو۔

**کُتب فروش:** اور اپنا یہ ایمان ہے کہ شعر چھاپے جائیں تو اس آدمی کے جو پاکیزہ مسلا اور پاکیزہ خیال ہو۔ آپ ایسی مثال ہو (شانے پر ہاتھ رکھ کر) ہر کس و ناکس کے اشعار چھاپنا ہمارا پیشہ نہیں۔

**ہجولی:** (شاعر سے) آپ کا دیوان تو اب مکمل ہو گیا ہو گا۔

**شاعر نما آدمی:** صاحب شاعر کا کلام اس کی زندگی کے ساتھ ہی تکمیل پر پہنچتا ہے۔ بہرحال اتنے شعر ضرور ہو گئے ہیں کہ کتابی صورت میں آجائیں۔

**کتب فروش** : لیجئے ——— اور اس کا آپ نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔

**رمجولی** : تسارہل! شاعر جو ٹھہرے۔

**شاعر نما آدمی** : گھر کی بات تھی۔ سوچا کسی بھی وقت مسودہ آپکے سپرد کردوں گا کر جو جی میں آئے کیجئے۔

**کتب فروش** : غضب نہ کیجئے صاحب! کل ہی مسودہ میرے یہاں پہنچا دیجئے۔

## کورس

### داخل ہوتے ہوئے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

اپنا مطلب ہو تو مطلب کی خوشامد کیجئے۔ اور نہ ہو کام تو اس ڈھب کی خوشامد کیجئے

انبیا اولیا اور رب کی خوشامد کیجئے اپنے مقدور غرض سب کی خوشامد کیجئے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

چار دن جس کو خوشامد سے کیا جھک کے سلام وہ بھی خوش ہو گیا اپنا بھی ہوا کام میں کام

بڑے عاقل بڑے دانا نے نکالا ہے یہ دام خوب دیکھا تو خوشامد ہی کی آمد ہے تمام

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

گر بھلا ہو تو بھلے کی بھی خوشامد کیجئے اور برا ہو تو برے کی بھی خوشامد کیجئے

پاک و ناپاک سڑے کی بھی خوشامد کیجئے کتے بلی و گدھے کی بھی خوشامد کیجئے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

(باہر چلے جاتے ہیں)

شاعر نما آدمی: (کتب فروش سے) واہ صاحب واہ واہ - وا! وہ شعر ہے کہ نہ تو اُسے کراہنے کی مہلت ہے نہ مرجانے کا یارا! حد حاضر کا مکمل نقشہ کھینچ دیا ہے آپ نے چند الفاظ کے اندر!

ہجولی: لیکن کیا صاحب یہ نہیں ہو سکتا کہ شاعری کے اندر کوئی اس سارے احوال کی تصویر کھینچ دے۔

شاعر نما آدمی: میر صاحب کے یہاں جو یہ سوز و گداز ہے اس افراتفری کی تصویر نہیں تو اور کیا ہے۔

ہجولی: نہیں صاحب یہ تو انھوں نے اپنی ذاتی پراگندہ حالی کا رونا رویا ہے کہ

پراگندہ روزی پراگندہ دل

شاعر نما آدمی: اس ایک فقرے پراگندہ روزی میں ایک دفتر معنی پنہاں ہے۔

ہجولی: اپنی روزی کا رونا ایک چیز ہے اور دوسروں کی حالت بیان کرنا۔

شاعر نما آدمی: (بات کاٹ کر) دنیا بھر کا ٹھیکا لے رکھا ہے شاعر نے؟

ہجولی: جی نہیں میرا مطلب کچھ اور تھا۔

شاعر نما آدمی: کیا مطلب تھا آپ کا؟

ہجولی: میرا مطلب یہ تھا کہ غزل کی صنف میں وہ وسعت نہیں کہ اس میں ہر مضمون اور ہر خیال نظم کیا جا سکے۔

شاعر نما آدمی: آپ شعر کے ایران اور اساتذۂ ہند کی صدیوں کی روایتوں پر حملہ کر رہے ہیں غزل جیسی حسین چیز دنیا کے کس ادب میں پائی جاتی ہے؟

ہجولی: میں اس کے حسن سے انکار نہیں کر رہا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس میں اتنی گنجائش نہیں۔

شاعر نما آدمی: جو چیز غزل میں نہیں کہہ سکتے۔ قصیدے میں کہیے۔

ہجولی: قصیدے میں بادشاہوں کی تعریف کے سوا اور کیا کہیے گا۔

شاعر نما آدمی: مثنوی میں تو سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔

(برتن والے کے ہاں دو چار دوست ابھی ابھی آکر بیٹھے ہیں وہ

اپنی ڈھولک اور جھانجھ وغیرہ ٹھیک کرتے ہیں اور
شروع کر دیتے ہیں۔

(برتن والا اور اس کے ساتھی)

پایو ستو یہ دودھ کے لٹیا کا بالپن  اور بدھ پوری نگر کے بسیا کا بالپن
موہن سرد سپندت کریا کا بالپن  بن بن کے گوال گوئیں چرّیا کا بالپن
ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنہیا کا بالپن

تھی ان کی چال کی تو عجیب یارو چال ڈھال  پاؤں میں گھنگرو باجتے سر پر جھنڈولے بال
چلتے ٹھمک ٹھمک کے جو وہ ڈگمگاتی چال  تھا نہیں کبھی جسودا کبھی نند لیں سنبھال
ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنہیا کا بالپن

تھے گھر جو گوالنوں کے لگے گھر سے جابجا  جس گھر کو خالی دیکھا اسی گھر میں جا پھرا
ماکھن ملائی دودھ جو پایا سو کھا لیا  کچھ کھایا کچھ خراب کیا کچھ گرا دیا
ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنہیا کا بالپن

کوٹھی میں ہو تو اس میں بھی جا منہ کو بوڑنا  گولی میں ہو تو اسی کو ڈھنڈورنا
اونچا ہو تو بھی کاندھے پہ چڑھ کر نچھوڑنا  پہنچا نہ ہاتھ تو اسے مرلی سے پھوڑنا
ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنہیا کا بالپن

گر چوری کرتے آ گئی گوالن کوئی وہاں  اور اس نے آ پکڑ لیا تو اس سے بولے ہاں
میں تو ترے دہی کی اڑاتا تھا مکھیاں  کھاتا نہیں میں اس کی نکالے تھا چیونٹیاں

ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنہیا کا بالپن

سب مل کے یارو کشن مراری کی بولو جے
گوبند چھیل کنج بہاری کی بولو جے
دو چور کہاری ناتھ بہاری کی بولو جے
تم بھی نظیرؔ کشن بہاری کی بولو جے

ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنہیا کا بالپن

(ایک ضعیف العمر تذکرہ نویس دائیں راستے سے داخل ہوتا ہے
گگڑی والا جواب تک گانا سننے میں محو تھا۔ دوڑ کر اس کے پاس
جاتا ہے اور اس کا راستہ روک مخاطب ہوتا ہے)

**گگڑی والا:** صاحب آپ بزرگ آدمی ہیں۔ میری گستاخی معاف کیجیے گا۔ میری ذرا سی عرض سن لیجیے

(تذکرہ نویس اس کی طرف دیکھتا ہے اور تیوری چڑھا کر خاموش
آگے بڑھ جاتا ہے)

**تذکرہ نویس:** (کتب فروش کی دکان پر پہنچ کر) السلام علیکم!

**کتب فروش:** وعلیکم السلام! آئیے مولانا!

(اپنی مسند مولانا کو دے دیتا ہے اور خود دوکان کے سامنے
والے بینچوں پر بیٹھ جاتا ہے)

**شاعر نما آدمی:** (دوکان سے اتر کر بنچ پر بیٹھ جاتا ہے) غریب صبح سے آپ کی راہ تک رہا تھا۔ کہ آپ آئیں تو آپ سے دو چار شعر اپنی گگڑی پر لکھوا لے اور آپ نے اس کی بات کا جواب تک دینا گوارا نہ کیا۔

**تذکرہ نویس:** میں ایسے رذیلوں سے بات کر کے اپنی زبان خراب کرنا نہیں چاہتا!

**کتب فروش:** آپ بھی گویا میر صاحب کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ سنا ہے کہ دلی سے لکھنؤ کے سفر میں

میر صاحب ایک لکھنوی کے ساتھ ایک ہی یکہ پر سفر تھے اور سارے راستے خاموش رہے کہ کہیں زبان نہ بگڑ جائے۔

**تذکرہ نویس:** صاحب یہی روائیتیں تو ہیں کہ آگے چل کر قوم کو زندہ رکھیں گی ورنہ بربادی میں کسر کون سی باقی رہ گئی۔ صاحب سنا ہے۔ کلام پاک کا ریختہ میں ترجمہ آگیا ہے۔

**کتب فروش:** جی ہاں۔ شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ موجود ہے اور اگر آپ کو مولوی عبدالقادر کا ترجمہ درکار ہے تو کچھ روز انتظار کر لیجئے۔ ہفتے دو ہفتے میں وہ بھی آ جائے گا۔

**شاعر نما آدمی:** ترقی کا دور آ رہا ہے مولانا!

**کتب فروش:** ترقی کہہ لیجئے یا تنزل! بہرحال زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ جگہ جگہ چھاپے خانے کھل رہے ہیں اور کلام پاک کے ساتھ ساتھ انجیل کے بھی ترجمے چھپ رہے ہیں۔ سنا ہے کلکتے میں ایک فرنگی ہے۔ جو سنسکرت۔ فارسی۔ ریختہ اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ اس نے وہاں ایک مدرسہ کھولا ہے۔ فورٹ ولیم کالج نام کا! وہاں ان زبانوں میں درس دیا جاتا ہے اور اب تو ما ہے کہ شاعرے بھی وہیں منعقد ہوں گے۔

**شاعر نما آدمی:** ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ دلی میں بھی ایک مدرسہ کھل رہا ہے جہاں انگریزی زبان کی تعلیم اور کیمیا اور طبعیات پر درس دیئے جائیں گے۔

**کتب فروش:** کفر اور الحاد کا دور ہے۔ اس دور کو بدل دینے کے لیے بخدا کسی مجاہد کی ضرورت ہے اور ہر طرف نامردوں کا جمگھٹ نظر آتا ہے۔ مجاہد کوئی نہیں۔

**راہ چلتا:** زمانے کی ضرورت دراصل مجاہد کی نہیں۔ مولانا: بلکہ انسان کی ہے۔ آدمی کہیں نظر نہیں آتا۔

**شاعر نما آدمی:** (کھڑے ہو کر) تو ہم لوگ کیا جانور ہیں۔

سب ہنس دیتے ہیں۔ شاعر نما آدمی بیٹھ جاتا ہے

**راہ چلتا:** درس و تدریس کا یہ نیا سلسلہ جو شروع ہو رہا ہے میرا تو یقین ہے کہ آدمی بھی یہیں سے پیدا ہوں گے۔ ویسے بھی سارے ملک میں لوٹ مار مچی ہوئی ہے جسے دیکھو اپنی بے روزگاری کا رونا رو رہا ہے۔ ان

نئے انگریزی مدرسوں سے کم از کم یہ تو ہوگا کہ کچھ لوگوں کی روزی کا بندوبست ہو جائے گا۔

**کتب فروش:** (تذکرہ نویس سے) میرا تو خیال ہے مولانا۔ آپ کی ان تصنیفات۔ شرح و حدیث تبصرہ تنقید اور تذکرہ نویسی وغیرہ میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ اب تو آپ بھی کچھ نئے راستے نکالنے کی فکر کیجئے۔ (اٹھ کر مولانا کے پاس بیٹھ جاتا ہے) میں نے اڑتے اڑتے کسی سے سنا ہے کہ دلّی میں چھاپہ خانہ آ رہا ہے اور بہت جلد دیکھتے ہیں رسالے اور اخبارات چھپنے شروع ہو جائیں گے۔ سوچ رہا ہوں میں کتب خانہ کھولوں اور اخبارات کا بھی سلسلہ جاری کروں۔

**تذکرہ نویس:** میاں بہت برا وقت آیا ہے واقعی! ابھی کل کی بات ہے۔ میں نے ابوالفتح صاحب کے مطب میں بیٹھا نصر اللہ بیگ صاحب سے باتیں کر رہا تھا کہ کس طرح آگرہ اور دلّی کو ہوس کاروں نے لوٹ لیا سلسلۂ گفتگو شعر و ادب تک پہنچا۔ میر امن خاں کی دردناک داستان سنانے لگے کہ کس طرح سورج مل جاٹ نے ان کا گھر برباد کیا اور ان کی جائداد پر قابض ہوا۔ کہنے لگے کہ وہ اب کلکتے کے نئے فرنگی مدرسے میں بیٹھے قصہ چہار درویش لکھ رہے ہیں اور خواہشمند ہیں کہ میں بھی کلکتے چلا جاؤں۔ فارسی کی مدرسی مل جائے گی۔ یہی رجب علی سرور نے کہلوا بھیجا ہے۔ خود نصر اللہ بیگ اس بات پر زور دے رہے ہیں۔

**کتب فروش:** (دکان سے اٹھ کر، باہر جانے جاتے رک کر) اب انھیں کو دیکھئے! فرنگی کی فوج میں رسالدار ہیں اور مزے سے ہیں!

(باہر جانے سے نکل جاتے ہیں)

**شاعر نما آدمی:** سنا ہے۔ ان کے بھتیجے اسد اللہ کی شادی ہو گئی؟

**تذکرہ نویس:** جی ہاں! بڑی عجیب ذہین لڑکا ہے یہ اسد اللہ بھی۔ اس کم عمری میں فارسی شعر کہتا ہے اور اللہ خود میری سمجھ میں نہیں آتے۔

**ریجھولی:** اس کی عمر تو یہی کوئی تیرہ چودہ کی ہوگی؟

**شاعر نما آدمی:** جی ہاں! اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ شیخ ابراہیم ذوق کو دیکھئے ۱۸، ۲۰ کی عمر ہوگی

اکبر ثانی کے دربار میں پہنچے۔ شاہ نصیر جیسے کہنہ مشق کا تختہ الٹ دیا اور اب اُستاد شہہ ہیں۔ سارے دلی میں ان کا طوطی بول رہا ہے۔

**تذکرہ نویس:** میاں اب کیسی دلی۔ کہاں کا دربار۔ اور کون سے اکبر ثانی۔ اکبر و عالمگیر وغیرہ کے بعد عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی اور اکبر ثانی۔ لوحِ سلطنتِ مغلیہ پر حرفِ مکرر کی طرح آتے ہیں اور اُجڑی ہوئی دلی کے خرابۂ وحشت ناک میں جس کا نام کبھی قلعۂ معلیٰ تھا۔ ایک ٹاٹ پٹا دربار جم جاتا ہے گھڑی بھر کے لیے شعر و ادب کی آواز بلند ہوتی ہے۔ پھر وحشیوں کا حملہ اور دلی ہو کا عالم۔ لوگ اودھ کی طرف یا دکن کی طرف بھاگ نکلے ہیں اور دلی کے گورستان شاہی میں پھر دری گتتے لوٹتے ہیں اور اُلّو بولتا ہے۔

(دائیں ہاتھ ایک گاہک داخل ہوتا ہے)

**گاہک:** (تذکرہ نویس کو کتب فروش سمجھ کر) صاحب! منشی مرزا مہدی کا نادر نامہ ہو گا۔ آپ کے ہاں؟

(کتب فروش ازار بند باندھتا ہوا بائیں طرف سے بڑی تیزی سے داخل ہوتا ہے)

**ایک آواز:** (باہر اسٹیج کے بائیں طرف سے بس چلتے ہیں) کیا مولوی صاحب۔ عین دکان کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ برخوردار آپ بھی! ہمارے بدبو کے ناک میں دم آگیا ہے۔

(ایک اجنبی جو بازار میں ٹہل رہا تھا۔ گلی سے جھانک کر یہ باتیں بغور سنتا ہے اور مولوی صاحب کو دیکھ کر قہقہہ لگاتا ہے)

**کتب فروش:** نادر نامہ تو نہیں ہے البتہ اس کا ترجمہ ریختے میں ہوا ہے تاریخ نادری۔ وہ موجود ہے۔

**گاہک:** اور قصۂ لیلیٰ مجنوں؟

**کتب فروش:** قصۂ لیلیٰ مجنوں بھی امیر خسرو کا ختم ہو گیا۔ مگر حیدری صاحب کا ریختے کا ترجمہ ابھی ابھی آیا ہے۔

**گاہک:** ذرا دکھلائیے۔

(کتب فروش گاہک کو لے کر اندر جاتا ہے)

(دیہاتیوں کی ایک ٹولی رنگین کپڑے پہنے نظم "بلدیو جی کا میلہ"
گاتی ہوئی بائیں راستے سے آتی ہے۔ اسٹیج کے بیچ میں جم کر
گاتی ہے ——— اور دائیں طرف سے چلی جاتی ہے)

## میلے والے

کیا وہ دلبر کوئی نویلا ہے　　ناتھ ہے اور کہیں وہ چیلا ہے
موتیا ہے چنبیلی بیلا ہے　　بھیڑ انبوہ ہے اکیلا ہے
شہری قصباتی اور گنویلا ہے　　زر اشرفی ہے پیسہ دھیلا ہے
ایک کیا کیا وہ کھیل کھیلا ہے　　بھیڑ ہے خلقتوں کا ریلا ہے

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

لوگ چاروں طرف سے آتے ہیں　　آکے عیش و طرب مناتے ہیں
دل سے سب شغلوں کو جاتے ہیں　　اپنے دل کی مراد پاتے ہیں
جھانجھ مردنگ دف بجاتے ہیں　　راس منڈلی کا بھجن سناتے ہیں
دل میں پھولے نہیں سماتے ہیں　　سب یہ ہنس ہنس کے کہتے جاتے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہر طرف گلبدن رنگیلے ہیں　　نوک پلک غنچہ لب سجیلے ہیں
بات کے ترچھے اور کٹیلے ہیں　　دل کے لینے کو سب ہٹیلے ہیں
خشک تر نرم سوکھے گیلے ہیں　　ٹیڑھے بلدار اور نکیلے ہیں
جوڑے بھی سرخ سبز پیلے ہیں　　پیار الفت بہانے حیلے ہیں

رنگ ہے روپ ہے چھبیلا ہے

زور بلدیو جی کا میلا ہے

نازنیں ہیں وہ سانوری گوری — جن کی نازک سی اک پری پوری

کر کے چتون نگاہ کی ڈوری — دل کو چھینے ہیں سب برازوری

دھوم ناز و ادا جھمکا جھوری — برج ہیں جیسے مچ رہی زوری

گھونگھٹوں میں ہیں کر رہی چوری — چوری کیسی کہ صاف سرزوری

رنگ ہے روپ ہے چھبیلا ہے

زور بلدیو جی کا میلا ہے

کیا مچی ہے بہار جے بلدیو — عیش کے کاروبار جے بلدیو

دھوم لیل و نہار جے بلدیو — ہر کہیں آشکار جے بلدیو

ہر زباں پر ہزار جے بلدیو — دم بدم یادگار جے بلدیو

کہہ نظیر اب پکار جے بلدیو — سب کہو ایک بار جے بلدیو

رنگ ہے روپ ہے چھبیلا ہے

زور بلدیو جی کا میلا ہے

شاعر نما آدمی: مولانا! سنا ہے آپ شعرائے ریختہ کا کوئی تذکرہ لکھ رہے ہیں۔

تذکرہ نویس: جی ہاں! لکھ تو رہا ہوں۔ پر نہ جانے کیوں

شاعر نما آدمی: کس منزل میں ہے؟

تذکرہ نویس: گمرہی کی منزلوں میں بھٹک رہا ہے صاحب! اور کیا۔ میاں سوز مرحوم کے ساتھ صحبت تھی اُن ہی نے اُکسایا تھا کہ کچھ لکھیے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلی اور اس کے گرد و نواح کے چکر لگتے تھے۔ سوز مرحوم کے علاوہ میر صاحب۔ خواجہ میر درد۔ حضرت سودا۔ میر حسن۔ حضرت فغاں۔ سب کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ یہ حضرات دنیا سے کیا اٹھے کہ بزم ہی اُجڑ گئی۔

**کتب فروش:** (ایک بیاتی لڑکے کو گزرتے دیکھ کر دکان سے نکل آتے ہیں) ادھر آنا میاں! (لڑکا نہیں سنتا) ابے ادھر آ بے خبیث! (لڑکا آتا ہے) سسرے ریختہ نہیں سمجھتے۔ جب تک مغلظات نہ بکیے سمجھتے ہیں عزت ہی نہ ہوئی (لڑکے کو پیسے دے کر) ذرا سامنے کی دکان سے چار پان تو لا۔

(لڑکا پان کی دوکان کی پہ چلا جاتا ہے۔ مولوی صاحب اپنی دوکان کے اندر)

**تذکرہ نویس:** میر صاحب کوئی ۳۰ برس بعد وطن مالوف واپس آئے۔ علماء و فقراء سے ملے۔ عزت و توقیر سے ملے پر ایسا کوئی مطلب نہیں ملا کہ اس دل بے تاب کو تسلی ہو۔ کہنے لگے کہ سبحان اللہ! یہی وہ شہر ہے کہ جس کے ہر کوچے میں عارف، کامل، فاضل، شاعر، منشی اور دانش مند تھے۔ آج وہاں کوئی ایسا آدمی نہیں کہ اس صحبت سے لطف اٹھاؤں۔ چار مہینے اس طور سے وطن عزیز میں گزارے۔ بہت رنج اٹھایا اور واپس چلے گئے۔

(لڑکا پان لاتا ہے)

وہ ان کا بزم میں آنا بس اتنا یاد ہے میر　　کہ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

غرض صاحب اب کیسا تذکرہ اور کہاں کا تذکرہ نویس! بہرحال داستان پارینہ کا ایک زریں ورق اب تک ذہن کے کسی گوشے میں جگمگاتا رہتا ہے۔ عہدِ حاضر کی ظلمتوں نے اگر اس شمع کو بجھا نہ دیا تو ممکن ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے کچھ چھوڑ جاؤں۔ ورنہ اب تو ہمارا دم بھی غنیمت سمجھو۔

(پیچھے کے دروازے سے ایک آدمی تیزی سے داخل ہوتا ہے اور بائیں راستے سے نکل جاتا ہے۔ گڑیا والا اس کے پیچھے آواز لگاتا ہوا دوڑتا ہے اور اس کے ساتھ ہی باہر نکل جاتا ہے)

**شاعر نما آدمی:** مولوی صاحب میرا دیوان چھاپنے پر مصر ہیں۔ سوچ رہا تھا کہ اگر آپ اسے ایک نظر دیکھ لیتے تو میری اصلاح بھی ہو جاتی اور بہت ممکن ہے آپ کو شعراء کا تذکرہ لکھنے کے سلسلے میں ایک نئی تحریک

بھی ہوتی۔

**تذکرہ نویس:** نئی تحریک تو خیر اب کیا ہوگی بہرحال خدمت کے لیے ہر وقت حاضر ہوں

(وہی آدمی دائیں راستے سے اندر آتا ہے اور بائیں سے
نکل جاتا ہے۔ ککڑی والا اب تک اس کے پیچھے لگا ہوا ہے
مگر بیچ اسٹیج پر پہنچ کر رک جاتا ہے۔ آواز کی گرمجوشی کم ہو جاتی
ہے۔ پان والے کی بیچ کی طرف آہستہ آہستہ واپس جاتا
ہے اور بیٹھ جاتا ہے)

**کتب فروش:** (گاہک سے) نہیں صاحب! فارسی کا لیلیٰ مجنوں ختم ہو گیا آپ سے میں نے پہلے ہی عرض کر دیا تھا۔

(گاہک چلا جاتا ہے)

**تذکرہ نویس:** اب یہ زمانہ دیکھئے کہ کتب خانوں میں فارسی کی کتابیں عنقا ہو رہی ہیں نثر بھی ریختہ ہی میں لکھی جاتی ہے۔ پھر کوئی کیا تذکرہ لکھے اور کس کے لیے؟

**کتب فروش:** خوب یاد آیا۔ میاں نظیر کے ایک شاگرد حال ہی میں میرے پاس آئے۔ ان کی ایک نظم لیلیٰ مجنوں لے کر آئے۔ میں اسے اپنے رسوخ سے شائع کروا سکتا ہوں۔ اب بھلا بتائیے کون پڑھے گا میاں نظیر کا کلام۔

(تین چار آدمی اسٹیج پر سے قہقہہ لگاتے ہوئے گزر جاتے ہیں
ککڑی والا ان کے پیچھے دوڑتا ہے: "پیسے کی چھ چھے، پیسے کی چھ چھے"
لوگ نکل جاتے ہیں۔ ککڑی والا مایوس ہو جاتا ہے۔ اس کی
رفتار دھیمی پڑ جاتی ہے اور لہجے میں مایوسی آ جاتی ہے۔ اور
آدمیوں کے پیچھے آہستہ آہستہ آواز لگاتا ہوا گزر جاتا
ہے)

**شاعر نما آدمی** : صاحب ! ایک زمانہ آنے والا ہے کہ یہی بازاری چیزیں چلیں گی۔ ہولی ! دیوالی پر کچھ تک بندی کر لیجے علم و فضل کی معراج پر پہنچ جایئے گا آپ ! یہ تو دور دن کا عالم ہے آج کل ! ابھی ابھی یہ ککڑی بیچنے والا میرے پاس دوڑا ہوا آیا۔ اور کہنے لگا صاحب میری ککڑی پر نظم کہہ دیجئے۔ اب بھلا بتایئے

**باہر ایک آواز** : تم سے ایک بار کہہ دیا نہیں چاہیئے ککڑی دماغ خراب ہو گیا ہے

**ککڑی والا** : ( باہر سے ) نہیں میاں۔ وہ بات یہ ہے۔

**آواز** : بس کہہ دیا نہ مجھے ککڑی خریدنی ہے نہ میں شعر کہہ سکتا ہوں۔ پریشان کر دیا۔

( قوال پیچھے کے دروازے سے ٹہلتا ہوا آتا ہے اور برتن والے سے مخاطب ہوتا ہے )

**قوال** : بڑی ڈھولکیں بج رہی تھیں تیرے ہاں آج رامو ؟

**برتن والا** : لڑکا ہوا ہے میرے ہاں !

**درزی** : ارے بھئی محمد خان ! رامو کے گھر لڑکا ہوا ہے، اور وہ بھی پہلا لڑکا۔ کچھ سناؤ گے نہیں اس خوشی میں

**قوال** : ہاں ہاں ضرور !

**درزی** : پھر لو سنبھالو طبلہ بیٹھی ہو جائے کوئی پھڑکتی ہوئی چیز !

( محمد خان قوال کی دھن میں نظم سناتا ہے۔ دو چار ساتھی اس کے ساتھ گانے میں شریک ہو جاتے ہیں )

بھاتا ہے اس کو یارو دم عاشقی کا بھرنا — جو یاد جس کو سو سو گل پھول کا کترنا

جس گھاٹ حسن اترے اس گھاٹ ہی اترنا — جس ڈھب کا حسن دیکھا اس ڈھب ہی پر گزرنا

سو مکر و فن بنانا، سو رنگ روپ بھرنا

عاشق کو ہر طرح سے خوباں کی دید کرنا

تصویر سی کسی کی صورت جو دی دکھائی — تو من کے پھر تصور تصویر یا بنائی

گلیوں میں سیر دیکھی، میلوں میں جا لگائی — اس شکل سے رہی اکثر کی حسن کی کمائی

سو مکر و فن بنانا، سو رنگ روپ بھرنا
عاشق کو ہر طرح سے خوباں کی دید کرنا

جو حسن شیر دیکھا تو ریچھ کو نکالا — اور بن کے ریچھ والے سونٹا کڑا سنبھالا
کشتی سے کھڑ کھڑایا اور آپ کو اچھالا — ہن ریچھ سے بھی کتنے گل رو کو دیکھ ڈالا

سو مکر و فن بنانا، سو رنگ روپ بھرنا
عاشق کو ہر طرح سے خوباں کی دید کرنا

کھڑکی کا حسن دیکھا تو پھر نچا کے بندر — بکرا بھی لا اٹھایا اس کام کا سمندر
جب ڈگڈگی بجائی کوچے گلی کے اندر — لڑکے ہزار لوٹے آدمیاں قلندر

سو مکر و فن بنانا، سو رنگ روپ بھرنا
عاشق کو ہر طرح سے خوباں کی دید کرنا

میلوں میں آم جامن سیب و انار بیچے — سیروں میں دال موٹھیں پاپڑ اچار بیچے
گھاٹوں میں جا جیسے نقد و ادھار بیچے — چکلوں میں ان کے مالی پھولوں کے ہار بیچے

سو مکر و فن بنانا، سو رنگ روپ بھرنا
عاشق کو ہر طرح سے خوباں کی دید کرنا

دیکھی جو نرم و نازک اس حسن کی کلائی — منہیار بن کے چوڑی ہاتھوں میں کھنکھنائی
بیچے بہت کھلونے اور جوگی بن کے آئی — آخر بھکاری بن کر کی حسن کی گدائی

سو مکر و فن بنانا، سو رنگ روپ بھرنا
عاشق کو ہر طرح سے خوباں کی دید کرنا

لازم ہے اس کو یارو، عاشق وہی کہاوے — جو اس طرح کی گھاتیں کر حسن کو بڑھاوے
ہر روپ میں بھی اپنا ہر روپ بھول جاوے — آگے نظیر کیا کیا عاشق کی دھن بتاوے

سو مکر و فن بنانا، سو رنگ روپ بھرنا
عاشق کو ہر طرح سے خوباں کی دید کرنا

( ایک لڑکی بائیں راستے سے گاتی ہوئی اندر آتی ہے اور معمولاً
پنساری کی دکان پر جا کر کھڑی ہو جاتی ہے )

لڑکی : ۔ " کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے "
چاچا ! نانا نے آم کا اچار منگایا ہے :

لالہ جی : کہاں بیٹھے ہیں میاں نظیر ؟

لڑکی : رائے صاحب کے یہاں بیٹھے ہیں ! میں بتاؤں ! رائے صاحب نے نانا کے لیے میمن کی ڈلی نکالی ہے ۔

لالہ جی : اچھا تو اس لیے اچار کی یاد آئی ! ——— لو !

( لالہ جی مٹکی میں سے چنگل بھر دونے میں رکھ کر اچار لڑکی کے
حوالے کرتے ہیں اور اپنے کام میں لگ جاتے ہیں ۔ لڑکی
بائیں راستے سے گاتی ہوئی چلی جاتی ہے )

ہمجولی ۔ مولانا ! آپ کی نظر میں میاں نظیر آج کے شعرا میں کیا حیثیت رکھتے ہیں ۔

تذکرہ نویس : ( ایک کتاب دیکھتے ہوئے ) بھئی بہت باغ و بہار آدمی ہے ! خوش مزاج شگفتہ
افتاد ، ہر شخص سے ہنس کر ملنے والا ، کسی کا دل نہ دکھانے والا ۔ ایسا کہ شاید جس کی مثال دنیا میں
مشکل سے ملے گی ! لیکن شاعری آں چیزے دیگر است ! فحش کلامی ، ہرزہ گوئی ۔ ابتذال اور
عامیانہ مذاق کی تک بندی کو ہم تو شعر نہیں مانتے ! میاں نظیر کو شاعر ماننا ان پر بہت بڑا بہتان
ہوگا ۔ شعرا کے تذکرے میں ان کی کوئی جگہ نہیں ۔

تربوز والا اٹھ کر آہستہ آہستہ آواز لگاتا ہوا باہر
چلا جاتا ہے ۔ بائیں راستے سے لڑکی واپس آتی ہے )

لڑکی : " کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے "
لالہ جی سے ) چاچا ! نانا نے اچار واپس کر دیا ۔

لالہ جی : کیوں :

**لڑکی** : (منہ ہی منہ میں ہنستی ہے ) یہ پڑھ لیجئے۔

لالہ جی پرچہ پڑھتے ہیں ۔ دونا لڑکی کے ہاتھ سے لیکر دیکھتے
ہیں اور بڑے زور کا قہقہہ لگاتے ہیں ۔ لڑکی اسی طرف سے
بھاگ جاتی ہے )

**برتن والا** : کیا بات ہے بھئی !

**لالہ جی** : سنو! میاں نظیر نے ایک نئی نظم کہی ہے ۔ ایک بند مجھے لکھ کر بھیجا ہے ۔

پھر گرم ہُوا آن کے بازار چھُوں کا
ہم نے بھی کیا خوانچہ تیار چھُوں کا
سر پاؤں کچل کوٹ کے دو چار چھُوں کا
جلدی سے کچومر سا کیا مار چھُوں کا
کیا زور مزیدار ہے اچار چھُوں کا

ہنسی سے بے قابو ہو جاتا ہے اور دونے میں سے مصالحہ
میں لت پت ایک مرا ہوا چوہا نکالتا ہے اور کہتا ہے
پتہ نہیں یہ سالا چوہا کہاں سے اچار کی مٹکی میں گھُس گیا تھا مرنے کے لیے !

( برتن والا اور درزی وغیرہ ہنستے ہیں )

**شاعر نما آدمی** : حضور ! یہ ہے میاں نظیر کا معیارِ سخن !

**کتب فروش** : تعجب اس بات پر ہے کہ میاں نظیر شریف گھرانے کے آدمی ہیں ! جاہل اور گداگر ان کی چیزیں گاتے پھرتے ہیں۔ انھیں اپنا نہ سہی، اپنے خاندان کی عزت کا تو خیال ہونا چاہیے۔

**تذکرہ نویس** : صاحب! جس شخص کی تمام عمر پتنگ بازی، میلے ٹھیلوں کی سیر، آوارہ گردی اور قمار بازی میں گزری۔ اسے کیا شرم و حیا !

**شاعر نما آدمی** : اب تو خیر آخری عمر میں ایک صوفی صافی کی زندگی بسر کرنے لگے ہیں۔ ورنہ سنا ہے

عہدِ شباب میں یہ عالم تھا کہ بازار کے لونڈوں کے ساتھ گاتے بجاتے اور کوٹھوں پر پھرتے تھے
ہولی کے دنوں میں باقاعدہ رنگ کھیلتے اور ہر رسم میں شریک ہوتے۔

**کتب فروش:** اب بھلا بتائیے۔ ان سوقیانہ طرز کے گانوں کو جو سڑکوں پر بھیک مانگنے والے
گاتے پھرتے ہیں۔ اگر شعر کہہ دیا جائے تو دنیائے شاعری پر ظلم نہ ہوگا۔

## کورس

آتے ہوئے

اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے
لمبے کسی کے بال ہیں روٹی کے واسطے
باندھے کوئی رومال ہیں روٹی کے واسطے
سب کشف اور کمال ہیں روٹی کے واسطے

جتنے ہیں روپ سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

تذکرہ نویس اپنے لال کپڑوں، شاعر نما آدمی اپنے لمبے بالوں
اور مولوی صاحب سر پر بندھے ہوئے رومال کو دیکھتے ہیں )

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے

بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

جس جا پہ ہانڈی چولھا توا اور تنور ہے
خالق کی قدرتوں کا اسی جا ظہور ہے
چولھے کے آگے آنچ جو جلتی حضور ہے
جتنے ہیں نور سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

آوے توے تنور کا جس جا زباں پہ نام
یا چکی چولھے کا جہاں گلزار ہو تمام
واں سر جھکا کے کیجیے ڈنڈوت اور سلام
اس واسطے کہ خاص یہ روٹی کے ہیں مقام
پہلے انہیں مکانوں میں آتی ہیں روٹیاں
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

ان روٹیوں کے نور سے سب دل ہیں پور پور
آٹا نہیں ہے چھلنی سے چھن چھن گرے ہے نور
پیڑا ہر ایک اس کا ہے برفی و موتی چور
ہرگز کسی طرح نہ بجھے پیٹ کا تنور
اس آگ کو مگر یہ بجھاتی ہیں روٹیاں
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو
میلے کی سیر خواہش باغ و چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو
سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو

اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں

پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں

آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں

سینے اوپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں

جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

روٹی کا اب ازل سے ہمارا تو ہے خمیر

روکھی بھی روٹی حق میں ہمارے ہے شہد و شیر

یا پتلی ہووے موٹی خمیری ہو یا فطیر

گیہوں، جوار، باجرے کی جیسی ہو نظیر

ہم کو تو سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

(چلے جاتے ہیں)

(ککڑی والا اس نظم کے دوران میں اندر آتا ہے اور پیچھے کھڑے ہو کر بہت غور سے نظم سنتا ہے)

**ککڑی والا**: (بڑی حسرت سے) میری ککڑی پر کوئی نظم نہیں لکھ دیتا!

(یہ کہہ کر پیچھے کے دروازے سے جانے لگتا ہے۔ لیکن یکایک ایک خیال سے چونک کر مڑتا ہے اور آواز لگاتا ہے)

شاہ صاحب !

آواز لگاتا ہوا دائیں راستے سے بھاگ جاتا ہے۔ مگر فوراً
ہی واپس آتا ہے اور آواز لگاتا ہوا بائیں راستے سے باہر
چلا جاتا ہے )

شاہ صاحب ! شاہ صاحب !!

( فقیر گاتے ہوئے واپس آتے ہیں۔ گگڑی والا پھر اندر
آتا ہے اور آواز لگاتا ہے۔ مگر فقیر پیچھے کے دروازے
سے باہر نکل جاتے ہیں۔ گگڑی والا سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے
فقیروں کا گانا اب تک فضاؤں میں گونج رہا ہے کہ پردہ
تیزی سے گر جاتا ہے )

پردہ

○

# دوسرا ایکٹ

(پردہ کھلنے سے پہلے کورس والے داخل ہوتے ہیں۔ ایک اسٹیج کے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف سے اور پردے کے سامنے کھڑے ہو کر نظم "اکبر آباد" سناتے ہیں۔ آخری بند پر پردہ اٹھتا ہے اور فقیر گاتے ہوئے پیچھے کے دروازے سے چلے جاتے ہیں)

## کورس

بستا رہے یہ شہر بصد امن اور اماں

شہرِ سخن میں اب جو ملا ہے مجھے مکاں
کیونکر نہ اپنے شہر کی خوبی کروں بیاں
دیکھی ہیں آگرے میں بہت ہم نے خوبیاں
ہر وقت اس میں شاد رہے ہیں جہاں تہاں

رکھیو الٰہی اس کو تو آباد جاوداں

بستا رہے یہ شہر بصد امن اور اماں

ہر صبح اس کی کھلتی ہے وہ نور گستری
شرمندہ جس کو دیکھ کے ہر عارض پری
ہر شام بھی وہ مشک ملاحت سے ہے بھری
لیلیٰ کی جعد کر نہ سکے جس کی ہمسری

دن روئے مہر طلعت و شب زلفِ مہوشاں

بستا رہے یہ شہر بعد امن اور اماں

باغات پر بہار عمارات زر نگار

بازار وہ کہ جس پہ چمن دل سے ہو نثار

محبوب دلفریب و گل اندام و گلعذار

کلیاں کیے ہیں آپ کو گلزار پر بہار

کوچے کیے ہیں اپنے تئیں صحنِ گلستاں

بستا رہے یہ شہر بعد امن اور اماں

بحرِ حسن کو دیکھو تو جیسے چمن کی نہر

لاکھوں بہاریں رکھتی ہے ایک ایک جس کی لہر

کوئی نہاوے اور کوئی منہ دھووے شاد بہر

اس پر ہجوم رکھتے ہیں یوں ساکنانِ شہر

شمشاد سرو ہوتے ہیں جوں نہر پہ عیاں

بستا رہے یہ شہر بعد امن اور اماں

گریاں کے پیرہنے کا کروں صف میں رقم

تو بحرِ صفحہ بیچ لگے پھیرنے قلم

پھرتے ہیں اس روش کی بہاروں سے ہو بہم

سو سو چمن بھرے ہوئے شبنم کے دمبدم

آ جاتے ہیں نظر وہیں دریا کے درمیاں

بستا رہے یہ شہر بعد امن و اماں

اہلِ ثنا جو کرتے ہیں سو سو طرح ثنا

بھریں نشاط و عیش کی اٹھتی ہیں دل میں آ

ملتا نہیں کنارہ کچھ عشرت کے بحر کا

ساحل پہ جوشِ خلق سے ملتی نہیں ہے جا

ہوتا ہے وہ ہجوم کہ اک بحر بے کراں

بستا رہے یہ شہر لعبا امن اور اماں

یارو عجب طرح کا یہ دلچسپ ہے مقام

ہوتے ہیں ایسے کتنے ہی خوبی کے اژدہام

ہر طور دل بہے ہے خوش اور طبع شاد کام

میری نظیرؔ دل سے یہی ہے دعا مدام

بستا رہے یہ شہر لعبد امن اور اماں

بستا رہے یہ شہر لعبد امن اور اماں

( باہر چلے جاتے ہیں )

پتنگ والا : گنگناتے ہوئے بائیں راستے سے داخل ہوتا ہے اور جاکر اپنی دکان کھولتا ہے سے

کچھ وار پہ رہتے ہیں کچھ پار پہ رہتے ہیں

اس آگرے میں کیا کیا اے یار ہیرتے ہیں

تذکرہ نویس حاضرین کی طرف پیٹھ کیے دکان میں کھڑا

کتابیں دیکھ رہا ہے۔ کتب فروش بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے

شاعر اور ہمجولی دوکان سے باہر سڑک پر کھڑے ایک

کتاب دیکھ رہے ہیں۔ حاضرین کی طرف ان کی پیٹھ ہے

پتنگ والے کی باتیں سنکر ہمجولی آگے بڑھتا ہے اور

بینچ پر بیٹھ کر اس طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ شاعر اسٹول

کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے۔ تذکرہ نویس بی گفتگو کے
دوران میں کتاب بند کر کے سنڈ پر بیٹھ جاتا ہے )

پتنگ والا : ( برتن والے سے ) مبارک ہو رامو! سنا ہے تیرے ہاں لڑکا ہوا! اور خوب ڈھولک
بجی!

درزی : اُدھر ڈھولک بج رہا ہوا۔ اِدھر محمد خاں قوال نے خوب رنگ جمایا۔ سب تمہیں پوچھتے رہے
تم کہاں تھے۔

برتن والا : ( اپنی دکان پر سے ) بڑی دیر کردی۔ آج دکان کھولنے میں؟

پتنگ والا : دریا کنارے گیا تھا میاں نظیر کے ساتھ تیراکی کا میلہ دیکھنے۔
( گنگناتا جاتا ہے )

برتن والا : طوطا ساتھ لے کر گئے تھے؟

پتنگ والا : ہیجڑ! ہاتھ میں اٹھائے، دریا پار کرتا ہوں۔ کیا سمجھتے ہو۔ یہ یار غضب کرتے ہیں اپنے
آگرے والے بھی! یار لوگ بیل سر پر بٹھا کر دریا پار کرتے ہیں۔ حد ہو گئی۔

کتب فروش : سن لیا حضور آپ نے؟ پیری میں بھی وہی عالم ہے۔

تذکرہ نویس : بڑھاپا انسان کا مزاج تو نہیں بدل دیتا۔ پرانی عادتیں ہی کیسے چھوٹیں گی۔ نو رنگا خود تیرتے
تھے۔ اب اگلے زمانے کی یاد اور ان یادوں کی حسرت لیے ہوئے جمنا کنارے کھنچے چلے آتے ہیں
کہ خود نہیں تیر سکتے تو دوسرے تیراکوں ہی کا تماشا دیکھ کر ہوس پوری کر لیں۔

ہمجولی : صاحب۔ لیکن یہ تیراکی کا سلسلہ رہتا بھی بڑا اکا فر ہے؟ اور یہ بہار آگرے ہی میں ہے۔ کتنا حسین
کتنا شاعرانہ منظر رہتا ہے۔ سچ پوچھیے تو جی میرا بھی بہت چاہتا ہے کہ شرکت بھی کروں اور ایسے حسین
موضوع پر شعر کہوں۔ بس یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں کر۔

شاعر نما آدمی : بس اسی طرح کہنا شروع کر دیجیے ــــ

کچھ تار پیرتے ہیں کچھ پار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

(سب ہنستے ہیں)

ہمجولی: میرا مطلب یہ نہیں لیکن صحیح معنوں میں بھی تو شعر کہا جا سکتا ہے۔

شاعر نما آدمی: تیراکی پر۔

ہمجولی: کیوں نہیں۔

شاعر نما آدمی: وہ کیوں کر؟

ہمجولی: بھئی اگر سمجھ میں آ جاتا تو کہہ نہ دیتا شعر۔

شاعر نما آدمی: جس موضوع پر آپ شعر نہیں کہہ سکتے۔ اسے شاعرانہ موضوع ٹھہرانا کیا معنی!

ہمجولی: میں نے تو صرف اتنا کہا کہ جی چاہتا ہے۔ یہ تو نہیں کہا کہ جس پہ شعر کہنا ممکن نہ ہو۔ اس پر شعر کہنے کی خواہش کہاں کی عقل مندی ہے۔

لڈّو والا: (اسٹیج کے دائیں طرف باہر سے) پھر تو بٹنا چاہتا ہے۔

ککڑی والا: (اسی طرف سے) نہیں تو؟

لڈّو والا: جہاں میں لڈّو لے جاتا ہوں۔ وہیں ککڑی والا اڑا دیتا ہے۔

(اسی طرف سے ایک لڑکا داخل ہوتا ہے اور پتنگ کی دکان پر جاتا ہے)

لڑکا: اب کھول رہے ہو دکان؟

پتنگ والا: ہاں صاحب۔ ذرا تیراکی کا میلہ دیکھنے گئے تھے۔

لڑکا: پتنگ وتنگ بھی بنائی ہے یا اس سال تیراکی کا میلہ ہی دیکھتے رہے؟

پتنگ والا: کون سی پتنگ چاہئے؟ ہر رنگ، ہر نوع، ہر مذاق، ہر بہار کی پتنگیں موجود ہیں صاحب! کون سی پتنگ لیجئے گا! دو دھاریا۔ گلھریا۔ پہاڑیا۔ دو باز للسرا۔ گھائل۔ لنگوٹیا۔ چاند تارا۔ بگلا۔ تپا۔ دھبّیر۔ خربوزیا۔ پھیندی پان۔ مینا۔ دو کوڑیا۔ گلسرا۔ ککڑی۔ چوکھڑا۔ باجرہ ـــــ!

لڑکا: ہاں ہاں ہاں! بس بھئی بس۔ نام تک نہیں سنے ان پتنگوں کے اپنی زندگی میں۔

پتنگ والا : پھر کیا پتنگ اُڑاتے ہیں آپ ؟

لڑکا : اُڑا لیتے ہیں ہم بھی تھوڑی بہت ! آپ تو ہمیں ایک سیدھا سادا دو دھاریا دے دیجئے۔

پتنگ والا : دو دھاریا لیجئے۔

لڑکا : دام ؟

پتنگ والا : پچیس (۲۵) کوڑی۔

لڑکا : یہ لیجئے۔

( گاہک پتنگ لے کر دائیں راستے سے چلا جاتا ہے )

کُتب فروش : ( پتنگ کے گاہک سے ) اے میاں ذرا ادھر آنا لڑکے ! ( لڑکا چلا جاتا ہے مولوی صاحب پتنگ کو دو ملادے تک پہنچ کر ) ذرا بات سننا میاں۔ مولوی صاحب دکان پر واپس آجاتے ہیں کچھ دیر بعد لڑکا واپس آتا ہے) بیٹھو! (مولوی صاحب ہاتھ سے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہیں لڑکا ادب سے دو ہٹ کر بیٹھ جاتا ہے) کیا نام ہے تمھارا ؟

لڑکا : جی !

کُتب فروش : ( تذکرہ نویس سے ) مولانا ! ذرا اس لڑکے کے منہ سے اُستادوں کا کلام سنیئے۔ جیسی شکل پائی ہے۔ بخدا ویسی ہی آواز۔

تذکرہ نویس : ماشاء اللہ !

لڑکا : کیا سناؤں مولانا ؟

کتب فروش : تمھیں تو اُستادوں کے پُورے پُورے دیوان حفظ ہیں۔ ہم سے کیا پوچھتے ہو اپنی مرضی سے سناؤ۔

تذکرہ نویس : ہاں میاں۔

لڑکا : ایک غزل سناتا ہوں۔

( بڑی خوش الحانی سے گاتا ہے۔ دکاندار اپنی دکانیں چھوڑ کر پاس آجاتے ہیں۔ راہگیر رُک جاتے ہیں )

قاصد تو مرا نام تو لیجیو نہ ولیکن — کہنا کوئی مرتا ہے ترا چاہنے والا
جیسا کہ وہ مجھ سے خفا ہو کے چلا تھا — اللہ نے کیوں جب ہی مجھے مار نہ ڈالا
شاید وہ پری بن ٹھن کے چلا ہے کہیں گھر سے — ہے یہ تو اسی چاند سی صورت کا اجالا
صحرا میں مرے حال پہ کوئی بھی نہ رویا — گر پھوٹ کے رویا تو مرے پاؤں کا چھالا
اوروں کو جو گرتے ہوئے دیکھا تو لیا تھام — ہم گر بھی پڑے تو بھی نہ ظالم نے سنبھالا

ہم تجھ سے اسی روز کو کہتے تھے نظیر آہ
کیوں تو نے پڑھا عشق و محبت کا رسالا

**شاعر نما آدمی:** (بڑے تعجب سے) یہ میاں نظیر کی غزل ہے؟

**ہمجولی:** بھئی کیا کہنے ہیں۔ ہمیں میاں نظیر کے اس کلام کی خبر نہ تھی۔

**کتب فروش:** میاں زندگی بھر مشق کرتا ہے آدمی تو ایک آدھ شعر تو کسی کے ہاں سے نکل ہی آئے گا
اس میں کون سی تعجب کی بات ہے؟ ہاں میاں کچھ اور سناؤ۔

**ہمجولی:** پر صاحب! استادوں کی زمین کی غزل ہے۔

**کتب فروش:** استادوں کی زمین پر ہل چلانے والے گھٹیا شاعر بہت سے ہیں۔

**ہمجولی:** لیکن صاحب! غزل کا رنگ بہت شستہ اور نکھرا ہوا ہے۔

**تذکرہ نویس:** میر اسی زمین میں کہتے ہیں ؎

دیکھے ہے مجھے دیدۂ پُرخشم سے وہ میر
میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالہ

**شاعر نما آدمی:** چھالا کا قافیہ باندھا ہے!

گزرے ہے لہو واں سر ہر خار سے اب تک
جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

**تذکرہ نویس:** اس قافیے میں انشاء کا شعر خوب ہے۔ فرماتے ہیں ؎

آتنا تو پھرا دادیؔ وحشت میں کہ میرے
ہے پائے نظر میں بھی پڑا اشک کا چھالا

ہجولی : لیکن صاحب نظیر کا شعر بے مثل ہے کہ

صحرا میں مرے حال پہ کوئی بھی نہ رویا
گر پھوٹ کے رویا تو مرے پاؤں کا چھالا

شاعر نما آدمی : سودا نے بھی کہی ہے اس زمین میں غزل!

ہجولی : سید انشاء اللہ کی کوئی چیز تمھیں یاد ہے میاں؟

کتب فروش : بھئی انشاء اور مصحفی کی معرکہ آرائیوں کا جواب نہیں ہے خصوصاً وہ غزل "شب دیجور کی گردن" اس میں جو نوک جھونک ہوئی ہے دونوں کی! عجیب لطف رہتا ہوگا بخدا نواب سعادت علی خاں کے دربار میں بھی۔

تذکرہ نویس : آپ بھی کب کی بات کر رہے ہیں حضرت! شب دیجور کی گردن والا زمانہ گیا۔ اب تو سید انشاء جیسے منہ زور کے لب پر بھی گریہ و زاری ہے کہ ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

ہجولی : اور اب تو سنا ہے کہ آتش و ناسخ کی آوازیں وہ گونجی ہیں لکھنؤ میں کہ انشاء مصحفی بھی پھیکے پڑ گئے کس قدر جاندار شاعر ہے آتش بھی زور بیاں دیکھئے فرماتے ہیں۔

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفے میں بازیٔ غلام نہیں

شاعر نما آدمی : اور ناسخ کا جواب بھی سن لیجئے ؎

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

**ہجولی** : نہیں بھئی یہ خواہ مخواہ کی لڑائی ہے۔ بلکہ اسے بے شعری کہیے۔ شعر خوبصورت ہے مگر تصنع آمیز۔
وہ سچائی، وہ آگ اس کے اندر نہیں ہے جو آتش کے یہاں ہے۔

**شاعر نما آدمی** : آپ حسنِ جواب دیکھیے۔ سچائی اور آگ کیا دیکھ رہے ہیں شعر میں۔

**کتب فروش** : آپ لوگ بھی وہی کرنے لگے بخدا جو دلّی اور لکھنؤ کے درباروں میں ہمارے اساتذہ
کر رہے ہیں۔ بس اب یہ بحث ختم کیجیے اور شعر سنئے۔ ہاں میاں!

**لڑکا** : کیا سنئے گا؟

**تذکرہ نویس**: (کسی قدر جھنجھلا کر) جو جی چاہے سناؤ۔

**لڑکا** : اونی غریب مفلس زردار پھرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پھرتے ہیں

جاتے ہیں ان میں کتنے پانی میں صاف سوتے — کتنوں کے ہاتھ پکڑے کتنوں کے سر پہ لوٹے
کتنے پتنگ اڑاتے کتنے سوئی پروتے — حقوں کا دم لگاتے ہنس ہنس کے شاد ہوتے

سو سو طرح کا کر کر بستار پھرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پھرتے ہیں

ہر آن بولتے ہیں سید کبیر کی جے — پھر اس کے بعد اپنے استاد پیر کی جے

(تذکرہ نویس جھنجھلا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور بغیر کچھ کہے
چلا جاتا ہے۔ محفل پر ایک تحقیرانہ سناٹا چھا گیا ہے۔
مگر بہت سے رستہ چلنے والے بڑے شوق سے نظم سننے
کے لیے رک گئے ہیں۔ اس جمگھٹ کو دیکھ کر مولوی صاحب
برس پڑتے ہیں)

**لڑکا** : مور مکٹ کنہیا جمنا کے تیر کی جے

**کتب فروش** : بس کرو میاں (آواز اٹھا کر) آپ لوگ کیوں یہاں جمع ہو گئے ہیں صاحب۔ کوئی

مداری کا کھیل ہو رہا ہے یا پرسا دبٹ رہی ہے۔

(مجمع پیچھے ہٹ جاتا ہے اور ایک سناٹا چھا جاتا ہے۔ اس سناٹے میں ککڑی والا بائیں طرف سے آہستہ آہستہ داخل ہوتا ہے)

**ککڑی:** (مُردہ آواز میں) پیسے کی چھے چھے! پیسے کی چھے چھے!

(کُتب فروش اسے غضب آلود نگاہوں سے گھور رہا ہے۔ ککڑی والا جو اب تک انجان تھا۔ مولوی صاحب کی نگاہوں کو دیکھ کر یکایک چُپ ہو جاتا ہے۔ اور بھاگ کر دائیں کونے میں دبک جاتا ہے۔ پتنگ والا، جو مجمع میں سب سے آگے تھا، کتب فروش کی طرف بڑھتا ہے)

**پتنگ والا:** ادھر آنا میاں!

(لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی دکان پر لے جاتا ہے)

**کُتب فروش:** لیجیے! ہم نے سوچا خوش گلو لڑکا ہے۔ مولانا کلام سن کر خوش ہوں گے۔ میں کیا جانتا تھا کہ وہ بازاری کلام سنانے لگے گا۔ آخر مولانا ناراض ہو کر چل دیئے۔

**بھولی:** لیکن نظم تو خوب تھی صاحب۔

**شاعر نما آدمی:** جی ہاں! "سو سو طرح کا کر کر لب ستارہ ہنسنے رہیں"۔ کر کر! اسے آپ شاعری کہتے ہیں؟ یوں معلوم ہوتا ہے آدمی شعر نہیں پڑھ رہا۔ ککڑی کھا رہا ہے۔

**بھولی:** لیکن صاحب "کر کر" مستعمل ہے۔ اساتذہ نے باندھا ہے۔

**شاعر نما آدمی:** چلیے اب اٹھیے۔

**کُتب فروش:** معاف کیجیے گا۔

**شاعر نما آدمی:** معافی کی کیا بات ہے مولانا! اچھا السلام علیکم۔

**کتب فروش** : وعلیکم السلام !

( تماشہ نما آدمی اور اس کا بچہ چلے جاتے ہیں۔ لوگوں کا گروہ
اب پتنگ والے کی دکان پر جمع ہو گیا ہے۔ مولوی صاحب
مجمع کو دیکھ کر کہتے ہیں )

اب کمبخت وہاں جم گئے ہیں۔

( مولوی صاحب حساب کتاب میں لگ جاتے ہیں۔ پتنگ والا
گویے کو اپنے ساتھ دکان پر بٹھاتا ہے )

**پتنگ والا** : تو میاں نظیر کہتے ہیں ۔

قسمت میں گر ہماری یہ مے ہے تو ساقیا
بے اختیار ہاتھ سے شیشہ کرے گا جست

پہلے ہی کیوں نہ بتایا تم نے یار کہ تمھیں میاں نظیر کا کلام یاد ہے۔

**لڑکا** : میں تو پتنگ خریدنے آیا تھا صاحب۔ شعر سنانے کی غرض سے تو نہیں آیا تھا۔

**پتنگ والا** : ارے یار تو مگر یہ تو جانتے ہو کہ کتنی پرانی ملاقات ہے ہماری میاں نظیر سے۔ بتانا تھا تو ہماری دکان پر بیٹھ کر سناتے ۔ وہاں شعر پڑھ کر ان کو بھی بے عزت کیا اور ہمیں بھی ! واہ ! —— اسی پر تو کہا ہے حضرت نظیر نے کہ

دل سا در یتیم بکا کوڑیوں کے مول
کیا کیجیے نصیب یہ ہم جیسے ... نصیب

اچھا سناؤ کچھ اپنی آواز سے۔

**لڑکا** : آپ فرمائیے کیا سناؤں ؟

**پتنگ والا** : وہی نظم سناؤ تیراکی والی ؟ اور کیا ؟

**لڑکا** : ـــ

ادنیٰ غریب مفلس زردار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

جمنا کا پاٹ گویا صحن چمن ہے یارے
پیراک اس میں پیریں جیسے کہ چاند تارے
منہ چاند کے سے ٹکڑے تن گورے گورے پیارے
پریوں سے پھر رہے ہیں منجدھار اور کنارے

کچھ وار پیرتے ہیں کچھ پار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

کتنے کھڑے سری پیریں اپنا دکھا کے سینہ
سینہ چمک رہا ہے ہیرے کا جوں نگینہ
آدھے بدن پہ پانی آدھے پہ ہے پسینہ
سردوں کا بہہ چلا ہے گویا کہ اک قرینہ

دامن کمر پہ باندھے دستار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

ناؤں میں وہ جو گارہے ناچوں میں چمک رہے ہیں
جوڑے بدن میں نگیں گہنے جھمک رہے ہیں
تانیں ہوا میں اڑتیں طبلے کھڑک رہے ہیں
عیش و طرب کی دھومیں پانی چھپک رہے ہیں

سو ٹھاٹھ کے بنا کر اطوار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

میران بولتے ہیں سید کبیر کی جے

پھر اس کے بعد اپنے اُستاد پیر کی جے
مورمکٹ کنھیا جمنا کے تیر کی جے
پھر غول کے سب اپنے خورد و کبیر کی جے

ہر دم یہ کر خوشی کی گفتار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

کیا کیا تغیر یاں کے ہیں پیرنے کے بانی
ہے جن کے پیرنے کی ملکوں میں آن ملی
اُستاد اور خلیفہ شاگرد یار جانی
سب خوش ہیں، بنہ ہے جنکا [illegible] کے بیچ پانی

کیا کیا ہنسی خوشی سے ہر بار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

(نظم کے دوران میں بہت سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ جن میں
خوانچے والے بھی شامل ہیں)

**پتنگ والا**: واہ واہ! میاں بھی کلام تو دل کو لگتا ہے۔ پر زمانے نے قدر نہ کی یار اس شاعر کی۔ کہتا ہے ؎

نہ گل اپنا نہ خار اپنا نہ ظالم باغباں اپنا
بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا

**سب**: واہ واہ کیا کہنے ہیں۔

**گھوڑوں کا تاجر**: (جو نظم کے دوران میں اندر آیا تھا اور راہگیروں میں شامل ہو گیا تھا) بالکل سچ! بالکل درست! بہت حسبِ حال کہا ہے۔

متفکر حسین لوگوں کے گروہ میں چھپے ہوئے کھڑے ہیں آواز
سُن کر پتنگ والا ان کی طرف لپکتا ہے مجمع کی صفوں کو چیرتے

ہوئے بڑھتا ہے۔ تو بیچ میں منظور حسین کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں)

**پتنگ والا:** ارے کون؟ منظور حسین؟ تم کہاں سے ٹپک پڑے بھئی! ہم نے تو سنا تھا کہ تم دکن کی طرف چلے گئے ہو۔

**گھوڑوں کا تاجر:** سارے ملک کی خاک چھانتا پھرا۔ آج ہی واپس آیا۔

**پتنگ والا:** بیوپار کیسے چل رہا ہے؟ بہت بیچے گھوڑے۔

**گھوڑوں کا تاجر:** اسی کو کہتے ہیں صاحب گھوڑے بیچ کر سونا۔ حیدرآباد کی طرف گیا تھا۔ جاتے وقت تو ایسی تکلیف نہ ہوئی۔ واپسی پر فرنگیوں اور مرہٹوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ ناگپور کی طرف سے آنے والا تھا پھر وہاں سے کترا تا ہوا لڑائی کی تیزیوں سے بچ بچا کر آ رہا تھا کہ جھانسی کے پاس فرنگیوں کے بھگائے ہوئے ٹھگوں اور پنڈاریوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ جو کچھ تھوڑا بہت کمایا تھا وہ بھی ان کی نذر کر دیا۔ اور باقی ماندہ گھوڑے ان ہی کے کام آئے۔ لٹ لٹا کر میرٹھ ہوتا ہوا آ رہا ہوں۔

(اب تک دونوں وہیں اسٹیج کے بیچ میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اب پتنگ والا منظور حسین کو پان کی دکان پر لے آتا ہے)

**پتنگ والا:** ہے ہے! بہت بُرا زمانہ آ رہا ہے یار!

**گھوڑوں کا تاجر:** میرٹھ میں دیکھا کہ ہر شخص فرنگیوں سے بیزار ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہندوستانی جو فرنگیوں کی فوج میں ملازم ہیں اپنے افسروں سے برگشتہ ہیں۔ نہ جانے زمانہ کیا کیا انقلابات دکھائے! خیر یہ چھوڑو تم اپنی سناؤ!

**پتنگ والا:** اپنی کیا سناؤں! لوگوں میں وہ شوق ہی نہ رہا۔ پتنگ بازی کا! یا اگر شوق ہے تو کیسہ خالی (پان پیش کرتا ہے۔ اور دکان کی طرف واپس آتا ہے۔ راستے میں رک کر کہتا ہے) لیکن تمہاری بات سے میاں نظیر پھر یاد آ گئے۔ ٹھگوں کے بارے میں بھی کہا ہے اور جنگ کے بارے میں بھی سنو پہلے ٹھگوں کے بارے میں سنو۔ فرماتے ہیں ؎

گر یاں کو نہ ہے اچکا تو چیدرات میں ہے

نٹ کھٹ کی کچھ نہ پوچھو ہر بات بات میں ہے
اُس کے بغل میں گپتی تیغ اُسکی ہات میں ہے
وہ اُس کی فکر میں ہے یہ اُس کی گھات میں ہے

ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

**گھوڑوں کا تاجر** : بھئی بہت برجستہ کہا ہے۔
**پتنگ والا** : اور سنو! جنگ کا بھی راز بتا دیا ہے۔ کہتے ہیں

ہوتی ہیں زر کے واسطے ہر جا چڑھائیاں
کٹتے ہیں ہاتھ پاؤں گلے اور کلائیاں
بندوقیں ہیں کہیں۔ کہیں توپیں لگائیاں
کُل زر کی ہو رہی ہیں جہاں میں لڑائیاں

جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

**گھوڑوں کا تاجر** : بہت خوب کہا ہے۔ مَیں تو ملک کے ہر کونے کے چکر لگاتا رہتا ہوں۔ بالکل یہی حال ہے چاروں طرف۔
**پتنگ والا** : اور تمہارے بارے میں بھی کہا ہے۔

(یہ کہہ کر منظور حسین کو دکان میں بٹھاتا اور خود دکان کے باہر کھڑا رہتا ہے)

**گھوڑوں کا تاجر** : اچھا؟
**پتنگ والا** : جا لوگ روم و شام میں زر کو کماتے ہیں
تا چین چیں سے زر کے جہاز آتے جاتے ہیں

دکن سے زر کے واسطے سب یاں کو آتے ہیں
اور یاں سے زر کے واسطے دکن جاتے ہیں

جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

**گھوڑوں کا تاجر:** (ہنس کر) واہ وا۔ سب پیسے کا کھیل ہے۔ بالکل ٹھیک۔

**پتنگ والا:** یار اپنے کو تو یہی کلام اچھا لگتا ہے اور یہی شعر ہم جیسے جاہلوں کی سمجھ میں آتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے بھیا کہ اپنے دل کا حال مل جاتا ہے ان شعروں میں اور اپنے آس پاس کی دنیا کا حال۔ اور طرہ یہ ہے کہ ہمارے شاعر نے وطن سے باہر قدم نہیں رکھا۔ یہیں بیٹھے بیٹھے ساری دنیا دیکھ لی! کہتے ہیں۔

(آواز اٹھا کر)

سب کتابوں کے کھل گئے معنی
جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

(کتب فروش کی دکان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کتب فروش کتاب کے پیچھے سے سر اٹھا کر دیکھتا ہے۔ طیش کے مارے اس کی نگاہیں سرخ ہو گئی ہیں۔ پتنگ والا حمید کے برابر بنچ پر بیٹھ جاتا ہے اور حمید سے کہتا ہے)

کچھ اور سنا یار!

**لڑکا:** کیا سناؤں؟

**پتنگ والا:** نظیر کا کلام سناؤ میاں اور کیا سناؤ گے؟ اس کا ہر شعر بے نظیر ہے۔

**لڑکا:** کہتے ہیں جس کو نظیر سنئے ٹک اس کا بیاں
تھا وہ معلم غریب بزدل و ترسندہ جاں

سست روش پست قد ، حلقۂ ارشادی نژاد
تن بھی کچھ ایسا ہی تھا قد کے موافق میاں
ماتھے پر اک خال تھا ، چھوٹا سا سکے کے طور
تھا وہ پڑا آنکھ اُوپر ، ابروؤں کے درمیاں
وضع سُبک اس کی تھی بس یہ نہ رکھتا تھا ریش
مونچھیں بھی تھیں اور کانوں پر پٹے بھی تھے پنبہ ساں
پیری میں تھی جس طرح ، اس کو دل افسردگی
ویسی ہی تھی ان دنوں ، جن دنوں وہ تھا جواں
فضل نے اللہ کے ، اس کو دیا عمر بھر
عزت و حرمت کے ساتھ پارچہ و آب و ناں

**سب :** واہ واہ واہ واہ ! کیا انکساری ہے ۔ وغیرہ وغیرہ !

( بائیں راستے سے ایک لڑکی اچھلتی کودتی داخل ہوتی ہے ۔ )

**لڑکی :** ( گنگناتی ہے ) کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے ۔
لڈو والے کے پاس جا کر ، جو اسٹیج کے بائیں حصے میں
کتب فروش کی دکان کے پاس بیٹھ گیا ہے ۔

لڈو دو ۔

**لڈو والا :** ایک پیسے کے چار ۔

**پتنگ والا :** ارے بیٹا ! لڈو کھا رہی ہے ؟
( آگے بڑھتا ہے اور اسٹیج کے بیچوں بیچ لڑکی کے سامنے
آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور دونوں ہاتھوں سے اسے
پکڑ لیتا ہے )

لڑکی : ہاں !

پتنگ والا : (منظور سے) میاں تنکیر کی نواسی ہے۔ (لڑکی سے) نانا کیا کر رہے ہیں ؟

لڑکی : مَیں بتاؤں ؟ پڑھا رہے ہیں۔

پتنگ والا : اور تم لڈو کھا رہی ہو۔ کس نے دیئے پیسے ؟

لڑکی : مَیں بتاؤں ! نانا کو پڑھانے کے پیسے ملتے ہیں نا !

پتنگ والا : اور تم موج کرتی ہو۔ کیوں ؟

لڑکی : نہیں امّی بتاؤں۔ ہمارے نانا پیسے کو ہاتھ نہیں لگاتے ہیں نا۔ جیسے ہم کو اماں کہتی ہیں نا۔ کہ گندی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیئے ؟ ویسے ہی نانا نے آج پیسے کو رومال سے باندھ کر کونے میں پھینک دیا۔

پتنگ والا : اور تم نے اُٹھا لیا ؟

لڑکی : نہیں ! سب تھوڑا ہی ! خالی ایک پیسہ !

پتنگ والا : اور لڈو کھانے چلی آئیں ! شیطان کہیں کی۔

لڑکی : باقی پیسے امّی کو دے دیئے۔

پتنگ والا : ارے پھر تو شیطان نہیں ہے۔ بڑی نیک بٹیا ہے۔ (لڑکی ہنس کر جس طرف سے آئی تھی چلی جاتی ہے) سُن لیا صاحب ؟ (منظور سے) حال ہی کا واقعہ ہے نواب سعادت علی خاں کے پاس آدمی آیا تھا روپیہ لے کر۔ رات بھر روپیہ گھر میں پڑا رہا اور روپے کی وجہ سے انھیں نیند نہ آئی۔ صبح کو جواب میں کہلوا بھیجا کہ نوز اسے تعلق سے تو یہ حال ہے اگر زندگی بھر کا ساتھ ہو گیا تو نہ جانے کیا ہوگا (دکان کی طرف جاتے ہوئے) لکھنؤ سے روپیہ آیا۔ اور حیدرآباد کے چندو لال کے پاس سے بھی بُلاوا آیا۔ پر میرا یار آگرے سے نہ ٹلا (حمید کے برابر بیٹھتے ہوئے) ورنہ اگر چاہتا تو وہ بھی دوسرے استادوں کی طرح دربار کا شاعر بن سکتا تھا۔

گھوڑے کا تاجر : بھئی میری تو پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ آج عجیب و غریب حالات میں

ڈر بیٹھ گئی۔ عجیب ولی صفت آدمی ہے۔ یہ عالمگیر روز تاج گنج سے مائی تھان ٹٹو پر
جاتے ہیں لالہ بلاس رائے کھتری کے لڑکوں کو پڑھانے کے لیے۔ بس ٹٹو پر چلے آ رہے
تھے راستے میں وہ اڑ گیا۔ ایک چابک جو اس کے رسید کی تو وہ نیچے لگتی ہوئی ٹٹو کے لگی۔ میں
نے کہا میاں میرا ایسا کیا قصور تھا کہ صبح ہی صبح چابک سے خبر لی۔ میاں نظیر ٹٹو سے اتر
پڑے اور زبردستی میرے ہاتھ میں چابک دے کر کہا کہ میاں میرے بھی ایک جڑ دو۔ بدلہ ہو جائیگا
میں کہہ کر پچھتایا۔ وہ نہ مانے آخر مجبوراً میں نے چابک لیکر ان کے ذرا سا چھوا دیا۔ کیا کرتا انھوں
نے چابک وہیں زمین پر پٹخ دی۔ کہنے لگے پہنچنے میں چاہے کتنی ہی دیر لگے بس آج کے دن
سے چابک کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔

(برتن والا جو اپنی دکان میں بیٹھے بیٹھے یہ باتیں بڑے غور سے
سن رہا تھا۔ اپنی جگہ سے اچھل پڑتا ہے اور سب کو سناتے
ہوئے گاتا ہے)

**برتن والا:** پہلے نانوں گنیش کا لیجے سیس نوائے
جائے کارج سدھ ہوں سدا مہورت لائے

بول بچن آنند کے پریم پیت اور چاہ
سن لو یارو دھیان دھر، مہادیو کا بیاہ

جوگی جنگی سے سنا، وہ بھی کیا بیان
اور کتھا میں جو سنا اس کا بھی پرمان

سننے والے بھی رہیں ہنسی خوشی دن رین
اور جو پڑھیں ہو یاد کر ان کو بھی سکھ چین

اور جس نے اس بیاہ کی مہمانی کی بنائے
اس کے بھی سر حال میں شیو جی رہیں سہائے

خوش رہے دن رات وہ کبھی نہ ہو دلگیر
مہماں اس کی بھی ہے جس کا ناؤں بخیر

سب : (مل کر گاتے ہیں)

مہماں اس کی بھی ہے جس کا ناؤں بخیر
مہماں اس کی بھی ہے جس کا ناؤں بخیر
مہماں اس کی بھی رہے جس کا ناؤں بخیر

ککڑی والا : (جو بہت دیر سے سہانے کے پاس کونے پر بیٹھا ہوا ہے) میاں کہاں رہتے ہیں یہ حضرت نظیر؟

پتنگ والا : کیوں کیا بات ہے؟

ککڑی والا : (اُٹھ کر) وہ بات یہ ہے کہ —— ایسے ہی ——

(پھر بیٹھ جاتا ہے)

پتنگ والا : آخر؟

ککڑی والا : میاں ایک بات پوچھوں آپ سے. اگر آپ بُرا نہ مانیں (آگے بڑھتا ہے)

پتنگ والا : اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟

ککڑی والا : یہ میاں نظیر غصے والے آدمی تو نہیں ہیں؟ (پاس پہنچ کر)

پتنگ والا : بہت رحمدل آدمی ہیں —————— کیوں؟

ککڑی والا : ہر آدمی سے بات کر لیتے ہیں؟

پتنگ والا : ہاں ہاں!

ککڑی والا : میری بات سنیں گے؟

پتنگ والا : ضرور سنیں گے؟ کسی کا دکھ ان سے نہیں دیکھا جاتا۔

ککڑی والا : نہیں دکھ کی بات نہیں میاں. ککڑیوں کی بات ہے۔

پتنگ والا : پھر تو ضرور سنیں گے. تمھاری باتیں سن کر تو ویسے بھی بڑا مزا آتا ہے۔

**ککڑی والا:** میری ککڑی پر دو چار شعر لکھ دیں گے؟

**پتنگ والا:** ضرور لکھیں گے اور خوب لکھیں گے۔ کتنوں کو اس طرح نظمیں لکھ کر دے دیں اور بھول گئے۔ ابھی کچھ دنوں کا واقعہ ہے ایک صاحب پہنچ گئے۔ ان کے ہاں۔ اپنے ٹوٹے ہوئے دل کا دکھڑا لے کر۔ کسی مہ جبین نے بے وفائی کی تھی ان کے ساتھ۔ ان کی بے وفائی کی داستان سنائی اور کہا کہ دل کو کیوں کر سمجھاؤں کسی پہلو چین نہیں لیتا۔ ہر دم آنکھوں کے سامنے اس بے وفا کی تصویر کھچی رہتی ہے۔ میاں نظیر نے اس کے حسب حال ایک نظم لکھ دی۔ بس اس صاحب کو چین آگیا۔ اب وہ نظم گنگناتے رہتے ہیں اور خوش و خرم پھرتے ہیں۔

**ککڑی والا:** رہتے کہاں ہیں میاں؟

**پتنگ والا:** بیگم باندہ کا محل دیکھا ہے؟

**ککڑی والا:** جی نہیں۔

**پتنگ والا:** ملکوں کی گلی دیکھی ہے؟

**ککڑی والا:** نہیں!

**پتنگ والا:** نوری دروازہ دیکھا ہے؟

**ککڑی والا:** جی نہیں میاں!

**پتنگ والا:** کہاں کے رہنے والے ہو؟

**ککڑی والا:** متھرا کے پاس کا رہنے والا ہوں۔

**پتنگ والا:** اچھا محلہ تاج گنج دیکھا ہے؟

**ککڑی والا:** جی ہاں دیکھا ہے۔

**پتنگ والا:** وہاں پہنچ کر کسی سے ملکوں والی گلی پوچھ لو اور بیگم باندہ کے محل پہنچ جاؤ۔ محل کے برابر ہی ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ وہ میاں نظیر کا ہے۔

(ککڑی والا خوشی خوشی بائیں راستے کی طرف بھاگتا ہے)

راستے کے پاس ایک اجنبی سے ٹکر ہوجاتی ہے )

**اجنبی** : اندھا ہو گیا ہے۔

**ککڑی والا** : معاف کرنا میاں ذرا جلدی میں ہوں۔

چلا جاتا ہے --- --- اجنبی بازار میں ٹہلتا ہے )

**پتنگ والا** : ( منظور سے ) ابھی کل میں دو چار احباب کے ساتھ ان کے گھر گیا۔ کنڈی کھٹکھٹائی۔ وہ باہر آئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ آٹے میں لت پت میاں نظیر جو کھٹ پر کھڑے ہیں۔ پہچان نہ پڑتے تھے۔ پوچھا میاں یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔ بولے تمھاری بھاوج بگڑ بیٹھی رہیں۔ کیا کرتا۔ سوچا خود ہی آٹا پیسوں۔ روٹی پکاؤں۔ میں نے کہا آپ اپنا کام کر چکے۔ اب ہم اپنا کیے دیتے ہیں۔ پھر ہم سب نے مل جل کر روٹی ڈالی اور کھانا پکایا۔ خود بھی کھایا اور ان کی اہلیہ کو منا کر کھلایا پلایا۔

**گھوڑوں کا تاجر** : یار شاعر اگر آدمی اچھا نہ ہو تو اس کے شعر بھی ہرگز اچھے نہ ہوں گے۔

**پتنگ والا** : ( حمید اور ان لوگوں کو سناتے ہوئے۔ جو اب تک وہاں جمع ہیں ) اچھا آدمی بھی ایسا کہ لاکھوں میں ایک ! ہر آدمی سے کھل کے ملتے ہیں۔ چھوٹا بڑا۔ اچھا برا۔ امیر غریب۔ ہندو مسلم سب ان کے لیے برابر ہیں۔ چاہے وہ پتنگ بنانے والا ہو۔ چاہے کتاب بیچنے والا۔ ان کے لیے تو بس آدمی ہے اور کچھ نہیں۔

( آواز اٹھا کر اور کتب فروش کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے

کتب فروش غصے سے سرخ ہو رہا ہے )

**اجنبی** : ( کتب فروش سے ) کلامِ ناسخ ہے آپ کے یہاں !

**کتب فروش** : ( پتنگ والے کا غصہ اس اجنبی پر نکالتا ہے۔ بوقع پاتے ہی برس پڑتا ہے ) میاں ناسخ کل کے چھوکرے ہیں۔ ابھی ابھی شعر کہنا شروع کیا ہے اور ابھی سے آپ ان کے کلام کی تلاش میں نکل پڑے۔ ایسا ہی شوق ہے تو لکھنؤ تشریف لے جائیے اور خود سن لیجیے۔

یہ اجنبی بہت دیر سے بازار کے چکر کاٹ رہا ہے آوارہ گرد

ہے۔ لوگوں کے منہ تکتا رہتا ہے اور ہر جگہ دخل انداز ہوتا
جا رہتا ہے۔ اُسے دنیا میں کوئی کام نہیں )

**اجنبی** : ابھی ابھی یہاں کچھ لوگ بیٹھے گفتگو کر رہے تھے ناسخ صاحب کا ایک شعر میرے کان
میں پڑا۔ میں نے سوچا

**کُتب فروش** : کہ میں نے اپنی کتابوں کے اشتہار کے لیے لوگوں کو اکٹھا کر لیا ہے۔ یہ شوق اور یہ
جہالت! سبحان اللہ!

( اجنبی مڑ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ لیکن گھوم کر پھر حملہ کرتا ہے )

**اجنبی** : یہ اتنے لوگ یہاں کیوں اکٹھا ہو گئے ہیں صاحب ؟

**کتب فروش** : ( غصے سے بے قابو ہو کر ) آپ ہی کی طرح کے جاہل ہیں۔ ایک جاہل کا کلام سننے کے
لیے جمع ہو گئے ہیں ( اجنبی سٹ پٹا کر چلا جاتا ہے۔ لوگ قہقہہ لگاتے ہیں ) ایک سے ایک چلا آتا
ہے۔ صبح سے دکان کھول کر بیٹھتے ہیں۔ جو بھی ہے طرح طرح کے سوالات لے کر پہنچ جاتا ہے
خرید و فروخت کی بات ہی نہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔

## کورس

بیٹھے ہیں سب دکان لگا پیٹ کے لیے

بیٹھے ہیں مسجدوں میں مصلّے بچھا بچھا — بجتے ہیں کے ہاتھ میں تسبیح کو پھرا
واعظ کے ہر سخن میں ہے کھانے کا مُدعا — عابد بھی دونوں کی عبادت ہے کر رہا

زاہد بھی مانگتا ہے دُعا پیٹ کے لیے
بیٹھے ہیں سب دکان لگا پیٹ کے لیے

نٹ کھٹ اُچکے چور دغا باز راہ مار — عیار جیب کترے دغا باز ہوشیار
سب اپنے اپنے پیٹ کے کرتے ہیں کاروبار — کوئی خدا کے واسطے کرتا نہیں شکار

بلی بھی مارتی ہے چوہا پیٹ کے لیے
بیٹھے ہیں سب دکان لگا پیٹ کے لیے

بانکا سپاہی خوب شجاعت میں بے جگر وہ بھی اسی کے واسطے ہے تیغ اور تبر
لڑتا ہے توپ تیر تفنگوں میں آن کر کھاتا ہے زخم جسم خوں میں ہوتا ہے تر بتر
آخر کو سر بھی دے ہے کٹا پیٹ کے لیے
بیٹھے ہیں سب دکان لگا پیٹ کے لیے

الفت کسی کے دل میں کسی میں پڑا ہے بیر مانے کوئی حرم کو کوئی پوجتا ہے دیر
کھانے کی ساری دوستی کھانے کی ساری سیر کہتا ہے صاحب فقیر بھی دے کر دعائے خیر
بابا کچھ آج مجھ کو دلا پیٹ کے لیے
بیٹھے ہیں سب دکان لگا پیٹ کے لیے

ہیں جن کے پاس منصب و جاگیر و مال و جاہ خوباں بھی ان کے ساتھ کریں ہیں سدا نباہ
کھانے کی ساری دوستی کھانے کی ساری چاہ دیکھا جو خوب غور سے ہم نے تو واہ واہ
معشوق بھی کرے ہیں دغا پیٹ کے لیے
بیٹھے ہیں سب دکان لگا پیٹ کے لیے

فاضل کے فضل میں بھی اسی کی ہے التجا عابد نجومی کا بھی اسی پر ہے مدعا
ملا بھی دن گزارے ہے لڑکے پڑھا پڑھا شاعر بھی دیکھئے تو قصیدے سنا سنا
کیا کیا کرے ہے وصف و ثنا پیٹ کے لیے
بیٹھے ہیں سب دکان لگا پیٹ کے لیے

جن کا شکم بھرا ہے وہ ہنستے ہیں مثل پھول خالی ہے جس کا پیٹ وہ رہتا ہے ہو ملول
جب تک نہ ہو گڑھے میں پڑے آ کے خاک دھول سوجھے حرم نہ دیر نہ اللہ نہ رسول
جو جو کلا کرے سو کیا پیٹ کے لیے

بیٹھے ہیں سب دکان لگا پیٹ کے لیے

کرتا ہے کوئی جور و جفا پیٹ کے لیے  سہتا ہے کوئی رنج و بلا پیٹ کے لیے
سیکھا ہے کوئی مکر و دغا پیٹ کے لیے  پھرتا ہے کوئی بے سر و پا پیٹ کے لیے

جو ہے سو رو رہا ہے خدا پیٹ کے لیے
بیٹھے ہیں سب دکان لگا پیٹ کے لیے

زردار مال دار گدا شاہ کیا وزیر  سردار کیا غریب تونگر ہو یا فقیر
ہر دم سبھوں کو دیکھا اسی حال میں اسیر  اپنی ہی دھن ہے شب و روز اے نظیر

دے شرم و آبرو سے خدا پیٹ کے لیے
بیٹھے ہیں سب دکان لگا پیٹ کے لیے

( فقیروں کا گانا ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ککڑی والا بائیں راستے
سے بہت تیزی سے داخل ہوتا ہے۔ چہرے پر بشاشت
ہونٹوں پر گانا۔ اس کے پیچھے بچے شور مچاتے ہوئے ایک
قطار میں داخل ہوتے ہیں۔ ککڑی والا پان والے کی بیچ پر
بیٹھ جاتا ہے اور بڑی خوش الحانی سے گا گا کر ککڑی بیچتا
ہے۔ نظم کا ہر بند دو چار آدمیوں کو ککڑی کا خریدار بنا لیتا ہے )

ککڑی والا:

پہنچے نہ اس کو ہرگز کابل دسے کی ککڑی  نے پورب اور پچھم خوبی بھرے کی ککڑی
نے چین کے پرے کی اور نے ورے کی ککڑی  نے دکن اور نہ ہرگز اس سے پرے کی ککڑی

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

کیا پیاری پیاری میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں  گنّے کی پوریاں ہیں ریشم کی تکلیاں ہیں

فرہاد کی نگاہیں شیریں کی ہنسیاں ہیں — مجنوں کی سرد آہیں لیلےٰ کی انگلیاں ہیں

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

کوئی ہے سیدھی سادی کوئی ہری بھری ہے — پکھراج منفعل ہے پنے کو تھرتھری ہے

ٹیڑھی ہے سو تو چوٹی وہ ہیر کی پری ہے — سیدھی ہے سو وہ یارو رانجھا کی بانسری ہے

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

چھونے میں برگ گل ہے کھانے میں کرکری ہے — گرمی کے مارنے کو اک تیر کی سری ہے

آنکھوں میں سکھ کلیجے ٹھنڈک ہری بھری ہے — ککڑی نہ کہیے اس کو ککڑی نہیں پری ہے

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

بل اس کی لچی نازک جوں زلف پیچ کھائی — پیچ ایسے چھوٹے چھوٹے خشخاس پا کر رائی

دیکھ اس کی ایسی نرمی باریکی اور گلائی — آتی ہے یاد ہم کو محبوب کی کلائی

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

جو ایک بار یارو اس جا کی کھائے ککڑی — پھر جا کہیں کی ہرگز اس کو نہ بھائے ککڑی

دل تو فقیر غش ہے یعنی منگائے ککڑی — ککڑی ہے یا قیامت کیا کہیے ہائے ککڑی

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

(پیچھے کے دروازے سے گاتا ناچتا نکل جاتا ہے۔ امین

راستے سے ترابعزہ طبلہ گاتے ہوئے داخل ہوتا ہے اور

دائیں سے باہر چلا جاتا ہے )

**تربوزوالا**

کیوں نہ ہو سبز زمرد کے برابر تربوز
کرتا ہے خنک کلیجے کے تئیں تر تربوز
دل کی گرمی کو نکالے ہے یہ اکثر تربوز
جس طرف دیکھیے بنتے ہیں بہتر تربوز

اب تو بازار میں بکتے ہیں سراسر تربوز

( چلا جاتا ہے )

**لڈو والا** : ( باہر راستے سے گاتا ہوا آتا ہے )

ہم کو تو ہیں گے دل سے خوش آئے تل کے لڈو
جیتے رہے تو یارو پھر کھائے تل کے لڈو
کوچے گلی میں ہر جا بکوائے تل کے لڈو
ہم نے بھی گڑ منگا کر بندھوائے تل کے لڈو

( پیچھے کے دروازے سے نکل جاتا ہے )

( برتن والا اپنی دکان ہی پر مٹکا بجاتے ہوئے گانا شروع
کر دیتا ہے )

**برتن والا** :

کورے برتن ہیں کیاری گلشن کی جس سے کھلتی ہے ہر کلی بن کی
بوند پانی کی ان میں جب کھنکی کیا وہ پیاری صدا ہے سن سن کی
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

کورے کوروں کو دیکھ عالم میں　　کورے مصری کے بھر گئے غم میں
یوں وہ رستے میں آ گئے نم میں　　جیسے ڈوبے ہوں پھول شبنم میں

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

جس صراحی میں سرد پانی ہے　　موتی کی آب پانی پانی ہے
زندگی کی یہی نشانی ہے　　دوستو یہ بھی بات مانی ہے

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

خاک سے جب یہ ان کو گڑھتے ہیں　　بندگی سے یہ اپنی بڑھتے ہیں
کوزوں پر پھول ہار چڑھتے ہیں　　حور و غلماں درود پڑھتے ہیں

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

کوزوں پر جو نقش جو بن ہے　　جو جڑے ہیں کہاں وہ کن کن ہے
جس گھڑونچی پہ کونہ آسن ہے　　وہ گھڑونچی نہیں ہے گلشن ہے

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

**پتنگ والا:** (موج میں آ کر)

ہاں جن دنوں میں ہوتا ہے آنا پتنگ کا　　ٹھپے ہے ہر مکان میں بنانا پتنگ کا
ہوتا ہے کترنوں سے بنانا پتنگ کا　　کرتا ہے شاد دل کو اڑانا پتنگ کا
کیا کیا گھروں میں شور مچانا پتنگ کا
ہر لحظہ اس بہار سے اڑتا ہے طُرّہ　　بلبل سمجھ کے گل جسے ہو جائے مبتلا

گھائل کے اُڑنے کی بھی صفت اب کروں میں کیا　　گھائل جو عشق کے ہیں وہ کہتے ہیں برملا

ہے دل میں خوب شوق بڑھاتا پتنگ کا

اُڑتا لنگوٹیے کا ہے کچھ ایسا ارجمند　　گر تُسے دیکھئے جسے آوے لنگوٹ بند

اور چاند تارے کی بھی چمک چاند سے دو چند　　اُڑتا پہاڑتیے کا بھی ہے اس قدر بلند

اکھڑے تو پھر فلک پہ ہو پانا پتنگ کا

اُڑتا گلہریے کا میں اب کیا کروں بیاں　　دیکھیں درخت پر جسے چڑھ کر گلہریاں

اور ہے دو دھاریے کی بھی کچھ اور آن بان　　حیراں ہو جس سے تیغ نگاہِ پری رخاں

پھر کس طرح نہ دل ہو دِوانا پتنگ کا

کٹتا ہے جو پتنگ تو پھر لوٹنے اسے　　دو دو ہزار دوڑتے ہیں چھوٹے اور بڑے

کاغذ نہ اس کا ملتا ہے یا لکڑے کانپ کے　　جب اس طرح کی سیر بھلا آن کے پڑے

پھر سوچئے تو ہے کیا ٹھکانا پتنگ کا

اس آگرے میں یہ بھی تماشا ہے دلپذیر　　ہوتے ہیں دیکھ شاد لے خورد اور کبیر

کیوں کر نہ دل پتنگ کی ہو ڈور میں اسیر　　خوباں کے دیکھنے کے لیے کیا بیاں نظیر

ہے یہ بھی ایک طرفہ بہانا پتنگ کا

(یکایک پس منظر سے طربیہ موسیقی کی تانیں بلند ہوتی ہیں مداری

ڈھول کی تال پر رقص کرتا ہوا بائیں راستے سے داخل ہوتا ہے

سر پر ہیٹ ہے اور اس کے ساتھ بندر کے بجائے ایک

ریچھ ہے۔ مداری اسٹیج کے بیچ میں آکر رک جاتا ہے اور تال

پر ہیٹ یکایک سر سے پھینک دیتا ہے۔ اس نے ہیٹ

کے نیچے گاندھی ٹوپی پہن رکھی تھی جو ہیٹ کے ہٹتے ہی نمایاں

ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ہاتھ کے سونٹے کو موسیقی کی تال پر

ایک جھٹکا دیتا ہے تو اس میں سے ایک ترنگا کھل کر فضا
میں لہرانے لگتا ہے۔ مداری گانا گاتا ہے اور کھیل دکھاتا
ہے۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں )

مداری :

کل راہ میں جلتے جو ملا ریچھ کا بچہ — لے آئے وہیں ہم بھی اٹھا ریچھ کا بچہ
سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچہ — جس وقت بڑا ریچھ ہوا ریچھ کا بچہ
جب ہم بھی چلے ساتھ چلا ریچھ کا بچہ

تھا ہاتھ میں اک اپنے سوا من کا جو سونٹا — لوہے کی کڑی جس پہ کھڑکتی تھی سراپا
کاندھے پہ چڑھا جھولنا اور ہاتھ میں پیالا — بازار میں لے آئے دکھانے کو تماشا
آگے تو ہم اور پیچھے چلا ریچھ کا بچہ

تھا ریچھ کے بچے پہ وہ گہنا جو سراسر — ہاتھوں میں کڑے سونے کے بجتے تھے جھمک کر
کانوں میں دُر اور گھنگرو پڑے پاؤں کے اندر — وہ ڈوری بھی ریشم کی بنائی تھی جو پُر زر
جس ڈوری سے یاں بندھا تھا ریچھ کا بچہ

جھمکے وہ جھمکتے تھے پڑے جیسے کرن پھول — مقیش کی ڈوریوں کی پڑی پیٹھ اور جھول
اور اس کے سوا کتنے بنائے تھے جو گل پھول — یوں لوگ گرے پڑتے تھے سر پاؤں کی سدھ بھول
گویا وہ پری تھا کہ نہ تھا ریچھ کا بچہ

کہتا تھا کوئی ہم سے میاں آؤ قلندر — اب کیا ہوئے اگلے جو تمہارے تھے وہ بندر
ہم ان سے یہ کہتے تھے یہ پیشہ ہے قلندر — ہاں چھوڑ دیا بابا انھیں جنگل کے اندر
جس دن سے - - - یا ریچھ کا بچہ

مدت میں اب اس بچے کو ہم نے ہے سدھایا — لڑنے کے سوا ناچ بھی اس کو ہے سکھایا
یہ کہہ کے جو ڈفلی کے تئیں گت پہ بجایا — اس ڈھب سے اسے چوک کے جمگھٹ میں نچایا

جو سب کی نگاہوں میں کھپا ریچھ کا بچہ

پھر ناچ کے وہ راگ بھی گا یا کہ وہاں آہ — پھر کبر وانا چا تو ہر اک بولی زباں آہ
ہر چار طرف تھے کھے ہیر و جواں آہ — سب ہنس کے یہ کہتے تھے ارے واہ میاں آہ

کیا تم نے دیا خوب نچا ریچھ کا بچہ

پھر ہم نے اٹھا ہاتھ کڑوں کو جو ہلایا — خم ٹھونک پہلواں کی طرح لڑنے کو آیا
لپٹا وہ تو کشتی کا ہنر آن دکھایا — وہ چھوٹے بڑے جتنے تھے ان سب کو رجھایا

ہم بھی نہ تھکے اور نہ تھکا ریچھ کا بچہ

پھر کشتی کی ٹھہری تو وہیں سر کو جو جھاڑا — للکارتے ہی اس نے ہمیں آن لتاڑا
گہہ ہم نے پچھاڑا اسے گہہ اس نے پچھاڑا — اک ڈیڑھ پہر ہو گیا کشتی کا اکھاڑا

گو ہم بھی نہ ہارے نہ ہٹا ریچھ کا بچہ

ان داؤں میں بیچوں میں جو کشتی میں ہوئی دیر — یوں پڑتے روپے پیسے کہ آندھی میں گرے بیر
سب نقد ہوئے آکے سوا لاکھ روپے ڈھیر — جو کہتا تھا ہر اک سے اسی طرح سے منہ پھیر

یارو تو لڑا دیکھو ذرا ریچھ کا بچہ

جس دن سے نظیرؔ اپنے تو دلشادی ہیں — جاتے ہیں جدھر کو ادھر ارشادی ہیں
سب کہتے ہیں وہ صاحب ایجادی ہیں — کیا دیکھتے ہو تم کھڑے استادی ہیں

کل چوک میں جن کا تھا لڑا ریچھ کا بچہ

( جیسے ہی مداری ہیٹ پھینک دیتا ہے، بازار میں ایک ہلچل ہوتی ہے اور گانے کے دوران میں بازار میں بہت سی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ کتب فروش اپنی دکان سے کتب خانہ "بلبہ" کا سائن بورڈ نکال کر باہر جاتا ہے، اور ایک دوسرا بورڈ لا کر دکان پر لگا دیتا

ہے جس پر لکھا ہے :

DIARIS FOR 1954 AVAILABLE AT

20TH CENTURY BOOK DEPOT

اس حال پنواڑی اپنی دکان میں اونٹ بیٹھی ۔ گلے الٹ جبہ
گاندھی جی، پنڈت نہرو، ثریا اور نرگس کی تصویریں یا ان کی
تصویروں والے کیلنڈر لگا لیتا ہے ایک آدمی سائیکل
پہ پان کی دکان پر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ درزی باہر جا کر
ہاتھ کی ایک مشین دکان میں لے آتا ہے ۔ بیسویں صدی کے
آدمی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ۔ سوٹ یا پھول دار امریکن
بش شرٹ پہنے ۔ سگریٹ کا دھواں اڑاتے ۔

اسی ہنگامے میں ہولی گانے والوں کی ایک ٹولی آتی ہے
ان میں کچھ مرد عورتوں کے لباس میں ہیں ۔ پیچھے کے دروازے
سے آتے ہیں اور اسٹیج کے بیچ میں آکر گاتے بجاتے اور
تھرکتے ناچتے ہیں اور فضا کو گلال اور موسیقی کے شور سے
رنگین بناتے ہوئے بائیں راستے سے نکل جاتے ہیں )

## ہولی گانے والے

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
خم شیشے جام چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا بیٹھے ہوں گل رو رنگ بھرے
کچھ بھیگی تانیں ہولی کی کچھ ناز و ادا کے ڈھنگ بھرے
دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے کچھ عیش کے دم منہ چنگ بھرے
کچھ گھنگرو تال چھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

سامان جہاں تک ہوتا ہے اس عشرت کے مطلوبوں کا
وہ سب سامان مہیا ہو اور باغ کھلا ہو خوبوں کا
ہر آن شرابیں ڈھلتی ہوں اور ٹھٹھ ہو رنگ کے ڈوبوں کا
اس عیش مزے کے عالم میں اک غول کھڑا محبوبوں کا
کپڑوں پر رنگ چھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

گلزار کھلے ہوں پریوں کے اور مجلس کی تیاری ہو
کپڑوں پر رنگ کے چھینٹوں سے خوش رنگ عجب گلکاری ہو
منہ لال گلابی آنکھیں ہوں اور ہاتھوں میں پچکاری ہو
اس رنگ بھری پچکاری کو انگیا پر تک کر ماری ہو
سینوں سے رنگ ڈھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اس رنگ رنگیلی مجلس میں وہ رنڈی ناچنے والی ہو
منہ جس کا چاند کا ٹکڑا ہو اور آنکھ بھی مے کی پیالی ہو
بدمست بڑی متوالی ہو ہر آن بجاتی تالی ہو
مے نوشی ہو بے ہوشی ہو بھڑوے کے منہ میں گالی ہو
بھڑوے بھی بھڑوا بکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اور ایک طرف دل لینے کو محبوب بھویوں کے لڑکے
ہر آن گھڑی گت بھرتے ہوں کچھ گھٹ گھٹ کے کچھ بڑھ بڑھ کے
کچھ ناز جتا دیں لڑ لڑ کے کچھ ہولی گا دیں اڑ اڑ کے
کچھ کافرنیں مٹکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

یہ لوگ گاتے بجاتے بائیں راستے سے نکل جاتے ہیں
ان کے ہٹتے ہی پیچھے کے دروازے سے آتے ہوئے
بچوں پر نظر پڑتی ہے یہ بچے ایک جلوس کی صورت
میں قطار در قطار خاموشی سے آتے ہیں اور اسٹیج پر دائیں
بائیں سامنے بیچ میں اور پیچھے ایک خاص ترتیب
سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے جسم پر چیتھڑے ہیں
چہرے پر مفلسی اور افسردگی ایک ہاتھ میں بھیک کے
ٹھیکرے اور دوسرے میں مختلف عنوانات کے اشتہار
بورڈ اور پلیکارڈ، ایک کے ہاتھ میں نظیر کی قد آدم تصویر
ہے۔ دوسرے کے ہاتھ میں ایک اعلان نامہ

یوم نظیر!
انڈو پاک مشاعرہ

کسی کے ہاتھ میں ترنگا ہے۔ اور کسی کے ہاتھ میں "یوم
آزادی" کا ایک پلیکارڈ

ان بچوں کے بالکل پیچھے فقیر "آدمی نامہ" گاتے ہوئے
اندر آتے ہیں۔ اس منظر میں نہ صرف اسٹیج پر کے سب لوگ
شامل ہو جاتے ہیں بلکہ اسٹیج کے پیچھے کام کرنے والے بھی

(نظم کے دوران ہی کچھ لوگ ہال سے اُٹھ کر اسٹیج پر
آتے ہیں اور کورس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ہر بند
ایک نیا آدمی اٹھاتا ہے اور ٹیپ کے بند میں سب
ایک ساتھ تین بار دہراتے ہیں اور مفلس و گدا ہے سو
ہے وہ بھی آدمی! ان کی آواز میں ترحم کے بجائے قوت
اور عزم کا جذبہ شامل ہے)

## کورس

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور
یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
ہے آدمی کا حسن و جمال و قبح میں ظہور
شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور

ہادی جو رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
قرآن آدمی ہی پڑھیں اور نمازیاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں

جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو لے کے مال
اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال
سچا بھی آدمی ہے نکلتا ہے میرے لال
اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار
اور آدمی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ صراحی جوتیاں دوڑے بغل میں مار
کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں دوڑتے کہار
اور اس میں جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کہتا ہے کوئی لو کوئی کہتا ہے لا رے لا
کس کس طرح سے بیچے ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی قہر سے لڑتے ہیں گھور گھور
اور آدمی ہی دیکھ انھیں بھاگتے ہیں دور
چاکر غلام آدمی اور آدمی مزدور
یاں تک کہ آدمی ہی اٹھاتے ہیں جا ضرور

اور اس نے جو پھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل و جواہر ہے بے بہا
اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ الٹا ہے جوں توا
گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند کا

بد شکل بد نما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں
روپے کے ان کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں
کمخواب تاش شال دوشالوں میں غرق ہیں

اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرتے ہیں آدمی کا کفن کرتے ہیں تیار
نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار
سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کے کاروبار

اور جو کہ مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر

یہ آدمی ہی کرتے ہیں سب کام دلپذیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اور مفلس وگدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس وگدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس وگدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

( گانے والوں کی لے اور سازوں کی صدا ایکبارگی بہت
اونچی اٹھتی ہے۔ اور بہت تیزی سے پردہ گرتا ہے

○

# لباس

**فقیر:** کفنی، لمبی ٹوپی، تہمد گلے میں بڑے موتیوں کے مالے، کانوں میں بالے، کندھے پر کشکول۔ ہات میں کڑے اور ڈنڈا۔

**ککڑی والا:** اونچی سی دھوتی، میلا سا کرتا۔ سر پر پگڑی نما ایک انگوچھا۔

**تربوز والا:** اونچی دھوتی۔ میلا سا کرتا۔ اوپر ایک پرانی سی مرزئی۔ سر پر ایک میلے کپڑے کی پگڑی۔

**لڈو والا:** بہت میلی دھوتی۔ میلا کرتا۔ سر پر کالی ٹوپی میلی سی۔

**برتن والا:** اونچی سی دھوتی۔ آدھی آستین کا شلوکا۔ سر پر تیلی سی میلی پگڑی۔

**پتنگ والا:** سلیم شاہی جوتا۔ چست پاجامہ۔ ململ کا پھولدار کرتا۔ کامدار صدری۔ پلے دار ٹوپی۔

**مداری:** لانگ بوٹ، دھوتی، خاکی رنگ کی ملیشیا کی فوجی قمیص۔ پرانے زمانے کا لمبا سا پرانا کوٹ۔ ہیٹ (پرانی سی) جھولا۔ ڈنڈا۔ ڈگڈگی۔

**بندر:** بندر کا لباس کپڑے کا بنا ہوا اور ماسک چہرہ۔

**کتب فروش:** سلیم شاہی جوتا۔ اونچا سا شرعی پاجامہ۔ نیچا نیچا کرتا انگیرو یا کسی اور رنگ کا) موتیوں والی ٹوپی۔ کندھے پر بڑا سا رومال۔

**شاعر نما آدمی:** سلیم شاہی جوتا (کامدار) چست پاجامہ۔ کرتا۔ انگرکھا یا اچکن۔ مخمل کی کشتی نما ٹوپی۔

**پھول:** سلیم شاہی سادا جوتا۔ شرعی پاجامہ۔ کرتا۔ انگرکھا یا اچکن۔ دو پلی ٹوپی۔

**تذکرہ نویس:** سلیم شاہی سادہ جوتا۔ شرعی پاجامہ۔ لمبا کرتا۔ صدری۔ جیبی گھڑی مع

زنجیر و قطب نما۔ عبا۔ عمامہ۔ سنہرے فریم کی چھوٹے بیضاوی شیشوں کی عینک۔ پرانی وضع کی چھڑی۔

**پتنگ کا گاہک:** سلیم شاہی کامدار جوتا۔ چست شفاف پاجامہ۔ رنگین کمربند۔ ململ کا کرتا پھولدار۔ شوخ رنگ کی صدری۔ سر پر مخمل کی کشتی نما ٹوپی۔

**گھوڑوں کا تاجر:** پرانا سا مضبوط سلیم شاہی جوتا۔ چوڑی چست پاجامہ۔ انگرکھا۔ سپاہیانہ انداز کی پگڑی۔

**راہگیر:** اچکن۔ کرتا۔ پاجامہ۔ ٹوپی۔

**کتاب کا گاہک:** پاجامہ۔ اچکن۔ کرتا۔ پگڑی۔ چھڑی۔ سلیم شاہی جوتا۔

**پان والا:** کرتا۔ دھوتی۔ دوپلی ٹوپی۔

**دیہاتی:** پگڑی۔ کرتا۔ دھوتی۔ صدری۔ شال۔ ڈنڈا

**ریچھ والا:** پھٹا پرانا گرم کوٹ۔ پھٹی پرانی ویسٹ (نیچے گاندھی ٹوپی) پیوند لگی پتلون۔ بوٹ۔

**ریچھ:** کالا کمبل اور ماسک (ریچھ کا چہرہ)

**لڑکی:** رنگین چست پاجامہ۔ ڈھیلا ڈھیلا لمبا رنگین کرتا۔ چھوٹی سی اوڑھنی۔

**اجنبی:** دوپلی یا کامدار مخمل کی ٹوپی۔ پھولدار سفید کرتا۔ چست پاجامہ۔ رنگین کمربند۔ سیاہ پیٹنٹ کا پمپ یا کامدار سلیم شاہی جوتا۔ ایک ہاتھ میں رنگین رومال۔ دوسرے ہاتھ کی کلائی میں پھولوں کا گجرا۔

○

# سامان

**کتابوں کی دکان**: طرح طرح کی مجلد اور غیر مجلد کتابیں۔ رجسٹر۔ قلمدان۔ جنتریاں وغیرہ
چند طغرے۔ فارسی کے قطعات۔ رباعیاں یا متفرق اشعار۔

**پتنگ کی دکان**: طرح طرح کی رنگین سادی۔ چھوٹی بڑی متعدد وضع کی پتنگیں۔ ڈور، مانجھا
چرخیاں۔

**برتن کی دکان**: طرح طرح کے چھوٹے بڑے مٹی کے برتن۔ ہانڈیاں۔ طشتریاں۔ پیالے
کونڈے۔ گھڑے۔ مٹکے وغیرہ۔

**پھول کی دکان**: طرح طرح کے رنگین اور سفید پھول۔ چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں میں۔ پھولوں
کے چھوٹے بڑے ہار (کناروں پر لٹکتے ہوئے) پھولوں کے مختلف وضع کے زیور کیلے
کے پتے۔

**پان کی دکان**: پیتل کے شفاف برتن۔ (کتھا چونا رکھنے کے لیے) چھوٹی چھوٹی پیتل کی پیالیاں
جس میں لونگ۔ الائچی تمباکو اور پان میں کھانے والے متعدد قسم کے مسالے۔
کتھئی رنگ کا یا سرخ ترل کا کپڑا پیتل کا ایک بڑا برتن جس میں پانی بھرا ہو۔ بھیگے ہوئے
سرخ کپڑے پر بنے ہوئے اور سادے پان۔ زنبیل۔ کرشن وشنو اور شنکر کی رنگین تصویریں

**پینٹر کی دکان**: چند مغل اور راجپوت آرٹ کی تصویریں۔ اسٹینڈ۔ پردہ۔ برش اور رنگ
کی پیالیاں۔

**ککڑی والا**: ایک ٹوکری، اور اس میں ہری ہری ککڑیاں۔

**تربوز والا**: ایک بڑا ٹوکرا۔ اس میں دو ایک ثابت اور ایک آدھ کٹا ہوا تربوز۔

**لڈو والا**: لوہے کی ایک تھالی۔ لڈو اور اس کو زمین پر رکھنے کے لیے ایک اسٹینڈ۔

**بندر:** ایک چھوٹا اسٹول چھوٹا سا آئینہ۔

**تذکرہ نویس:** ایک فائل میں تھوڑے سے لکھے اور بغیر لکھے ہوئے کاغذات۔

**شاعر نما آدمی:** ایک بیاض۔

**راہگیر:** ہاتھ میں ایک پرانی سی کتاب۔

**درزی کی دکان:** سلے بن سلے بہت سے کپڑے۔ کچھ تیار جو دیوار پر لٹکے ہوں گے اور کچھ قطع کیے ہوئے۔ سوئی۔ تاگا۔ قینچی۔ فیتہ۔ (کپڑے کا ) مشین کپڑے سینے کی۔ وقت بدلنے پر

**پنساری کی دکان:** بوریاں (اناج کی ) المونیم کے کنستر۔ ٹوکریاں میں مرچ نمک اور دوسرے مسالے۔ اچار کے مٹکے۔ اچار کی چھوٹی ہنڈیا۔ اچار دینے کے لیے۔

**کتب فروش:** مسلمان شعرا اور صوفیوں کے اقوال۔ اشعار۔ قطعات طغروں کی شکل میں۔ تاج۔ قلعہ آگرہ اور فتح پور سیکری کی عمارتوں کی تصویریں۔

**ہولی کھیلنے والے:** تھالی۔ گلال۔

○

# اس منجدھار میں

سعادت حسن منٹو

# کردار

بیگم : ماں

امجد :
مجید : } بیگم کے بیٹے

سعیدہ : امجد کی نئی نویلی حسین بیوی

اصغری : خادمہ

کریم اور غلام : نوکر

O

# پہلا منظر

( نگار سدِتلا کا ایک کمرہ —— اس کی خوبصورت شیشہ
لگی کھڑکیاں پہاڑی کی ڈھلوانوں کی طرف کھلتی ہیں۔ حدِ نظر تک
پہاڑ نظر آتے ہیں جو آسمان کی خاکستری اور نیلاہٹوں میں گھل
مل گئے ہیں۔ کھڑکیوں کے ریشمی پردے صبح کی ہلکی ہلکی ہوا سے
ہولے ہولے سرسرا رہے ہیں۔ یہ کمرہ جیسا کہ ساز و سامان سے
معلوم ہوتا ہے، حجلۂ عروسی میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ دائیں ہاتھ
کو کھڑکیوں کے پاس ساگوان کی مسہری ہے۔ اس کے ساتھ ہی
ایک کونے میں شیشے کی تپائی جس پر بلور کی صراحی اور گلاس کے
علاوہ ایک ٹائم پیس رکھی ہے۔ پیچھے ہٹ کر پیازی مخملیں
صوفہ سیٹ ہے۔ اس پر دو ملائم گدیاں سجا رہی ہیں —
اُس سے ذرا ہٹ کر ایک نوجوان خادمہ جو معمولی شکل و صورت
کی ہے۔ آتش دان پر سجی ہوئی مختصر چیزوں کو اور زیادہ
سجانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کمرے کی فضا میں ایسی دوشیزگی
ہے جو ذرا سی جنبش سے منکوحیت میں تبدیل ہو سکتی ہے —
باہر سے تھالوں پر کھرپی کی ننھی ننھی ضربوں کی آواز آتی ہے۔ تینوں
خادمہ پلے سے ذرا جھجک کے بعد پھر اپنے کام میں مشغول
رہتی ہیں —— دروازے سے ایک ادھیڑ عمر کی
وجیہ صورت بیساکھیوں کی مدد سے اندر آتی ہے اور کمرے کا

جائزہ لے کر اپنے اطمینان کا اظہار کرتی ہے )

**بیگم صاحب** : ( بیساکھیوں کی مدد سے کمرے میں ادھر ادھر پھر کر تمام چیزوں کو صحیح مقام پر دیکھ کر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ) ٹھیک ہے !

( ایک بیساکھی کو اپنی بغل سے الگ کر کے صوفے کے بازو کے ساتھ
رکھ کر بیٹھنا چاہتی ہے۔ مگر فوراً ہی اپنا ارادہ ترک کر دیتی ہے
ایسا کرتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ سہارے کے لیے صوفے کے
بازو کی چکیلی سطح کے ساتھ چھوا تھا۔ اور اس پر نشان پڑ گیا تھا۔
اپنے دوپٹے کا ایک کونہ پکڑ کر وہ بمشکل خود مٹ جانے والا نشان
بجھا دیتی ہے۔ اور پھر بیساکھی اپنی بغل میں جما کر نوجوان خادمہ سے
مخاطب ہوتی ہے۔

اصغری !

**اصغری** : ( فوراً متوجہ ہو کر ) جی !

**بیگم صاحب** : ( یکدم یہ محسوس کرتے کہ وہ بھول گئی ہے۔ کہ اس نے اصغری سے تخاطب کیوں کیا تھا ) میں کیا کہنے والی تھی ؟

**اصغری** : ( مسکراتی ہے ) آپ یہ کہنے والی تھیں کہ آپ کا اطمینان نہیں ہوا ——————— میں بھی یہی سمجھتی ہوں بیگم صاحب ——— ۔ دولہن بہت خوبصورت ہے ——————— ۔ اس کمرے کی تمام سجاوٹیں اس کے سامنے ماند پڑ جائیں گی ۔

( وہ آتش دان کے عین درمیان میں ایستادہ ریشمی ڈوریوں سے آویزاں دولہن
کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے )

**بیگم صاحب** : ( مسکراتی ہوئی ——————— آتش دان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔ اور اپنی بہو کی تصویر کو غور سے دیکھتی ہے ——— خوش ہوتی ہے۔ لیکن ایک دم گھبرا سی جاتی ہے ) اصغری !

**اصغری:** جی!

**بیگم صاحب:** صبح سے میری طبیعت ——— کچھ گھبرا سی رہی ہے۔

**اصغری:** امجد میاں جو آ رہے ہیں۔ اپنی دولہن کے ساتھ!

**بیگم صاحب:** (اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی) ہاں! ——— بس آنے ہی والا ہے ——— کمال موٹر لے کے گیا ہے اسٹیشن پر۔

**اصغری:** اگلے سال مجید میاں کی شادی کر دیجئے ——— گھر میں رونق ہو جائے گی۔

**بیگم صاحب:** انشاء اللہ ——— وہ بھی انشاء اللہ اسی طرح بخیر و خوبی انجام پائے گی (زیر لب) انشاء اللہ!

**اصغری:** (دولہن کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے۔ اور اس کے حسن سے بہت متاثر ہوتی ہے) اللہ نظر بد سے بچائے۔

**بیگم صاحب:** (غیر ارادی طور پر قریب قریب چیخ کر) اصغری!

**اصغری:** (سہم کر) جی!

**بیگم صاحب:** کچھ نہیں ——— گاڑی کب آتی ہے کراچی سے؟

**اصغری:** معلوم نہیں بیگم صاحب۔

**بیگم صاحب:** (ایک خادم سے) دیکھو کریم! تم ٹیلی فون کرو۔ اور پوچھو ——— لیکن گاڑی تو کل ہی کی راولپنڈی پہنچ چکی ہے ——— مجید کا تار جو آیا تھا۔

**کریم:** جی ہاں!

**بیگم صاحب:** اور میں نے کمال کو کس اسٹیشن پر بھیجا ہے (گھبرا کر) خدا معلوم میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے ——— امجد میاں کو رات راولپنڈی ٹھہرنا تھا ——— اپنے دوست سعید کے پاس ——— اور وہ تو میرا خیال ہے۔ اب وہاں سے چل بھی چکے ہوں گے (دوسرے خادم سے) غلام محمد!

غلام محمد: جی!

بیگم صاحب: تم دیکھو کمال کہاں ہے ——— موٹر کہاں لے گیا ہے؟

غلام محمد: بہت اچھا!

(چلا جاتا ہے)

بیگم صاحب: (اصغری کے کاندھے کا سہارا لے کر) آج صبح سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ...... چلنے پھرنے سے معذور نہ ہوتی ——— اس کمبخت ڈاکٹر ہدایت اللہ نے مجھے منع نہ کیا ہوتا تو میں دولہن کو اپنے ساتھ لاتی (دور سے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے) میرا خیال ہے شاید امجد میاں کا ٹیلی فون ہے۔ کہ وہ چل پڑے ہیں۔ جاؤ اصغری ——— بھاگ کے جاؤ۔

(اصغری دوڑی باہر جاتی ہے)

بیگم صاحب: (کریم سے ——— اپنی افسردگی دور کرنے کی خاطر) بس آتے ہی ہوں گے امجد میاں۔

کریم: اللہ خیر خیریت سے لائے۔

بیگم صاحب: (قریب قریب چیخ کر) کیا مطلب تمہارا

کریم: (ڈر کر) جی یہی کہ ——— جی یہی ———

(اصغری کی چیخیں سنائی دیتی ہیں ——— "بیگم صاحب" بیگم صاحب!")

بیگم صاحب: (سراسیمہ ہو کر) کیوں کیا ہوا؟

(اصغری سخت اضطراب کی حالت میں اندر داخل ہوتی ہے)

اصغری: بیگم صاحب ——— بیگم صاحب۔

بیگم صاحب: (بیساکھیوں کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر) کیا ہے؟

اصغری: جی ——— مجید میاں کا ٹیلی فون آیا ہے کہ گاڑی ——— گاڑی ٹکرا گئی ہے۔

**بیگم صاحب:** (بیساکھیوں پر ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط ہو جاتی ہے) پھر؟

**اصغری:** حمید میاں اور ان کی دولہن دونوں زخمی ہو گئے تھیں اور ہسپتال میں پڑے ہیں۔

**بیگم صاحب:** (ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے ——— بیساکھیاں بغل میں سے گر پڑتی ہیں ایک لمحے کے لیے وہ یوں کھڑی رہتی ہے جیسے پتھر کا بُت ——— پھر اس میں تھوڑی سی جنبش ہوتی ہے۔ اور وہ دروازے کی جانب بڑھتی ہے) کمال سے کہو، موٹر نکالے ——— ہم راولپنڈی جا رہے ہیں۔

(بیگم دروازے کی جانب بڑھ رہی ہے ——— غلام محمد

اور اصغری حیرت زدہ ہیں۔ اصغری زور سے چیختی ہے

بیگم پلٹ کر اس کی طرف دیکھتی ہے)

**بیگم صاحب:** کیا ہے؟

**اصغری:** آپ ——— آپ چل رہی ہیں ——— چل سکتی ہیں۔

**بیگم صاحب:** میں (اپنی بغلوں میں بیساکھیوں کی عدم موجودگی کا احساس کرتے ہوئے) میں ؟ ——— میں کیسے چل سکتی ہوں۔

(ایک دم چکراتی ہے اور فرش پر گر کر بے ہوش ہو جاتی ہے)

**اصغری:** (بیگم کے پاس جاتے ہوئے۔ غلام محمد سے) غلام محمد، ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کرو۔

(غلام محمد چلا جاتا ہے ——— اصغری بیگم کو

ہوش میں لانے کی کوشش کرتی ہے)

**پردہ**

○

# دوسرا منظر

وہی کمرہ جو پہلے منظر میں ہے ——— ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ اس میں سازوسامان پہلے پڑا تھا۔ اب اپنا نیا نویلا پن
کھو چکا ہے۔ اب ہر چیز دیر کی استعمال شدہ معلوم ہوتی
ہے ——— صبح کا وقت ہے۔ کھڑکیوں کے ریشمی پردے
صبح کی ہلکی ہلکی ہوا سے سرسرا رہے ہیں ——— دائیں ہاتھ
کو ساگوان کی مسہری پر دولہن سعیدہ کمبل اوڑھے لیٹی ہے —
شیشے کی تپائی پر رکھی ہوئی ننھی ٹائم پیس۔ جس میں نو بجے ہیں۔
لرزنا شروع کر دیتی ہے۔ ——— ہلکی سی گھنٹی کی آواز
پیدا ہوتی ہے۔ ——— کمبلوں میں جنبش پیدا ہوتی ہے۔
سعیدہ کروٹ بدلتی ہے اور آنکھیں کھولتی ہے۔ جھک کر ننھی
ٹائم پیس کی طرف دیکھتی ہے۔ اور مسکراتی ہے، ایسا کرتے ہوئے
اس کے خوبصورت چہرے پر چھائی ہوئی گھنی پلکیں پھڑپھڑاتی
ہیں ——— کروٹ بدل کر، وہ بستر میں تکیوں کا سہارا
لے کر ذرا اوپر اٹھ آتی ہے اور باہر حد نظر تک پھیلی ہوئی پہاڑیوں
کا دلکش منظر دیکھ کر بچوں کی سی مسرت محسوس کرتی ہے ———
پھر ایک دم ٹانگیں چلا کر کمبل اوپر سے ہٹاتی ہے اور جھک کر
مسہری سے اترتی ہے۔ اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنا
شروع کر دیتی ہے۔ کسی خوش الحان پرندے کی آواز سنائی

دے رہی ہے ——— سعیدہ اپنے خیالوں میں محو

ہے۔ وہ جوان ہے۔ شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا ریشمی لباس

بھی جو اس کے بدن سے دور دور اپنی حریری دنیا الگ بسائے

ہے۔ اس کے خوبصورت خطوط سے غافل نہیں ——— اور خود

سعیدہ کا ادراک بھی ——— اس کا سراپا حسین وجمیل

ہے اور اپنے حسن وجمال سے آگاہ ——— اصغری کی

کرخت آواز۔ پرندے کی خوش الحانی کا تقابل پیش کرتی ہے

سعیدہ چونکتی ہے )

سعیدہ : (نگاہوں ہی نگاہوں میں) کیا ہے ؟

(پوچھتی ہے)

اصغری : مجید میاں ابھی ابھی ہسپتال سے آئے ہیں۔ کہتے تھے جا کے دیکھو اب جگ گئیں یا نہیں ؟

سعیدہ : کیا خبر لائے ہیں ؟

اصغری : میں انھیں بھیجتی ہوں۔

( اصغری چلی جاتی ہے۔ سعیدہ کھڑکی کے پاس ہٹ کر سنگھار

میز کے پاس آتی ہے۔ آئینے میں ایک لحظے کے لیے اپنے آپ

کا جائزہ لیتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے بکھرے ہوئے

بال سرسری طور پر ٹھیک کرکے مسہری کی طرف آہستہ آہستہ

بڑھتی ہے۔ مسہری کے سرہانے اس کا عاجٹ کا سفید

لٹکا ہے۔ اُسے اتارتی ہے اور بڑی بے توجہی سے اپنے

کاندھوں پر ڈال لیتی ہے ——— باہر سے بڑوں کی ہلکی

آواز آتی ہے۔ خفیف سے ردعمل کے ساتھ سعیدہ دروازے

کی جانب دیکھتی ہے ـــــ ۔ مجید ـــــ سانولے
رنگ کا متوسط قد نوجوان ۔ جو مضبوط پاؤں رکھتا ہے اور جس
کے چہرے کے خطوط عمر کے مقابلے میں زیادہ پختہ اور سنجھے
ہوئے ہیں ۔ اندر داخل ہوتا ہے )

**مجید** : سلام بھابی جان !

**سعیدہ** : سلام ۔

**مجید** : (صوفے کے پاس آکر رکتے ہوئے) طبیعت کیسی ہے آپ کی ؟

**سعیدہ** : (بے دلی سے) ٹھیک ہے (صوفے پر بیٹھ جاتی ہے) سنایئے کیا خبر لائے راولپنڈی سے ؟

**مجید** : (سعیدہ کے سامنے آکر) کوئی خاص نہیں (آدھی سی آہ بھر کر) بس اب نہیں لے آئیں گے یہاں ۔

**سعیدہ** : کیوں ؟

**مجید** : وہ تنگ آ گئے ہیں (ایک مونڈھا گھسیٹ کر اس پر بیٹھتے ہوئے) اُن کی جگہ میں ہوتا تو
بہت ممکن تھا ۔ میں نے خودکشی کر لی ہوتی ۔

**سعیدہ** : (اُٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) کیا معلوم تھا کہ میری قسمت میں یہ لکھا ہے
اتنے آدمی مرے ـــــ میں ساتھ ہی مر گئی ہوتی ۔

**مجید** : مگر یہ اللہ کو منظور نہیں تھا ۔

**سعیدہ** : (کھڑکی سے باہر پہاڑیوں کا منظر دیکھتی ہے) ہاں ! یہ اللہ کو منظور نہیں تھا ـــــ
اللہ کو یہ منظور تھا کہ میری ٹانگ پر ہلکی سی خراش آئے ۔ پر میری زندگی زخموں سے چور چور ہو جائے ۔
(آنکھوں میں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں ـــــ سفید دوپٹے سے انہیں بنزاکت طریقہ سے ہولے
ہولے خشک کرتی ہے) اللہ کو یہ منظور تھا کہ میرے سہاگ کی کمر ٹوٹ جائے ۔ اور میں ساری عمر
ہواؤں میں کٹے ہوئے پتنگ کی طرح اڑتی رہوں ۔

(سسکیاں لیتی ہے)

مجید : (اٹھتا ہے) بھائی جان! حوصلے سے کام لینا چاہئے ــــــ کیا پتہ ہے وہ ٹھیک ہو جائیں؟

سعیدہ : (سرزنش کے طور پر) مجید تم تو کم از کم مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو ــــــ چھ ماہ ہو گئے ہیں انھیں ہسپتال کی چارپائی کے ساتھ لگے ہوئے ــــــ ڈاکٹروں کا جو فیصلہ ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں ــــــ وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے ــــــ ان کی دونوں ٹانگیں بے کار ہو چکی ہیں ــــــ لیکن ــــــ لیکن۔ میں ایک بات مانتی ہوں۔ کہ ان میں بہت حوصلہ ہے ــــــ میں جب بھی ان کے پاس گئی۔ انھوں نے مجھے پاس بٹھا کر کہا۔ سعیدہ کچھ فکر نہ کرو میں بہت جلد تندرست ہو جاؤں گا ــــــ اور پھر میں تمھیں اُن پہاڑوں کی سیر کراؤں گا جن کا ذکر تم کراچی میں اتنی بار میرے منہ سے سُن چکی ہو ــــــ مجھے اُن پہاڑوں سے پیار ہے ــــــ اتنا پیار ہے کہ تم ان کے متعلق اور سنو گی تو رشک کرو گی ــــــ اور وہ مجھے حوصلہ دینے لگتے کہ سعیدہ! دنیا حادثوں کا دوسرا نام ہے ــــــ میں تو خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میری جان نہیں گئی ــــــ ورنہ ــــــ پھر وہ ایسی بات کہتے کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

مجید : کیا؟

سعیدہ : (نمناک آنکھوں سے خلا میں دیکھتے ہوئے) کہ تم ــــــ کہ تم میرے بعد کسی اور کی ہو جاؤ گی (کانپ جاتی ہے) ــــــ وہ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں مجید؟

مجید : معلوم نہیں۔

سعیدہ : تمھیں معلوم ہونا چاہئیے (آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی صوفے پر بیٹھ جاتی ہے ــــــ دوپٹہ ڈھلک آتا ہے ــــــ حریری لباس میں اس کا متلاطم سینہ ریشمی اتار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے) تم مرد ہو ــــــ تم اس کے بھائی ہو ــــــ اگر اس حادثے کے تم شکار ہوتے ــــــ تو؟

مجید : میں کبھی ایسی باتیں نہ سوچتا۔ جو امجد بھائی سوچتے ہیں۔

سعیدہ : کیوں؟

مجید : ہم دونوں مرد ہیں ــــــ سگے بھائی ــــــ مگر دل اور دماغ کے اعتبار سے ہم دونوں بہت

مختلف ہیں۔

سعیدہ : (بڑبڑاتی ہے) دل ——— اور دماغ۔

(اصغری داخل ہوتی ہے)

اصغری : مجید میاں۔ آپ کو بیگم صاحب بلاتی ہیں۔

مجید : چلو۔ میں آتا ہوں!

اصغری : انھوں نے کہا ہے جلدی آیئے!

مجید : اچھا ——— (سعیدہ کی طرف دیکھ کر) میں بھی آتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

(اصغری۔ فرش پر بچھے ہوئے رگ پر سعیدہ کے قدموں میں بیٹھ جاتی ہے اور اس کے پاؤں کی انگلیاں چٹخانا چاہتی ہے)

سعیدہ : (پاؤں ایک طرف کھینچ کر) جانے دو اصغری۔

اصغری : (پاؤں سے قریب قریب لپٹ کر) نہیں دولہن بیگم (انگلیاں چٹخانا شروع کر دیتی ہے) کیا خبر لائے ہیں مجید میاں؟

سعیدہ : کہتے تھے، وہ یہاں آنا چاہتے ہیں۔

اصغری : یہ تو بڑی خوشخبری کی بات ہے۔

سعیدہ : (دکھ کے ساتھ) ہاں!

اصغری : پر بیگم صاحب تو بہت ناراض ہو رہی تھیں، کہ اتنی دیر کیوں لگا دی مجید میاں نے۔

سعیدہ : کہاں؟

اصغری : یہاں ——— آپ کے پاس۔

سعیدہ : میرے پاس ——— کیا کہتی تھیں بیگم صاحب؟

اصغری : کچھ نہیں ——— اُن کا مزاج آجکل بہت چڑچڑا سا رہتا ہے ——— انھیں کوئی بات

اچھی نہیں لگتی ــــ انھیں ــــ امجد میاں کا اتنا دکھ نہیں جتنا آپ کا ہے ــــ ہر وقت آپ ہی کے متعلق سوچتی رہتی ہیں ــــ تو ــــ امجد میاں ٹھیک ہو گئے ہیں نا ؟

سعیدہ : (چونک کر اپنا پاؤں ہٹا کر اٹھتے ہوئے) ہاں ٹھیک ہو گئے ہیں۔

(بیگم کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اصغری اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

سعیدہ : سلام خالہ جان !

بیگم صاحب : سلام بیٹیا ــــ جیتی رہو۔ (پاس آ کر سعیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے) انھیں معلوم ہو گیا۔ مجیبہ سے کر ــــ

سعیدہ : جی ہاں !

بیگم صاحب : غریب تنگ آ گیا ہے، وہاں ہسپتال میں (اصغری کی طرف دیکھ کر) اصغری تم جاؤ۔

(اصغری چلی جاتی ہے)

بیگم صاحب : اس کا ــــ اس کی خواہش ہے کہ وہ تمھارے پاس رہے ــــ اس نے مجھ سے کہا۔ اگر مجھے مرنا ہی ہے تو میری سعیدہ میری نظروں کے سامنے ہونی چاہیئے ــــ

سعیدہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ بیگم کے گلے لگ جاتی ہے)

بیگم صاحب : (آنکھوں سے آنسو رواں ہیں) وہ تم سے بے اندازہ محبت کرتا ہے ــــ لیکن ــــ لیکن اس نے کہا تھا تم سے پوچھ لیا جائے کہ تمھیں اس کے یہاں آ کر رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں ؟

سعیدہ : اعتراض ــــ !

بیگم صاحب : ہاں بیٹیا ــــ ہو سکتا ہے۔ یوں تمھارے دکھ میں اضافہ ہو۔

سعیدہ : وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں ــــ خالہ جان وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔

بیگم صاحب : بیٹیا ! وہ کچھ ایسے ہی دل و دماغ کا آدمی ہے ــــ اس کو دوسروں کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔

سعیدہ : آئیں ——— کیوں نہ آئیں (لہجے میں چڑ سی پیدا ہو جاتی ہے) وہ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔

**بیگم صاحب :** ڈاکٹروں نے کہا ہے۔ اگر وہ خوش رہے تو انشاء اللہ ایک دو مہینے میں بیساکھیوں کی مدد سے چل پھر سکے گا (ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے) بیساکھیاں ——— جو اس کے گاڑی کے حادثے کی خبر سن کر میری زندگی سے الگ ہو گئی تھیں ——— مجھے معلوم ہوتا کہ یہ اس کی زندگی میں داخل ہونے والی ہیں تو میں ان کو مضبوطی سے پکڑ کے رکھتی ——— مگر بیٹا اس نحس دھارے میں جسے زندگی کہتے ہیں مضبوط سے مضبوط کشتی بھی ڈوب جاتی ہے اور ایک معمولی تنکا ہی کنارے لگا دیتا ہے۔ (توقف کے بعد) سعیدہ بیٹا! امجد نے مجھ سے ایک اور بات تم سے پوچھنے کو کہا تھا؟

سعیدہ : کیا خالہ جان؟

**بیگم صاحب :** کیا تم اس سے محبت کرو گی؟

سعیدہ : (بوکھلا کر) محبت

**بیگم صاحب :** (سعیدہ کے سر پہ ہاتھ پھیرتی ہے) میں تمہیں زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتی۔

(چلی جاتی ہے)

سعیدہ : (دوپٹے سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بڑبڑاتی ہے) محبت ——— محبت! دل و دماغ۔

(آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی۔ آتش دان کے عین وسط میں ریشمی ڈوریوں سے لٹکی ہوئی اپنی تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے ——— بتا ——— کیا تو اس سے محبت کرے گی؟

ٹرے میں رکھی ہوئی پیالیوں کی آواز آتی ہے ——— اصغری ناشتہ لیے اندر داخل ہوتی ہے اور پہیوں والی تپائی صوفے کے آگے لے جاتی ہے اور اس پر ناشتہ چن دیتی ہے)

**اصغری :** دولہن بیگم! امجد میاں سے محبت نہیں کرے گی تو اور کون کرے گی؟

سعیدہ: (ایک دم چونکتی ہے) کیا کہا؟

اصغری: جی کچھ نہیں — ایسے ہی اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی — ناشتہ کر لیجئے۔

سعیدہ: تم جاؤ۔

اصغری: جی اچھا!

(اصغری۔ ایک نظر سعیدہ کو اور ایک نظر اس کی تصویر کو دیکھتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے — سعیدہ آہستہ آہستہ سوچ میں مستغرق صوفے کی طرف بڑھتی ہے اور مسہری پر لیٹ جاتی ہے)

سعیدہ: (چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی ہے) دولہن بیگم۔ امجد میاں سے محبت نہیں کریں گی تو اور کون کرے گی (اونچی آواز میں) اور کون کرے گی — اور کون کر سکتی ہے؟

پردہ

○

# تیسرا منظر

نگار وِلا سے ملحقہ بغیچہ —— وسط میں پست قد تراشی ہوئی
جھاڑیوں کے درمیان فوارہ ہے جس میں سے پانی کی پھوار دھڑک
دھڑک کر باہر نکل رہی ہے۔ دُھوپ کھلی ہے۔ آسمان نکھرا
ہوا ہے۔ فضا میں عجیب سا کنوارپن ہے —— بے حجاب
ہر ذرہ نظارے کی دعوت لیے گویا قبولیت کا منتظر ہے۔
ایسا معلوم ہوتا ہے ہوا چلتے چلتے ٹھیر سی گئی ہے کہ باغ کی
بیلیں پھر سے اپنی زلفیں سنوار لیں۔ پھول اپنے گالوں کی سُرخی
درست کرلیں اور بھونروں کو جن کلیوں کا منہ چومنا ہے بے خوف و
خطر چوم لیں —— اس فضا میں گھاس کے ہموار قالین
پر کرسیاں بچھی ہیں۔ ایک میں سعیدہ گلابی لباس میں ملبوس خود اپنا
ہی عکس بنی بیٹھی ہے۔ دُھوپ کی حدت سے اس کے غازے
کے ہلکے سے غبار سے اس کی اپنی گلابیاں۔ سُرخیاں بن بن کر
باہر نکل رہی ہیں۔ دوسری کرسی میں مجید ہے جو ہولے ہولے
سگریٹ کے کش لگا کر دھوئیں کے نیلے نیلے چھلّے منہ سے
نکال رہا ہے۔ اس کا چہرہ مطمئن ہے۔ سامنے امجد ہے
اپاہجوں کی کرسی میں —— اس کے چہرے پر اپاہجوں کی
کرسی والی کیفیت ہے۔ جو کسی اور کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتی
—— اس کا رنگ بہت زرد ہے۔ مگر اس کی آنکھوں میں

چمک ہے جو سعیدہ کے حسن و جمال کی بازگشت ہے )

امجد : ( اپنے دائیں بائیں دیکھ کر ) آج موسم کتنا دلفریب ہے ۔

سعیدہ : ( فوراً متوجہ ہو کر ) جی ہاں !

امجد : مجید جاؤ۔ سعیدہ کو گھما لاؤ۔ —— ان پہاڑیوں کی سیر کرا لاؤ ( پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتا ہے ) افسوس ہے مجھ سے مڑا نہیں جاتا —— مجید اٹھو —— میری کرسی گھما کر اِدھر کر دو —— یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہونا چاہیے۔

( مجید اٹھتا ہے۔ لیکن سعیدہ اس سے پہلے اٹھ کر امجد کی کرسی کا رُخ پھیر دیتی ہے۔ اب تینوں کا منہ پہاڑیوں طرف ہے۔ جو دھوپ میں حدِ نگاہ تک اپنے منہ دھو رہی ہیں )

امجد : ( پہاڑیوں کے منظر کو پیاسی نگاہوں سے پیتے ہوئے ) سعیدہ۔ یہی ہیں وہ پہاڑیاں جن سے مجھے پیار ہے۔ —— اتنا پیار کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ( مجید سے ) جاؤ مجید۔ سعیدہ کو ساتھ لے جاؤ اور ان کو سیر کراؤ ( سعیدہ سے ) سعیدہ ! جب تم ان پر چڑھتے چڑھتے ہانپنے لگو گی اور تمھاری سانس رکنے لگے گی تو تمھیں ایسا محسوس ہو گا کہ اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی لذت نہیں —— میں مجید کو زبردستی ساتھ لے جاتا تھا۔ مگر یہ ایک چڑھائی کے بعد ہی ہمت ہار دیتا تھا —— مجھ سے کہتا تھا۔ بھائی جان مجھے آپ کا یہ شغل پسند نہیں ہے —— یہ کیا کہ آدمی بیکار میں ہانپ ہانپ کر بے ہوش ہو جائے ( ہنستا ہے ) پہاڑیوں اور ان کو سر کرنے کا حسن اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آئے گا۔ کیوں سعیدہ !

سعیدہ : ( مسکرا کر ) جی ہاں !

امجد : ( مجید سے ) جاؤ یار —— سعیدہ کو لے جاؤ —— کبھی کام بھی کیا کرو۔

مجید : ( سعیدہ ) چلیے بھابی جان —— مگر میں شرط لگاتا ہوں۔ آج تو یہ چلی جائیں گی۔ لیکن پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کریں گی ؟

سعیدہ : دل و دماغ —— یہ کیا بلا ہے دل و دماغ ؟

**مجید** : آپ کو ایک ہی پہاڑی چڑھنے سے معلوم ہو جائے گا۔

**امجد** : (ہنستا ہے) تم بکتے ہو مجید ــــ سعیدہ کی زندگی کے سامنے تو ایک پہاڑ ہے ــــ اگر یہ ایک معمولی سی پہاڑی کی چڑھائی ہی سے اکتا گئی تو . . . !

**سعیدہ** : چلئے مجید میاں۔

**مجید** : چلئے !

(دونوں چلے جاتے ہیں ــــ امجد مسکراتا ہے ــــ اصغری داخل ہوتی ہے ــــ اس کے ہاتھ میں پلیٹ ہے۔ جس میں چھلے اور کاٹے ہوئے سیب ہیں۔ وہ معنی خیز نظروں سے مجید اور سعیدہ کو دیکھتی امجد کی جانب آتی ہے اور اس سے مخاطب ہوتی ہے)

**اصغری** : تھوڑے سیب کھا لیجئے۔

**امجد** : (جو سعیدہ اور مجید کو ڈھلوانوں میں اترتے دیکھ رہا ہے) کھاؤں گا۔

**اصغری** : (انہی کی طرف دیکھ کر) آج دولہن بیگم کتنی پیاری دکھائی دے رہی ہیں ؟

**امجد** : (ایکدم پلٹ کر اصغری کو دیکھتے ہوئے) دکھائی دے رہی ہیں ؟

**اصغری** : (خفیف سی بوکھلاہٹ کے ساتھ) جی ــــ جی ہاں !

**امجد** : (پھر سعیدہ اور مجید کو دیکھتے ہوئے) خوبصورت ہے۔ خوبصورت دکھائی نہیں دیتا ــــ ہونے اور دکھائی دینے میں زمین آسمان کا فرق ہے اصغری۔

**اصغری** : جی ہاں ــــ یہ تو ہے۔

**امجد** : لاؤ سیب۔

**اصغری** : (پلیٹ بڑھاتے ہوئے) حاضر ہیں ــــ یہ چھلے ہوئے ہیں۔

**امجد** : تمہارا مطلب ؟

**اصغری** : چھلی ہوئی چیز سے کوئی بھی دھوکا کھا سکتا ہے (ہنس کر) اس کے سرخ سرخ گال تو چھری سے اتر

چلے ہیں۔

**امجد** : (ہنستا ہے) اصغری — تم بہت شیطان ہو گئی ہو۔

**اصغری** : (سنجیدگی سے) شیطان ؟ امجد میاں — آپ نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ شیطان خدا کا سب سے بڑا فرشتہ تھا جس نے آدم — یعنی مٹی کے پتلے کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

**امجد** : ہاں ہاں۔

**اصغری** : اور فرشتوں کے ہیڈ ماسٹر کو اس کی سزا دی گئی تھی۔

**امجد** : درست ہے

**اصغری** : تو یہ بھی درست ہے۔

**امجد** : کیا ؟

**اصغری** : کچھ بھی نہیں — درست آخر ہوتا کیا ہے — وہی جسے آپ درست سمجھیں یا درست سمجھنے کی کوشش کریں یا وہ غلطی جو آپ ایک دفعہ اس لیے کر لیں کہ آئندہ درست ہوتی رہے گی۔ یا وہ درستی جسے آپ غلطی میں تبدیل کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ آپ پھر درست کر سکتے ہیں — لیکن یہ سب بکواس ہے۔ — میں ایک موٹی عقل کی عورت ہوں امجد میاں۔

**امجد** : تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو ؟

**اصغری** : میں ایک موٹی عقل کی عورت ہوں — لیکن ایک عورت ہوں امجد میاں۔

**امجد** : میں پھر نہیں سمجھا۔

**اصغری** : (سیب کی ایک قاش اٹھاتی ہے اور امجد کے منہ کے پاس لے جاتی ہے) آپ سیب کھائیے۔

**امجد** : (سیب کی قاش دانتوں میں لیتے ہوئے) تم پہلے کبھی ایسی باتیں نہیں کیا کرتی تھیں۔

**اصغری** : آج موسم ہی کچھ ایسا دلفریب ہے۔

**امجد** : کیا نہیں ہے۔

**اصغری** : (سیب کی دوسری قاش اٹھا کر) کیوں نہیں — یہ لیجیے ایک اور قاش

(دوسری قاش امجد کے کھلے ہوئے منہ میں ڈالتی ہے)

**امجد** : (سیب کھاتے ہوئے کچھ توقف کے بعد) اصغری!

**اصغری**: (جو پہاڑیوں کا منظر دیکھنے میں محو تھی۔ چونک کر) جی!

**امجد** : تمہاری شادی کر دیں!

**اصغری**: شادی؟

**امجد** : ہاں! ——— اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیئے۔

**اصغری**: کیوں امجد میاں؟

**امجد** : شادی بڑی اچھی چیز ہے ——— دنیا میں ہر شے کی شادی ہو جانی چاہیئے ——— زندگی میں شادی سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں ——— میں امی جان سے کہوں گا کہ اصغری کی شادی جلدی سے کر دیجئے۔

**اصغری**: نہ امجد میاں!

**امجد** : کیوں؟

**اصغری**: مجھے ڈر لگتا ہے۔

**امجد** : کس سے؟

**اصغری**: (سیٹ سے پر سمٹ جاتی ہے۔ لہجہ فکر مند ہوتا ہے) شادی سے۔

**امجد** : (ہنستا ہے) پگلی!

**اصغری**: سچ کہتی ہوں امجد میاں ——— مجھے واقعی ڈر لگتا ہے ——— اوّل تو ایک نوکرانی کی شادی ہی کیا ہے۔ ہوئی ہوئی۔ نہ ہوئی نہ ہوئی ——— کیا فرق پڑتا ہے ——— لیکن ہو گئی تو کہیں گاڑی پٹڑی سے اتر جائے اور ———

**امجد** : (دکھ کے ساتھ) اصغری!

**اصغری**: (کہے جاتی ہے) گاڑی پٹڑی سے اتر جائے اور اصغری تیرہ تیرہ ہونے سے بچ جائے ———

ایک ٹانگ سے لنگڑی۔ ایک بازو سے لُنڈی اور ایک آنکھ اندھی ہو جائے ـــــ آدھی اصغری
غائب ہو جائے ـــــ آدھی بچ جائے ـــــ نا امجد میاں ـــــ میری شادی
کا نام نہ لیجیے ـــــ شادی تو ایک سالم چیز ہے ـــــ آدھی یا چوتھائی چیز کو شادی نہیں کہتے۔

**امجد** : (سوچتے ہوئے) اصغری!

**اصغری** : (گھٹی گھٹی آواز میں) جی!

**امجد** : تم ٹھیک کہتی ہو (آواز میں انتہا درجے کا درد پیدا ہو جاتا ہے) لیکن دیکھو مجھے رنجیدہ نہ کرو
میں خوش رہنا چاہتا ہوں ـــــ اپنی ان دو شکستہ ٹانگوں پر بھی خوش رہنا چاہتا ہوں
مجھے نہ چھیڑو ـــــ میرے دل میں درد ہوتا ہے

**اصغری** : (امجد کے پاؤں پکڑ لیتی ہے) مجھے معاف کر دیجیے امجد میاں (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) جانے میں
کیا بک گئی ـــــ آپ خوش رہیں ـــــ خدا آپ کو خوش رکھے۔

**امجد** : (بہادری کے ساتھ) خدا کا نام نہ لو ـــــ اگر اس کو مجھے خوش رکھنا ہوتا تو مجھے اس حادثے کا
شکار ہی کیوں کرتا ـــــ کیا تھا تو مار کر اپنے شکاری تھیلے میں کیوں نہ ڈال لیا ـــــ اس
کا نام نہ لو ـــــ میری اس کی دوستی ختم ہو چکی ہے ـــــ مجھے اگر خوش رہنا ہے تو اپنے رہے
سہے وجود ہی کے سہارے خوش رہنا ہے ـــــ انہی ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں پر چند تنکے چن کر مجھے اپنی خوشی
کے آشیانے بنانا ہیں۔

**اصغری** : صرف اپنی خوشی کے ؟

**امجد** : (بہت زیادہ دکھ کے ساتھ) اصغری خدا کے لیے ـــــ تم کیوں اتنی ظالم ہو گئی ہو ـــــ
تمہارے منہ میں اگر زبان پیدا ہوئی ہے تو کیا اس لیے کہ تم میرے دکھ میں اضافہ کرو ـــــ میں تم سے
درخواست کرتا ہوں کہ میری مدد کرو ـــــ ایک اپاہج کی مدد کرو کہ وہ اپنی ٹوٹی ہوئی زندگی جوڑ
جاڑ کے چند دن ـــــ صرف چند دن گزار لے۔

**اصغری** : آپ درخواست نہ کیجیے امجد میاں ـــــ میرا کلیجہ پھٹتا ہے ـــــ آپ مالک ہیں۔

حکم دے سکتے ہیں —— میری زندگی حاضر ہے۔

(اس کے موٹے موٹے آنسو امجد کے سلیپروں پر گرتے ہیں

اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور ایک طرف چلی جاتی ہے)

(امجد۔ گردن جھکا کر اپنے سلیپروں کی طرف دیکھتا ہے۔ جن پر سے

اصغری کے آنسو اڑ کر غائب ہو جاتے ہیں —— گردن اٹھا کر

اصغری کو دیکھتا ہے جو کہ جا رہی ہے۔)

(کوٹھی کی جانب سے بیگم نمودار ہوتی ہے۔ شال اوڑھے ہاتھ

میں زیورات کے ڈبے لیے وہ امجد کے پاس آتی ہے)

بیگم صاحب: امجد بیٹا!

امجد: (جلدی سے اپنے پاؤں کمبل میں چھپا کر) جی!

بیگم صاحب: سعیدہ کے لیے جو زیورات تم نے پسند کیے ہیں۔ تیار ہو کے آگئے ہیں۔ لو

(ڈبے امجد کی گود میں رکھ دیتی ہے)

امجد: (بچوں کے اشتیاق سے ہر ڈبہ کھول کر سارے زیورات دیکھتا ہے اور اپنی پوری خوشی کا اظہار کرتا ہے) بہت

اچھے ہیں —— بہت عمدہ ہیں —— بہت حسین ہیں —— لیکن اتنے نہیں جتنی سعیدہ

ہے۔ —— اصغری —— اصغری —— ادھر آؤ ——

(اصغری جو ایک سرو کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔ امجد کے پاس آتی

ہے۔ امجد اسے تمام زیورات دکھاتا ہے)

امجد: کہو، کیسے ہیں؟

اصغری: آپ خود کہہ چکے ہیں —— حسین ہیں، لیکن اتنے نہیں جتنی دلہن بیگم ہیں۔

امجد: (ماں سے) امی جان کپڑے کب آئیں گے۔

اصغری: کل تک آجائیں گے۔

امجد : اور وہ ٹیلسکوپ مشین ——— کیوں نہیں آئی ابھی تک ؟

بیگم صاحب : بیٹا! ——— مجید آرڈر دے آیا تھا۔ ایک دو روز میں آجائے گی۔

امجد : اچھا (رک کر) امّی جان!

بیگم صاحب : جی بیٹا!

امجد : کچھ اور بھی منگوانا چاہئیے سعیدہ کے لیے ——— میں اُسے ایک لمحے کے لیے بھی اداس نہیں دیکھنا چاہتا ——— ہر روز اس کے لئے کوئی نہ کوئی نئی چیز ضرور ہونی چاہیئے۔

بیگم صاحب : سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔ جو چاہو کرو۔

امجد : اختیار؟ (رک کر) ہاں ——— تو ——— امّی جان!

بیگم صاحب : جی!

امجد : کمال کو بھیجئے ——— اسپورٹس کی دکان میں جائے ——— جتنے کھیل اسے مل سکیں لے آئے سعیدہ اور مجید کھیلا کریں گے اور میں دیکھا کروں گا۔ ——— اور دیکھئے ——— اس سے کہئے کچھ ایسے کھیل بھی لے آئے جو میں ——— میں بھی سعیدہ کے ساتھ کھیل سکوں۔

بیگم صاحب : (بے حد متاثر ہو کر امجد کا سر اپنے ہاتھوں میں لے کر) میرے بچے!

(امجد بلک بلک کر رونا شروع کر دیتا ہے ——— اصغری ضبط نہیں کر سکتی اور چیختی ہوئی ایک طرف دوڑ جاتی ہے۔ بیگم کی آنکھوں سے خاموش آنسو رواں ہیں)

○

# چوتھا منظر

وہی کمرہ جو پہلے اور دوسرے منظر میں ہے — رات کا وقت
فضا بالکل خاموش ہے۔ بڑے بے ڈھنگے طریق پر مسہری پر سعیدہ
تین چار گدے تکیوں میں اپنا نیم سنہرے بالوں والا سر دبائے کوئی
کتاب پڑھنے میں مشغول ہے — نظریں کتاب کے حروف
کے بجائے اس کے اپنے دل کی جانب معلوم ہوتی ہیں۔ سینے کے
مقام پر کمبل کی سلوٹیں جھنیاں کھا رہی ہیں اور ننھے سے تالاب میں
جزر کا نقشہ پیدا ہو رہا ہے — بائیں طرف رہڑ کی ہسپتالوں
جیسی چارپائی بچھی ہے — اس کے ساتھ پاہیوں والی
کرسی میں امجد بیٹھا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کتاب ہے۔ وہ اسے
یوں پکڑے ہے جیسے کوئی تپتے کی چیز ہے۔ اس کی نظریں پریشان
ہیں کتاب کے حروف سے اٹھ کر کبھی وہ سعیدہ کے ہاتھوں پر جا بیٹھتی
ہیں کبھی اس کے سنہرے بالوں والے سر پر جو تکیوں میں دھنسا ہے۔
— آخر اس سے نہیں رہا جاتا — کتاب بند کر کے اپنی
گود میں رکھتا ہے اور بڑی آہستگی کے ساتھ سعیدہ سے مخاطب
ہوتا ہے۔

**امجد** : سعیدہ!

**سعیدہ** : (چونک کر) جی!

**امجد** : میرا خیال ہے، اب سو جاؤ۔

سعیدہ: (کروٹ بدل کر امجد کو دیکھتے ہوئے) آپ سونا چاہتے ہیں تو میں غلام محمد اور کریم کو بلاؤں کہ وہ آپ کو لٹا دیں۔

امجد: (کمزور کمزور آواز میں) لٹا دیں ——— نہیں سعیدہ ——— میں لیٹ لیٹ کے تھک گیا ہوں۔ آج میں کرسی پر ہی سو جاؤں گا ——— تمھیں تکلیف نہ ہو تو اٹھ کے یہ بتی بجھا دو اور سبز روشنی کر دو۔

سعیدہ: (اٹھتی ہے) آپ بار بار میری تکلیف کا ذکر کیوں کرتے ہیں۔

امجد: میں خود سوز تکلیف میں ہوں۔

سعیدہ: (جھڑک کر) مجھے اس کا احساس ہے امجد صاحب ——— مگر بتائیے میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں ——— مجھ سے جو ہو سکتا ہے میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ آپ کو ہر وقت میری تکلیف کی پڑی رہتی ہے ——— مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

امجد: سعیدہ تم بہت اچھی ہو۔

(سعیدہ بتی اوف کرتی ہے ——— چند لمحات کے لیے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ پھر کمرے کی ہر چیز ہلکی ہلکی سبز روشنی میں نہانا شروع کر دیتی ہے)

سعیدہ: کاش میں اچھی ہوتی ——— اچھی ہو سکتی ———

(صوفے پر بیٹھ جاتی ہے ——— جس سے اس کا اضطراب ظاہر ہے)

امجد: اس سے زیادہ تم اور کیا اچھی ہو سکتی ہو سعیدہ!

سعیدہ: (تیزی سے) اچھا نہیں ——— آپ نہیں جانتے۔

امجد: (بہت ملائم آواز میں) اگر کسی وجہ سے میں نے تمھیں ناراض کر دیا ہے تو مجھے معاف کر دو۔

سعیدہ: (امجد کی طرف دیکھتی ہے ——— اٹھتی ہے اور مسکراتی ہوئی اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے امجد کے بالوں میں کنگھی کرتی ہے) سچ تو یہ ہے امجد صاحب کہ میں آپ کے لائق نہیں ہوں۔

امجد: (سعیدہ کا ہاتھ پکڑ کر) یہ تمھارے دل کی اچھائی ہے۔ اگر تم ایسا سمجھتی ہو ورنہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

سعیدہ : ( بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے ) سوچا ہے ـــ کئی راتوں سے آپ جاگ رہے ہیں۔ بلکہ جب سے یہاں آئے ہیں ایک لمحے کے لیے بھی آپ کی آنکھ نہیں لگی۔

امجد : مجھے نیند نہیں آتی سعیدہ۔

سعیدہ : کیوں ؟

امجد : معلوم نہیں لیکن ـــ بس ایسا لگتا ہے کہ نیند کبھی آئی ہی نہ آئے گی ـــ میں تو وہ راتیں بھی یاد کرنا بھول گیا جب سویا کرتا تھا۔

سعیدہ : کاش ! میں آپ کو اپنی نیند دے سکتی۔

امجد : نہیں سعیدہ ! میں اتنی عزیز چیز تم سے نہیں چھیننا چاہتا ـــ یہ تمھاری آنکھوں ہی کے لیے سلامت رہے جو نیند میں اور بھی خوبصورت ہو جاتی ہیں ـــ جاؤ اب سو جاؤ۔

سعیدہ : میں کم بخت تو سو ہی جاؤں گی۔

امجد : ایسا نہ کہو ـــ خدا تمھارے بخت بلند کرے ـــ جاؤ سو جاؤ۔

سعیدہ : ( چڑ کر ) آپ کیوں میرے ساتھ اتنی نرمی سے پیش آتے ہیں۔ امجد صاحب ! مجھے اس سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ خدا کی قسم آپ کی یہ نرمی۔ یہ حلیمی۔ یہ انکسار ایک دن مجھے پاگل بنا دیں گے ( جھنجھلا کر تیزی سے مسہری کی طرف بڑھتی ہے اور خود کو بستر میں گرا دیتی ہے )

امجد : مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے منہ سے جو باتیں نکلتی ہیں۔ وہ بھی ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہیں۔

( سعیدہ خاموش رہتی ہے۔ کروٹ بدل کر وہ اپنا منہ دوسری طرف کر لیتی ہے ـــ امجد اپنی گود میں سے کتاب اٹھاتا ہے اور اس کی ورق گردانی شروع کر دیتا ہے ـــ سکوت کا عالم ہے۔ ہلکی ہلکی سبز روشنی میں یہ سکوت اور بھی زیادہ خفیف

ہوگیا ہے ــــ کافی لمبا عرصہ خاموشی میں گذرتا ہے۔ بڑی
پُراسرار خاموشی ہے ــــ امجد کے چہرے پر راشنی قبروں کے سبز
غلاف کی طرح چڑھی ہے ــــ اس کی نگاہیں کتاب سے ہٹ کر
بار بار سعیدہ کی جانب اٹھتی ہیں اور شرمسار ہو کر دوبارہ پاؤں لوٹ
آتی ہیں ــــ تھوڑی دیر کے امجد بہت زیادہ مضطرب ہو
جاتا ہے )

امجد : سعیدہ !

سعیدہ : جی !

امجد : میں ــــ میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔

سعیدہ : (کروٹ نہ بدلتے ہوئے) کیا ؟

امجد : کیا ــــ کیا آج ہماری پہلی رات ہو سکتی ہے ــــ

سعیدہ : (بستر میں لرزسی جاتی ہے)

امجد : وہ رات ــــ جو ابھی تک نہیں آئی۔

سعیدہ : (خاموش رہتی ہے)

(وقفہ)

امجد : سعیدہ !

سعیدہ : جی !

امجد : کیا تم میری یہ درخواست قبول کر سکتی ہو ؟

سعیدہ : کروٹ بدل کر امجد کو دیکھتی ہے ــــ اس کی آنکھوں میں بے بسی کی زخمی خواہش تیر رہی ہے) کیسے
امجد صاحب ؟

امجد : جھوٹ موٹ ــــ محض میرے بہلاوے کے لیے ــــ تم یہ فرض کر لو کہ میں تمہارے

پہلو میں لیٹا ہوں ——— میں یہاں فرض کروں گا کہ تم میرے پہلو میں لیٹی ہو ——— میں تم سے
وہی باتیں کروں گا۔ جو پہلی رات کو مجھے تم سے کرنا تھیں ——— تم اسی طرح جواب دینا جس طرح کہ تمہیں
دینا تھا ——— میرے لیے ——— کیا میرے لیے تم یہ جھوٹ موٹ کا کھیل کھیل سکتی
ہو سعیدہ!

**سعیدہ** : (آنکھوں میں سپردگی کی خواہش کے بجائے رحم کے آنسو تیر رہے ہیں) میں حاضر ہوں امجد صاحب۔

**امجد** : شکریہ!

(طویل وقفہ)

**امجد** : آج ہماری پہلی رات ہے سعیدہ ——— وہ رات جس میں جوانیاں اپنی
جنت کی طرف پہلا قدم اٹھاتی ہیں ——— وہ رات جس کی تمام پہنائیوں میں
دو جی غوطہ لگاتے ہیں اور ایک ہو جاتے ہیں ——— شرماؤ نہیں یہ
رات تو وہ ہے جب تمام پوشیدہ حقیقتوں کے گھونگھٹ اٹھنے کے لیے
بیتاب ہوتے ہیں ہلکی سی سرگوشی۔ نرم سی آہ۔ ایک چھوٹا سا لمس۔ پردہ سانس
کا ننھا سا ٹکڑا وہ بھی ان گھونگھٹوں کے پٹ کھول دیتا ہے ——— اس قدر
آہستہ کہ معمولی۔ سرسراہٹ تک بھی نہیں ہوتی اور آدمی دیدار ——— پورے
دیدار کے تمام مراحل طے کر جاتا ہے ——— یہ وہ رات ہے جب نگاہیں
ٹکڑے ٹکڑے کر تارے جھڑتی ہیں اور یہ افشاں دو زندگیوں کے ایک ماتھے پر
چُن جاتی ہے ——— یہ وہ رات ہے ——— پہلی سب سے
پہلی، جب آدم کی پسلیاں چیر کر حوا نکالی گئی تھی ——— یہ وہ رات ہے
جس کی درازی عمر کے لیے شاعر دعائیں مانگ مانگ کر ابھی تک نہیں تھکا
——— یہ وہ رات ہے جس کے حصول کے لیے جوانی کی جائے نماز بچھا
کر زندگی اکثر سجدہ ریز رہی ہے ——— یہ وہ رات ہے جس میں حجاب

کی تمام گرہیں لمحہ بھر کے لئے خود کھولتے ہیں —— یہ وہ رات ہے۔ جب
قدرت کے تمام کارخانے صرف ایک ہی پرزہ ڈھال رہے ہوتے ہیں —— وہ
پرزہ جس نے کائنات کے ان تمام کارخانوں کو حرکت بخشی تھی —— یہ وہ
رات ہے جب تمام آوازیں واپس اپنے مخزنوں میں چلی جاتی ہیں کہ اس آواز کا جلوس
انتہائی آرام و سکون سے گذر جائے۔ جس میں "کن" کی گونج ہے —— یہ وہ
رات ہے جس کا ہر پردہ اجالے سے بنا ہے —— یہ وہ رات ہے
ہر آنے والی رات جس کے حضور جھولی پھیلائے بھیک کی منتظر کھڑی ہے ——
یہ وہ رات ہے۔ جب بدن کا رواں رواں منہ کھول کے بولتا ہے اور کان کھول
کے سنتا ہے —— بڑے بڑے ان کہے راز —— بڑے
بڑے گائے ووگ —— (ایک دم چیخ کر) ڈھانپ لو ——
ڈھانپ لو —— سعیدہ اپنا بدن ڈھانپ لو —— مجھے یہ
ڈس رہا ہے —— اس کا ایک ایک خط تلوار کی دھار کے مانند
میری کوائی خواہشوں پر پھر رہا ہے —— ڈھانپ لو —— خدا کے
لیے اپنا جسم ڈھانپ لو ——

سعیدہ: (ہلکی ہلکی سبز کشتی میں گھاس کی نرم نرم پتیوں سے بنی ہوئی لاش کے مانند لیٹی ہے۔ اس کا بدن لرز رہا ہے
ایک ایک انگ کانپ رہا ہے) جی!

امجد: (بلک بلک کر رونے لگتا ہے) اپنا بدن ڈھانپ لو۔

(سعیدہ اپنا لرزتا ہوا بدن کمبل سے ڈھانپ لیتی ہے۔ امجد آنکھوں
کے سامنے ہاتھ رکھے روتا ہے)

○

# پانچواں منظر

(نگار ولا سے ملحقہ لغیچہ ——— شام کا وقت

نوارے کا پانی کھل کھیل رہا ہے۔ سائے گہرے ہو چکے ہیں پس
منظر میں خاکستری پہاڑیاں شام کے دھندلکوں میں رنگینی اختیار
کر گئی ہیں۔ آسمان نے ایسا لگتا ہے۔ اپنے بدن پر بھبوت
مل لی ہے۔ تختوں کے سینے پر سبزہ خاموش لیٹا ہے۔ کرسیاں
خالی ہیں ——— ساری فضا خالی ہے۔ اس فریم کی طرح
جس میں تصویر جڑی جانے والی ہے ——— مجید اور سعیدہ کی
ہنسی کی آواز آتی ہے ——— چند لمحات کے بعد دونوں ہنستے
بڑی مشکل سے اپنی تھکاوٹ کا بوجھ اٹھاتے داخل ہوتے ہیں
——— سعیدہ نڈھال ہو کر خود کو کرسی میں گرا دیتی ہے مجید
اس کے پاس کھڑا رہتا ہے)

**سعیدہ** : (دانتوں پر انگلیاں مارتے ہوئے) اُف ——— ف!

**مجید** : (ہنستا ہے) آپ تھک گئیں ——— دیا دُوں آپ کو؟

**سعیدہ** : (گھبرا کر) نہیں نہیں ——— اصغری کو بھیج دیجئے ——— مجھ سے تو اب دو قدم بھی چلنا دشوار ہے۔

**مجید** : (مسکراتا ہے) بہتر

(آگے بڑھ کر سعیدہ کے چہرے پر نیم منہ سے بالوں کی آوارہ لٹ
انگلیوں سے اٹھا کر ایک طرف کر دیتا ہے)

سعیدہ : (بہت زیادہ گھبراہٹ سے) میں جاتی ہوں اندر۔

(اٹھنے لگتی ہے)

مجید : (ایک طرف دیکھ کر) لو وہ صغریٰ خود ہی آگئی ——— آؤ صغریٰ ——— بھابی جان کے پاؤں دبا دو۔

(صغریٰ داخل ہوتی ہے ——— اس کے ہونٹوں کے خفتا گوشے کپکپا رہے ہیں جیسے کچھ کہنے کے لیے تڑپ رہے ہیں پاس آجاتی ہے)

صغریٰ : (سعیدہ سے) دولہن بیگم تھک گئیں آج ؟

سعیدہ : (رانوں پر چٹکیاں لیتے ہوئے) ہاں !

صغریٰ : (گھاس پر بیٹھ کر سعیدہ کی ایک پنڈلی دبانا شروع کرتی ہے۔ خطاب مجید سے ہے) یہ سب مجید میاں کا قصور ہے ——— اتنی بڑی سیر اور اتنی جلدی (لہجے میں تیکھا پن ہے) ہر چیز دھیرے دھیرے ہونی چاہیئے (ہولے ہولے دباتی ہے) اس طرح —— ہولے ہولے (سعیدہ سے) کہوں دولہن بیگم۔ کچھ آرام محسوس ہوا آپ کو ؟

سعیدہ : (دوسری ٹانگ جو صغریٰ کی گرفت سے آزاد ہے۔ اضطراب کا شدید مظاہرہ کرتی ہے) ٹھیک ہے ٹھیک ہے !

صغریٰ : (مجید سے) مجید میاں۔ آپ جائیں ——— منہ ہاتھ دھوآئیں ——— گرد و غبار سے آپ کا چہرہ بالکل ان دھویا آلو بنا ہوا ہے۔

مجید : (تیزی سے) تم بہت گستاخ ہو گئی ہو ——— یہ سب ——— ———

صغریٰ : (مجید کی بات کاٹ کر) دولہن بیگم کا قصور ہے جنہوں نے مجھے منہ لگا لیا ہے (سعیدہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر) ایسا خوبصورت منہ !

(مجید نگاہوں ہی نگاہوں میں غصّہ برساتا چلا جاتا ہے)

**اصغری** : (ہنستی ہے) مجید میاں کی شکل صورت یوں تو ماشاءاللہ بڑی اچھی ہے —— مگر غصے میں ہمیشہ بگڑ جاتی ہے —— آپ کا کیا خیال ہے ؟

**سعیدہ** : تم مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو (اٹھنا چاہتی ہے مگر اصغری کی مضبوط گرفت کے باعث نہیں اٹھ سکتی) چھوڑ دو مجھے !

**اصغری** : (دباتے ہوئے) میں اس خدمت سے خود کو چھڑانا نہیں چاہتی (سعیدہ کے پاؤں سے سینڈل اتارتی ہے) مجید میاں کہہ رہے تھے میں گستاخ ہو گئی ہوں —— کیا یہ درست ہے دولہن بیگم ؟

**سعیدہ** : بالکل درست ہے ۔

**اصغری** : (بڑے اطمینان سے سعیدہ کے پاؤں کی انگلیاں چٹخاتے ہوئے) تو یہ بہت بری بات ہے نوکرانی کو گستاخ کبھی نہیں ہونا چاہیے —— آپ میرے کان کھینچیے !

**سعیدہ** : خاموش رہو !

**اصغری** : یہ ظلم ہے —— زبان بندی بہت بڑا ظلم ہے دولہن بیگم —— میں نے ایسی کونسی بات کی جو آپ کو ناگوار گذری ۔

**سعیدہ** : (اضطراب کے ساتھ) تمہاری سب باتیں مجھے ناگوار گذرتی ہیں ۔

**اصغری** : اصغری بے چاری اب کیا کرے (توقف کے بعد) میں تو یہ سمجھتی تھی کہ آپ جیسی لکھی پڑھی بیگم کی نوکری میں اس ایک برس کے اندر اندر ہی مجھے سب کچھ آگیا ہے —— پر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غلط فہمی تھی —— میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں سیکھا —— لیکن یہ کس کا قصور ہے سیکھنے والے کا یا سکھانے والے کا ؟

**سعیدہ** : (پاؤں واپس کھینچتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں) تم کہنا کیا چاہتی ہو ؟

**اصغری** : (مصنوعی حیرت سے) میں ؟

**سعیدہ** : ہاں تم —— کیا کہنا چاہتی ہو تم ؟

**اصغری** : (سوچتے ہوئے) کہنے کو تو میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں

سعیدہ: (اٹھ کر ننگے پاؤں گھاس پر چلتے ہوئے) تو کہہ ڈالو آج ——— مجھے تمھاری سر بستہ کی مہین مہین چٹکیاں پسند نہیں ——— تم جو کہنا چاہتی ہو۔ میں سننے کے لیے تیار ہوں۔

اصغری: آپ بڑی ہمت والی ہیں دولہن بیگم۔

سعیدہ: میں ہمت والی ہوں یا بزدل ہوں۔ تم اسے چھوڑو ——— جو کہنا چاہتی ہو آج اگل ڈالو۔

اصغری: یہ نفرہ آپ کو اور مجھے دونوں کو تکلیف دے گی۔

سعیدہ: میری تکلیف کا تم کچھ خیال نہ کرو ——— میں برداشت کر لوں گی۔

اصغری: (— چپتے ہوئے) میں سمجھتی تھی۔ میرے دانتوں تلے دبی ہوئی کٹاری دیکھ کر آپ ڈر جائیں گی۔ پر اب ایسا لگتا ہے کہ آپ چلتے چلتے ایسی جگہ پہنچ گئی ہیں۔ جہاں زخموں کی کوئی پروا نہیں رہتی ——— اب تو مجھے خوف آنے لگا ہے آپ سے۔

سعیدہ: (اضطراب میں ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے) اصغری!

اصغری: (چونک کر) جی!

سعیدہ: تم مجھے یہ بتاؤ ——— اگر امجد میاں گاڑی کے حادثے میں مر جاتے تو میں کیا کرتی؟

اصغری: آپ ——— مجھے معلوم نہیں آپ کیا کرتیں۔

سعیدہ: میں جوان ہوں۔ خوبصورت ہوں۔ میرے سینے میں ایسے ہزاروں ارمان ہیں جو میں سترہ برس تک اپنے خیالوں کا شہد پلا پلا کر پالتی پوستی رہی ہوں ——— میں ان کا گلا نہیں گھونٹ سکتی ——— میں نے بہت کوشش کی ہے اصغری ——— میرا خدا جانتا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی ہے۔ لیکن میں اپنے ہاتھوں کو اس قتل پر آمادہ نہیں کر سکی ——— تم مجھے کمزور کہہ لو ——— بزدل کہہ لو۔ اخلاق باختہ کہہ لو ——— تم ایک نوکرانی ہو ——— میں تمھارے سامنے اعتراف کرتی ہوں۔ کہ میں اپنی جوانی کا باغ جس کے پتے پتے۔ بوٹے بوٹے میں میرے کنوارے ارمانوں کا گرم گرم خون دوڑ رہا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے نہیں اُجاڑ سکتی۔ ——— ویسے میں کسی کو بھی اجازت دے سکتی ہوں کہ وہ میری آنکھیں بند کر کے ——— نہیں ——— میرے تمام حواس پر تالے لگا کر بڑھاپے

اور منڈ لپے کی عمیق ترین گہرائیوں میں اُتار دے —— یا ایک ہی بار دھکا دے کر مجھے اپنے ارمانوں کی لرزتی ہوئی چٹانوں کی چوٹیوں پر سے نیچے گرا دے جن پر میں اس وقت تک دامن سمیٹے تند ہواؤں کا مقابلہ کرتی رہی ہوں —— میں تم کو بھی اجازت دیتی ہوں۔

**اصغری:** (شکست خوردہ اُٹھتی ہے) بس دولہن بیگم۔

**سعیدہ:** میں ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہوں اصغری۔ جہاں زمین میرے قدموں کے نیچے گھوم رہی ہے۔ میں جس راستے کی طرف منہ کرتی ہوں وہی مجھ سے منہ موڑ لیتا ہے —— میں جو ارادہ کرتی ہوں مجھ سے اپنا دامن چھڑا کے بھاگ جاتا ہے۔ میں اس کے پیچھے بھاگتی ہوں —— اندھا دھند دوڑتی ہوں اور جب اسے پکڑ لیتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریت کا بنا ہوا تھا۔ میرے پکڑتے پکڑتے ہی ڈھیر ہو جاتا ہے —— اصغری تم نہیں جانتی ہو۔ میں کتنی دیر سے انگاروں کے بستر پر لوٹ رہی ہوں۔ بجھانے کے لیے میں ان پر پانی ڈالتی ہوں تو بھاپ کے ایسے بگولے اٹھتے ہیں جو مجھے اپنے ساتھ اونچا ہواؤں میں لے جاتے ہیں اور جھنجوڑ جھنجوڑ کر جھنجوڑ جھنجوڑ کر ایک دم نیچے پٹک دیتے ہیں —— میری ہڈی ہڈی پسلی پسلی چور چور ہو چکی ہے اصغری —— کیا ہی اچھا ہوتا اگر میاں صاحب کے بدلے میں بیمار ہوئی ہوتی۔

طویل وقفہ

(اصغری خاموش کھڑی رہتی ہے —— سعیدہ اضطراب میں ادھر اُدھر ٹہلتی رہتی ہے)

**سعیدہ:** بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہئے؟

**اصغری:** (محویت کے عالم سے بیدار ہوتی ہے) کیا کرنا چاہئے —— آپ کو —— آپ کو امجد میاں کی موت کا انتظار کرنا چاہئے۔

**سعیدہ:** (کچھ دیر سوچ کر) تم مجھے اتنا بے رحم اور سنگدل کہو گی —— لیکن میں پوچھتی ہوں —— انھیں کب موت آئے گی؟

اصغری: جب اللہ میاں کو منظور ہوگا (بڑبڑاتی ہے) لیکن امجد میاں کی دوستی تو ان سے ختم ہو چکی ہے۔

سعیدہ: کیا؟

اصغری: جی! کچھ نہیں۔

(اکھڑے اکھڑے قدم اٹھاتی اصغری چلی جاتی ہے ——
سعیدہ ننگے پاؤں گھاس کے ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر اضطراب
کی حالت میں ٹہلتی رہتی ہے)

○

# چھٹا منظر

(نگار ولا ——— ڈرائنگ روم ——— وسیع و عریض کمرہ جو پُرانی وضع کے ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ ہر چیز وزنی اور پائدار ہے ——— دیواروں پر آئل پینٹنگز آویزاں ہیں جو خاندان کے مختلف افراد کی ہیں ایک پینٹنگ بیگم کی ہے۔ جب کہ وہ جوان تھی۔ اس پینٹنگ کے نیچے بیگم ایک صوفے پر بیٹھی تقابل پیش کر رہی ہیں۔ تصویر میں وہ بے فکر ہے۔ مگر صوفے میں سخت فکرمند۔ اس کا چہرہ غم و اندوہ کا مجموعہ ہے۔ کوئی اُدنی چیز بُن رہی ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خیالات و افکار کے الجھے ہوئے دھاگے لپیٹتی ہے۔ کبھی کھولتی ہے

اصغری داخل ہوتی ہے)

**بیگم صاحب:** مجید میاں ملے ؟

**اصغری:** جی ہاں !

**بیگم صاحب:** کہاں تھے ؟

**اصغری:** نیچے ہیں۔

**بیگم صاحب:** کیا کر رہے تھے ؟

**اصغری:** جی ؟ ——— (اٹک کر) جی اکیلے بیٹھے تھے۔

**بیگم صاحب:** (اصغری کی طرف دیکھ کر نگاہیں نیچی کر کے) آ رہے ہیں۔

**اصغری:** جی ہاں !

**بیگم صاحب:** تم جاؤ۔

(اصغری چلی جاتی ہے ——— مجید اس کی طرف دیکھتا اندر داخل ہوتا ہے)

مجید : کیا بات ہے امی جان ؟
بیگم صاحب : کچھ نہیں — بیٹھ جاؤ ۔
مجید : ( پاس ہی صوفے کی دوسری کرسی پر بیٹھ جاتا ہے ) یہاں سردی ہے ؟
بیگم صاحب : ہاں —— یہاں سردی ہے ۔

وقفہ

مجید : ( بے چینی محسوس کرتے ہوئے ) میرا خیال ہے —— آپ نے مجھے یہاں کچھ کہنے کے لیے بلایا ہے ۔
بیگم صاحب : ہاں !
مجید : فرمایئے ؟
بیگم صاحب : مَیں تمہیں یہاں سے بھیجنا چاہتی ہوں ۔
مجید : مجھے ؟ ( اٹھ کر ) کہاں ؟
بیگم صاحب : بیٹھ جاؤ ۔
مجید : ( بیٹھ جاتا ہے ) یہ لیجئے ۔
بیگم صاحب : مَیں نے ابھی امجد سے بات نہیں کی ۔
مجید : ( پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے ) کون سی ؟
بیگم صاحب : یہی تمہیں یہاں سے بھیجنے کی ۔
مجید : لیکن آپ مجھے یہاں سے کیوں بھیج رہی ہیں —— میرا مطلب ہے کوئی خاص کام ہے یا
بیگم صاحب : بیٹھ جاؤ ۔
مجید : ( بیٹھ جاتا ہے ) کوئی خاص کام ہے ؟
بیگم صاحب : نہیں ۔
مجید : تو پھر مجھے یہاں سے کہیں باہر بھیجنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی ہے ۔
بیگم صاحب : کہ مَیں اسی میں بہتری سمجھتی ہوں ۔

مجید : بہتری ـــــــ کس کی بہتری ؟

بیگم صاحب : ہم سب کی ـــــــ اس گھر کی۔

مجید : (اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) آپ پہیلیوں میں بات کر رہی ہیں امّی جان !

بیگم صاحب : مجید تم میرے لڑکے ہو۔ مَیں تمہاری ماں ہوں ـــــــ میرے تمہارے درمیان کوئی ایسی گفتگو نہیں ہونی چاہیئے۔ جو اس مقدس رشتے پر ذرا سی بھی کالک لگائے ـــــــ مَیں چاہتی ہوں کہ تم آج ہی کراچی چلے جاؤ اور جب تک مَیں کہوں وہیں رہو۔

مجید : لیکن امّی جان !

بیگم صاحب : (بات کاٹ کر) تمہارے وہاں بے شمار دوست موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے۔ تم ان کی مدد سے یا خود اپنی ہمت سے۔ اس منجدھار میں سے جسے زندگی کہتے ہیں، اپنی کشتی صحیح و سلامت کنارے لے جاؤ گے۔

مجید : (کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر کہہ نہیں سکتا۔ اور بیٹھ جاتا ہے) بہت بہتر ـــــــ مَیں چلا جاؤں گا۔

بیگم صاحب : تمہارا فیصلہ ـــــــ

(ایک دم خاموشی ہو جاتی ہے)

(کمرے میں امجد اپا ہجوں والی کرسی میں داخل ہوتا ہے۔ جسے کریم چلا رہا ہے)

امجد : (مجید سے) یار مجید تم بھی عجیب آدمی ہو ـــــــ میں وہاں کمرے بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ تم آؤ گے تو ہم دونوں سعیدہ کی سالگرہ کے تحفے کے متعلق سوچیں گے ـــــــ لیکن تم یہاں بیٹھے ہو۔ (بیگم صاحب سے) امّی جان! ـــــــ آپ نے کیا سوچا ـــــــ کیسا تحفہ ہونا چاہیئے ! مَیں تو سوچ سوچ کر پاگل ہو گیا ہوں۔

بیگم صاحب : تم سعیدہ سے کیوں نہیں پوچھتے۔

امجد : لو اور سنو (ہنستا ہے) حد کر دی آپ نے امّی جان ـــــــ اس سے مشورہ لیا تو تحفے کا مزا کیا خاک آئے گا (مجید سے) کیوں مجید ؟

مجید : (خاموش رہتا ہے)

امجد : بولو یار۔

مجید : (اُٹھ کر) آپ امی جان سے پوچھیے ــــــ میں تو جا رہا ہوں۔

امجد : (حیرت سے) جا رہے ہو! ــــــ کہاں جا رہے ہو؟

مجید : کراچی۔

امجد : یقیناً تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے ــــــ کیا کرنے جا رہے ہو کراچی؟

مجید : کیا کرنے جا رہا ہوں (ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ) منجدھار میں سے اپنی کشتی نکالنے۔

امجد : (بیگم سے) کیا ہو گیا ہے اسے (مجید سے) بیٹھو یار ــــــ پرسوں اس کی سالگرہ ہے۔ ابھی ابھی فیصلہ ہو جانا چاہیے۔

مجید : فیصلہ تو ہو چکا ہے۔

امجد : کیا؟

مجید : کہ میں کراچی جا رہا ہوں اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔

امجد : کیا بکتے ہو (بیگم سے) امی جان یہ قصہ کیا ہے؟

بیگم صاحب : کچھ نہیں ــــــ ان بیٹے میں لڑائی ہو گئی ہے کسی بات پر۔

امجد : کس بات پر؟

بیگم صاحب : تم نہیں پوچھ سکتے۔

امجد : حدول حکمی تو ہوتی ہے ــــــ لیکن مجید میرا بھائی ہے ــــــ آپ کے اور اس کے درمیان اگر کوئی رنجش یا غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے تو اسے دور کرنا میرا فرض ہے ــــــ مجید کو میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں ــــــ اس سے ایسی کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی جو آزار کا موجب ہو (مجید سے) ادھر آؤ مجید۔

مجید : بھائی جان۔ مجھے اپنا اسباب بندھوانا ہے۔

**امجد** : لاحول ولا ——— یہ سب کیا ہے (بیگم سے) امی جان —— خدا کے لیے اسے روکیے
——— میرے لیے نہیں تو سعیدہ کے لیے روکیے ——— اس گھر میں ایک صرف یہی
ہے جس نے ابھی تک اسے اُداس نہیں ہونے دیا ——— میری خاطر اتنی زحمت برداشت
کرتا ہے ——— اگر آپ نے اسے جانے دیا تو امی جان! میں نہیں جانتا میرا کیا حال ہوگا
سعیدہ کو میرے لیے سے جاتا ہے تو میں تصور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے بدلے میں اس کے ہمراہ ہوں۔ اس
کے ساتھ کوئی کھیل کھیلتا ہے تو وہ خلا بہت حد تک پورا ہو جاتا ہے۔ بہو، ان کے بچے ہاتھوں
نے میری زندگی میں پیار رکھا ہے ——— میں تو کئی بار سوچتا ہوں امجد۔ اگر یہ بھائی مجید نہ ہوتا
تو کیا میری شکستہ زندگی کا ملبہ اس قابل نہیں تھا کہ کھنڈر سے پڑا ہوتا —— امی جان اسے روکیے
——— یہ تو میرا بازو ہے ——— کیوں آپ اس کو مجھ سے جدا کر رہی ہیں —— اللہ میاں
کی جگہ نہ لیجیے امی جان!

(رونے لگتا ہے)

**مجید** : میں جا رہا ہوں امی جان!

**بیگم صاحب** : ٹھیرو!

**مجید** : (رک جاتا ہے)

**بیگم صاحب** : (اٹھتی ہے اور پھر امجد کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے) امجد بیٹا ——— رو نہیں جانِ مادر
——— مجید نہیں جائے گا ——— جو چیز جہاں ہے وہیں رہے گی —— اس لیے
کہ اسے یہی منظور ہے۔ (مجید سے) بھائی کے پاس بیٹھو اور سعیدہ کی سالگرہ کے متعلق سوچو۔

(چلی جاتی ہے)

(مجید کچھ دیر سوچتا ہے پھر امجد کی کرسی کی طرف بڑھتا ہے)

**مجید** : (آہستہ سے) بھائی جان! آپ مجھے جانے دیں!

**امجد** : (جھٹکا سا دے کر سر اٹھا کر) جانے دوں —— کہاں جانے دوں؟ —— پاگل مت بنو۔

مجید : آپ نہیں جانتے بھائی جان۔

امجد : میں سب سمجھتا ہوں ——— اپنا رومال نکالو اور ذرا یہ میرے آنسو پونچھ دو۔

مجید : (تھوڑے توقف کے بعد اپنا رومال نکالتا ہے اور امجد کے آنسو پونچھتا ہے)

(جلدی جلدی)

امجد : کیا کرتے ہو یار ——— تمہیں تو آنسو پونچھنا بھی نہیں آتا (مسکراتا ہے) اتنا معمولی سا کام ہے۔

مجید : یہ معمولی کام نہیں بھائی جان۔

امجد : (مسکرا کر) اچھا بھائی بڑا جان جوکھوں کا کام ہے ——— آؤ ادھر بیٹھو ——— سعیدہ کی سالگرہ کے تحفے کے متعلق سوچیں۔ بیٹھو۔

مجید : (امجد کے پاس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) سوچیے۔

امجد : (آہ بھر کر) سوچتے ہیں بھائی سوچتے ہیں ——— سوچنے کے علاوہ اب اور کام ہی کیا ہے۔ لیکن تم ذرا تم بھی سوچو۔

(مجید اور امجد دونوں سوچ میں مستغرق ہو جاتے ہیں)

O

# ساتواں منظر

نگار ولا سے ملحقہ باغیچہ ـــــــ شام کا وقت۔ فوارے
کا پانی بند ہے۔ جیسے وہ اُبل اُبل کر عاجز آچکا ہے۔ پس منظر میں خاکستری
پہاڑیاں دھندلکوں میں اپنی سنگینیاں جیسے چھپا رہی ہیں فرش پر سبزہ روندا
ہُوا سا معلوم ہوتا ہے۔ دائیں طرف فوارے سے دور ہٹ کر گھنی
جھاڑیاں۔ جن کے عقب میں امجد اپاہجوں والی کرسی میں بیٹھا ہے پشت
پر صغری کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہے ــــ وہ اُسے
چلانے لگتی ہے۔

**امجد** : نہیں اصغری ــــــ کچھ دیر ٹھہرو

**اصغری** : (ٹھہر جاتی ہے) لیکن امجد میاں

**امجد** : میں آج اپنی زندگی کا آخری زخم کھانا چاہتا ہوں۔

**اصغری** : یہ زخم کھانا اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو اپنے تصور ہی میں کھا سکتے ہیں ــــ لیکن ــــ یہ زخم تو آپکے لگ چکا ہے ــــ اسے دوبارہ کیوں کھانا چاہتے ہیں آپ ؟

**امجد** : (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) میری حالت میں جو آدمی ہو اس کے بدھونے کی کوئی حد نہیں رہتی اپنے زخموں کے ٹانکے کھول کھول کر دیکھتا ہے۔ انگوروں کی زبانی بیٹوں کی داستانیں سنتا ہے اور خود کو بہت بڑا شہید سمجھتا ہے (ہنستا ہے) صغری تمھاری کبھی کوئی چیز ٹوٹی نہیں۔ بس ویسے تم لوگوں کا دردناک حال نہیں جانتی ہو جو عجز کی انتہا کو پہنچ کر شکست و ریخت میں بلند بام عمارتیں بناتے ہیں۔

**اصغری** : (مسکراتی ہے) میں تو ان حدوں سے بھی آگے نکل گئی ہوں امجد میاں ــــــ بڑی بڑی اونچی اونچی عمارتیں بنا کر خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا چکی ہوں ــــــ ایسا کرتے کرتے تو میرے ہاتھ شل ہیں

بھی گٹنے پڑ چکے ہیں۔

**امجد** : (کانپ جاتا ہے) اصغری —— تم بڑی خوفناک ہو۔

**اصغری** : (ہنستی ہے) ہر اجاڑ خوفناک ہوتی ہے —— حالانکہ بے چاری کیا خوفناک ہوسکتی ہے۔ اسے اپنے ماتم پر اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے جو دوسروں کو ڈرائے —— وہ تو خود دبکی ہوئی سہمی ہوئی ہوتی ہے۔

**امجد** : تمھاری زندگی بھی کسی حادثے سے دوچار ہوئی ؟

**اصغری** : جی نہیں —— ہم جیسی کی زندگی کسی حادثے سے کیا دوچار ہوگی جو کہ خود ایک حادثہ ہے۔

**امجد** : تمھاری باتوں سے جلتے ہوئے گوشت کی بو آتی ہے۔

**اصغری** : اس لیے کہ اب آپ کی سونگھنے کی حس جاگی ہوئی ہے۔

**امجد** : پہلے سو رہی تھی ؟

**اصغری** : جی ہاں —— بہت گہری نیند۔

**امجد** : اسے جگایا کس نے ہے ؟

**اصغری** : اس گاڑی نے جو پٹڑی سے اتر گئی۔

**امجد** : (بڑبڑاتا ہے) اس گاڑی نے —— جو پٹڑی سے اتر گئی —— (ذرا بلند آواز) کیا یہ پھر پٹڑی سے اترے گی ؟

**اصغری** : جو اللہ میاں کو منظور ہے وہی ہوگا۔

**امجد** : اللہ میاں کا نام مت لو —— میری اس کی دوستی ختم ہو چکی ہے۔

**اصغری** : نہیں امجد میاں۔ اس شخص سے ہم ایسوں کی دوستی کبھی ختم نہیں ہوتی —— ٹوٹ ٹوٹ کے آپ جڑتی رہتی ہے۔

**امجد** : یہ سب بکواس ہے۔

(دونوں ایک دم چونکتے ہیں —— قدموں کی آہٹ سنائی دیتی

ہے۔ مجید اور سعیدہ ہانپتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں — سعیدہ
جو بہت تھکی ہوئی ہے۔ فوارے کی منڈیر پر بیٹھ جاتی ہے مجید کھڑا
رہتا ہے)

سعیدہ: آج تو میں بہت تھک گئی ہوں۔

مجید: حالانکہ ہم زیادہ دور نہیں گئے۔

سعیدہ: ہاں۔

**وقفہ**

مجید: کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر میں کراچی چلا گیا ہوتا:

سعیدہ: اچھا ہی رہتا۔

مجید: میری جان عجیب مشکل میں پھنس گئی ہے — میں کراچی چلا جاتا — لیکن سوال ہے
کیا میں اس منجدھار میں سے اپنی کشتی کھیکر کنارے لے جاتا؟ — نہیں — میں
ضرور ناکام رہتا۔

سعیدہ: مجھے معلوم ہے۔

مجید: تمہیں معلوم ہے — مجھے معلوم ہے — سوائے بھائی جان کے اور سب کو معلوم ہے
اور یہی اس کہانی کا سب سے المناک حصہ ہے۔

سعیدہ: میں نے کئی بار سوچا ہے کہ ان سے کہہ دوں لیکن (اٹھ کھڑی ہوتی ہے) مجھے ڈر ہے وہ اس صدمے کی
تاب نہ لاسکیں گے۔

مجید: مجھے خود بھی اسی بات کا ڈر ہے — ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک
برس اور زندہ رہے گا — غریب سے زندگی کا اتنا مختصر عرصہ چھیننا ظلم ہے!

(جھاڑیوں کے عقب میں امجد اپنے دانت بھینچ لیتا ہے
اضطراری غصے میں سے اس کا کندھا پکڑ لیتی ہے)

سعیدہ : ہمیشہ کوشش کرنی چاہیے کہ جب تک وہ زندہ ہیں خوش رہیں۔ ان کے احساسات کے نازک آبگینوں کو ہلکی سی ٹھیس بھی نہ لگے۔

مجید : اور اگر ہمارا کوئی چھالا رگڑ کھا کے پھوٹ پڑا تو ——

سعیدہ : (قریب قریب چیخ کر) تو قیامت آجائے گی

مجید : اسی لیے میں سوچتا ہوں کہ میں چلا جاؤں۔

سعیدہ : (ایک دم بات کاٹ کر) ایسا نہ کہو مجید —— اتنے ظالم مت بنو۔

(امجد۔ پایا ہجوں کی کرسی میں لرز جاتا ہے۔ اصغری اس کا دوسرا کندھا بھی مضبوطی سے پکڑ لیتی ہے)

مجید : محبت بڑی ہی ظالم اور خود غرض ہوتی ہے سعیدہ ! —— کم بخت دوسروں کی موت پر ناچنے کی خواہش کرتے ہوئے بھی نہیں شرماتی۔

سعیدہ : ہمیں ایسے خیال اپنے دماغ میں نہیں لانے چاہئیں

مجید : ٹھیک ہے —— لیکن آجائیں تو کیا کریں۔

سعیدہ : کیا کر سکتے ہیں —— چلو۔

(سعیدہ کوٹھی کی جانب چلتی ہے —— مجید اس کے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا روانہ ہوتا ہے —— جھاڑیوں کے عقب میں اپاہجوں والی کرسی میں امجد سر جھکائے ہوا ہے۔ اس کے پیچھے اصغری بت بنی کھڑی ہے)

اصغری : چلیں ؟

امجد : (اسی طرح سر جھکائے ہوئے) نہیں —— ابھی نہیں —— میں سوچ رہا ہوں۔

اصغری : کیا ؟

امجد : معلوم نہیں —— شاید یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے اب کیا سوچنا چاہیے۔

**اصغری** : ایسی سوچ بچار بالکل فضول ہوتی ہے۔

**امجد** : (سر اُٹھا کر) فضول تو ہوتی ہے ——— مگر پھر کیا کروں ——— (وقفے کے بعد) وہ اتنے ظالم نہیں ہیں جتنی تم ہو ——— تم تو مجھے سوچنے سے منع کرتی ہو ——— تم بڑی ظالم ہو اصغری!

**اصغری** : (مسکرا کر) محبت بڑی ظالم اور خودغرض ہوتی ہے امجد میاں ——— کم بخت اپنی موت پر بھی ناچنے سے باز نہیں آتی۔

**امجد** : میرے سامنے آؤ۔

(اصغری اس کے سامنے آتی ہے امجد اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے ——— کچھ سوچتا ہے اور بڑبڑاتا ہے)

**امجد** : یہ کتاب اب تک کہاں پڑی تھی۔

**اصغری** : کہیں ردی ہی کی کوٹھری میں ——— اپنی صحیح جگہ!

**امجد** : چلو ——— مجھے لے چلو۔

(اصغری کرسی کھینچتی ہے اور کوٹھری کی جانب چلتی ہے)

○

# آٹھواں منظر

(وہی کمرہ جو پہلے دوسرے اور چوتھے منظر میں ہے رات کا وقت ۔ چھت سے سبز روشنی کی پھوار گر رہی ہے —— ہر شے کا اصلی رنگ بدلا ہوا ہے۔ جیسے اعصاب زدہ مریضوں کا —— مسہری خالی ہے کچھ اس طور پر خالی جیسے وہ کبھی آباد ہی نہیں تھی —— اصغری۔ امجد کو اپاہجوں والی کرسی میں اندر لاتی ہے)

**اصغری** : دولہن بیگم۔ بیگم صاحب کے کمرے میں کیوں چلی گئیں ؟

**امجد** : ڈر آتی تھی۔

**اصغری** : آپ سے ؟

**امجد** : (مسکرا کر) مجھ سے کوئی کیا ڈرے گا —— وہ اپنے آپ سے ڈرتی ہے۔

**اصغری** : وہ اتنی کمزور نہیں ہیں امجد میاں۔

**امجد** : وقت بڑے بڑے پہاڑ کھوکھلے کر دیتا ہے —— وہ تو ایک جوان لڑکی ہے۔

**اصغری** : (توقف کے بعد) آپ سونا چاہیں گے اب ؟

**امجد** : سونا ؟ (ہنستا ہے) میرا مذاق مت اڑاؤ اصغری —— میرے جلتے ہوئے زخموں کی توہین ہوتی ہے۔

**اصغری** : (توقف کے بعد) کیا آپ کو سعیدہ سے محبت ہے ؟

**امجد** : نہیں۔

**اصغری** : تو پھر یہ جلتے ہوئے زخم کیسے ؟

**امجد** : مجھے سوچنے دو —— بولو اجازت دیتی ہو سوچنے کی ؟

**اصغری** : آپ سوچئے۔

(طویل وقفہ جس میں امجد سوچ میں غرق رہتا ہے)

**امجد** : مجھے سعیدہ سے محبت نہیں ہے ــــ جس طرح مارکیٹ سے آدمی اچھی چیز چن کے لاتا ہے ــــ اسی طرح میں نے سینکڑوں لڑکیوں میں سے اسے انتخاب کرکے اپنی بیوی بنایا تھا ــــ مجھے اپنے اس انتخاب پہ ناز تھا اور ہے ناز تھا ــــ سعیدہ مبالغے کی حد تک خوبصورت ہے ــــ اس پر میرا صرف اتنا حق ہے کہ میں نے اُسے چُنا اور اپنی رفیقہ حیات بنایا ــــ اس حیات کا جواب مجھے نہ ہوئی ہی کرسی میں دھری ہے ــــ جو کسی دوسرے کی مدد کے بغیر ہل جُل نہیں سکتی ــــ ڈاکٹروں نے مجھے زیادہ سے زیادہ ایک سال اور زندہ رہنے کے لیے دیا ہے ــــ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کیوں اس عرصے تک اس کو اپنی زنجیروں میں باندھ کے رکھنا چاہتا ہوں جن کا ہر حلقہ میری اپنی زندگی کی طرح غیر یقینی ہے۔ ــــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ــــ سوچتے ہوئے) اس کی حیران خوبصورتی ہی ایک وجہ ہو سکتی ہے (ایک دم چونک کر) یہی۔ یہی ــــ یہی وجہ ہے اور کوئی نہیں (تکلیف محسوس کرتا ہے) اوہ ــــ اوہ ــــ وہ نظارہ ــــ وہ نظارا ــــ مجھے بھول سکتا ہے۔ کبھی وہ نظارہ ــــ اس مسہری میں جوان خوبصورتی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ لیٹی دنیا کے حسین ترین ملبوسات کو شرمسار کر رہی تھی ــــ یہ نظارہ میرے ساتھ چمٹ گیا ــــ نہیں۔ میں اس کے ساتھ چمٹ گیا ہوں ــــ (وقفے کے بعد) اصغری!

**اصغری** : (چونک کر) جی!

**امجد** : کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے جو یہ چمپل نچ کر میرے وجود سے علیحدہ ہو جائے۔

**اصغری** : ہر مشکل کی ہتھیلی میں اس کو آسان کرنے کی ترکیب چھپی ہوتی ہے۔

**امجد** : تو ڈھونڈنی چاہیئے ــــ لیکن ــــ لیکن مجھے حجاب کیوں محسوس ہوتا ہے

**اصغری** : معلوم نہیں کیوں ــــ یہ مشکل آپ ہی کی مشکل ہے اس کے لیے آپ کا ہاتھ کسی نامحرم کا ہاتھ نہیں ہوگا۔

**امجد** : جانتا ہوں ــــ میں اپنے دل کی ان تمام مختلف نسوں سے واقف ہوں جو اس غلط جذبے

کی دھڑکنیں پیدا کرتی ہیں ——— لیکن آج اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔

اصغری: کس کا؟

امجد: میرے سامنے آؤ۔

(اصغری امجد کے سامنے آجاتی ہے)

امجد: جاؤ۔ مسہری میں لیٹ جاؤ۔

اصغری: (ہچکچا کر) امجد میاں! مجھ میں وہ جوان خوبصورتی نہیں ہے جس کی رعنائیاں دنیا کے حسین ترین ملبوسات کو شرمسار کر سکیں ——— میری جوانی تو کھردرے ٹاٹ کی شرمندہ احسان ہونا چاہتی ہے۔

امجد: مسہری میں لیٹ جاؤ اصغری۔

اصغری: (آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں) نہیں امجد میاں ——— مسہری کو تکلیف ہوگی ——— یہ دولہن بیگم کے نرم اور نازک بدن کی عادی ہے۔

امجد: میں تمھیں حکم دیتا ہوں۔

اصغری: (سر جھکا کر) آپ مالک ہیں۔

(مسہری میں لیٹ جاتی ہے ——— آنکھیں چھت میں گڑ جاتی ہیں)

امجد: جانتی ہو آج کون سی رات ہے ——— وہ رات ہے جب ایک تڑپتی ہوئی جوانی اور زیادہ تڑپ تڑپ کر سالمیت اختیار کرنے والی ہے ——— یہ قیامت کی رات ہے ——— فنا کی رات اس کے اندھیاروں میں وجود عدم کی بھٹیوں میں پگھل کر ایک غیر فانی قالب اختیار کرے گا ——— یہ وہ رات ہے جس کے بعد اور کوئی رات نہیں آئے گی۔ اس کی اندھی آنکھوں میں ایسے کاجل سے تحریریں ہوں گی جو اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روشن کر دیں گی ——— یہ وہ رات ہے جب موت کے نچڑے ہوئے تھنوں سے زندگی کے آخری قطرے ٹڈ کر خود بخود باہر آجائیں گے ——— یہ وہ رات ہے جب شکستگی اپنی کوکھ سے سربلند ایوانوں کو جنم دے گی ——— ایسے سربلند ایوان جن کے کنگروں کو عرش کی بلندترین اونچائیوں سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہوگا ——— یہ وہ رات ہے

جب زمزم کا سارا پانی ریگ رینگ کر زمین کی تہوں میں چھپ جائے گا۔ اس کے بدلے خاک اُڑے گی جس سے پاکیزہ روحیں تیمم کریں گی ——— یہ وہ رات ہے جب کاتبِ تقدیر اپنا قلمدان اوندھا کر کے عرش کے کسی کونے میں منہ دے کر روئے گا ——— یہ وہ رات ہے جس میں امجد اس دنیا کی تمام محبوبوں کو تین دفعہ طلاق دیتا ہے اور ایک بدصورتی کو اپنے رشتۂ مناکحت میں لاتا ہے۔ (ایکدم چیختا ہے)

اصغری ——— اصغری!

(اس دوران میں اصغری مسہری پر سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس پہنچ کر اسے کھول چکی ہے اور اس کی سِل پر کھڑی ہو کر نیچے گہرائیوں میں دیکھ رہی ہے)

**امجد**: (چیخ کر) یہ کیا کر رہی ہو اصغری!

**اصغری**: (کھڑکی کی سِل پر مڑ کر امجد کو دیکھتی ہے) ایجاب قبول ضروری ہے میرے مالک!

(نیچے کود جاتی ہے)

**امجد**: (دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ کر) اصغری!

(ہاتھ ہٹاتا ہے اور چند لمحات کھلی کھڑکی کے اندھیرے کو دیکھتا رہتا ہے۔ جو سنر دیوار میں ایک زخم کے مانند منہ کھولے ہے۔ ایجاب و قبول! بڑبڑاتا ہے) ایجاب قبول واقعی ضروری ہے! زور لگا کر دونوں ہاتھوں سے اپنی کرسی آگے گھسیٹتا ہے ——— بڑی مشکل سے کھڑکی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔)

مجھے مشکل کو آسان کرنے کا یہ راستہ معلوم تھا ——— مگر شاید کسی انگلی پکڑنے والے کی ضرورت تھی۔

(کھڑکی کی سِل دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑتا ہے اور اپنا اپاہج جسم بڑی دقتوں سے اوپر اٹھاتا ہے اور دوسری طرف لٹکنا شروع کر دیتا ہے)

**امجد**: میری پہاڑیاں ——— میری پیاری پہاڑیاں ——— میری پیاری اصغری!

(اگلا دھڑ نیچے پھسلتا ہے اور ایک دم اس کا سارا وجود اندھیرا کھا جاتا ہے)

# پردۂ غفلت

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی

# کردار

میر الطاف حسین : رسول آباد کے زمیندار۔ عمر ساٹھ سال

رقیہ خاتون : ان کی بیوی۔ عمر ۵۲ سال

صغرا : ان کی لڑکی۔ عمر ۲۲ سال

محمد حسین : ان کے داماد۔ ناظر کلکٹری۔ عمر ۲۷ سال

منظور حسین : ان کا بھتیجا میر شجاعت حسین مرحوم کا لڑکا عمر ۱۷ سال

سعیدہ : اُس کی بہن۔ عمر ۲۰ سال

شیخ کرامت علی : شجاعت حسین مرحوم کے اتالیق عمر ۷۵ سال

محمد جواد : مڈل سکول رسول آباد کے ہیڈ مدرّس عمر ۳۶ سال

محمد علی : ایک دوسرے قصبے کمال پور کا زمیندار۔ سعیدہ کا عاشق عمر ۲۰ سال

انوار حسین : میر الطاف حسین کے سالے اور مختار عام عمر ۴۵ سال

گنگا سہائے : میر شجاعت حسین مرحوم کی جائداد کے منتظم عمر ۶۵ سال

سیتارام : مہاجن عمر ۴۸ سال

چپڑاسی۔ خدمت گار۔ خادمہ

○

# پہلا ایکٹ

## پہلا سین

(میر الطاف حسین اپنے مکان کے سامنے نیم کے درختوں کے سائے
میں ایک تکیہ دار مونڈھے پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ ہاتھ میں تسبیح ہے
وظیفے کا شغل جاری ہے۔ سیدھے ہاتھ پر احمد حسین اور بائیں ہاتھ پر
کچھ فاصلے سے ایک چارپائی کی پائنتی پر سیتا رام جو اجن بیٹھے ہیں۔)

**احمد حسین:** (سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے) چودھویں صدی ہے۔ خون سفید ہو گئے ہیں جس چچا نے بچپن سے بیٹے کی طرح پالا۔ اس سے یہ سرکشی۔ اپنا گھر الگ کریں گے۔ اپنی جائداد سنبھالیں گے۔ بہن کو لکھا پڑھا کر میم بنائیں گے اس میں خاندان کی آبرو مٹی میں مل جائے چاہے۔

**سیتا رام:** (بات کاٹ کر) احمد میاں یہ سب انگریزی پڑھائی کا قصور ہے۔ دیکھو نا صاحبزادے کے والد بھائی یہ تمہارے ساتھ اردو مڈل میں پڑھتے تھے کیسے چپ چاپ میاں آدمی تھے۔ ہم تم مڈل فیل رہے اور وہ پاس ہو ہوا کر انگریزی سکول میں پہنچے۔ تب سے کیسی دھوال دھار باتیں کرنے لگے اور لندن جا کر تو ایسے بدلے کہ کیا مجال کوئی کہہ سکے یہ وہی میاں شجاعت ہیں جو سر جھکائے بغل میں بستہ اور سلیٹ دبائے مدرسے جایا کرتے تھے۔

**احمد حسین:** اور نوادر اس پڑھے لکھے کرامت علی کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔ شجاعت بھائی مرحوم کی لن ترانیاں سن کر اس کی عقل ماری گئی منظور اور اس کی بہن دونوں کو خدا جانے کیا الٹا سبق پڑھایا کرتا ہے۔

**میر الطاف حسین:** (خفگی کے لہجے میں) بھئی احمد حسین تم نے کتنی بار کہہ دیا کہ شیخ جی کا ذکر ایسے الفاظ میں نہ کیا کرو۔ کچھ بھی ہو والد مرحوم کے زمانے کے آدمی ہیں اور میرے تمہارے دونوں کے بزرگ ہیں۔

**احمد حسین:** بھائی صاحب ایسی بزرگی کو سات سلام۔ آخر خدا رسول بھی کوئی چیز ہے۔ دین کی باتوں میں کسی کی بزرگی نہیں چلتی۔ ہم جب جانتے بڑے بزرگ ہیں جب لڑکے کو سمجھاتے کہ میاں نیچریت کے خیال کو چھوڑو۔ بہن کو سیدانیوں کی طرح پردے

میں بیٹھنے دو۔ چچا کی اطاعت کرو

**سیتارام:** اور ماموں کی۔

**احمد حسین:** ماموں کمبخت کس حساب میں ہے۔ وہ تو نالائق۔ جاہل ہے ایمان سمجھا جاتا ہے (میر صاحب کی طرف مخاطب ہوکر)
کہیئے قبلہ و کعبہ بڑوں کی اطاعت چھوٹوں پر فرض ہے کہ نہیں؟ پھر جو شخص بھتیجے کو چچا سے بغاوت کرنے پر ورغلائے
اور لڑکیوں کو پڑھ لکھ کر غارت ہو جانے کی صلاح دے۔ اس پر میں اعتراض کرتا ہوں تو کیا برا کرتا ہوں؟

**میر صاحب:** تمہیں کہاں سے معلوم ہے کہ شیخ جی ان باتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ منظور بچہ ہے اس کی طبیعت میں بے چینی ہے
جب مزاج میں یکسوئی آئے گی یہ باتیں جاتی رہیں گی۔

**احمد حسین:** بھائی صاحب خطا معاف۔ آپ ہیں فرشتہ خصال اور سب کو اپنا جیسا سمجھتے ہیں۔ آپ کو خبر نہیں کہ کیا کیا
ہانڈیاں پک رہی ہیں۔ کل نیک رام ضلع سے واپس آیا ہے۔ اپنے مقدمے کے لیے وکیل کرنے گیا تھا۔ لالہ
بالکشن کے یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی موکلوں سے بات کر رہے ہیں۔ فرصت نہیں ہے۔ دو گھنٹے کامل
انتظار کرنا پڑا۔ اس کے بعد دیکھتا کیا ہے کہ وکیل صاحب کے کمرے سے منظور اور گنگا سہائے سرگوشی کرتے
ہوئے نکلے۔ دونوں نے سامنے دیکھا۔ مگر آنکھ بچا کر نکل گئے۔ اب فرمایئے اس کے کیا معنی ہیں؟

**میر صاحب:** واللہ اعلم۔ منظور کو کسی امر میں قانونی مشورہ کرنا ہوگا۔

**احمد حسین:** جی! وہ امر قانونی یہ ہے کہ اپنی اور بہن کی جائداد کو خاندان کی جائداد سے الگ کرانے کی درخواست دیں اور
بہن کو لے کر کمال پور میں الگ گھر میں رہیں۔ پھر آزادی ہی آزادی ہے۔ بہن پہلے ہی سے پڑھی لکھی ہے۔ اسے
مشن کی میم سے اور پڑھوائیں گے۔ پھر محمد علی کے ساتھ مل کر لڑکیوں کا مدرسہ قائم کریں گے اور یہ سب سکھائی پڑھائی
ہے جناب شیخ کرامت علی صاحب کی۔

**میر صاحب:** مجھے یقین نہیں آتا۔ اور بفرض محال ایسا ہو بھی تو شیخ جی نے کبھی ایسی رائے نہ دی ہوگی۔

**احمد حسین:** اب آپ نہ مانیئے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ تھوڑے دن میں آپ ہی معلوم ہو جائے گا۔

**میر صاحب:** اچھا میں منظور کو سمجھاؤں گا کہ مدرسے وغیرہ کا خیال چھوڑ دے۔ لیکن اگر وہ اپنی جائداد کا انتظام خود کرنا چاہتا
ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔ اب بھی اس کی جائداد کی نگرانی منشی گنگا سہائے کرتے ہیں اب وہ خود کرے تو

کون سی قباحت ہے؟

**احمد حسین** : عرض کروں کون سی قباحت ہے؟ آدھے سے زیادہ آمدنی جاتی رہے گی۔ اتنے بڑے خاندان کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ موجودہ آمدنی میں تو معلوم کن مصیبتوں سے کام چلاتا ہوں۔ پھر تو نقصان کی حکمت سے بھی پورا نہ پڑے گا دوسرے یہ سیتارام بیٹھے ہیں انھوں نے جن لوگوں سے یہ روپیہ قرض لے کر ہمیں دیا ہے۔ انھیں جب معلوم ہوگا کہ آدھی جائداد صاف نکل جاتی ہے۔ تو وہ فوراً نالش داغ دیں گے۔

**سیتارام** : سرکار! آدھ میاں سچ کہتے ہیں۔ گنگا سہائے نے پہلے سے لوگوں کو ہشیار کر رکھا ہے کہ چھوٹے میر صاحب کی جائداد سے قرضے سے کوئی مطلب نہیں۔ اب بٹوارہ ہوگا تو بالکل سا کھ جاتی رہے گی۔

**میر صاحب** ۔ مگر یہ تو سچ ہے نہ شجاعت مرحوم نے کبھی قرضہ لیا نہ منظور نے۔ اور اس کی بہن تو شاید ابھی قانوناً بالغ بھی نہیں ہے۔

**احمد حسین** : جی بالکل درست ہے۔ کسی نے قرضہ نہیں لیا۔ یہ تو مجھ کمبخت کی شامت آئی تھی کہ صغرا کی شادی میں خاندان کی آبرو رکھنے کے لیے محرم ہی شان سے کرنے کے لیے جیسا بزرگوں کے وقت سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ سال بھر کا جمع خرچ پورا کرنے کے لیے میں نے قرض لیا۔ لیکن کیا میاں منظور اور ان کی بہن۔ دونوں خاندان سے الگ تھے۔ کیا میرے آپ کے بزرگ ان کے بزرگ نہ تھے جو ان کی جائداد قرضے سے بری ہے۔

**سیتارام** : سرکار! یہ تو پکی بات ہے۔ ہم لوگوں کے گھر میں بھی سب کاروبار ایک میں ہوتا ہے۔ سب کی آمدنی ایک ہوتی ہے۔ خرچ ساتھ ہوتا ہے۔ قرضہ بھی سبھی کے لیے لیا جاتا ہے۔

**میر صاحب** : بھئی میری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں۔ منظور دو چار دن میں آئے گا تو اس سے گفتگو کروں گا۔

**احمد حسین** : خدا ہی ہے جو آپ کے سمجھانے کا اثر ہو۔ صاحبزادے اپنے آپ کو افلاطون سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں کسی کی بات کب جچتی ہے۔ پھر انھیں مشیر ملے ہیں شیخ کرامت علی۔ اور دوست محمد علی۔ اس لڑکے کے ارادے شجاعت بھائی مرحوم کی حیات ہی سے یہ ہیں کہ سعیدہ سے شادی کرے۔ جانتا تھا کہ بھائی مرحوم ہمارے خاندان کی رسم کے خلاف آدھی جائداد لڑکی کے نام چھوڑیں گے لیکن مرحوم نے اسے کبھی منہ نہیں لگایا۔

**میر صاحب** : یہ تو تم صریحاً غلط کہتے ہو۔ شجاعت مرحوم اس لڑکے کو بہت چاہتے تھے۔ وہ ہوتے تو ضرور اسی سے

شادی کرتے۔

**احمد حسین:** اب میں آپ کی تردید کیسے کر سکتا ہوں۔ آپ بشیرہ صاحبہ سے پوچھیے۔ ایسا ہوتا تو وہ سعیدہ کی نسبت محمد جواد سے کیوں ٹھہراتیں۔

**میر صاحب:** یہ وہ باتیں ہیں جو میرے نزدیک تو یہ نسبت ہی بے کس کی ہے۔ نہ لڑکی راضی ہے نہ اس کا بھائی۔

**احمد حسین:** شادی کے معاملے میں لڑکے لڑکی کی رضامندی کا خیال کرنا انوکھی بات ہے۔ شریف گھرانوں میں لڑکی سے جا کر کوئی نہیں پوچھا کرتا۔ ماں باپ جیسا اولاد کی بہتری کو سمجھتے ہیں۔ وہ خود لیا سمجھے گی۔ اب رہے لڑکی کے بھائی صاحب تو چچا چچی کے ہوتے انھیں بولنے کا کون منصب ہے۔

**میر صاحب:** مگر بھائی ممنظور بہت برہم ہے۔ اگر لڑکی کی شادی جواد سے کر دی گئی تو خاندان میں نا اتفاقی کی بنیاد پڑ جائے گی۔

**احمد حسین:** بہر حال نسبت تو ٹھہر چکی ہے اور شادی جواد سے ہونا ضروری ہے اگر ایسا نہ ہوا تو دنیا بھر کے سامنے ناک کٹ جائے گی کہ بندہ ہی بندہ بھائی نسبت چھوٹ گئی

**میر صاحب:** خیر ہوگا (آس پاس نظر ڈال کر) نماز کا وقت آگیا ہے (اٹھتے ہوئے سیتا رام کی طرف مخاطب ہو کر) لالہ جی آپ کو جو کچھ گفت گو کرنا ہے احمد حسین سے کیجیے۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے تو کسی بات سے مطلب نہیں۔

**سیتا رام:** سرکار! آپ اور آمد میاں کچھ دو تھوڑی ہیں ہم آپ کے بھی تابعدار۔ ان کے بھی اور آپ لوگوں سے علاحدہ کاروبار کی بات چیت کریں گے۔ گھر کا کام جان کرتے ہیں۔

**میر صاحب:** بے شک آپ سے ایسی ہی امید ہے۔

(چلے گئے)

**سیتا رام:** میاں یہ تو بڑی بے ڈھب خبر سنائی منظور میاں نے اگر سچ مچ درخواست دے دی تو آدھی بڑی جائداد ہاتھ سے گئی۔

**احمد حسین:** درخواست دینے میں کیا کچھ کسر ہے۔ بالکش کو تم جانتے ہو۔ ایک سر کی کالیاں ہے۔ اس سے یہ کب

امید ہو سکتی ہے کہ راگ تمام کرے۔

**سیتارام:** پھر کیا کرنا چاہیئے؟

**احمد حسین:** تم بتلاؤ لالہ! تم مقدمے کے معاملے میں جتنا جانتے ہو ہم تھوڑی جان سکتے ہیں۔

**سیتارام:** نہیں آقا میاں! ہم نے جو ایک آدھ حرف قانون سیکھا ہے سب آپ کے طفیل میں لیکن اس معاملے میں ہماری سمجھ میں خود کوئی بات نہیں آتی۔

**احمد حسین:** پھر بھلا جب تمہاری فطرت نہیں چلتی تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

**سیتارام:** ایک بات کہوں اگر آپ خفا نہ ہوں۔

**احمد حسین:** کہو کہو۔ خفا ہونے کی کیا بات ہے۔

**سیتارام:** ادھر ادھر دیکھ کر چپکے سے) کہیں ایسا ہوتا کہ شجاعت میاں کی لکھی ہوئی دستاویز نکل آتی کہ انھوں نے پچاس ہزار روپے بیس سال پہلے بڑی سرکار سے قرض لیے تھے۔

**احمد حسین:** دستاویز کہاں سے نکل آتی۔ میں سمجھا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔

**سیتارام:** جہاں سے چھُن کی دستاویز بے دخلی کے مقدمے میں نکل آئی تھی

**احمد حسین:** اچھا یہ مطلب ہے۔ مگر سنو تو سہی یہ فقرہ کیسے چل سکتا ہے۔ بھائی صاحب ہم سے کہہ چکے ہیں کہ شجاعت بھائی نے کبھی قرض نہیں لیا وہ جو پوچھیں گے یہ دستاویز کیسی ہے؟

**سیتارام:** کہہ دیجیے گا کہ روپیہ تھوڑا تھوڑا کر کے لیا تھا اور دستاویز کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا آپ بھول گئے۔

**احمد حسین:** واہ۔ یہ ایسی سہل بات ہے؟ وہ دیکھنے کو مانگیں گے اور خط کا فرق کوئی نہ پہچانے وہ پہچان لیں گے۔

**سیتارام:** تو ان کو سمجھانے کی آپ فکر کیجیے۔ اب اتنا بھی آپ نہیں کر سکتے؟

**احمد حسین:** نہیں لالہ! یہ میرے کیا کسی کے بس کی بات نہیں تم بھائی صاحب کو جانتے ہو۔ پھر ایسی باتیں کرتے ہو اگر کوئی پیچیدہ معاملہ ہو تو خیر۔ ورنہ جہاں ان کی سمجھ میں آگیا تو وہ ہرگز ان قانونی چالوں کے روادار نہیں ہوتے۔

**سیتارام:** پھر اور تو کوئی بات سمجھ نہیں پڑتی۔ آپ منظور میاں کو سمجھا دیجیے کہ زمینداری کا کام بڑے کھیڑے

کا ہے۔ اس میں نہ پڑو۔ رہا خرچ۔ اس کی تمہیں کبھی کمی نہ ہوگی۔ سب کچھ تمہارا ہے۔ اس کو ذرا نمک مرچ لگا کر کہئے تو شاید مان جائیں۔

**احمد حسین** : جی ہاں! میرے ہی سمجھانے سے تو وہ مانیں گے۔ میری تو انھیں صورت سے نفرت ہے۔ دوسرے یہ کہ ان سے منطق کی بحث کون کرے گا۔

**سیتارام** : پھر بالکل سے سمجھتہ نہیں کہ کسی طرح لڑکے کو نہیں پڑھانے دے کہ جیا کی زندگی میں عدالت سے بٹوارے کی اجازت نہیں ہوگی۔

**احمد حسین** : لالہ تم بھی بعض وقت عجیب باتیں کرنے لگتے ہو۔ ایسے ہی منظور ہے نہیں کہ بوجھ بالکل ... کہا ہے وہ مان لیں گے۔ اور پھر کرامت علی جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے ہے اور محمد علی جیسے قانون ازبر ہے۔ ان کے صلاح کار جو بیٹھے ہیں۔

**سیتارام** : (ٹھنڈی سانس لے کر) ایسا ہی ہے تو منظور میاں کے حصے سے ہاتھ دھونا چاہئے اور چھوٹی بٹیا کے حصے کو کسی طرح بچانا چاہیئے۔

**احمد حسین** : یہ بھی کچھ کوئی ایسا سہل نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ محمد جواد سے شادی ہو جائے تو وہ تو اپنا آدمی ہے اور جائداد اپنے ہی انتظام میں رہے گی لیکن شادی ہو جائے تو جائے۔

**سیتارام** : اگر سیدانی بی اپنی بات کی پیچ کریں تو ضرور ہوگی۔

**احمد حسین** : ارے لالہ تم اس نئی پود کو نہیں جانتے ہو۔ یہ لوگ ہی عقل کے آگے سات پشت تک کے بزرگوں کی کوئی عزت نہیں سمجھتے۔ ان کے دماغ میں یہ سمائی ہے کہ دنیا کی اصلاح کریں گے۔ اور وہ کیسے۔ عورتوں کو لکھا پڑھا کے۔ اور ان کا پردہ توڑ کے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ اب تک دنیا کیسے چل رہی تھی اور اب کیا مصیبت آن پڑی ہے کہ عورتیں پڑھ کر قانون گو ہو جائیں اور گاؤں گاؤں ماری ماری پھریں؟

**سیتارام** : واہ احمد میاں! آپ بھی کیا خوب وکیل مختاروں کی سی بحث کرتے ہیں۔ مگر ہم سے پوچھئے تو یہ سب انگریزی کتابوں کا پھیر ہے۔ ہمارا چھوکرا ابھی چھٹی میں گھر آیا تھا اس کی کتاب اٹھا کر دیکھی۔ تصویریں تو اچھی چکنی چکنی ہیں مگر قسم لیجئے جو ایک حرف بھی سمجھ میں آیا ہو۔ جس زبان کی الف بے ایسی ہو اس کی کتابوں میں نہ

جانے کیا کچھ لکھا ہوگا۔

**احمد حسین:** اجی کچھ بھی لکھا ہو۔ میری طرف سے جہنم میں جائیے۔ یہاں بھی مصیبت کیا کم ہے۔ جو ان جھگڑوں کی فکر ہو۔
اچھا لالہ میں جاتا ہوں۔ ذرا گاؤں کا ایک چکر لگا آؤں گا۔

(اٹھ کھڑے ہوتے)

**سیتارام:** بہت اچھا۔ اگر کل سود بھیجنے کا دن ہے۔ اسے نہ بھولیے گا

(پردہ گر جاتا ہے)

○

# دوسرا منظر

( شیخ کرامت علی ڈیوڑھی میں ایک مونڈھے پر رضائی اوڑھے بیٹھے
ہیں۔ اندر کی طرف کے دروازے میں پردہ پڑا ہے جس کے
پیچھے رقیہ خاتون ابھی ابھی آکر بیٹھی ہیں )
( پردے کے پیچھے سے رقیہ خاتون کی آواز )

شیخ جی! بندگی عرض ہے

**شیخ جی** : جیتی رہو سیدانی بی۔ خدا گھر بار میں برکت دے۔

**رقیہ خاتون** : کہیئے شیخ جی! اب مزاج کیسا ہے۔ اس کھانسی نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔

**شیخ جی** : کسے؟ مجھے؟ نہیں سیدانی بی! بڑھاپے میں تو کھانسی تکیہ کلام ہوگئی ہے سننے والوں کو اس سے تکلیف ہو۔ مجھے تو آرام ملتا ہے۔

**رقیہ خاتون** : سچ ہے۔ شیخ جی۔ بڑھاپا سو بیماریوں کی بیماری ہے۔ آپ تو خدا رکھے پانچ اوپر ستر برس کے ہیں۔ صغرا کے باپ کو ابھی ساٹھ پورے نہیں ہوئے وہ بھی سدا کے روگی ہو گئے ہیں۔

**شیخ جی** : جی الطاف میاں کی نہ کہیئے۔ وہ جوانی ہی میں کون سے تندرست تھے۔ بات یہ ہے کہ جب انسان ایک اندھیری کوٹھری میں رات دن جانماز پر بیٹھا رہے گا۔ تو صحت آپ ہی خراب ہوگی۔

**رقیہ خاتون** : بس۔ شیخ جی آپکی انھیں باتوں سے تو آگ لگ جاتی ہے۔ آپ کے نزدیک جو اللہ کا نیک بندہ نماز وظیفے میں اپنے دن رات کاٹے وہ احدی اور نکما ہے۔

**شیخ جی** : لے لو سیدانی بی خفا ہوگئیں۔ میں نے تو ایک بات کہی تھی ان پر اعتراض کب کیا تھا۔

**رقیہ خاتون** : آپ منہ سے نہ کہیں مگر دل میں یہی ہے کیئے میں جھوٹ کہتی ہوں۔

**شیخ جی** : اب آپ کہلواتی ہیں تو کہتا ہوں۔ میر الطاف حسین کے کاہل ہونے میں کیا شبہ ہے۔ جو شخص دنیا میں اپنے

خاندان کو نہ سنبھال سکے۔ جو اپنے ہمسایوں کا حق نہ ادا کر سکے۔ جو اپنی جائداد کو اپنے نالائق سالے۔ اور ایک بے ایمان مہاجن کے ہاتھوں برباد ہونے کے لیے چھوڑ دے۔ وہ کاہل نہیں تو کیا ہے

**رقیہ خاتون:** دیکھو نا میں جانتی تھی کہ صغرا کے باپ اور احمد حسین کو صلواتیں سنانا آپ کو منظور تھا۔ میں احمد حسین کی طرف سے تو کچھ نہیں کہتی۔ لوگ کہیں گے۔ بہن ہے طرفداری کرتی ہے۔ لیکن صغرا کے باپ کو کوئی دوسرا کچھ کہتا تو منہ جھلس دیتی۔ غضب خدا کا اس شخص نے دنیا کو چھوڑا۔ چین آرام تج دیا۔ دن رات کی عبادت میں اپنی جان ہلکان کر دی اور لوگوں کے نزدیک کاہل ہے۔

**شیخ جی:** سیدانی بی! کاہلی اسی کا نام نہیں ہے کہ آدمی سچ مچ ہاتھ پیر نہ ہلائے۔ جو شخص اپنی سمجھ سے کام لینا نہیں چاہتا اور زندگی کی گتھیوں کے سلجھانے سے جی چراتا ہے وہ سب سے بڑھ کر کاہل ہے۔ محض اللہ اللہ کرنے سے کوئی شخص اللہ کا نیک، بندہ نہیں بن جاتا۔ اس کے لیے پہلی شرط ہے کہ انسان دنیا میں اپنا فرض جانے اور ادا کرے۔ اللہ کے اور بندوں کے لیے مصیبت نہیں بلکہ راحت کا باعث ہو۔

**رقیہ خاتون،** اے ہے تو اس بے چارے نے کس کے سر پر مصیبت ڈھائی ہے؟

**شیخ جی:** اس بے چارے نے مصیبت ڈھائی ہے اپنی اسامیوں پر جن کا خدا نے اس سے سابقہ ڈالا تھا اور جنھیں اس نے میاں احمد حسین کے سپرد کر دیا کہ پولیس سے مل کر انھیں لٹوائیں۔ اس نے مصیبت ڈھائی ہے اپنے خاندان پر جس کی آدھی جائداد اس کی نماز گزاری کی بدولت مہاجن کے قبضے میں جا رہی ہے۔ اس نے مصیبت ڈھائی ہے اپنے بیٹے اور بھتیجے پر جن کی تعلیم و تربیت کو اس نے آپ پر چھوڑ رکھا ہے۔

(کھانسنے لگے)

**رقیہ خاتون:** یا اللہ یا اللہ! اب میری باری آئی۔ شیخ جی! آپ بزرگ ہیں۔ اس لیے زبان روک کر رہ جاتی ہوں مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ بڑھاپے میں آپ کا دماغ صحیح نہیں رہا ——— میں آئی تھی ایک معاملے میں صلاح کرنے۔ مگر سٹری سودائیوں سے کون باتیں کرے۔ لیجیے بندگی میں جاتی ہوں۔

**شیخ جی:** (ہنس کر) آپ نے خود ہی چھیڑ چھیڑ کر کہلوایا۔ ورنہ میں نے تو آپ لوگوں کو عقل کی بات سمجھانے سے توبہ کر لی ہے۔ اچھا لیجیے اب غصے کو تھوک دیجیے۔ میر الطاف حسین میں خوبیاں بھی بہت سی ہیں۔ آپ کہیں تو

سنا چلوں۔ سیدانی بی ———— ہائیں کیا سچ مچ چلی گئیں؟

**رقیہ خاتون:** کیا کروں بھٹ کے۔ انسان اپنے حواس میں ہو تو اس سے بات کی جائے۔

**شیخ جی:** اچھا اب سے ہے۔ میں سمٹ سمٹا کے حواس میں سمایا جاتا ہوں۔

**رقیہ خاتون:** لیجئے اب گالیاں دینے سے تھکے تو دل لگی کرنے لگے کہتی ہوں کہ بڑی ضروری باتیں کرنا ہیں۔

**شیخ جی:** یا اللہ! تو ضروری باتیں کیا ضرور ہے کہ رو رو کے کی جائیں اور کراہ کراہ کے سنی جائیں۔ آپ کہہ چلئے۔ میں خود سے سن رہا ہوں۔

**رقیہ خاتون:** کچھ نہیں۔ بات یہ ہے کہ مجھے سعیدہ کی طرف سے بڑی فکر ہے۔ یہ لڑکی ایسی گھنی ہے کہ اس کے دل کی بات ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ دن بدن دبلی ہوتی جاتی ہے اور اوپر سے پڑھنے کی ہوس ہے۔ ویسے تو میں روک تھام کرتی ہوں۔ لیکن جب بھائی یہاں ہو تو سوائے کتاب کے سر مارنے کے اور کوئی کام ہی نہیں ہے اور یہ منظور تو دنیا سے انوکھا لڑکا ہے۔ اس نے میری بچی کو خدا جانے کیا سمجھا دیا ہے کہ وہ زندگی سے بیزار ہو گئی ہے۔ میں دن رات چیخا پیٹا کرتی ہوں مگر نہ تو وہ خدا کی بندی منہ سے کچھ کہتی ہے اور نہ میرے کہنے پر کان دھرتی ہے۔

**شیخ جی:** جہاں تک میں سمجھا۔ آپ کو اس سے دو شکایتیں ہیں ایک یہ کہ پڑھنے کا شوق رکھتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اداس رہا کرتی ہے اور اس کا علاج آپ یہ کرتی ہیں کہ اُسے پڑھنے نہ دیں اور اُس پر خفا ہوں۔

**رقیہ خاتون:** آپ نے پھر اُلٹی اُلٹی باتیں کرنا شروع کیں۔ میں اس پر خفا ہوں تو اس کی بھلائی کے لیے۔ یا خدانخواستہ دشمنی سے؟

**شیخ جی:** سیدانی بی! سنئے سعیدہ کو میں نے گود میں کھلایا ہے اور اس کے باپ کو بچپن سے پڑھایا ہے۔ اُس لڑکی کی طبیعت کی اُفتاد آدمی جب سمجھ سکتا ہے جب اس کے باپ کی سیرت سے خوب واقف ہو۔ شجاعت حسین آپ کے دیوا تھے۔ مگر اُن کو نہ آپ نے پہچانا نہ آپ کے شوہر اور بھائی نے۔ اور سچ پوچھیے تو سوائے میرے اور چند اور لوگوں کے کسی نے بھی نہیں۔ اگر میں آپ کو ان کی طبیعت اور اُن کے خیالات سمجھاؤں تو آپ کیا سمجھیں گی۔ اتنا سن لیجئے کہ مرحوم ایسا دماغ رکھتے تھے جو روزمرہ زندگی سے آگے کچھ سوچ

سکتا تھا اور ایسا دل جو اپنے اور اپنے خاندان کے رنج و راحت کے علاوہ اور باتوں کا بھی احساس رکھتا تھا۔ ایسے لوگوں پر ان ذرا ذرا سی باتوں کا بہت اثر ہوتا ہے جو آپ کے نزدیک کچھ معنی نہیں رکھتیں۔ سعیدہ ان کی بیٹی ہے اور اس نے منظور سے کہیں زیادہ اُن کی طبیعت پائی ہے۔ علاوہ اس کے وہ عورت ہونے کے سبب سے ان سے بڑھ کر درد طبیعت میں رکھتی ہے۔ اس قسم کے لوگ دنیا میں محض کھانے پینے اور سونے کے لیے نہیں بلکہ قلب و دماغ سے بھی کام لینے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور اگر انھیں اپنے خیالات و احساسات کو الفاظ یا مقاصد کو کاموں میں ظاہر کرنے کا موقع نہ ملے۔ تو یہ دل ہی دل میں اُلجھتے ہیں اور اُن کی زندگی خاموشی افسردگی اور حزن و ملال بن کر رہ جاتی ہے۔ اب اس لڑکی کا دل تو ٹھہرا اس درجہ اثر پذیر اور پیدا ہوئی ہے وہ ایسے ملک میں جہاں عورت کو جاننے۔ سوچنے اور کرنے کی ممانعت ہے تو جو نتیجہ ہونا چاہیئے وہ ظاہر ہے۔ اس پر طرہ ہے آپ کی محبت جو اس کے تھوڑے بہت پڑھنے کو بھی روکنا چاہتی ہے اور تنبیہہ و سرزنش سے اس کے دل کو اور صدمہ پہنچاتی ہے۔

**رقیہ خاتون**: شیخ جی میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آتیں۔ یہ میں بھی سمجھتی ہوں کہ لڑکی سچ مچ شیشے کا سا دل رکھتی ہے مگر یہ کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ میں نصیحت کرنا چھوڑ دوں۔ جوان لڑکی کی تعلیم آسان نہیں ہے۔ اگر گھر کی چھڑکی سے کام نہ لوں تو کل کو میری برابری کرنے لگے گی۔ خیر۔ میں نے جس بات میں صلاح لینے کے لیے آپ کو بلایا تھا وہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اگر سعیدہ کی شادی ہو جائے تو گھر کے کام دھندوں میں اس کا جی بہل جائے گا۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

**شیخ جی**: یہ لیجیئے پھر آپ نے دیوانے کو ہوا کی کنجی دے دی۔ میں ابھی پہلی تقریر سے ہانپ رہا ہوں۔ آپ نے وہ بات کہہ دی کہ اُبل پڑنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر آپ کے سامنے بکواس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے اب میں آپ کی بات کا نہایت اختصار سے جواب دیا کروں گا۔ آپ جو مجھ سے پوچھتی ہیں یہ میرے نزدیک سعیدہ سے پوچھنا چاہیے۔

**رقیہ خاتون**: اوئی سنو لوگوں میں لڑکی سے جا کر اس کی شادی کی باتیں کروں۔ شیخ جی آپ کی حیا و شرم کو آخر کیوں آگ لگ گئی۔ یہ باتیں لڑکیوں سے دنیا میں کوئی کرتا ہے۔ باپ ماں۔ چچا چچی آخر کا ہے کے لیے ہوتے ہیں

**شیخ جی** : جواب سے بخوف طوالت قطع نظر کرکے گزارش ہے کہ آپ سعیدہ کی شادی کس سے کرنا چاہتی ہیں؟

**رقیہ خاتون** : یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اسی سے جس سے منگنی ہوئی ہے۔

**شیخ جی** : یعنی مسمی محمد سجاد مدرس مڈل سکول سے ؟

**رقیہ خاتون** : اور نہیں تو کس سے ؟

**شیخ جی** : میں اس کے بالکل خلاف ہوں۔

**رقیہ خاتون** : آخر کیوں ؟

**شیخ جی** : نمبر ایک جہیز جہل مرکب ہے۔ نمبر دو سعیدہ کی اور اس کی طبیعت میں راجہ بھوج اور گنگا تیلی کا فرق ہے۔ نمبر تین۔ وہ ایک دوسرے لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

**رقیہ خاتون** : صاف صاف کیوں نہ کہیئے کہ آپ سعیدہ کی شادی محمد علی سے ہونے کا خواب دیکھ رہے ہیں لوگ سمجھتے ہیں کہ جو ہو منصوبے گھڑتے ہیں وہ مجھ سے چھپے ہوئے ہیں مگر میں اتنی بھی نہیں ہوں۔ مجھے رتی رتی کی خبر ہے اور سب کو سنا کر کہتی ہوں کہ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میری بچی کا بیاہ ہرگز بدنصیب محمد علی سے نہیں ہو سکتا۔

**شیخ جی** : آپ کا یہ خیال ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ دونوں طرف کی دنیا اپنی اپنی جگہ پر قائم رہے گی اور آپ کی بچی کا بیاہ محمد علی سے ہو کے رہے گا۔

**رقیہ خاتون** : وہ کون تیس مار خاں ہے جو میرے مقابلے میں آئے گا؟ میں بھی تو سنوں اس کا نام۔

**شیخ جی** : لیجئے سنئے۔ اس کا نام ہے ——— سعیدہ۔

**رقیہ خاتون** : بس۔ میں تو سمجھی تھی کہ بڑا رستم ہے۔ میاں منظور صاحب بہادر کو آپ کیوں بھول گئے ؟

**شیخ جی** : سعیدہ کا مقابلہ ایک تو آپ کی اور احمد حسین کی قوت جسمانی سے ہے اور دوسرے خاندان اور قوم کی رائے سے۔ پہلے معاملے میں بے شک منظور اس کی مدد کرے گا مگر دوسرے میں وہ آپ اپنی مددگار ہوگی۔ کیونکہ اس کا دل قوی ہے اور ارادہ مضبوط۔

**رقیہ خاتون** : (طعن آمیز ہنسی کے ساتھ) کیوں نہیں بہ دیکھ تو گم ضم لڑکی ضرور اپنے قبیلے سے لڑائی لڑے گی۔ اچھا ہے

میں بھی تماشا دیکھوں گی۔

**شیخ جی**: جی ہاں ایسی بے زبان لڑکی سارے جہان کا مقابلہ کرے گی۔ میں کہہ چکا ہوں کہ آپ اس لڑکی کو نہیں پہچانتی ہیں۔ سنئے دنیا کے دو تمدنوں کے ٹکرانے سے ایک شرارہ پیدا ہوا ہے جس کا مخزن اس لڑکی کا دل ہے۔ ایشیا کے مغرب سے ایک قوم عزم حوصلہ اور جرأت لے کر آئی اور مشرق میں ایک دوسری تھی جو صبر، ایثار اور درد رکھتی تھی۔ دونوں کے صدیوں تک رہنے سے ایک نئی سیرت کا خمیر تیار ہوا جس کے اجزا میں دونوں قوموں کے جواہر ملے جلے تھے۔ تعجب کی بات ہے کہ ان دونوں قوموں کے مردوں نے اس دولت کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا یہ ہماری چیز نہیں ہے۔ مگر عورتوں نے چپکے سے اپنے قلب میں چھپالیا اب چونکہ عورتوں کے دل پر جہالت اور غفلت کے بندوں نے پہرا بٹھا رکھا ہے اس لیے اور بہت سے بیش بہا خزینوں کی طرح یہ امانت بھی زمانے کی نظروں میں پنہاں ہے۔ اس سعیدہ نے خوش قسمتی سے ایسا باپ پایا جس کی بدولت وہ کم سے کم خود اس سے واقف ہو گئی ہے۔ کہ اس کے پاس کیا بے بہا دولت ہے۔ اب آپ کی اور سارے زمانے کی مخالفت کو وہ صبر، خاموشی اور مسکینی سے برداشت کرتی ہے۔ لیکن اگر آپ یہ سمجھیں کہ آپ بہن بھائیوں کی سختی نے اس کے عزم کو دبا دیا ہے اور اس کے حوصلے کو توڑ دیا ہے تو آپ سے بڑھ کر کوئی غلطی پر نہیں۔ وہ دن آرہا ہے کہ آپ پر بھی اصل حقیقت عیاں ہو جائے گی۔

**رقیہ خاتون**: شکر ہے آپ نے بس تو کی۔ میں تو بھی تھی شام ہوئی۔ اب مجھے آپ کے سٹھیا جانے میں مطلق شبہ نہیں رہا۔ خدا جانے کہاں کی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ لڑکی کے دل میں پورب پچھم۔ خمیر، خزانہ۔ خاک دھول خدا جانے کیا ہے۔ خیر میں آپ کا عندیہ لینے آئی تھی۔ معلوم ہو گیا ہے کہ آپ نے بھی میری دشمنی پر کمر باندھی ہے۔ بہت خوب۔ زندگی ہے تو دونوں دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔ اچھا بندگی عرض ہے۔ میں جاتی ہوں۔

**شیخ جی**: جیتی رہو۔

(اٹھ کر باہر کی طرف چلے جاتے ہیں)

(آپ ہی آپ)

یہ تو سچ لگتا ہے لڑکی ــــــ میں ضرور سٹھیا گیا ہوں۔ ورنہ اس کے سامنے ایسی باتیں کیوں کرتا۔ جو اس کے گھری برابر دماغ میں کسی طرح نہیں سما سکتیں۔ دوسرے اُسے اس طرح مشتعل کر دینا بھی بُرا ہے۔ مگر میں مجبور ہوں۔ بڑھاپے کے سبب سے زبان پر قابو

(ڈیوڑھی کے دروازے سے نکل جاتے ہیں)

پردہ

○

# تیسرا منظر

(ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ جس میں ایک طرف پلنگ بچھا ہے اور
اس کے پاس ایک چھوٹا سا تخت ہے جس پر منہ دھونے کا سامان
اور نیچے ایک تسلہ رکھا ہے۔ کمرے میں ایک طرف ایک چھوٹی
سی میز اور اس کے سامنے او سیدھی طرف ایک کرسی رکھی
ہے۔ میز پر چند کتابیں اور قلم دوات وغیرہ ہے۔ کونے میں ایک
الماری پر چند کتابیں رکھی ہیں۔ دیوار پر ایک نقشہ لٹکا ہوا ہے۔
سعیدہ تخت پر بیٹھی منہ دھو رہی ہے۔ چند منٹ کے بعد رقیہ بیگم
کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ سعیدہ جواب منہ دھو چکی ہے اور تولیہ
سے خشک کر رہی اسے چھوڑ کر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

**سعیدہ**: تسلیم عرض ہے چچی جان۔

**رقیہ خاتون**: جیتی رہو بیٹی! خدا عمر دراز کرے۔ اب طبیعت کیسی ہے؟ رات کو دشمنوں کو بخار تھا۔

**سعیدہ**: جی ہاں! خفیف سی حرارت تھی۔ اب اچھی ہوں۔

**رقیہ خاتون**: میں رات کو ادھر سے گزری تو دیکھا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے فوراً بند کیا تمہیں اتنا سمجھایا کہ بخار میں ہوا نقصان کرتی ہے مگر تم پر اثر نہیں ہوتا۔

**سعیدہ**: چچی جان رات گرمی بہت تھی۔

**رقیہ خاتون**: بیٹا مانا کہ گرمی بہت تھی مگر صحت کا خیال مقدم ہے۔ پسینہ آتے میں ہوا کا لگ جانا بہت برا ہے۔ آخر ہم لوگوں کی اتنی عمر آئی ہے ہم نے بھی کچھ دنیا میں دیکھا ہے۔ تم نے دو حرف کیا پڑھ لیے ہیں کہ اپنے نزدیک گھر بھر سے زیادہ عقل مند ہوگئی ہو۔ اور سچ پوچھو تو اس پڑھنے ہی نے تمہیں بیمار ڈالا

ہے۔ دن بھر میرے ساتھ باورچی خانے میں کام کرنا سینا پرونا اور رات کو بیٹھ کر پڑھنا صغرا کہتی تھی کہ
گھڑی بھر پڑھنے سے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ نہ کہ دو دو گھنٹے سر مغزن کرنا۔ بات ساری یہ ہے کہ آجکل
بھائی موجود ہیں اس لیئے دماغ عرش پر ہے۔

(سعیدہ کچھ جواب نہیں دیتی بلکہ اثنائے گفتگو میں ایک جھاڑن لے
کر اپنی میز صاف کرنے لگتی ہے۔)

**رقیہ خاتون:** اور میری سمجھ میں نہیں آتا یہ پڑھنا کاہے کے لیے۔ قرآن پڑھ لیا۔ نماز روزے کے مسائل تحفۃ العوام
میں سے نکال لیتی ہوں۔ اب خون پانی ایک کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ ہاں خوب یاد آیا۔ صغرا کہتی تھی کہ تم نے
اسے خط لکھ کر بھیجا تھا۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟ کیا بالکل ہی خاندان کی ناک کٹوانے کا ارادہ ہے؟ جو سنے گا
وہ کیا کہے گا؟ کہ میر سجاد حسین کی پوتی تحریریں لکھتی ہے۔ شجاعت مرحوم کو خدا بخشے جانے کیا سوجھا کہ
لکھنا سکھایا۔ خیر اس کو بھی صبر کیا۔ تختی لکھتے لکھتے بھائی کو خط جانے لگے۔ اس کو بھی کسی طرح سہہ لیا مگر یہ
تو مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا کہ دوسرے کنبے تک بات پہنچے۔ خبردار اب کوئی خط پتر صغرا کی
سسرال گیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ ادھر دیکھو! تم سے کہتی ہوں۔

(سعیدہ میز جھاڑنا موقوف کر کے بے تعلقی کی نظر سے رقیہ
کی طرف دیکھتی ہے)

**رقیہ خاتون:** میں دم بھر کے لیے تمہارا مزاج پوچھنے آئی تھی۔ یہاں آکر باتوں میں لگ گئی۔ ہاں مجھے یہ بھی کہنا
تھا کہ محسن کا خط آیا ہے وہ صغرا کو لینے آرہا ہے اور دوپہر کی گاڑی سے اترے گا اگر تمہاری طبیعت
ٹھیک ہو تو دوپہر اور شام کے کھانے کے لیے ٹھیک ٹھاک کر لو لیکن جو جی ناڈھال ہو تو خبردار کسی کام
میں ہاتھ نہ لگانا۔ صغرا کو سمجھا دو۔ وہ سب کرے گی۔

**سعیدہ:** جی نہیں۔ میری طبیعت اب بالکل صاف ہے۔

**رقیہ خاتون:** اچھا میں اب جاتی ہوں۔ مجھے صغرا کی لڑکی کے کرتوں میں بچکا ٹانکنا ہے۔

(چلی جاتی ہیں)

( سعیدہ اپنی کتابیں ترتیب سے رکھتی ہے۔ اس سے فارغ ہو کر میز کے خانے سے ایک تصویر نکال کر دیکھنے لگتی ہے صغرا کمرے میں داخل ہوتی ہے اور سعیدہ کے ہاتھ میں تصویر دیکھ کر چپکے چپکے قدم رکھتے ہوئے اس کے پاس پہنچ کر پیچھے سے جھانکنے لگتی ہے۔ سعیدہ ایسی محو ہے کہ اسے مطلق صغرا کے آنے کی خبر نہیں )

صغرا : کیا پیارا چہرہ ہے ؟

سعیدہ : ( چونک کر ) اسے ہے آپ بھی ڈرا دیتی ہیں بعض وقت صغرا بہن !

صغرا : سچ کہو کیسی چوری پکڑی ہے۔ نکلی نا محمد علی کی تصویر ؟

سعیدہ : ہاں ! یہ تصویر بھائی جان یہاں بھول گئے تھے۔ اس وقت میز صاف کرتے میں سامنے آ گئی تو میں نکال کے دیکھنے لگی۔

صغرا : ( تصویر ہاتھ میں لے کر ) بہت دن کے بعد یہ صورت دیکھی ہے۔ چچا جان کی زندگی میں ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ مگر تب بچپنے کا چہرہ تھا اب اور ہی بات ہے ( سعیدہ سے ) بھئی دولھا خوب ڈھونڈھ کے نکالا ہے۔ بڑی خوش نصیب ہو۔

سعیدہ : کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ کس کا دولھا۔ کہاں کی دلھن ؟

صغرا : چلو بس باتیں نہ بناؤ مجھے سب معلوم ہے۔ روزانہ خط لکھے جاتے ہیں۔ تحفے آیا جایا کرتے ہیں۔

سعیدہ : آپ خواب دیکھا کرتی ہیں اور صبح اٹھ کے بھولے سے سمجھ لیتی ہیں کہ جاگتے میں دیکھا تھا۔

صغرا : یہ تصویر بھی تو خواب میں دیکھ رہی ہوں نا ؟ آخر تم انکار کیوں کرتی ہو ؟

سعیدہ : جب کوئی بات بھی ہو آپ کو تو ہر وقت ہنسی سوجھتی ہے۔

صغرا : ہنستے ہی گھر بستے ہیں بھئی میں تو دل سے تمھاری خیرخواہ ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ محمد علی سے شادی ہو وہ چکنی مٹی کا ڈھیر جواد مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

**سعیدہ**: بس ہو چکا۔ اب کوئی اور ذکر چھیڑیئے۔

**صغرا**: اچھا تمہارا مزاج کیسا ہے؟

**سعیدہ**: الحمدللہ! اچھی ہوں۔

**صغرا**: کیا اماں جان یہاں آئی تھیں؟

**سعیدہ**: ہاں! ابھی ابھی تشریف لے گئی ہیں۔

**صغرا**: نئی خبر تو سنا گئی ہوں گی؟

**سعیدہ**: ہاں کہتی تھیں دولہا بھائی آ رہے ہیں مبارک ہو۔

**صغرا**: بس رہنے بھی دو مبارک باد۔ یہ بھی معلوم ہے کاہے کے لیے آ رہے ہیں؟

**سعیدہ**: آپ کو لینے آ رہے ہیں۔ تو میں نے مبارک باد دی تھی۔

**صغرا**: یا اللہ! یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ آدمی اپنا گھر چھوڑ کے پرائے گھر جائے؟

**سعیدہ**: پرایا گھر کیوں۔ آپ کا نہیں ہے؟

**صغرا**: اے ہاں۔ کیوں نہیں۔ ایسی ہی تو میری تقدیر ہے کہ راج کروں گی۔ بھلا خوش دامن صاحبہ کو خدا سلامت رکھے۔ ان کے ہوتے ہوئے میری کون سنتی ہے۔

**سعیدہ**: یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ دولہا بھائی اپنے والدین کے انتقال کے بعد افسر خاندان ہیں۔ آپ ان کی بیوی ہیں۔ آپ کی کوئی سنتی نہیں۔

**صغرا**: بڑے افسر خاندان ہیں! ہر بات میں ان کے اشاروں پر چلتے ہیں وہ جو کچھ کہہ دیں۔ مجال نہیں اس میں بال برابر فرق آ جائے۔ جو کچھ کماتے ہیں لاکر اماں کے ہاتھ میں رکھ دیتے ہیں وہی اندر باہر سب کا انتظام کرتی ہیں۔ میری وہ حیثیت ہے جو لونڈی کی۔ پکانا۔ ریندھنا۔ سینا پرونا یہ سب میرے متعلق ہے۔ یہ سب کچھ ہے اور یہ تیری منہ سے اُف نہیں کرتی۔ مگر جو چاہو کہ دشمنوں کو چین آ جائے تو یہ ناممکن ہے۔ دنیا بھر کے الزام میرے سر تھوپے جاتے ہیں۔ لڑکے کا دل ماں سے میں پھیراتی ہوں۔ ساس کا ادب میں نہیں کرتی۔ بدزبان میں ہوں۔ غرض کوئی برائی ایسی نہیں۔ جو مجھ میں نہ ہو۔ اور تو سب فرشتے ہیں۔

سعیدہ : پھر آپ ہی دیکھئے میں جو کہتی ہوں کہ مشترکہ خاندان فساد کی بنیاد ہے تو آپ خفا ہوتی ہیں۔

صغرا : تم تو دنیا سے نرالی باتیں کرتی ہو۔ یہ میری تقدیر ہے کہ ایسے ماں کے غلام سے پالا پڑا ہے۔ نہیں تو ایسی اللہ کی بندیاں بھی ہیں جن کے میاں ان کے بس میں ہیں۔ وہ گھر بھر میں راج کرتی ہیں اور ساس کو تاکوں چنے چبوا دیتی ہیں۔

سعیدہ : وہ تو ایک ہی بات ہے کہیں ساس بہو کو ستاتی ہے۔ کہیں بہو ساس کو۔ امن کسی گھر میں نہیں ہے۔

صغرا : تمہارے لیے ایک بات ہے۔ کوئی میرے دل سے پوچھے۔ اب رہا امن نہ ہونا تو یہ دنیا کا قاعدہ ہے اس کے لیے کوئی کیا کرے جب تمہاری شادی ہو تو میاں کو لے کر اپنا گھر الگ بنانا ــــــــــ

(منظور داخل ہوتا ہے)

منظور بھائی بہت رنگی!

سعیدہ : آداب عرض ہے۔ بھائی جان!

منظور : کیوں سعیدہ طبیعت کیسی ہے؟

سعیدہ : الحمد للہ! بالکل اچھی ہوں۔ حرارت رات ہی کو جاتی رہی۔

منظور : آج صاحب بہادر آ رہے ہیں معلوم ہوتا ہے ابھی یہاں استقبالیہ کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا۔

صغرا : میں کسی کا استقبال کرتی ہوں نہ کسی کی کمیٹی۔ یہ آپ کی بہن صاحبہ مشت ــــ مشت ــــ مشترکہ خاندان کی بحث کر رہی ہیں

سعیدہ : بھائی جان! صغرا بہن اپنی ساس کی شکایت کر رہی تھیں کہ گھر بھر پر حکومت کرتی ہیں۔ انھیں معطل کر رکھا ہے اور ان سے ہمیشہ لڑتی رہتی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ مشترکہ خاندان کی خرابی ہے تو خفا ہوتی ہیں۔ اور کہتی ہیں کہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ سب مل جل کر رہیں۔

صغرا : آپ ہی کہیے میں کیا جھوٹ کہتی ہوں۔ دنیا میں کون شادی کے بعد الگ گھر کے بیٹھتا ہے۔

منظور : پھر تم چاہتی کیا ہو آخر ہو؟

صغرا : میں چاہتی ہوں کہ جس طرح خورشید دامن صاحبہ مجھ بے گناہ پر ستم توڑتی ہیں۔ خدا وہ دن لائے کہ میں بھی بتا دوں۔ بہو کیسی ہوتی ہے۔

**منظور** : تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ ساس بہو میں مخالفت کیوں ہوتی ہے؟

**صغرا** : میں دیوانی تو نہیں کہ غور کیا کروں۔ سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔

**منظور** : اسی وجہ سے اور غور کرنا چاہیئے کہ سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے اور جو کوئی غور نہ کرسکا اسے بقول شیخ
کے نہ خدا کی پرواہ ہے نہ اس کے دین کی اور نہ اس کی جو ہوتا ہے۔

**صغرا** : اچھا آپ ہی کوئی سبب بتائیے آپ تو غور کرتے ہوں گے۔

**منظور** : ساس بہو میں میل ساس کے بیٹے اور بہو کے شوہر کے سبب نہیں ہوتا ایک طرف تو ماں جو اپنے بیٹے کو
بچپن سے بہ ہزار ناز و نعمت پالتی ہے اور اسے اپنی زندگی کا سہارا جانتی ہے سمجھتی ہے کہ ایک غیر عورت
نے آکر اس کے نور نظر کو اس سے چھین لیا۔ دوسری طرف جو اپنے عزیز و اقارب گھر بار چھوڑ کر اور
ایک شخص کا دامن تھام کر اسے اپنی زندگی کا شہ باب بناتی ہے۔ کسی طرح یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ اس کا چہیتا
کسی اور کو۔ خواہ ماں ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے زیادہ عزیز رکھے۔ بلکہ اسے اس سے بھی اذیت ہوتی ہے
کہ کوئی دوسرا اس کے چہیتے کو خود اس سے زیادہ چاہے۔ انسانیت کی نشو و نما کی ابتدائی حالت میں
یہ تعلقات عداوت کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ لیکن جب نوع انسانی علم و تمدن کی شاہراہ میں آگے
قدم بڑھاتی ہے اور محبت کا مفہوم پاکیزہ تر اور لطیف تر ہو جاتا ہے تو انسان اس سے جسے اس کا محبوب
چاہتا یا جو اس کے محبوب کو چاہے بجائے عداوت کے محبت کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہندوستان
قوموں کی ارتقا کے ابتدائی زینے پر ہے اور بالخصوص یہاں کی عورتیں تو حیوانوں سے ذرا ہی بہتر ہیں
اس پر طرہ یہ ہے کہ مشترکہ خاندان کی بدولت ساس بہو ہمیشہ ایک دوسرے کے سر پر سوار رہتی ہیں
اس میں لڑائی کے قدرتی ہیجان کو پوری طرح اظہار کا موقع ملتا ہے اور ہر گھر میدان جنگ بن جاتا ہے

**صغرا** : یا اللہ! یہ تو تقریر ہی ہوگئی اور تم بھی فیلسوف نکلے ان تقریروں کا بھلا میں کیا جواب دے سکتی ہوں۔

**منظور** : اچھا اپنے شوہر جنگ بہادر کو آجانے دو دونوں مل کر مجھ سے بحث کرنا۔

**صغرا** : جی ہاں! وہ ضرور ہی ماں کے مقابلے میں میرا ساتھ دیں گے یہ ہوتا تو پھر سارا رونا ہی کاہے کا تھا۔

**منظور** : ماں کے مقابلے کا کیا ذکر ہے۔ میں تو مشترکہ خاندان کے مسئلے پر علم عمرانیات کے نقطۂ نظر سے بحث کرلے

کو کہتا ہوں۔

**صغرا** : بھلا نقطۂ نظر سے بحث کر کے مجھے کیا مل جائے گا؟ آپ سے کوئی اپنا درد دکھ بیان کرے تو آپ بجائے تسلی و تشفی کرنے کے اور اُوپر سے نقطۂ نظر لے بیٹھتے ہیں۔

**سعیدہ** : (ہنس کر) بھائی جان کی اور آپ کی نہیں بنے گی۔ آپ کو اپنی فکر ہے اور انھیں سارے جہان کی۔ آپ اپنی ساس کا فیصلہ کرنا چاہتی ہیں اور بھائی جان دنیا بھر کی ساسوں کا جھگڑا نپٹانا چاہتے ہیں۔

**منظور** : (مسکراتے ہوئے) بھئی صغرا یہ تمھاری زبردستی ہے کہ تم سمجھتی ہو مجھے تم سے ہمدردی نہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ جن مشکلات میں تم مبتلا ہو۔ انھیں میں تمھاری ہزاروں بہنیں گرفتار ہیں۔ اس لیے میں ان پر خصوصی نہیں بلکہ عمومی نقطۂ عام حیثیت سے غور کرتا ہوں۔ تمھاری ساس کچھ دنیا سے نرالی ..................

**صغرا** : بس منظور بھائی یہی تو کہتی ہوں کہ آپ نہیں جانتے مجھے کس بلا سے سابقہ پڑا ہے۔ آپ کبھی خورشید دلہن صاحبہ کو دیکھیں تو معلوم ہو کہ دنیا سے نرالی ہیں یا نہیں۔ وہ ڈراؤنی شکل کہ خدا کی پناہ۔ ہتھنی کا سا ڈیل ڈول بجو کی سی آنکھیں۔ موٹے موٹے ہونٹ۔ بالشت بھر کی ناک۔ پھر زبان کا یہ حال کہ میرا دل جانتا ہے۔ چھل فریب بھرپور ہیں

**منظور** : بس بس رہنے دو صغرا۔ اب تم گالیوں اور کوسنے پر اتر آؤ گی۔ معلوم ہو گیا کہ تمھاری اور تمھاری ساس کی مخالفت انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ محسن کو آنے دو میں ان سے اس مسئلے پر گفتگو کروں گا۔

(خادمہ داخل ہوتی ہے)

**خادمہ** : سیدانی بی کہتی ہیں کھانا نکالنا شروع کیجیے۔ دیر ہو رہی ہے۔

**صغرا** : (اٹھتے ہوئے منظور سے) ہاں ہاں وہ آپ کی بات ضرور مانیں گے میرے منظور بھائی خوب اچھی طرح کہئے مگر ضرور بھول جائیے گا۔

**منظور** : نہیں بھولوں گا۔

**صغرا** : (اٹھ کر) آؤ سعیدہ چلیں۔ بہت کام کرنا ہے۔

**سعیدہ** : آپ چلیے میں ایک منٹ میں آتی ہوں۔

**صغرا** : دیکھو دیر نہ کرنا۔

(چلی جاتی ہے)

**منظور** : آج تو تھا۔ اسبق۔ ؟ کل جمعہ ہے۔ پرسوں صبح کو پڑھنا۔

**سعیدہ** : کیوں بھائی جان۔ آخر پرسوں کو فرصت نہ ہوگی۔

**منظور** : نہیں! آج کا دن تو سارا محسن کی نذر ہوگا۔

**سعیدہ** : بہت اچھا مگر سنیچر کو ضرور۔ ہاں یہ تو بتایئے آپ نے جو نقشوں کی کتاب منگانے کا وعدہ کیا تھا۔

**منظور** : ہاں میں نے محسن کو لکھ دیا تھا وہ غالباً لائیں گے۔

**سعیدہ** : خدا کرے بھول نہ جائیں۔

**منظور** : اچھا اب تم جا کر کام کرو صغرا انتظار کرتی ہوگی۔

**سعیدہ** : اچھا تو! آداب عرض ہے۔

**منظور** : جیتی رہو۔

**پردہ**

○

# دوسرا ایکٹ

## پہلا منظر

(ایک اونچی کرسی کا دالان ہے۔ تختوں کی چوکی پر سفید چاندنی بچھی ہے اور صدر میں قالین اور گاؤ تکیہ ہے۔ میر الطاف حسین تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ ایک چھوٹی سی تپائی پر حقّہ رکھا ہے۔ تخت کے ایک سرے پر احمد حسین ایک پیچھے دار مونڈھے پر شیخ کرامت علی اور دو کرسیوں پر محمد محسن اور منظور بیٹھے ہیں)

**احمد حسین**: دولھا میاں۔ سنا ہے کہ کلکٹر صاحب کی بدلی ہونے والی ہے۔

**محسن**: یہ خبر یہاں تک تو صحیح ہے کہ احکام صادر ہو گئے تھے۔ بلکہ گزٹ بھی ہو گیا تھا لیکن اس کے بعد کی کارروائی لوگوں کو معلوم نہیں۔ وہ حکم منسوخ ہو گیا اور بدستور یہاں رہیں گے

**احمد حسین**: آخر یہ کیسے؟ سنا کرتے تھے کہ گورمنٹی احکام نادری ہوتے ہیں اور کسی کے ٹالے نہیں ٹلتے۔

**محسن**: معلوم نہیں۔ "رموز مملکت خویش خسرواں دانند"

**احمد حسین**: نہیں دولھا میاں آپ کو ضرور معلوم ہے مگر آپ بتانا نہیں چاہتے۔

**محسن**: نہیں صاحب میں کیا جانوں۔

**احمد حسین**: بس اب یہ باتیں رہنے دیجیے آپکو صاحب اور میم صاحب دونوں جتنا مانتے ہیں وہ کس سے چھپا ہے۔ بھلا کوئی بات ہے کہ انھوں نے آپ سے نہ کہا ہو؟

**محسن**: (مسکرا کر) آپ سے کس نے کہا کہ صاحب مجھے مانتے ہیں؟ خیر اب آپ پوچھنا ہی چاہتے ہیں تو سنئیے۔ دو ہفتے ہوئے میم صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ ناظر ہم بڑا پریشان ہے۔ صاحب کا بدلی ہونے کا حکم ہو گیا ہے۔ اور ہم جانا نہیں چاہتا۔ ہم کو یہاں کا آب و ہوا بہت پسند ہے اور دوسرا اس ضلع کا زمیندار لوگ بڑا اشراف ہے۔

**احمد حسین:** سچ کہئے یہ کہتی تھیں میم صاحب؟

**محسن:** اور نہیں کیا میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ خیر تو میم صاحب کہنے لگیں "ناظر آپ کوئی ترکیب بتائیے کہ صاحب یہاں رہ جائے"۔ میں نے کہا حضور یہ کتنی بڑی بات ہے آپ کے اقبال سے آج ہی حکم تبادلہ منسوخ ہو جائے گا بس حضرت وہاں سے آتے ہی میں شہر کے وکلاء اور دوسرے معززین اور بااثر لوگوں سے ملا اور دو تار ایک ہندوؤں اور ایک مسلمانوں کی طرف سے لاٹ صاحب کو دلوا دیئے کہ محرم میں بلوے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اگر یہ کلکٹر صاحب یہاں نہ رہے تو خون ریزی کا اندیشہ ہے شام کو بارگاہِ لفٹنٹی سے ارجنٹ تار پہنچا کہ تا حکم ثانی تبادلہ موقوف ہے۔ یہ ہے سارا قصہ۔ مگر اسے اپنے تک رہنے دیجئے گا۔ اب تک سوائے چند لوگوں کے کسی کو خبر نہیں ہے۔ صاحب خود یہ سمجھتے ہیں کہ واقعی فساد کا اندیشہ ہے۔ لوگوں سے دھڑا دھڑ مچلکے لے رہے ہیں۔

**احمد حسین:** کیوں نہ ہو۔ دو ملنا میاں آخر آپ کس باپ کے بیٹے ہیں۔ آپ کے والد نے اپنی تحصیلداری کے زمانے میں ایک جنٹ کو بدلوا دیا تھا۔ آپ نے کلکٹر کو روک لیا۔

**شیخ جی:** واہ ناظر صاحب واہ! رام مورتی کو سنا کرتے تھے وہ موٹر روک لیتا ہے آپ نے کلکٹر کو روک کے دکھا دیا۔

**میر صاحب:** مگر ستو تم نے خلافِ واقعہ تار دلوا دیا تو گویا سرکار کو دھوکا دیا۔

**محسن:** جی نہیں۔ دھوکے کی بات کیا ہے۔ محرم میں ہندو مسلمان کی تنازع تو طے شدہ امر ہے اور یہ بھی یقینی ہے ہمارے صاحب جس طرح ان معاملات کو باحسن وجوہ سلجھا سکتے ہیں اور کسی سے نہ بن پڑے گا۔

**شیخ جی:** ارے یہ کیا۔ اگر یہ سب سچ تھا تو آپ کی تعریف ہی کیا ہوئی احمد حسین اسے حکمت عملی تھوڑی کہیں گے۔

**احمد حسین:** بس آپ کے نزدیک تو میں دنیا بھر کا جھوٹا ہوں اور جھوٹوں کا قدر دان۔

**شیخ جی:** نہیں توبہ کرو اگر تم جھوٹے ہوتے تو ہمارے میر صاحب تمھیں اپنا سکریٹری امور دنیا کیوں بناتے اور کمزور مقدموں والے تمھیں اپنی گواہی میں کیوں لکھایا کرتے (محسن سے) ہاں صاحب تو آپ نے فقط سچا تار دے کر کلکٹر صاحب کو روکا۔ خیر روک تو لیا۔

منظور: میاں محسن تم نے ضرور تار دلوایا ہوگا۔ لیکن مسٹر فریزر کا تبادلہ منسوخ ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ اُن کی جگہ جو شخص آرہا تھا وہ دفعتہً بیمار ہوگیا اور چھٹی لیکر انگلستان جانے والا ہے۔

محسن: تم سے یہ کس نے کہا

منظور: محمد علی نے ان سے خود مسٹر فریزر سے باتیں ہوئی تھیں

محسن: بس معلوم ہوگئی حقیقت۔ ایسا ہی تو محمد علی کا کلکٹر سے یارانہ ہے۔

منظور: یارانہ کاہے کو ہونے لگا۔ ان دونوں میں تو ہمیشہ سے ان بن ہے۔ محمد علی نے جب سے کاشتکاروں کی انجمن قائم کی ہے سارے حکام ان کے جانی دشمن ہیں۔ فریزر کا منشا ان کو یہ خبر سنانے سے یہ تھا کہ تم میرے جانے سے بہت خوش تھے۔ اب میں تو کہیں ٹلنے والا نہیں۔

محسن: کیسی بچپن کی باتیں کرتے ہو! حاکم ضلع دشمن ہوتا اور محمد علی ضلع میں رہنے پاتے۔ سب انجمن ونجمن کھی رہتی اور صاحبزادے کو بوریا بدھنا سمیٹنا پڑتا۔

منظور: کیوں؟ حاکم ضلع کو اختیار ہے کہ جسے چاہے ضلع سے نکال دے۔

محسن: یوں اختیار نہیں ہے تو کیا ہُوا۔ وہ سو بہانے سے باغیوں کو کچل سکتا ہے

شیخ جی: مثلاً بقر عید کا جھگڑا سے کر۔

منظور: (غصے کے لہجے میں) تمھارے نزدیک کلکٹر ——————

(محمد جواد کے داخل ہونے سے سب لوگ ادھر متوجہ ہو جاتے ہیں اور سلسلۂ کلام منقطع ہو جاتا ہے)

احمد حسین: آیئے آیئے ہیڈ مدرس صاحب۔ کب سے آپ کا انتظار ہے

محمد جواد: (نہایت جھک کر سلام کرتے ہیں) تسلیمات عرض ہے۔ ناظر جی کی خدمت میں آداب (شیخ جی سے) بندگی (احمد حسین سے) مجرا (منظور سے) کورنش۔

(سب لوگ سلام کا جواب دیتے ہیں)

میر صاحب: جیتے رہو۔ کہو آج تمھارے مکتب میں تعطیل ہے نا؟

**محمد جواد**۔ ابھی تعطیل کیسی قبلہ و کعبہ۔ ملازمان سرکاری اور خصوصاً عمال سررشتۂ تعلیمات مغربی و شمالی کو تعطیل کہاں۔ پرسوں ڈپٹی صاحب بغرضِ معائنہ تشریف لائیں گے۔ صبح سے مصروف دوڑ دھوپ تھا۔ طالب علموں کو جمع کیا۔ مدرسے کے سامنے گھاس چھلوائی۔ درجوں کے اندر زمین کو لیپوایا۔ دفعہ چار میں چوہوں کے بل تھے۔ انہیں بند کروایا۔ بہت سی ٹیمیں گاؤں والے مانگ لے گئے تھے۔ ان سے واپس منگائیں غرض بے انتہا عرق ریزی کے بعد اب مدرسہ اس قابل ہوا ہے کہ منظورِ نظرِ حکام بالا دست کی حاصل کرے۔

"از خرداں خطا، از بزرگاں عطا"

**شیخ جی**: بلکہ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔

(میر صاحب مسکرانے لگتے ہیں اور محمد حسین از منظور مشکل ہنسی کو روکتے ہیں)

**احمد حسین**: سنا ہے ڈپٹی صاحب بہت سخت آدمی ہیں۔

**محمد جواد**: دیکھئے کیسے نکلتے ہیں۔ ابھی تک ان سے پہلا سابقہ ہے۔ سب مدرسوں کو تاکید کر دی ہے کہ ایک سبق سب شاگردوں کو اچھی طرح نوک بزبان کرا دیں۔ اب تک تو ڈپٹی صاحبان کا یہ قاعدہ رہا ہے کہ ہیڈ مدرس کو حکم دیتے ہیں کہ سوال کرے اور صرف اسی سبق میں سے پوچھتے ہیں جو لڑکوں نے ذہن نشین پہلے سے کر رکھا ہے۔

**شیخ جی**: کیوں پارسال کا واقعہ نہ ہو جب انسپکٹر صاحب معائنے کو آئے تھے۔ آپ نے لڑکوں سے کہا کہ برٹش حکومت کی برکات بیان کرو وہ لگا قحط کے اسباب بتانے۔

**محمد جواد**: نہیں وہ تو اتفاقیہ بات تھی۔ وہ لڑکا کئی دن غیر حاضر رہا تھا اسے معلوم نہیں تھا کہ کون سا سبق یاد کرایا گیا ہے کسی دوسرے ہم سبق سے پوچھا۔ اس نے الٹا سیدھا بتا دیا۔ جب میں نے پوچھا تو جو اسے یاد تھا سنانے لگا مگر اس دن بھی خیریت ہو گئی۔ انسپکٹر صاحب رائے بہادر سے باتیں کر رہے تھے۔ انھوں نے سنا نہیں ورنہ خدا جانے کیا ہوتا۔

**شیخ جی**: ہوتا کیا۔ لڑکے سے، اس کے ماں باپ سے اور آپ سے مچلکہ لے لیتے۔

**محمد جواد**: شادمان چہ عجب گر بتواز ند گدارا۔ میں نے صاحب کے جانے کے بعد دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھی۔

**شیخ جی**: اور سچ کہئے ان کے آنے سے پہلے نمازِ خوف پڑھی تھی کہ نہیں؟

**محمد جواد** : یہ تو نہیں مگر جوشن کبیر میر صاحب سے لکھوا لیا گیا تھا وہ بازو پر بندھا تھا۔

**شیخ جی** : تو اب کی مرتبہ ڈپٹی صاحب کے بیٹے جوشن صغیر لکھوائے جائیے۔

**میر صاحب** : شیخ جی آپ دنیوی باتوں میں چاہے جتنا مذاق کیجیے۔ اُمورِ دین کا مضحکہ آپ کی بزرگی کے شایاں نہیں ہے

**شیخ جی** : میں ہیڈ مدرس صاحب سے ان کے مذاق کی باتیں کر رہا تھا۔ آپ کیوں دخل دیتے ہیں۔ آپ اعتراض کریں گے مجھے معقول جواب دینا پڑے گا اور اس سے میں حتی الامکان پرہیز کرتا ہوں۔

**میر صاحب** : آپ کو اس کا تو خیال کرنا چاہیے کہ جب آپ ایسی باتیں کریں گے تو نوجوانوں پر کیا اثر پڑے گا۔

**شیخ جی** : انھیں نوجوانوں کی فکر تو میرے لیے کاہش جان ہو رہی ہے۔ یہ غریب بچپن سے مغربی عقلیت کے سائے میں پلے ہیں اور عقیدت و معرفت کی روشنی کو جو قلب کے ناپیدا کنار صحرا میں بہت دور چمکتی ہے علم کی نزدیک بین عینک سے دیکھنا چاہتے ہیں اور جب کچھ نظر نہیں آتا۔ تو کہتے ہیں یہاں تاریکی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر قانونِ فطرت کے خلاف باوجودیکہ یہ روشنی بہت دور ہے۔ اس کی حرارت قلب کے ہر حصے میں محسوس ہوتی ہے اور اسی نے اہل مغرب کو حیرت میں ڈال رکھا ہے کہ اگر روشنی نہیں ہے تو یہ حرارت کیسی؟ رہے نوجوان تو ان کا علم اور خشک ہو تو مانگے کے ہیں اس لیے انھیں یہ حیرت بھی نصیب نہیں۔ یہ تو ہے ان کی حالت اور اس پر طرہ یہ ہے کہ کتابی مذہب کو جس سے ان کم نگاہوں کو نظر ملنے کی امید ہو سکتی تھی آپ لوگوں نے چھو منتر بنا رکھا ہے۔ مذہب کی حقیقت قرار دی ہے۔ عبادت ظاہری اور عبادت کا مقصد زندگی کے ادنیٰ مقاصد کا حصول۔ پھر اگر یہ لوگ اس سے دور رہیں۔ تو کون سے تعجب کی بات ہے۔

**میر صاحب** : مگر شیخ جی جوشنین کی فضیلت میں روایات صحیحہ موجود ہیں۔

**شیخ جی** : بس رہنے دیجیے اپنی روایاتِ صحیحہ۔

**احمد حسین** : (اٹھ کر) حضرت مجھ سے تو یہ کفر نہیں سنا جاتا۔ میں تو رخصت ہوتا ہوں۔

**محمد جواد** : شیخ جی آپ کا سا بزرگ اور ایسی باتیں کرے۔ بڑے تعجب کی جگہ ہے۔ میں آپ سے خرد سال ہوں لیکن اگر حکم ہو تو منطق فلسفے سے خدا کا وجود ثابت کر دوں۔ دفعہ سات کی سائنس ریڈر تک میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا ہے۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں اس وقت یاد نہیں آتا۔

**شیخ جی** : الایا ایہا الساقی ادرکاساً و ناولہا۔

**محمد جواد** : نہیں وہ شعر ادر ہے "چوں" سے شروع ہوتا ہے۔

**شیخ جی** : میں یں تو چوں وچرا سے خدا کے وجود کو نہیں ثابت کر سکتا البتہ اگر ضرورت پڑجائے تو خدا کے وجود سے چون وچرا ثابت کر دوں۔

(نوکر داخل ہوتا ہے)

**نوکر** : حضور اندر سے کہلا بھیجا ہے کہ کھانا تیار ہے۔

**میر صاحب** : اچھا کہدو کہ آتے ہیں۔

(اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ منظور، محسن، احمد حسین اور جواد بھی)

**میر صاحب** : میاں محمد جواد تم بھی یہیں شیخ جی کے ساتھ کھانا کھاؤ۔ شام کو جانا۔

**محمد جواد** : نہیں قبلہ وکعبہ مجھے جانے دیجئے۔ بہت کام کرنا ہے۔

**شیخ جی** : اجی ٹھہریے بھی آپ کے ساتھ کھانا کھانے میں لطف آئے گا۔ آپ کے ماتحت مدرسے میں لیپ پوت کرلیں گے۔

**احمد حسین** : نہیں جواد میاں تمھیں ٹھہرنا پڑے گا۔ میں کھانا بھیجتا ہوں۔

**پردہ**

○

# دوسرا منظر

(میر صاحب کے گھر کے زنانے حصے میں ایک دالان ہے جس میں
تخت اور چوکا بچھا ہے۔ اس پر اسی طرح کا فرش ہے جیسا مردانے میں
میر صاحب کی نشست گاہ میں تھا۔ دالان کے ایک حصے میں دیوار
سے لگی ہوئی ایک گھڑونچی ہے جس پر گھڑے اور ایک تپائی پر سربند
کٹورے رکھے ہیں۔ قالین پر محسن اور منظور تکیے سے لگے بیٹھے ہیں اور
احمد حسین قالین کا ایک کونہ دبائے۔ چوکے کے پاس ایک نواڑ کا
پلنگ ہے جس کے سرہانے بچھونا لپٹا ہوا رکھا ہے۔ اس سے تکیہ لگائے
رقیہ خاتون بیٹھی چھالیہ کتر رہی ہیں۔ پائنتی کی جانب صغرا بیٹھی پان بنا رہی ہے)

**محسن** : اماں جان! سعیدہ کھانا کھا کے کہاں غائب ہو گئی؟

**رقیہ خاتون** : اس کا جی اچھا نہیں تھا۔ میں نے کہا جا کر ذرا آرام کرے۔ مجھے اس لڑکی کی طرف سے بڑا اندیشہ ہے۔ سدا کی روگی ہو گئی اور دن بدن گھلی جاتی ہے۔ اس پہ گھنی اتنی ہے کہ دن بھر میں انی گنی باتیں کرتی ہے اور اپنا حال کسی کو نہیں بتاتی۔

**صغرا** : میں تو تھوڑے دن سے یہ بات دیکھتی ہوں۔ چچا میاں کی زندگی تک یہی سعیدہ بلبل کی طرح چہکتی تھی۔

**محسن** : آپ کو اس کی غذا کی طرف خاص توجہ کرنا چاہیے۔ عورتیں عموماً مردوں کے کھلانے کے اہتمام میں ایسی لگی رہتی ہیں کہ اپنے کھانے کی انھیں مطلق پروا نہیں ہوتی۔ خراب اور ناکافی غذا نہ صرف جسم کو توڑتی ہے۔ بلکہ مزاج کو بھی بدل دیتی ہے۔

**احمد حسین** : محسن میاں۔ یہ سچ ہے۔ لیکن سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اس کی شادی کر دی جائے۔

**محسن** : مجھے آپ سے اتفاق ہے۔

**رقیہ خاتون** : ہاں جواد کی ماں کا اصرار ہے کہ جلدی کرنا چاہیئے اب تم لوگ سوچ سمجھ کے تاریخ مقرر کر دو۔

**محسن** : کیا جواد والی نسبت اب تک قائم ہے ؟

**رقیہ خاتون** : اے اور نہیں تو کیا۔ شریفوں میں کہیں بندھی بندھائی نسبت چھوٹتی ہے۔

**محسن** : ہاں بلا سبب نہیں چھوٹنا چاہیئے۔ لیکن جب معلوم ہو گیا کہ جواد کی ماں نے ان کی پہلی شادی پوشیدہ رکھی تھی اور جائداد کے معاملے میں دروغ بافی کی تھی۔ تو آپ پر اس نسبت کی پابندی کب ہے۔

**رقیہ خاتون** : میاں تم بچے ہو۔ شادی بیاہ کے معاملے میں لوگ سچ نہیں بولا کرتے۔ یہ تو بیوپار ہے ہر شخص اپنے مال کی جھوٹی تعریف کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جواد کا بیاہ ایک بار ہو چکا ہے۔ لیکن جب بیوی مر گئی تو وہ قصہ ختم ہوا۔ رہی جائداد۔ تو ہو وہ ہزار سال جھوٹ سہی مگر دس ہزار کے قریب تو جواد کو اپنی ماں سے ضرور ملے گی پھر یہ دیکھو کہ ایسا خاندان کہاں ملے گا اصل نسل سادات جن کی سات پیڑھیوں میں غیر ذات کا میل نہیں

**محسن** : اماں جان۔ آپ سعیدہ کی چچی ہیں۔ آپ سے بڑھ کر اس کا خیر خواہ کون ہو سکتا ہے۔ لیکن جب آپ میری رائے لیتی ہیں تو مجھ پر فرض ہے کہ اپنا صحیح خیال ظاہر کر دوں۔ میں محمد جواد کو ہرگز سعیدہ کا شوہر ہونے کے قابل نہیں سمجھتا۔ اول تو عمر میں تفاوت زیادہ ہے۔ دوسرے جواد کی علمی قابلیت اور دماغی تربیت بہت کم ہے۔ بلکہ بیچارہ عقل بھی واجبی ہی واجبی رکھتا ہے۔ نہ کسی اچھے عہدے پر مامور ہیں۔ ہیڈ مدرس کا گریڈ بہت کم ہے۔ ضلع کے دربار میں بھی نہیں جانے پاتے۔

**صغرا** : اور صورت شکل کے بھی صاحبزادے اچھے نہیں۔ میں نے سنا ہے طباق سا چہرہ ہے اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔

**رقیہ خاتون** : یہ تو تم دونوں زبردستی کی باتیں کرتے ہو۔ میں نے کئی بار ڈیوڑھی سے جھانک کر جواد کو دیکھا ہے اللہ رکھے پچیس کے لگ بھگ ہے اور اچھی خاصی آدمیوں کی سی صورت ہے۔

**احمد حسین** : اور یہ کیا کہا کہ قابلیت نہیں ہے۔ گیارہ مدرس ڈیڑھ سو لڑکے یوں ہی خواہ مخواہ ان کے تحت میں ہیں رہا دربار۔ تو قصباتی لوگ کب دربار میں جایا کرتے ہیں اور یوں جواد میاں کو پارسال مردم شماری کے کام کے صلے میں تحصیلدار صاحب نے اپنے ہاتھ سے سند دی تھی جس پر کلکٹر کے دستخط تھے۔

**محسن** : آپ دونوں متفق ہیں تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ لیکن میری نظر میں تو کسی طرح یہ ٹھیک نہیں جچتا۔ کیوں بھئی منظور
تم کیوں چپ ہو؟ تم بھی اپنی رائے ظاہر کرو۔

**منظور** : مجھے رائے دینے کی ضرورت نہیں۔ میں اس بحث ہی کو لغو سمجھتا ہوں۔

**رقیہ خاتون** : تم تو دنیا بھر کی باتوں کو لغو سمجھتے رہو۔ غضب خدا کا بہن کی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں اور صاحبزادے
انہیں لغو بتاتے ہیں۔

**منظور** : شادی کی باتیں مہمل نہیں مگر جس طریقے سے آپ اس کا فیصلہ کرنا چاہتی ہیں وہ مہمل ہے۔

**رقیہ خاتون** : اور کون سا انوکھا طریقہ فیصلہ کرنے کا ہے؟

**منظور** : وہ یہ ہے کہ جس کی شادی ہو وہ خود فیصلہ کرے۔

**رقیہ خاتون** : بس رہنے دو لڑکے۔ میں یہ بے شرمی کی باتیں نہیں سننا چاہتی۔ جاکر اپنے اسکول میں تقریریں کرو۔ شریفوں کے
گھر میں

**محسن** . ٹھہریے اماں جان! آپ تو خفا ہو جاتی ہیں۔ ذرا مجھے کوشش کرنے دیجئے کہ میاں منظور کو سمجھاؤں (منظور
کی طرف مخاطب ہو) اس سے تو ہر روشن خیال آدمی کو اتفاق ہے کہ لڑکے لڑکی کی شادی ان کی رضامندی
سے کرنا چاہیئے۔ ان کی طبیعت کے خلاف انہیں مجبور کرنا سخت ظلم ہے۔ لیکن ان کے بر ڈھونڈھنا تو
والدین ہی کا کام ہے۔ کیونکہ شادی سے پہلے نہ تو لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ بلا واسطہ
کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

**منظور** : یہ کیا ظلم ہے کہ دولہا دولھن شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں۔

**محسن** : اچھا تو یہ کہئے۔ آپ بھی شیخ جی کی طرح پردے کے بہت مخالف معلوم ہوتے ہیں۔

**منظور** : بے شک ہر صحیح عقل کے آدمی کے لیے پردے کا مخالف ہونا ضروری ہے۔

**رقیہ خاتون** : (محسن سے) دولھا میاں اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا۔ تم دونوں باہر سدھارو۔ وہاں شوق
سے بحث کرنا۔ تم کو اصل معاملہ نہیں معلوم۔ یہ سب بحث مباحثہ ہے میاں محمد علی کی خاطر۔

**منظور** : اماں جان! سچ پوچھیے تو آپ کو اصل معاملہ معلوم نہیں۔ کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ جواد سے سعیدہ

کی شادی کے اصل محرک لالہ سیتا رام ہیں۔

**رقیہ خاتون**: کہنے والے کا کلیجہ۔ اور تم کو کیا کہوں۔ بھائی مرحوم کا خیال کر کے رہ جاتی ہوں۔ (محسن سے) دولھا میاں نصیبن فرصت ہو تو سہ پہر کا ناشتہ بھی آج گھر میں کرنا۔ اس وقت تم سے باتیں کروں گی۔ ساری دنیا بکے جانے۔ مجھے ذرہ برابر پرواہ نہیں ہے۔ میں نے جو دل میں ٹھانی ہے وہ کر کے رہوں گی۔

(محسن اور منظور اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

**محسن**: آداب عرض ہے۔

**رقیہ خاتون**: جیتے رہو۔

**منظور**: تسلیم عرض ہے چچی جان۔

(رقیہ خاتون منہ پھیر لیتی ہے ——— دونوں باہر چلے جاتے ہیں)

**پردہ**

○

# تیسرا منظر

(امیر صاحب کی نشست گاہ جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ شیخ کرامت علی
اور محمد جواد انہیں جگہوں پر بیٹھے ہیں۔ جہاں ڈیڑھ گھنٹہ پہلے
بیٹھے تھے۔ حقے کا دور چل رہا ہے)

**محمد جوّاد:** کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہ لونڈے پڑھانے کی نوکری خوشی سے کرتا ہوں؟ بھئی نواب صاحب کی زبردستی سمجھئے کہ انھوں نے سعی و سفارش کرکے مجھے اس بلا میں پھنسا دیا۔ مجھے تو بچپن سے حدیث خوانی سکھائی گئی تھی۔ اس میں یہ مصیبت ضرور تھی کہ عربی کی آیتیں یاد نہیں رہتی تھیں۔ مگر ایسے ویسے مجمع میں تو فرفر پڑھتا تھا کہ صلوٰۃ کے نعرے سے آسمان ہل جاتا تھا ع

"چیست دنیا خاک دانے کہنہ ویرانہ"

**شیخ صاحب:** آپ کی وہ ابتدائی تعلیم ہرگز بے کار نہیں گئی۔ میں نے آپ کو پڑھاتے سنا ہے۔ انڈین پریس ریڈر کو بھی آپ خاص لب و لہجہ اور جزر و مد سے پڑھتے ہیں خصوصاً نون غنہ تو اس جاں فرسا الحان کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ مجلس عزا کا سماں آ جاتا ہے اور رقت بھی۔ آپ کے درجے میں کافی ہوتی ہے اور نہایت خلوص سے۔

**محمد جوّاد:** شیخ جی آپ تو معلوم ہوتا ہے مذاق کرتے ہیں۔

**شیخ جی:** ہاں یہ میری بڑی بُری عادت پڑ گئی ہے۔ تمھارے ایسے متین آدمی کو دیکھ کر خواہ مخواہ مذاق کرنے کو جی چاہتا ہے اور یوں بھی میں ظرافت کو اچھا سمجھتا ہوں۔ بشرطیکہ اس کے اندر بھی کچھ ہو۔

(منظور اور محسن داخل ہوتے ہیں)

**محسن:** اصل میں اندر عورتوں کے سامنے یہ بحث چھیڑنے کا موقع نہ تھا۔ اب یہاں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں ہو سکتی ہیں۔

**منظور** : محض بے کار ہے۔ آپ لوگوں سے بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

**شیخ جی** : کیوں خیر تو ہے۔ کاہے کو بحثا بحثی ہے؟

**محسن** : مجھ سے اور منظور سے پردے کے مسئلے پر بحث ہو رہی تھی کہ اماں جان نے دونوں کو نکال دیا۔

**شیخ جی** : خیر پردے کی برکت سے آپ کو مردانے میں تو امن نصیب ہے یہاں بیٹھ کر زبان آزمائی کیجئے۔

**محسن** : (منظور سے) تم جانتے ہو کہ میں مذہبی آدمی نہیں ہوں اور پردے کی حمایت بھی مذہب کی بنا پر نہیں بلکہ معاشرتی اور اقتصادی وجوہ سے کرتا ہوں۔ ایک طرف تو ہنگامۂ زندگی کے جسمانی اور اخلاقی خطرات سے صنفِ نازک کو محفوظ رکھنے کے لیے پردہ ضروری ہے۔ دوسری جانب امورِ خانہ داری کا انجام دینا جو عورت کی قدرتی صلاحیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے تقسیم محنت کے اصول پر اس کے حصے میں آیا ہے۔ یکسوئی کے ساتھ اسی وقت ممکن ہے کہ وہ گھر کی چار دیواری کو اپنی دنیا سمجھے۔

**محمد جواد** : اس میں کیا شک ہے "نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد"

**منظور** : جی درست ہے۔ ہنگامۂ ہستی ایسا ہی مدھم تو ہے کہ اس کی صدا کو آپ کی چار دیواری روک لے گی اور اس کے جسمانی اور اخلاقی خطرات ایسے ہی کمزور تو ہیں کہ آپ کی چلمن سے ٹکرا کر واپس جائیں گے۔ اے جناب یہ آندھی کسی کے روکے رکنے والی نہیں۔ اور بفرضِ محال باہر سے آنے والے بگولوں کو آپ نے روک بھی لیا تو جو گھر کے اندر کی خاک سے اٹھتے ہیں۔ ان کے لیے کیا کیجئے گا؟ اگر آپ انصاف سے کام لیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ زندگی کے مشکلات اور خطرات حرم سرا کے اندر بھی پہنچتے ہیں البتہ ان سے مقابلہ کرنے کی قوت نہیں ہوتی۔ رہے امورِ خانہ داری۔ تو یہ کتنا اوچھا اندھیر ہے کہ پردے میں بیٹھ کر یہ امور بہتر طریقے سے انجام دیئے جا سکتے ہیں۔ بے شک تدبیرِ منزل کا مرکز گھر ہے۔ لیکن یہ مرکز بجائے خود بے معنی ہے۔ اگر اس کے گرد ایک دائرہ دنیائے معیشت کا نہ کھینچا جائے اور مرکز نشین ذات پورے دائرے پر حاوی نہ ہو۔

**محسن** : یہی دلائل ہیں صاحب پردے کے خلاف پیش کیا کرتی ہیں انہیں تو جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن تم کو دیتا ہوں۔ گھر کے مرکز کے گرد بڑا سا دائرہ بنا کے یورپ کی عورتوں نے جو پیچیدگیاں تمدن میں پیدا کر دی

رہیں دہی تمہارے یہاں پیدا ہو جائیں گی۔

**محمد جواد:** جی ہاں اور چین کو دیکھیے۔ وہاں عورتوں کے پیر دبا دبا کر چھوٹے کر دیتے ہیں۔

**منظور:** (محسن سے) تمہارے دماغ پر تو یورپ مسلط ہے۔ تمہارے نزدیک اصلاح کے لیے قدم اٹھانا صرف اسی راستے پر ممکن ہے جس پر یورپ چلتا ہے۔ میرا یہ منشاء نہیں ہے کہ ہم یورپ کی مثال کو سامنے رکھ کر اس سے فائدہ نہ اٹھائیں یا عبرت نہ حاصل کریں۔ لیکن ہمیں ممالک یورپ اور ہندوستان کے فرق کو نہیں بھولنا چاہیے تم کو شاید یہ معلوم نہیں کہ یورپ میں پردہ پہلے بھی نہیں تھا۔ لیکن جن پیچیدگیوں کا ذکر تم کرتے ہو یہ زمانۂ حال میں پیدا ہوئی ہیں۔ یورپ کی بعض عورتیں مرکز سے محیط تک خطوط کھینچنے پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ چاہتی ہیں کہ مرکز اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔ ظاہر ہے کہ پورے دائرے کی شکل بگڑ جائے گی۔ بالفاظ دیگر بعض عورتوں کا یہ خیال ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد اصلی صرف گھر کو گھر بنانا اور مردوں کو آدمی بنانا نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کی طرح کام کر سکتی ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ گویا فطرت کے خلاف پیامِ جنگ ہے اور زندگی شاید ہے کہ سوائے ان پیشوں کے جو امورِ خانہ داری اور تعلیم و تربیت سے زیادہ بعد نہیں رکھتے اور کسی میں عورتیں مردوں کی طرح کامیاب نہیں ہوتیں اور تجربہ ان کو بہت جلد سکھا دے گا کہ وہ غلطی پر ہیں۔ خیر یہ دوسری بحث ہے۔ مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ یہ مشکلات یورپ میں وہاں کے مخصوص تاریخی معاشرتی۔ اقتصادی حالات کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں۔ اور ان کا پردہ نہ ہونے سے لازمی تعلق نہیں ہے چودہ صدی سے پہلے کی صدیوں میں یورپ کو دیکھیے۔ پردہ وہاں نہیں تھا۔ لیکن عورتیں گھر کو اپنا مرکز سمجھتی تھیں۔ اب بھی جو ممالک اور طبقات صنعتی تمدن کی زہریلی ہوا سے مقابلتہً بچے ہوئے ہیں ان میں یہ خرابیاں نہیں ہیں۔ ہندوستان کی اور قوموں کو جن کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں دیکھیے۔ کیا ان کے گھر برباد ہو گئے ہیں یا امورِ خانہ داری کو مرد انجام دیتے ہیں۔

**محسن:** خیر اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ پردے کے ٹوٹنے سے وہ نظامِ معاشرت جو خاندان کے نام سے موسوم ہے برباد ہو جانے گا تو بھی اس کا کیا جواب کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے لوگ رہتے ہیں جو ایک دوسرے پر اتنا اعتبار نہیں کر سکتے۔ جتنا یورپ والے

ایک قوم ہونے کے سبب سے کرتے ہیں

منظور: تم جیسے آدمی کو ایسی بات نہیں کہنا چاہیئے۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ ہندوستان کی اور قوموں میں بالعموم عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ وہ ایک دوسرے پر اور مسلمانوں پر کیوں اعتبار کرتی ہیں؟ اور ان کے اعتبار کرنے سے کیا خرابیاں پیدا ہوئی ہیں جو مسلمانوں کو ان کی تقلید کرنے میں عذر ہو؟

محمد جواد: تقلید تو سوائے مجتہد صاحب اجازت کے کسی کی جائز نہیں واللہ اعلم بالصواب۔

محسن: اس وقت موقع نہیں ورنہ میں تمہیں بتاتا کہ کیا خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ لیکن تم یہ تو دیکھو کہ ہماری عورتیں تو وجہ پردے کے نہیں نکلنا چاہتیں۔ انھوں نے اتنے دن کے تجربے سے اپنے گھر کے اندر کام کرنا اور صبر و قناعت کرنا سیکھ لیا ہے۔ اپنی خوشی یہی ہوگی کہ دن کاٹ دینا سب سے بڑا ہے۔ اب انہیں یہ طریق زندگی چھوڑنے میں سخت دشواری ہوگی۔

منظور: ہاں اس میں مجھے بھی اتفاق ہے کہ بے شک عادت نے ہماری عورتوں کو اس قدر بے حس بنا دیا ہے کہ وہ زندگی کی بہترین نعمتوں یعنی ہوا اور روشنی سے بے نیاز گھٹ گھٹ کر زندگی اور سل میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتی ہیں اور ان کے لب پر کبھی شکایت نہیں آتی۔ لیکن کیا اس سے تم پردے کی اچھائی ثابت کر سکتے ہو کہ مریض صبر و قناعت کا مجسمہ ہیں۔ جن عورتوں نے کسی قدر تعلیم پائی ہے۔ اگر تم انہیں اظہار رائے کا موقع دو اور سوسائٹی کے جبر و تہدید میں ذرا تخفیف ہو تو تم دیکھو گے کہ عورتیں گھر کی چار دیواری سے نکلنے کے لیے کس قدر تڑپتی ہیں۔

محسن: میں یہ اپنی بات کی پیچ کے لیے نہیں بلکہ ایمان سے کہتا ہوں کہ یہاں کا میرا تجربہ ہے۔ شرفا کی عورتیں پردہ توڑنا نہیں چاہتیں

محمد جواد: ناظر جی آپ بالکل بجا کہتے ہیں۔ اسی سال شروع جاڑے میں یہ حکم سرکاری میں نے اضافہ تعداد طالب علمان نسوانی کے لیے قصبے کا دورہ کیا اور دروازے دروازے پھرا۔ نیچ قوم کے لوگ دو دو روپے کے لالچ میں راضی ہو گئے۔ لیکن شرفا میں بعض بعض نے تو پچاس پچاس بلکہ سو روپے مانگے۔ اور بعض نے صاف انکار کیا "صلاح کار کجا و من خراب کجا"

**محسن** : شیخ جی آپ تو پردے کے بڑے مخالف ہیں۔ آپ نہیں کچھ بولتے؟

**شیخ جی** : بھائی میں کیا بولوں؟ آپ لوگوں نے ابتدا ہی سے مذہب کو بحث سے خارج کر دیا ہے۔ میں ٹھہرا بڈھا

آدمی مسلمان۔ میرا دارو مدار مذہب پر ہے۔

**محمد جواد** : ہائیں! شیخ جی آپ اور مذہب۔ آپ جو شن کبیر کے قائل نہیں۔ خدا کو مانتے نہیں اور کہتے ہیں مذہب

پر دارو مدار ہے

**محسن** : ہاں صاحب یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ میں تو آپ کو اب تک معقول پسند سمجھتا تھا۔

**شیخ جی** : آپ کا بھی قصور نہیں ہے آپ نے جو معنی مذہب کے سمجھے ہیں اس کے مطابق میں مذہب کو سوں دور ہوں۔

**محسن** : آخر آپ کے نزدیک مذہب کیا معنی ہیں؟

**شیخ جی** : کیا مختصر سا سوال جناب نے کر دیا ہے۔ ایک تو میں یوں ہی کیا کم بکی ہوں۔ دوسرے آپ بات وہ

پوچھتے ہیں جس کی حقیقت کا تعین الفاظ میں ناممکن ہے اور جو ایک نقطے کی طرح ہے۔ جس کے گرد خیال

پھرتا ہے۔ لیکن اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس کوشش میں جتنا بھی وقت صرف ہو

کم ہے۔ خیر اس وقت مجھے وہ تقریر یاد آگئی ہو مجھ سے اور اس عجیب و غریب پیر و مرشد مرد سے ہوئی

تھی جس کے ساتھ میں نے تمام ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ اس نے مذہب کی جو تعریف کی تھی اُسے میں

اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں تاکہ سر دست بحث کی بنا قائم ہو سکے۔ کیونکہ ہر مسئلے کے متعلق میں صرف

مذہب کے نقطۂ نظر سے رائے دے سکتا ہوں۔ یہ پھر کہے دیتا ہوں کہ یہ الفاظ مذہب کی ماہیت کو کسی

طرح ظاہر نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر سننے والا پر اسرار کیف پہلے سے دل میں رکھتا ہے تو ممکن ہے کہ وہ

اس بگڑی ہوئی تصویر میں اصلیت کے خد و خال پہچان لے۔

**محسن** : جی ہاں! فرمائیے۔

**شیخ جی** : سنئے! قلبِ انسانی گونا گوں جذبات کا جلوہ گاہ ہے جن میں سے ہر ایک کسی خاص چیز کے

ادراک یا خیال سے برانگیختہ ہوتا ہے۔ کوئی چیز ہمارے دل میں خوشی پیدا کرتی ہے۔ کوئی غم

کوئی نفرت۔ کوئی محبت۔ لیکن ایک ایسا جذبہ ہے جس کے موضوع کا تعین کرنا ہی نہیں بلکہ اس کی نوعیت

کا بیان کرنا بھی مشکل ہے۔ یہ جذبہ شاذ و نادر ہی مشتعل ہوتا ہے۔ لیکن جب ہوتا ہے تو ہمارے سارے وجود پر چھا جاتا ہے۔ اس وقت ہمارے دل پر زندگی کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات بجلی کی لہر کی طرح ہماری روح میں دوڑ گئی ہے۔ عام لوگوں پر اس کا اثر محض آنی اور بہت ہلکا ہوتا ہے۔ وہ نہ تو اس واردات کو خود سمجھ سکتے ہیں نہ الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن بعض برگزیدہ ذاتیں اس جذبے کی حرارت کو اس درجے تک محسوس کرتی ہیں کہ وہ اس کے عالم معنی اور عالم صورت میں شمعیں روشن کر دیتی ہیں جن کی روشنی میں (ان مقدس لوگوں کی بدولت) دوسرے بھی زندگی اور کائنات کو دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں اور جن کی گرمی سے خود اپنے قلب کی حرارت کو تازہ کر سکتے ہیں۔ ایسی ایک قندیل روشن کی تھی رسول ہاشمیؐ نے جس کی روشنی سے دنیا تیرہ سو سال سے جگمگا رہی ہے۔ لیکن ایک تو تنگ نظری اور تعصبات کی گرد اس قندیل پر جم گئی ہے جس سے اس کی روشنی ماند پڑ گئی ہے۔ دوسرے لوگ اس کی خارجی گرمی پر اکتفا کر کے خود اپنے قلب کی حرارت سے غافل ہو گئے ہیں۔ تیسرے سب سے بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ لوگوں نے اس کے نور کو دیکھنے کے لیے ساری دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ چنانچہ شمع کے روشن کرنے والے کا مقصد اس کی روشنی میں حیات اور کائنات کو دیکھا جائے تو فوت ہو گیا ہے بلکہ کہنے والا چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ جس شخص نے اس شمع کے گرد کی فضا کو نہیں دیکھا اس نے گویا خود یہ شمع نہیں دیکھی۔

**محمد جواد**: شیخ جی! میری خطا معاف کیجئے۔ میں آپ کو لامذہب سمجھتا تھا۔ آپ نے اس وقت وہ وعظ کہا ہے کہ سبحان اللہ! مگر پیچیدہ بہت تھا۔ میں نے اگرچہ سکنڈ زمانے تک پڑھا ہے۔ لیکن سوائے اس کے اور کچھ نہیں سمجھا کہ محفل میلاد اور شمع کی روشنی کا ذکر تھا

بلغ العلیٰ بکمالہ        کشف الدجیٰ بجمالہ

**محسن**: اگر مذہب ایسا ہے جیسا آپ نے کہا تو بہت اچھی چیز ہے۔ مگر پردے کی بحث سے اس سے کیا تعلق ہے؟ عورتوں کو پردے میں بیٹھ کر مذہبی کتابوں کے پڑھنے سے تو کسی نے نہیں روکا۔

**شیخ جی**: پردے سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔ مجھے پردے سے بڑی شکایت یہ ہے کہ اس نے عورتوں کو مذہب کی تکمیل سے باز رکھا ہے۔ میرے خیال میں عورتیں مردوں کی طرح، بلکہ شاید مردوں سے

زیادہ یہ صلاحیت رکھتی ہیں کہ شمع مذہب کے نور سے منوّر حیات اور کائنات کا نظارہ کر کے اس کی حرارت کو حواس ظاہری اور باطنی کی مدد سے جذب کریں اور اس طرح ہم خفی آگ کو پھر مشتعل کریں جو مذہب کی اصل اور زندگانی کا مدعا ہے۔ لیکن جہالت کا خدا برا کرے جس نے عورتوں کو اس قید فرنگ میں ڈال رکھا ہے جہاں وہ میاں منظور کے الفاظ میں لیکن دوسرے معنی میں روشنی اور ہوا کی آرزو میں تڑپ تڑپ کر جان دیتی ہیں آپ نے بجا کہا کہ بعض گھروں میں جہاں عورتوں کو تھوڑا بہت لکھنے کی اجازت ہے وہ مذہبی کتابیں پڑھ سکتی ہیں لیکن عزیز من مذہب کا جو مختصر خاکہ میں نے پیش کیا ہے اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ کتابوں میں بند ہونے والی چیز نہیں ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو تمام عالم پر طاری اور تمام زندگی میں ساری ہے۔ اور جس کے احاطے کے لیے انسان کو لازم ہے کہ زمان و مکان کی بڑی سے بڑی وسعت میں جو اسے میسر آسکے۔ ہر چیز کو اسی خاص شئی میں جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ دیکھے۔ پرکھے۔ سوچے اور اگر ممکن ہو تو سمجھے۔

**محمد جواد** : واہ صاحب! کہاں مذہب کا ذکر تھا کہاں

**منظور** : شیخ جی! میں چاہتا ہوں کہ اب یہ سلسلہ گفتگو ختم کیا جائے۔ آپ کی تقریر سننے کے بعد اب دوسروں کا ہر لفظ مجھ پر گراں گذرے گا۔

**شیخ جی** : ہاں بھائی میں بھی شل ہو گیا۔ بیٹھنے کی طاقت نہیں۔ اب جا کر آرام کروں گا۔

( اٹھ کھڑے ہوتے ہیں )

پردہ

○

# تیسرا ایکٹ

## پہلا منظر

( ایک چھوٹا سا کمرہ جس کی ایک دروازہ ہے اور دو روشندان۔
آدھے کمرے کو ایک چارپائی گھیرے ہوئے ہے بقیہ حصے میں
ایک چھوٹی سی چوکی ہے جس پر بے ترتیبی سے خطوط اور دوسری
چیزیں پڑی ہوئی ہیں۔ ایک طرف دیوار کے اندر ایک تین
خانوں کی الماری ہے۔ ہر خانے میں کتابوں کے ڈھیر ہیں۔ دو
کھونٹیوں پر دو اچکنیں اور ایک عمامہ لٹکا ہوا ہے۔ پلنگ
کے پاس ایک سپائی پر چند دواؤں کی شیشیاں۔ گلاس۔ تھرمامیٹر
وغیرہ رکھے ہیں۔ دو کرسیاں چارپائی کے پاس بچھی ہیں۔ ایک
خالی ہے۔ دوسری پر منظور بیٹھا ہے۔ شیخ جی رضائی اوڑھے
چارپائی پر لیٹے ہیں۔ )

**منظور** : خدا کا شکر ہے کہ آج بخار اتر گیا۔ کل ڈاکٹر کہتا تھا کہ اگر دو دن اور یہی حال رہا تو بہت اندیشے کی بات ہے۔

**شیخ جی** : ( نحیف آواز میں ) ہاں بھائی کمبخت تپ نے علاوہ میری ہڈیوں کو پھونک ڈالنے کے تم کو اور تمہاری بہن کو بہت تکلیف دی۔ چھ دن سے دونوں کا سارا وقت میری پٹی سے گزرتا ہے۔

**منظور** : نہیں شیخ جی۔ انصاف سے پوچھیے تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ ساری تیمارداری سعیدہ کرتی تھی۔ میں تو بیٹھا ہوا کتاب پڑھا کرتا تھا

**شیخ جی** : یہ تیسرا موقع ہے کہ سعیدہ کی تیمارداری نے میری جان بچائی ہے (کچھ دیر کے بعد) خدا جانے کیا بات ہے کہ مجھے اس بیماری میں تمہارے والد مرحوم بہت یاد آئے۔ تم دونوں کو اکثر میں شجاعت ہی کے

نام سے پکارتا تھا۔ تم سمجھ ہوگے کہ میں ہذیان بک رہا ہوں۔ یا بخار نے مرحوم کی خیالی شکل میرے سامنے پیش کر دی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں تم دونوں کو خوب پہچانتا تھا۔ پھر بھی جی یہ چاہتا تھا کہ تمھیں بھی نام سے پکاروں۔

(خادمہ داخل ہوتی ہے)

**خادمہ** : منظور میاں چھوٹی بیٹا پوچھتی ہیں کہ کوئی اور نہ ہو تو میں آؤں۔

**منظور** : ہاں کہہ دو چلی آئیں۔

**شیخ جی** : اچھا ہے سعیدہ کو بھی آ جانے دو۔ آج میرا تم دونوں سے کچھ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔

**منظور** : مگر آپ کمزور بہت ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہیئے۔

**شیخ جی** : ڈاکٹر کا بہت بہت شکریہ۔ مگر میں مجبور ہوں۔ ستر برس سے باتیں کرنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔

(سعیدہ داخل ہوتی ہے)

**سعیدہ** : آداب عرض ہے شیخ جی! کہئے اب طبیعت کیسی ہے؟

**شیخ جی** : جیتی رہو بیٹی۔ اب بالکل اچھا ہوں۔ البتہ بخار سے کشتی جیت لینے کے بعد ذرا ہانپ رہا ہوں۔

**سعیدہ** : یہ لیجے آپ کے لیے تھوڑا سا انار کا افشردہ لائی ہوں۔ اسے پی لیجئے۔

**شیخ جی** : اچھا ذرا ٹھہر کر پیوں گا۔ ابھی دوا پی ہے۔ اسے چوکی پر رکھ دو۔

(سعیدہ پیالہ چوکی پر رکھ کر۔ دوسری کرسی پہ بیٹھ جاتی ہے)

**سعیدہ** : چچا جان نے آپ کا مزاج پوچھا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر خود بھی تشریف لائیں گے۔

**شیخ جی** : خدا انھیں جیتا رکھے۔ دنیا میں تم دونوں کے بعد اُن کی ذات سے مجھے اُنس ہے۔ تمھارے باپ نے بسترِ مرگ انھیں میری خبر گیری کی تاکید کی تھی۔ بے چارے کو اس کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ اِدھر دیکھو خاندان میں جو منتقل رہیں لیکن جب کوئی میری مخالفت کرتا ہے تو ان سے سنا نہیں جاتا۔ خدا کی شان ہے اپنوں نے میرے ساتھ کیا کیا اور ایک غیر شخص میرے ساتھ کیا کر رہا ہے (کسی قدر وقفہ کے بعد) تم دونوں سے میں نے اپنی ابتدائی زندگی کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ آج جی چاہتا ہے کہ تمھیں اپنی کہانی سناؤں۔ بشرطیکہ تمھیں

ناگوار نہ ہو۔

**منظور**: بہت شوق سے۔ مگر ڈاکٹر

**سعیدہ**: شیخ جی! آپ ڈاکٹر کو بکنے دیجئے اور جی کھول کر باتیں کیجئے۔ مگر چیکے چیکے اور ٹھہر ٹھہر کر۔

**شیخ جی**: رسم کے مطابق میں بھی اپنے قصے کو غدر کے بعد سے شروع کرتا ہوں۔ ۱۸۶۵ء میں ایک دور دراز قصبے کے زمیندار کا اکلوتا لڑکا سترہ برس کا تھا۔ یہ لڑکا قرب و جوار میں شرارت اور شہدہ پنے میں مشہور تھا۔ آم اور امرودوں کے باغوں میں چھاپہ مارنے اور اپنے ہم عمر لڑکوں کو مارنے پیٹنے میں اُس کا نظیر دُور دُور نہ تھا گاؤں کے بڈھے اس کی حرکتوں کا ذکر سُن کر مسکراتے تھے اور کہتے تھے کہ اس لڑکے میں بچپن سے زمینداری کی شان ہے (سعیدہ منظور کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے) مگر اس کی ایک بات سے ہر شخص خائف اور متردد تھا اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا حالانکہ مولوی صاحب جو اس کے پڑھانے پر نوکر تھے اور جن کی افیون اور حقے میں وہ کبھی کوتاہی نہیں کرتا تھا اس کا اطمینان دلایا کرتے تھے کہ اسے اس سے زیادہ پڑھنے میں انہماک نہیں جتنا کہ ایک زمیندار کے بچے کو ہونا چاہئے۔ مگر گاؤں بھر جانتا تھا کہ یہ قریب کی گوروں کی چھاؤنی میں جاکر ایک بنگالی بابو سے انگریزی پڑھا کرتا ہے۔

**سعیدہ**: اس بابو کا نام جھنڈر بابو تھا۔

**شیخ جی**: اچھا معلوم ہوتا ہے۔ بخار میں یہ نام میری زبان پر تھا۔ خیر اپنے باپ سے چھپا کر یہ لڑکا انگریزی جھنڈر بابو سے جو بنگالی ہونے کے سبب سے جادوگر مشہور تھے اور فارسی لیور خود پڑھا کرتا تھا۔ اس سبب سے لوگوں کو نہ صرف اس کی زمینداری بلکہ اُس کی آدمیت میں بھی شبہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آخر میں بالکل ظاہر ہو گیا کہ لڑکا دین دنیا سے گذر گیا ہے۔

**منظور**: کیوں؟ کیا اس نے مڈل پاس کر لیا؟

**شیخ جی**: نہیں اُس کا باپ اس کی شادی ایک نہایت معزز اور امیر گھرانے میں کرنا چاہتا تھا مگر اس بدنصیب نے انکار کر دیا اور جب باپ نے تشدد کرنا شروع کیا۔ تو بائیس برس کی عمر میں گھر چھوڑ کر تن بہ تقدیر نکل کھڑا ہوا۔

منظور : آفریں ہے اس ہمت کو۔

سعیدہ : اس لڑکی میں کیا خرابی تھی ؟

شیخ جی : کوئی نہیں ۔ سوائے اس کے کہ وہ دیوانی تھی ۔ بہر حال ایک عرصے تک یہ لڑکا ہندوستان کے مختلف حصوں میں مارا مارا پھرتا رہا اور زیادہ تر زمینداروں کے لڑکوں کی اتالیقی کرکے پیٹ پالتا رہا ۔ اس نوکری میں اسے ہر طرح کا آرام تھا ۔ اعلیٰ درجے کے خدمت گار کی حیثیت سے ہر خاندان میں رہتا تھا ۔ کھانے کپڑے کے علاوہ آٹھ آنے سے لیکر دو دو روپے مہینے تک تنخواہ ملتی تھی اور کام کچھ نہیں تھا مگر مزاج کا خدا بھلا کرے ۔ اس شخص کو سب کہیں شہر کا اندیشہ لگا رہتا تھا ۔ کہیں زمینداروں کی جہالت سے ملال تھا ۔ کہیں کاشتکاروں کے ساتھ ان کے ظلم کا شاکی ۔ بارہ تیرہ برس کی گردش کے بعد یہ شخص ایک ایسے خاندان میں پہنچا ۔ جو اسے ہر طرح پسند تھا اور اس کے سپرد ایک بچہ کیا گیا جس کا ذہن اور ہونہار شاگرد اس معلم کو کبھی نہیں ملا تھا ۔

سعیدہ : اس زمانے میں کیا عمر تھی ابا جان کی ؟

شیخ جی : دس سال کی ۔ اس لڑکے کو پڑھانے میں اتالیق کو معلوم ہوا کہ معلمی کیا دلفریب پیشہ ہے ۔ غنچے کو کھل کر پھول بنتے ہوئے دیکھنے سے اور اس کی شمیم نسیم سحری کی مدد سے سونگھنے سے باصرہ اور شامہ کو وہ فرحت حاصل نہیں ہوتی جو ایک ننھی سی جان کو اپنے ماحول میں پھیلتے اور بڑھتے ہوئے دیکھنے سے اور اس میں معاون ہونے سے مدرس کو حاصل ہوتی ہے ۔ قصہ مختصر اب اس اتالیق کو زندگی کا ایک مصرف مل گیا شاگرد کے خداداد جوہر شفیق استاد کی مدد سے خوب چمکے ۔ لڑکے نے اسکول کی پڑھائی کامیابی کے ساتھ ختم کی ۔ کالج میں داخل ہوا ۔ اور وہاں بھی اپنی قابلیت کا سکہ طالب علموں کی دنیا میں جما دیا ۔

منظور : میں نے بعض دشمنوں کی زبانی سنا ہے کہ کالج میں اس لڑکے کی زندگی عیوب اور نقائص سے پُر تھی ۔

شیخ جی : بچے تختی لکھنے میں غلطیاں کرتے ہیں ۔ فرض کرو کوئی اس تختی کو اٹھا رکھے اور یہ بچے پڑھ لکھ کر فاضل ہو جائیں تو انہیں ان کی غلطیاں دکھا کر شرمندہ کرے ۔ ایسے شخص کو میں ان لوگوں کے مقابلے میں کم حق

اور بد باطن سمجھتا ہوں جو ایک پسندیدہ سیرت کے مالک کو اس کی خطاؤں کا طعنہ دیں جو اس سے آدمی بننے کی کوشش میں سرزد ہوئی تھیں۔

سعیدہ: آپ تو اپنی کہانی کہئے اور اس ذکر کو چھوڑیئے۔

شیخ جی: لڑکے نے کالج سے امتیاز کے ساتھ سند حاصل کی اور اسے حوصلہ پیدا ہو کر یورپ میں جا کر مزید تعلیم حاصل کرے اور اپنی زندگی کو علمی کاموں کے لیے وقف کر دے۔ لڑکے کے خاندان کو اس کا اسکول اور کالج میں جانا ہی ناگوار گزرا تھا۔ یورپ کے نام پر تو قیامت ہی برپا ہو گئی۔ لیکن لڑکا اپنی دھن کا پکا تھا اس کا عزم ساری مخالفتوں پر غالب آیا اور اس نے یورپ کی راہ لی۔ اُستاد پر عزیز شاگرد کی روانگی کے بعد زندگی دوبھر ہو گئی۔ اگرچہ اب اسے اتالیق کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ اور گرد و نواح کے اکثر رئیس اپنے لڑکوں کی تعلیم اس کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس نے سب سے انکار کر دیا۔ آخر جب اس نے دیکھا کہ کسی کام میں جی نہیں لگتا تو وحشت کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ دل میں ٹھان لی کہ ہمالیہ پر جا کر اپنی زندگی کوہ نوردی اور دشت پیمائی میں گذارے۔ چنانچہ ایک دن صبح تڑکے اس نے اپنے اسباب میں سے دو جوڑے کپڑے لیکر ایک گٹھری میں باندھے اور پیٹھ پر رکھ کر نکل کھڑا ہوا۔ اسے منزل بہ منزل سفر کرتے ہوئے دس بارہ دن ہوئے تھے۔ کہ راہ میں ایک پیر مرد ملے جو خود کسی اس کے رفیق سفر بن گئے۔ ابتدا میں تو ہمارا اتالیق کوشش کرتا رہا کہ اس بڈھے سے کسی طرح پیچھا چھڑائے لیکن ایک طرف تو اس کی وحشت آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ دوسری طرف اس کے ساتھی کا اثر اس پر بے اس کے محسوس کیے ہوئے پڑ رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز کے بعد دونوں میں گہری دوستی ہو گئی اور ہمارا اتالیق اپنے پہلے ارادے کو ترک کر کے پیر مرد کے ساتھ عرصہ دراز تک سفر کرنے کے لیے راضی ہو گیا۔ پیر مرد نے اس سے یہ شرط کی کہ پہلے دونوں کوہ و صحرا کا خیال چھوڑ کر بستیوں اور شہروں کی سیر کریں اس کے بعد اگر جوان کو کوہ ہمالیہ پر چڑھنے کی ہوس باقی رہے تو پیر مرد بھی اس کا ساتھ دے گا۔

سعیدہ: خوب شرط کی پیر مرد نے۔ میں بھی ہوتی تو یہی کرتی۔

شیخ جی: چار برس میں ان دونوں نے سارا ہندوستان پورب پچھم تک اور اُتر سے دکھن تک چھان

ڈھالا۔ اس سفر میں انھوں نے لہراتے ہوئے دریا۔ شاداب وادیاں لہلہاتے ہوئے کھیت دیکھے اور فاقہ کش مرد بے زبان عورتیں اور بیمار بچے۔ انھوں نے سر فلک محل اور عالیشان مکان دیکھے اور ان کے جاہل اور عشرت پسند مکین۔ عشرت، رفعت، مسجدوں اور مندروں کو دیکھ کر انھیں خدا یاد آگیا۔ ایمان سے خالی نمازیوں اور پجاریوں کو دیکھ کر ان کے دل ٹوٹ گئے۔ دلفریب زمین اور بدبخت انسانوں۔ قابل فخر ماضی اور شرمناک حال کے ان نظاروں اور روشن ضمیر پیر مرد کی صحبت کا آتالیق پر عجیب اثر پڑا۔ اس کی بے چینی اور بے مرکزی دور ہوگئی اور اس کا دل ایک نئے درد سے معمور ہوگیا۔ جو صحرا نوردی کا نہیں بلکہ آبادیوں میں رہنے کا۔ ہمالیہ میں جاکر خود کو کھو دینے کا نہیں بلکہ انسانوں سے مل کر اپنے آپ کو پالینے کا متقاضی تھا۔ پیر مرد تو اس سے رخصت ہوکر اپنے دائمی سفر پر روانہ ہوگئے اور وہ اپنے شاگرد کی واپسی کی خبر سن کر اس کے گھر پہنچا تاکہ اسے اپنے نئے جذبات و خیالات کا شریک بنائے۔

یہ اتفاق دیکھو۔ ادھر شاگرد بھی یورپ سے وہی چوٹ لے کر آیا تھا جو اُستاد نے ہندوستان میں کھائی تھی اس نے یورپ میں اپنا وقت بے کار نہیں کھویا تھا۔ بلکہ وہاں کے تمدن کا نہایت غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کی ظاہری آنکھیں جس قدر وضاحت سے یورپ کو دیکھتی تھیں اسی قدر اس کی چشم بصیرت کے آگے ہندوستان کے اصلی خد و خال نمایاں ہوتے جاتے تھے۔ ہندوستان کے اس نئے مرقع میں اُسے بہت سے دردناک مناظر نظر آئے لیکن سب سے زیادہ قابل رحم اس نے عورتوں کی حالت زار کو پایا۔ چار برس کے بچھڑے اُستاد اور شاگرد ملے۔ دونوں نے اپنی اپنی کہانی ایک دوسرے کو سنائی بعد مہینوں مشورے ہوئے جن میں شاگرد کی بیوی بھی شامل ہوا کرتی تھی۔ یہ نیک بیوی کچھ دن کے بعد ایک بچہ اور ایک بچی چھوڑ کر راہی جنت ہوئی۔ مگر استاد اور شاگرد نے اپنی زندگی کو عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے لیے وقف کرنے کا قصد کرلیا (ذرا ٹھہر کر) اس کے بعد کا نقشہ تمھیں معلوم ہے کہ کس طرح دونوں نے اپنی قوم کے تعصب اور جہالت کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ شاگرد کو موت دنیا سے لے گئی اور استاد کو بڑھاپے نے ہر کام سے معذور کردیا۔

**منظور** : کاش ہمارے ملک میں اور چند افراد ایسے ہوتے ——— کاش!

**سعیدہ** : شیخ جی! آپ پیاسے ہوں گے (پیالہ اٹھا کر) لیجیے اب پی لیجیے۔

(شیخ جی اٹھ کر افسردہ پیتے ہیں)

**شیخ جی** : بیٹی! خدا تمھاری عمر میں برکت دے۔ آنکھیں کھل گئیں۔

**سعیدہ** : آپ کا قصہ میں نے بہت جی سے سنا۔ اس سے دل بھی دکھا اور خوشی بھی ہوئی۔ آپ سے ایک بات پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔

**شیخ جی** : شوق سے پوچھو۔

**سعیدہ** : آپ کے نزدیک ہم عورتوں کی حالت کبھی بدلے گی یا نہیں؟

**شیخ جی** : بیٹی! میری عمر کا اور اس وقت کی حالت کا تقاضا تو یہ ہے کہ لال بھبھوکا سی صورت بنا کر اور سر ہلا کر کہوں "کہ بہ مباد ایں نیز گردد"۔ لیکن میں نئی نسل میں تھا۔ تم سی لڑکیاں اور تمھارے بھائی کے سے لڑکوں کو دیکھ کر مجھے امید ہوتی ہے کہ جلد اچھے دن آ جائیں گے۔

**منظور** : شیخ جی! آپ کی محبت ہے کہ آپ ہم عورتوں کی نسبت ایسے خیالات رکھتے ہیں۔ آپ کی تعریف کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ احترام آپ کی تنقید کا میری نظر میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس گفتگو کے سلسلے میں آپ ہمیں ان خامیوں سے آگاہ کر دیں جو آپ کو ہم لوگوں کے طرزِ عمل میں نظر آئیں۔

**شیخ جی** : میرے خیال میں تم نوجوانوں میں دو بڑے نقائص ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم لوگوں میں جوش عمر سے زیادہ ہے۔ دوسرے جیسا تمھارے سوال سے ظاہر ہوتا ہے تم لوگ نکتہ چینی کو ضرورت سے زیادہ اہم سمجھتے ہو۔

**منظور** : پہلا اعتراض تسلیم۔ لیکن دوسرا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کا ایسا سخت گیر نکتہ چینی کا مخالف کیسے ہو سکتا ہے؟

**شیخ جی** : ہاں میاں! میں بھی ایک زمانے میں زبان کی کاٹ کا بہت معتقد تھا۔ ٹوکنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ دوسرے بڑھاپے میں بسیار گوئی کے ساتھ اعتراض کرنے کا مادہ اور بڑھ گیا ہے۔ لیکن جس غلطی میں میں مبتلا ہوں اس سے تمھیں بچانا چاہتا ہوں۔ تمھارے حریف زیادہ تر بڈھے لوگ ہیں اور

بھی زیادہ تر تمہارے ہدفِ ملامت ہوتے ہیں لیکن انصاف سے دیکھو تو ان لوگوں پر اعتراض کرنا بالکل بے جا ہے
انھوں نے اس تاریک خیالی کے زمانے میں پرورش پائی ہے جس کا تم آجکل کی روشنی کو دیکھ کر بھی اندازہ نہیں کر سکتے
عادت نے ان کے خیالات کو راسخ اور عمر نے قوائے ذہنی کو سست کر دیا ہے۔ یہ بے چارے کسی طرح نئے خیالات
نہیں قبول کر سکتے۔ چنانچہ تمہاری نکتہ چینی علاوہ بے جا ہونے کے لاحاصل بھی ہے۔ تمھیں چاہیئے کہ جو وقت مناظرے
میں صرف کرتے ہو اسے اور مفید کاموں میں صرف کرو۔ اپنے دوست محمد علی کو دیکھو۔ اگرچہ اسے تمہاری سی فراغت
اور جمعیت نہیں عطا ہوئی ہے۔ لیکن اس کی تلافی قدرت نے قوتِ عمل سے کر دی ہے۔ بحث مباحثہ جھگڑے
بکھیڑے سے اسے کوئی مطلب نہیں۔ خاموشی سے اپنا کام کیے جاتا ہے۔ گویا ایک بھاری بھرکم جہاز ہے۔
جس پر طوفان کا کوئی اثر نہیں ہے۔ جو موجوں سے لڑنے کے لیے نہیں ٹھہرتا۔ بلکہ انھیں چیر کر اپنا راستہ
بناتا چلا جاتا ہے۔

سعیدہ: سچ کہتے ہیں آپ شیخ جی۔ میں بھی بھائی جان کو بہت سمجھاتی ہوں کہ چچی جان اور میر احمد حسین سے نہ
الجھا کریں۔

منظور: خیر احمد حسین تو خود مجھ سے اس قدر گھبراتے ہیں کہ بات نہیں کرتے۔ البتہ چچی جان سے نہ الجھنا بہت مشکل
ہے مجھے یقین ہے کہ اگر اُن کے سامنے فرشتے تسبیح و تہلیل کر رہے ہوں تو وہ اُن سے بھی لڑائی کا کوئی
بہانہ نکال لیں گی۔

شیخ جی: ہاں وہ کہیں گی کہ یہ ہر وقت بڑبڑایا کرتے ہیں۔ ضرور مجھے کوستے ہیں۔

سعیدہ: (ہنس کر) شیخ جی اب آپ آرام کیجئے۔ کہیں پھر خدانخواستہ طبیعت نہ خراب ہو جائے۔

منظور: (اُٹھ کر) ہاں اب ہم لوگوں کو رخصت ہونا چاہیئے۔

شیخ جی: ذرا ٹھہرو تو۔ میں تم سے یہ پوچھنا بھول گیا کہ پرسوں تم سے اور محمد علی سے کیا طے ہوا؟

منظور: معاملہ قریب قریب تیار ہے محمد علی کو آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ انشاء اللہ سب اسی طرح ہوگا جیسے
آپ چاہتے ہیں۔

سعیدہ: شیخ جی دعا کیجئے۔

شیخ جی: دل و جان سے دُعا کرتا ہوں۔

پردہ

(میر الطاف حسین اپنے مکان کے سامنے نیم کے درختوں کے سائے
میں جہاں روزانہ سہ پہر کو ان کی نشست ہوتی ہے۔ ایک تکیے دار
مونڈھے پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ ان کے پاس کرسی پر منظور بیٹھا
ہے)

**میر صاحب:** بیٹا تم جانتے ہو کہ میں گھر کی کسی بات میں دخل نہیں دیتا۔ مگر تمہاری بہن کی شادی کے معاملے میں کچھ ایسی پیچیدگیاں پڑ گئی ہیں کہ تم دونوں کی محبت مجھے خاموش نہیں رہنے دیتی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری لڑائی محمد علی کے ساتھ سعیدہ کی شادی کرنے کی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ شجاعت مرحوم کا رجحان اسی طرف تھا مگر تمہاری چچی کو ضد ہو گئی ہے کہ محمد جواد سے شادی ہو۔ اور ان کی بات نہ پوری ہوئی تو خدا جانے کیا قیامت برپا کریں گی بہرکا رائے میں مناسب یہ ہے کہ تم رفع شر کے لیے اسی پر راضی ہو جاؤ۔

**منظور:** چچا میاں! اگر محض والد مرحوم کی خواہش اور میری رائے کی بات ہوتی تو میں آپ کے فرمانے کے مطابق یقیناً مخالفت سے باز آ جاتا مگر آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ سعیدہ خود محمد علی سے شادی کرنا چاہتی ہے اور جواد کے نام سے نفرت کرتی ہے۔

**میر صاحب:** یہ میں نے بھی سنا ہے۔ مگر رسم زمانہ یہ ہے کہ لڑکیوں کی رائے نہ اس معاملے میں کوئی پوچھتا ہے اور نہ اس کی طرف التفات کرتا ہے۔ دوسرے میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جواد میں کیا خرابی ہے۔ علاوہ نجیب الطرفین ہونے کے نہایت سعادت مند اور متقی لڑکا ہے۔

**منظور:** ہاں! یہ بالکل سچا ہے۔ مگر بعض وجوہ سے سعیدہ انھیں پسند نہیں کرتی اور رسم دنیا کچھ بھی ہو، عقل و انصاف اور حکم شرع کا یہی تقاضا ہے کہ لڑکی کی رضامندی کے بغیر اس کی شادی نہ ہونا چاہیے۔

**میر صاحب:** ہاں! یہ بھی تم ٹھیک کہتے ہو (کچھ سوچ کر) مگر بھئی محمد علی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ تیجری

ہو گیا ہے۔

منظور: یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ محمد علی بھائی کے مذہبی معتقدات بالکل وہی ہیں۔ جو والد مرحوم کے تھے۔
اب یہ آپ بہتر جانتے ہیں کہ وہ نیچری تھے یا نہیں۔

میر صاحب: نہیں نہیں، شجاعت مرحوم کا سینہ نور ایمان سے معمور تھا۔ بعض امور میں مثلاً تمثالیت کے یا
ان اوراد و ظائف کے معاملے میں جو کسی مراد سے پڑھے جائیں البتہ مرحوم کا عقیدہ راسخ نہ تھا
سو کوئی نہ کوئی ضعف سوائے معصومین کے ہر شخص کے ایمان میں ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ رحمٰن و رحیم
ہے۔ ان خطاؤں سے در گذر کرے گا۔

منظور: بس تو محمد علی بھائی کی نسبت بھی جناب کو یہی رائے رکھنا چاہیئے۔

میر صاحب: ایک اور پیچیدگی بھی تو ہے۔ محمد علی پردے کا مخالف ہے اور چونکہ اس کا قول اور عمل واحد
ہے وہ اپنی زوجہ کو ضرور باہر نکالے گا۔

منظور: اس مسئلے پر جہاں تک مجھے یاد ہے والد مرحوم نے جناب سے ایک بار بحث کی تھی اور ثابت کیا تھا
کہ شرع میں جس پردے کی تاکید ہے وہ آنکھ اور دل کا پردہ ہے یہ قید فرنگ نہیں۔

میر صاحب: مرحوم نے یہ بحث ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ میرے سامنے کی تھی۔ اور ان کے دلائل ضرور قوی
تھے۔ مگر کچھ بھی ہو مجھے یہ گوارا نہیں کہ ہمارے خاندان کی لڑکی میموں کی طرح ماری ماری پھرے۔

منظور: مجھے یقین ہے کہ محمد علی بھائی سعیدہ کو اس کی مرضی کے خلاف ہرگز باہر نکلنے پر مجبور نہ کریں گے البتہ
اگر وہ خود چاہے تو اسے روکنا بڑی ہی جواب دہی کا کام ہے۔

میر صاحب: مجھے ایک اور بات بھی تم سے پوچھنا تھی۔ کیا تم اپنے بھائی بہنوں کی جائداد الگ کرانے
کے لیے مقدمہ لڑ رہے ہو؟

منظور: چچا میاں! آپ نے جتنی باتیں سنی ہیں یہ ایک ہی سازش کے سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ مجھے معلوم ہے
کہ آپ ان باتوں سے گھبراتے ہیں۔ لیکن ذکر آ گیا ہے تو مناسب سمجھتا ہوں کہ اختصار کے ساتھ
پورا معاملہ آپ کو سمجھا دوں۔ آپ کو اس کی خبر نہیں ہے کہ خاندانی جائداد میں جتنا حصہ آپ کا ہے۔

دوسرے پیر تک قرضے سے زیر بار ہے۔ سیتارام جب ہی چاہے نالش کرکے اس پر قبضہ کرسکتا ہے لیکن
اسے انتظار یہی کا ہے کہ آہستہ آہستہ اور قرض دے کر بقیہ جائداد کو بھی اپنے قبضے میں کرے اسی لیے
اس امر میں خاص دلچسپی ہے کہ سعیدہ کا عقد محمد جواد سے ہو جو اس کے مقروض ہونے کے سبب سے پہلے ہی
سے اس کے قابو میں ہیں۔ اس کی ان سازشوں کا سد باب کرنے کے لیے میں نے درخواست دی ہے کہ
جائداد کا بٹوارہ کر دیا جائے تاکہ میں خود گنگا سہائے کی مدد سے اپنے حصے کی دیکھ بھال کروں۔ بس اتنی
سی بات ہے نہ کوئی مقدمہ ہے نہ معاملہ۔

**میر صاحب**۔ سنتا ہوں کہ اگر یہ امر وقوع میں آیا تو مہاجن نالش کردیں گے۔

**منظور**: بہت ممکن ہے کہ ایسا ہو۔ کیونکہ آپ جس ذریعے سے سب باتیں سنا کرتے ہیں وہ سیتارام کے مقاصد
کا صحیح ترجمان ہے۔ لیکن اگر نہ کیا جائے تو کچھ دن کے بعد وہ پورا سرا یہ مہاجن، سیتارام کا، بابت میں حوالہ
دیا کرتا ہے۔ پوری جائداد پر قبضہ کرلے گا کم سے کم ایک حصہ تو بچا لینا چاہیے۔

**میر صاحب**: خیر بھئی! تم ان باتوں کو بہتر سمجھتے ہو۔ میں خود کو رائے دینے کا اہل نہیں سمجھتا۔ تم احمد حسین سے مشورہ
کرکے جو مناسب سمجھو کرو۔

**منظور**: (مسکرا کر) بہت بہتر۔

پردہ

○

# چوتھا ایکٹ

## پہلا منظر

(محمد علی کا مکان ۔ دفتر کا کمرہ ۔ وسط میں ایک میز ہے جس پر
رجسٹر کاغذات وغیرہ ترتیب سے رکھے ہوئے ہیں جس طرف
دروازہ ہے ۔ اس دیوار پر بڑی گھڑی لگی ہے ۔ اور چند نقشے
لٹکے ہوئے ہیں ۔ اس کے مقابلے کی دیوار سے لگی ہوئی الماریاں
رکھی ہیں جن میں کتابیں سلیقے سے چنی ہوئی ہیں ۔ تیسری طرف دو
کھڑکیاں ہیں جن سے خانہ باغ نظر آتا ہے ۔ وسط میں میز کے تین
طرف تین کرسیاں رکھی ہیں ۔ چوتھی طرف جدھر رجسٹروں کے اونچے
ڈھیر رکھے ہیں کوئی کرسی نہیں ہے ۔ ایک کرسی پر محمد علی بیٹھا
رجسٹر میں پنسل سے نشان کر رہا ہے اور بیچ میں گھڑی اور
دروازے کی طرف نظر ڈالتا جاتا ہے ۔ چند منٹ میں دروازے
کے باہر سے قدموں کی آواز آتی ہے اور منظور دروازہ کھول
کر اندر آتا ہے ۔ پیچھے پیچھے گنگا سہائے کاغذوں کا بستہ
دبائے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور جھک کر آداب
بجا لاتے ہیں )

**منظور** : (مصافحہ کرتے ہوئے) بھائی صاحب ! معاف کیجئے گا ۔ ذرا سی دیر ہو گئی ۔ اسٹیشن پر اتفاقاً انجمن اتحاد المسلمین کے سکریٹری مل گئے ۔ ان کی گاڑی میں دیر تھی ۔ میرے پیچھے پڑ گئے کہ انجمن کا نیا دستور العمل سن لو ۔ پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے سوا ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب سنانا شروع کر دی اور اس تیزی سے کہ میں اچھی طرح سمجھ بھی نہیں سکتا تھا ۔ میرے ٹوک دینے کے خوف سے وہ سانس کسی جملے کے خاتمے پر نہیں

تو ڈھے تھے نہ کر دہ میاں۔ وہ تو کہئے گاڑی وقت پر آگئی۔ مجبور ہو کر جیسی ہوئی گاڑی میں بیٹھے۔ مگر میری
تلکین کے لیے پکار پکار کر کہتے گئے کہ بقیہ دفعات کسی دن میرے گھر پر آکر سنائیں گے۔

**محمد علی** : اچھا اب فوراً کام شروع کر دینا چاہیے مجھے ایک پنچایت میں سوہن لپور جانا ہے۔

( دونوں کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں )

**محمد علی** : بیٹھیے منشی گنگا سہائے صاحب۔

( گنگا سہائے کرسی ہٹا کر فرش پر بیٹھنا چاہتا ہے )

**منظور** : ہائیں! یہ کیا کرتے ہیں۔ آپ کرسی پر بیٹھیے۔

**گنگا سہائے** : حضور لوگوں کی غربا پروری ہے۔ ورنہ فدوی یہ صلاحیت کہاں رکھتا ہے۔

( جھک کر آداب بجالاتا ہے اور کرسی کے سرے پر بیٹھ جاتا ہے )

**منظور** : آپ کی پنچایتیں خوب ترقی کر رہی ہیں سنا اب کوئی مقدمہ عدالت میں نہیں جاتا۔

**محمد علی** : نہیں یہ تو مبالغہ ہے البتہ چھوٹے چھوٹے معاملات اکثر پنچایت ہی میں طے ہو جاتے ہیں۔

**منظور** : کس قدر خوشی کی بات ہے کہ آپ کی کوشش سے ہمارے کسانوں میں خودداری اور جمہوریت کی روح پیدا
ہو رہی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بیدار ہو رہی ہے۔ کیونکہ جدید تاریخی تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے کہ
قدیم الایام سے ہندوستان کے دیہات میں حکومت خود اختیاری کے اصول پر زندگی بسر کی جاتی تھی یہ
صرف چند دن کی بات ہے کہ غلامی کا طوق ہماری گردن میں پڑ گیا ہے (گنگا سہائے سے) آپ بتا
سکتے ہیں کہ اس کا کیا سبب ہے؟

**گنگا سہائے** : چھوٹے میاں۔ ہم لوگ یہ امورات کیا جانیں۔ البتہ یہ جانتے ہیں کہ کلجگ کے ایام میں لگان
بڑھتا جاتا ہے اور پیداوار کم ہوتی جاتی ہے۔

**محمد علی** : اچھا اس کی تحقیقات پھر کریں گے۔ (گنگا سہائے سے) آپ سب کاغذات ساتھ لائے ہیں؟

**گنگا سہائے** : ہاں حضور فدوی نے ہمہ جہت سے پابندی احکام کی کی ہے۔

**محمد علی** : اچھا انھیں چھوڑ جائیے۔ میں اطمینان سے دیکھوں گا۔ آپ پرسوں پھر بارہ بجے کی گاڑی سے تشریف

لائیے گا اور شام تک یہیں قیام کیجئے گا البتہ اس وقت مجھے بڑے میر صاحب کی جائداد کے متعلق
چند سوال کرنا ہیں۔

**گنگا سہائے** : ارشاد فرمادیں۔

**محمد علی** : بڑے میر صاحب کے حصے پر مجموعی قرضہ کتنا ہے ؟

**گنگا سہائے** : حضور کلھم انیس دستاویزیں ہیں جن کی میزان زر اصل کی بتیس ہزار ہے اور سود در سود مل کر پھاگن
کے ختم تک تہتر ہزار چار سو بانوے روپے گیارہ آنے سات پائی ہوتے ہیں۔

**منظور** : آپ یہ غضب دیکھتے ہیں۔ بتیس ہزار قرضہ اور چالیس ہزار سود۔ یہ سود خوروں کی قوم جونک کی طرح انسان
کے لپٹتی ہے اور ایک قطرہ خون کا نہیں چھوڑتی۔ ہمارے ملک میں عدالتیں بھی ہیں۔ جج بھی۔ کونسل بھی۔ قانون
بھی۔ مگر اس وحشیانہ ظلم کے روکنے کی کسی کو توفیق نہیں ہوتی۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ سیاہ کار جیل خانوں
میں جگہ پائیں اور وہ لوگ جو جان بوجھ کر خود کو ان کے حوالے کرتے ہیں پاگل خانوں کو زینت دیں۔

**محمد علی** : اس حصے کی سالانہ آمدنی کیا ہے ؟

**گنگا سہائے** : حضور آمدنی جو ہے سو اس کا یہ حساب ہے کہ کھاتہ وغیرہ احمد میاں کے پاس ہے اور فدوی کو
دیکھنے کی مجال نہیں۔ البتہ کاغذات پٹواری کے حساب سے گذارش کر سکتا ہے۔ ساڑھے چھ ہزار آمدنی بڑے
سرکار کے حصے کی ہے ——— حضور کہنے کی بات نہیں (ادھر ادھر دیکھ کر) سارا نظم و نسق اس
قدر ابتر ہے کہ اللہ تعالیٰ تیری پناہ۔ بہت سے اسامیوں پر برسوں کی باقی ہے اور بہتوں سے دو دو بار
بوریا لیا جاتا ہے نہ پرانے چاہات کی مرمت ہوتی ہے نہ نئے بنوائے جاتے ہیں۔ منظور میاں اور صاحبزادی کا
حصہ بھی اتنا ہی بڑا ہے مگر اس کی آمدنی سال گذشتہ میں آنے پائی چھوڑ کر سات ہزار سات سو گیارہ تھی۔
اور پھر یہ حصہ بھی پوری طرح فدوی کی سپردگی میں نہیں ہے۔ فدوی تحصیل وصول کر کے احمد میاں کو دے دیتا
ہے۔ زمین میں لگانے کے لیے مانگتا ہے تو ایک پائی بھی نہیں ملتی۔ اگر دو تین بار کر کے ایک دس ہزار روپیہ
جائداد میں لگا دیا جائے تو آمدنی ڈیوڑھی ہو جائے۔

**منظور** : منشی جی! آپ اطمینان رکھیے۔ چند دن میں ہمارا حصہ الگ ہوا جاتا ہے۔ پھر آپ جو مناسب سمجھئے کیجئے۔

(محمد علی سے) بھائی صاحب لالہ بالکشن کہتے تھے کہ اب کی پیشی میں ضرور بٹوارے کا حکم ہو جائے گا
اس وقت ضرور آپکو موجود ہونا چاہئے۔ ورنہ اکیلے میرے بنائے کچھ نہ بنے گا۔ جب انسان کے ایک طرف پٹواری
اور دوسری طرف قانون گو ہو تو عقل یوں ہی گم ہو جاتی ہے۔

**محمد علی:** تم بالکل فکر نہ کرو۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ (گنگا سہائے سے) بڑے میر صاحب کے حصے کی تخمینی قیمت
کیا ہوگی۔ اور اگر نیلام ہو تو کہاں تک دام لگیں گے۔

**گنگا سہائے:** حضور قیمت آپ یہ دیکھئے کہ بتانا بہت مشکل ہے کیونکہ ساری بات بیچنے والے اور خریدنے والے
کی ہے۔ سلیقے سے معاملہ کیا جائے اور مال دھنی خریدنے والا مل جائے تو دو لاکھ سے زیادہ ہی مل رہے گا۔
رہا نیلام تو اس میں کوڑی کے مول چیز جاتی ہے۔ جتنا قرضہ ہے اتنے بھی دام لگ جائیں تو غنیمت ہے

**منظور:** ہاں بھائی صاحب! میں نے سنا ہے کہ سیتا رام نالش کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ اُسے یقین ہو گیا کہ سعیدہ
کی شادی جواد سے نہیں ہوگی۔ تو فوراً نالش کرے گا اور جائداد نیلام کرالے گا مجھے بڑا اندیشہ ہے
کہ اس کے بعد کام کیسے چلے گا۔ ہم بھائی بہن اپنی آمدنی کا جتنا حصہ لیا کرتے ہیں اگر اس سے بھی کم
لیں تب بھی چچا جان کے یہاں کا خرچ پورا نہیں پڑے گا۔

**گنگا سہائے:** حکم ہو تو فدوی اپنی موٹی ناچیز عرض کرے۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ اگر اس کا تہائی حصہ
ہوشیاری سے فروخت کیا جائے تو سارا قرضہ ادا ہو سکتا ہے اور باقی جائداد بے داغ بچ جائے گی۔

**منظور:** لیکن فروخت کرے کون؟ احمد حسین سے یہ امید رکھنا بالکل فضول ہے کہ اس کی سمجھ میں بات آئے
گی۔ ایک تو وہ پہلے ہی سے معذور تھے۔ دوسرے سیتا رام نے اور اُنکو بیمار کر رکھا ہے۔ رہے چچا جان
تو وہ کسی حساب ہی میں نہیں ہیں۔

(نوکر داخل ہوتا ہے)

**نوکر:** سرکار گھوڑا تیار ہے۔

**محمد علی:** (اُٹھ کر) اچھا۔ اب مجھے کپڑے بدل کر فوراً جانا ہے (منظور سے) تم ابھی ٹھہرو۔ تم سے مدرسے
کے متعلق باتیں کرنا ہیں۔ بستی اسکول کی نئی معلمہ مس ایمن چائے پر آئیں گی اُن سے بھی مشورہ کریں گے

**منظور:** بہت اچھا!

**محمد علی:** تو منشی جی! پرسوں ساڑھے بارہ بجے۔

**گنگا سہائے:** فدوی بسر و چشم حاضر ہوگا۔

(نوکر دوبارہ داخل ہوتا ہے)

**نوکر:** حضور! مسلمین کے سکتر صاحب آئے ہیں منظور میاں کو پوچھ رہے ہیں۔

**منظور:** اسے یہ بزرگ یہاں کیسے پہنچے۔ میرے سامنے ریل میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے تھے۔ کیوں منشی جی تم نے بھی تو دیکھا تھا۔

**گنگا سہائے:** ہاں! چھوٹے میاں۔ دیکھنے میں تو یہی معلوم ہوا تھا جیسے گاڑی میں دوڑ کر بیٹھ گئے ہوں

**منظور:** نہیں صاحب معلوم کیا معنی۔ انھوں نے گاڑی چلنے کے بعد کھڑکی میں سے سر نکال کر مجھ سے بات کی تھی۔

**محمد علی:** خیر بیٹے! میں تو اب جاتا ہوں۔ تم جی بھر کے ان کی صحبت کا لطف اٹھاؤ۔

(چلا جاتا ہے)

**منظور:** میری سمجھ میں نہیں آتا کیا معاملہ ہے (پیروں کی چاپ سنائی دیتی ہے) خیر وہ خود آتے ہیں۔ ان سے معلوم ہو جائے گا۔

(سکریٹری صاحب داخل ہوتے ہیں)

**سکریٹری صاحب:** آداب عرض ہے میاں منظور صاحب! بھئی عجب دل لگی ہوئی۔ میں اسٹیشن پر آپ سے باتوں میں ایسا مشغول تھا کہ بے سوچے سمجھے غلط گاڑی میں بیٹھ گیا مجھے جانا تھا پور بپ کی گاڑی سے اور وہ تھی برانچ لائن کی گاڑی۔

**منظور:** برانچ لائن کا پلیٹ فارم ہی تھا۔ کوئی دوسری گاڑی وہاں سے کیوں چھوٹنے لگی۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ آپ کو کہاں جانا ہے ورنہ روک لیتا۔

**سکریٹری صاحب:** جب گاڑی مدرسے کے پاس پہنچ کر تحصیل کی کچہری کی طرف مڑی تب مجھے معلوم

ہوا کہ غلط گاڑی میں بیٹھ گیا ہوں۔ خیر دوسرے اسٹیشن پر اُتر کے یکہ کر کے فوراً واپس ہوا۔ خیال تھا کہ شاید پورب والی گاڑی گھنٹے سوا گھنٹے لیٹ ہوئی تو مل جائے گی۔ یہاں اسٹیشن پہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ کمبخت ٹھیک وقت پر چھوٹ گئی۔ بہرحال میں نے تار دے دیا کہ جلسہ کل پر ملتوی کر دیا جائے۔ جی چاہ رہا تھا کہ آپ کو بقیہ دستورالعمل سنا دوں۔ خیال تھا کہ محمد علی صاحب بھی ہوں گے۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ کہیں چلے گئے ہیں (ایک ضخیم مسودے کو کھول کے) تو کیسے شروع سے سناؤں یا جہاں سے چھوڑا تھا وہاں سے؟

**منظور:** آپ اس وقت بیکار زحمت فرماتے ہیں۔ پروگرام کے خراب جانے سے آپ کی طبیعت بدحظ ہوگی پھر کبھی دیکھا جائے گا۔

**سکریٹری صاحب:** نہیں صاحب۔ یہ اتفاقات تو ہوا ہی کرتے ہیں۔ جب قومی کام کرنا ٹھہرا تو طبیعت کی بدحظی کا خیال کیا۔ اچھا تو میں جہاں تک پہنچا تھا وہاں سے شروع کرتا ہوں۔

"دفعہ ایک سو ستائیس"

**منظور:** معاف فرمائیے گا۔ مجھے قصبے میں ایک دوست سے ملنا ہے ——————— پورا دستورالعمل سنوں گا تو دیر ہو جائے گی۔

**سکریٹری صاحب:** نہیں تو یہ کیا دیر ہوگی۔ سو صفحے سے بھی کم باقی ہیں اور وہ بھی دور دور لکھے ہوئے آج آپ صرف سن لیجئے۔ اس پر بحث کسی فرصت کے دن ہوگی (تیزی سے) دفعہ ایک سو ستائیس سکریٹری کے فرائض۔ سکریٹری انجمن پر لازم ہے کہ خدا کا خوف اور قوم کا درد دل میں رکھے "نہی عن المنکر اور امر بالمعروف" کا عامل ہو۔ زندگی کو فانی جانے اور آخرت پر ایمان لائے قوم کی بہبودی کے لیے دل و جان سے کوشش کرے۔ اس امر میں ذرا بھی شک نہ کرے کہ افراد کی زندگی قوم کی زندگی سے وابستہ ہے۔ ہیئت قومی سے الگ ہو کر کوئی فرد کشاکشِ حیات میں سلامت نہیں رہ سکتا۔ غرض جملہ اُمور جو حسب دفعہ ایک سو گیارہ تا ایک سو پندرہ ممبروں پر قرار دیئے گئے ہیں۔ سکریٹری پر بدرجہ اولیٰ فرض ہیں

اُسے چاہیئے کہ اپنے عمل کو نمونہ بنائے جس کی ممبر تقلید کر سکیں اور اس طرح دونوں جہان میں

سرخ روئی حاصل کریں۔ ——— علاوہ اس کے سکریٹری کے فرائض مخصوص حسب
ذیل ہیں جو گیارہ شعبوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔
شعبہ الف انجمن کے اجلاس کی اطلاع سکریٹری ممبروں کو اجلاس سے پہلے دے گا

پردہ

○

# دوسرا منظر

(میر صاحب کی نشست گاہ۔ میر صاحب اپنی معمولی جگہ پر
تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ شیخ جی جو نہایت ضعیف نظر آتے
ہیں رومالی اوڑھے تکیئے دار مونڈھے پر رونق افروز
ہیں۔ محسن اور جواد بھی موجود ہیں۔ احمد حسین بے چینی کے ساتھ
دالان میں ٹہل رہے ہیں)

**احمد حسین** : (گفتگو جاری رکھتے ہوئے) میر سجاد حسین کا نام بارہ گاؤں میں مشہور تھا۔ ہر طرف دھاک بندھی ہوئی تھی۔ اس گھر کے محرم کی ضلع بھر میں دھوم تھی۔ آج اسی خاندان کی آبرو مٹی میں مل رہی ہے سر بازار جائداد نیلام ہو رہی ہے اور آسمان نہیں پھٹ پڑتا۔

**میر صاحب** : لاحول ولا قوۃ! توبہ کرو توبہ۔ جو مرضی الٰہی ہو اس میں بندے کو دم مارنے کی گنجائش نہیں۔

**احمد حسین** : توبہ۔ نعوذ باللہ۔ سب کر کے دیکھ لیا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ حرام زادہ سیتا رام آستین کا سانپ نکلا۔ مجھے مل جائے تو بوٹیاں چبا جاؤں۔ میرے یار غار بنے تھے۔ بچپن کے دوست۔ ہم مکتب۔ خاندان کے خیر خواہ بھولی دوالی۔ عیدبقرعید تھالی لے کر آتے تھے۔ ہر وقت آؤ میاں آؤ میاں کہتے۔ منہ سوکھتا تھا۔ اور اب کیسی طوطے کی سی آنکھیں بدل لیں۔ پرسوں میں گیا تو مجھے دیکھتے ہی گھر میں چلا گیا اور بیٹے کو سکھا دیا کہ کہہ دو نہیں ہیں۔

**محسن** : کمبخت نے اتنی جلدی نالش نہ کی ہوتی تو میں روپے کی فکر کرتا۔ دو شنبے کو مجھے تار پہنچا چار دن میں کیا ہو سکتا تھا۔ اتنی جلدی زیور بھی اچھے داموں نہیں بیچا جا سکتا تھا اگر مہینے کی مہلت ہوتی تو روپے کا فراہم ہونا کوئی بات نہ تھی۔

**جواد** : جی ہاں! یہ مزید تعجب ہے کہ سیتا رام کو اتنی جلدی کیا پڑی تھی۔ "دیر آید درست آید"

**احمد حسین:** جی ہاں۔ آپ بھی کیا بھولے بنے جاتے ہیں۔ جلدی ہی کی تھی کہ جائداد نیلام پر چڑھے تو خود اونے پونے خرید لے۔ آپ دیکھیے گا اگر لالہ سیتا رام کے نام نہ ختم ہو تو میرا نام احمد حسین نہیں اور یہ سب کیا دھرا ہے اس منظور کا (شیخ جی کی طرف دیکھتے ہوئے) خدا جانے کن مفسدوں نے کان بھر دیئے تھے لڑکے کے۔ جائداد کا بٹوارہ ہوا وہ گنگا سہائے کا بچہ سفید و سیاہ کا مالک مقرر ہوا۔ ایک تو اس بات سے مہاجن بھڑک گیا۔ دوسرے شادی کے معاملے میں بزرگ دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینک دیئے گئے۔ اور میری اور ہمشیرہ صاحبہ کی ضد پر ملحد نیچری محمد علی سے نسبت قرار پائی۔ اس نے جو کاشتکاروں کی انجمن کا جال پھیلا رکھا ہے اس کے سبب سے دنیا بھر کے مہاجن اس سے جلتے ہیں۔ نسبت ہو تا تھی کہ سیتا رام کے تلووں سے آگ لگ گئی۔ اس نے نالش دائر کر دی۔ اب صاحبزادے منظور الدولہ بہادر کہتے ہیں کہ اپنی اور بہن کی آمدنی کا نصف چچا جان کو دیا کریں گے۔ پوچھیے جب دونوں حصوں کی آمدنی میں گھر کا خرچ نہیں چلتا تو ایک حصے کے نصف میں کیا ہوگا؟

**محسن:** منظور اس وقت ہیں کہاں؟ میں ابھی گھر میں گیا تھا۔ وہاں اماں جان نے قیامت برپا کر رکھی ہے کل سے سعیدہ کے پیچھے پڑی ہیں۔ سوائے اسے کوسنے اور برا بھلا کہنے کے کوئی کام نہیں۔ سنا ہے کہ سر تا پھینک کر مارا تھا۔ وہ بے چاری ایک کونے میں بیٹھی سب خاموشی سے برداشت کر رہی ہے۔

**احمد حسین:** جی ہاں! بس دنیا میں دو قصوروار ہیں۔ ایک میں ایک میری بہن۔ اس گھنی لڑکی کے کرتوت کسی کو نہیں معلوم۔ ہمدردی کرنے کو سب موجود ہیں۔ آج چوتھا دن ہے کہ محمد علی کی سگی بہن کی میم دوڑاتی ہوئی گھر میں چلی آئی اور دو گھنٹے بیٹھ کے سعیدہ سے باتیں کیں۔ ہمشیرہ صاحبہ کو جواد سے نسبت ٹوٹنے کے بعد یوں ہی اس لڑکی کی صورت سے نفرت ہو گئی ہے۔ دوسرے میم کا اس طرح گھر میں چلے آنا سیدانی کے دل پر تیر کی طرح لگا۔ اس وقت تو جھجک کے سبب سے کچھ نہ کہہ سکیں مگر دل میں بات لیے رہیں۔ پھر ان بھائی بہنوں کی بدولت جو بزرگوں کی پگڑیاں اچھل رہی ہیں۔ بس کا صدمہ اور بھی طرہ ہو گیا۔ ان سب باتوں نے ہمشیرہ صاحبہ کو دیوانہ کر رکھا ہے۔ دو دن سے ایک نوالہ نہیں کھایا ہے اور رو رو کر آنکھیں سجا لی ہیں۔ اچھی بات ہیں، اگر لڑکی کو جھڑک دیا تو کیا اندھیر ہو گیا۔

**محسن** : ہاں یہ میں بھی جانتا ہوں کہ اماں جان کے لیے بڑا سخت موقع ہے لیکن سعیدہ بے چاری سے سب کا بدلہ کیوں نکالتی ہیں اور میم کے آنے میں کیا خرابی ہوگئی۔ سچ پوچھیے تو ہم ایسوں کی عزت افزائی ہے کہ ایک مشن کی میم صاحبہ وہ بھی امریکن نہیں انگریز قوم کی ہمارے گھر پہ آئیں۔

**جواد** : کیوں ناظر جی صاحب کیا امریکہ کی عورتیں بھی میم صاحب کہلاتی ہیں؟

**میر صاحب** : منظور آتا تو گھر میں جاکر اپنی چچی کو سمجھاتا کہ آہ و بکا سے کیا فائدہ ہے اور لڑکی پہ کیوں تشدد کرتی ہیں۔ یہ تو بری بات ہے۔

**شیخ جی** : بجا ہے منظور ہی سیدانی کو سمجھائیں گے۔ ان کے پاس اس وقت بوعلی سینا بھی جائیں تو چولھے کی جلتی ہوئی مٹی اور کھولتا ہوا پانی لے کر گل حکمت کریں۔

**احمد حسین** : شیخ جی! آپ کو کسی بات کا حس بھی باقی رہا ہے یا بالکل عقل نے جواب دے دیا۔ غضب خدا کا سادات کی آبرو جا رہی ہے۔ بزرگوں کا نام مٹ رہا ہے اور آپ اسی بے فکری سے مذاق کر رہے ہیں۔

**شیخ جی** : سادات کی آبرو چند بیگھہ زمین میں نہیں ہوا کرتی۔ اس کے مخزن اس کے سینے ہیں۔ اگر سیادت کا خیال ہے تو صبر اختیار کیجیے جو آپ کے بزرگوں کا شعار ہے۔

**احمد حسین** : بس باتیں بنانا آپ سے سیکھ لے۔ دوسرے کی مصیبت پر صبر کرنا بہت آسان ہے آپ کو بھی ایک بیگھہ زمین بھی نصیب ہوئی ہوتی اور پھر وہ اس طرح سر بازار نیلام ہوتی تو البتہ قدر ہوتی (گجر ٹلنے لگے) بارہ بج چکے ہیں۔ مگر ابھی تک نیلام کی آواز نہیں سنائی دیتی۔ بات یہ ہے کہ نیلام کیا ملتی ہے۔ معلوم ہے کہ مہاجن کے مقابلے میں کون بولے گا۔ ستر اسی ہزار اس کے پہلے سے ہیں۔ ضرورت پڑ گئی تو دو چار ہزار اور دے دے گا جیسے چٹکی (دور سے شور و غل کی آواز آتی ہے۔ سب سے بلند صدا اس کا ملکا بولی پچاس ہزار") لیجیے شروع کر دیا بے ایمانوں نے۔ انھیں سوائے ہمارے پچھواڑے کے کوئی اور جگہ بھی نہیں ملتی تھی۔ (آواز پچپن ہزار۔ پچپن ہزار۔ پچپن ہزار ایک) کیسا بڑھ بڑھ کے بول رہے ہیں۔ جیسے ان کے باپ ہی کی جائداد تو ہے۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ آدھے گاؤں۔ خانہائے رعایا باغات۔ سب پر ستیا رام کا قبضہ (آواز پچپن ہزار ایک۔ پچپن ہزار دو۔ پچپن ہزار ایک دو) باقی گاؤں

گنگا سہائے کا ڈنکا بج رہا ہے۔ رہ گئے میر الطاف حسین اور کمبخت احمد حسین۔ دونوں کی گاؤں میں کوئی حیثیت نہیں۔ دونوں رعیت ہیں سیتا رام کی بمنظوری اور گنگا سہائے کی۔ کل تک میرے نام سے اسامی تھراتے (آواز ساٹھ ہزار ساٹھ ہزار) صورت دیکھ کر کانپتے تھے اور اب! اب کوئی بات بھی نہ پوچھے گا بلکہ مجھ پر ہنسا کریں تو کوئی تعجب نہیں ہے اور تو اور یہ بینی پرشاد جس نے میری طرف سے سیکڑوں اسامیوں کی قرقیاں کیں (آواز ستر ہزار ——— ستر ہزار ——— ستر ہزار ایک) بڑی بڑی رقمیں لیں دعوتیں چکھیں۔ اب آج وہ میری قرقی کرنے آیا ہے۔ میں ہمیشہ سمجھا کرتا تھا کہ بڑا بھلا مانس ہے۔ مگر معلوم ہو گیا دنیا غرض کی ہے۔ کسی کا اعتبار نہیں۔

**محمد جواد**: ملازمان سرکار پر تعمیل حکم شاہنشاہی واجب ہے وہ کیسے (آواز ——— ستر ہزار ——— ستر ہزار ——— کسی کی رو رعایت کر سکتے ہیں ع

"پردہ داری می کند بر قصر قیصر عنکبوت"

**احمد حسین**: بس چپ بیٹھئے۔ آپ سے کس نے بولنے کو کہا (آواز ستر ہزار ایک ——— دو ——— ستر ہزار دم آئے وہاں سے بڑے ملازم سرکار بن کے۔ اس ساری مصیبت میں آپ کو بھی بہت دخل ہے۔ اگر آپ میں ذرا بھی عقل ہوتی (آواز ——— ستر ہزار ——— ایک ——— دو ——— ایک ——— دو تین) لیجئے ایک دو تین (سر تھام کر) نیلام ختم ہو گیا۔ اور صاف ظاہر ہے کہ سیتا رام کے نام پر کیوں کر کوئی دوسرا اگر بولتا تو سیتا رام اتنی تھوڑی رقم پر کیوں خاموش رہتا۔ میری آنکھوں میں اس وقت اندھیرا چھا رہا ہے۔ میرے سر میں چکر آ رہا ہے۔ خدا جانے ہمشیرہ صاحبہ کا کیا حال ہو گا۔ میں جاتا ہوں ذرا ان کی خبر لوں۔

(چلے جاتے ہیں)

**میر صاحب**: رضا بالقضاء و تسلیماً للامر۔ مگر بھئی احمد حسین کے حال پر مجھے بہت ترس آتا ہے۔ بے چارہ بدحواس ہو رہا ہے۔

**جواد**: پہلے تو میر احمد حسین بڑے مومن بالغیب تھے۔ میری بڑی خاطر کیا کرتے تھے۔ چند دن سے خدا جانے

کیا ہو گیا ہے کہ بات بات پر زجر و توبیخ کرنے لگے ع

مردانِ خدا خدا نباشند

لیکن ز خدا جدا نباشند

(منظور داخل ہوتا ہے)

**منظور**: (غصے کے لہجے میں) چچا جان! میں آپ سے رخصت ہونے آیا ہوں۔ سواری تیار ہے۔ سعیدہ ڈیوڑھی میں کھڑی ہے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو چل کر اُسے خدا حافظ کہہ دیجئے۔

**میر صاحب**: کیوں۔ کہاں؟

**شیخ جی**: اتنی جلدی؟

**منظور**: بس انتہا ہو چکی۔ اب ایک منٹ اس منحوس گھر میں ٹھہرنا مجھ پر حرام ہے۔ کل سے اس غریب لڑکی پر زدوکوب سب وشتم کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا ہے۔ اس بدبخت نے منہ سے اُف تک نہیں کی۔ لیکن چہرے پر خون کی ایک بوند نہیں۔ مُردنی چھا رہی ہے۔ اگر وہ چند گھنٹے یہاں اور ٹھہری تو قلب پھٹ جائے گا۔ میں آج صبح سے سفر کا سامان کر رہا تھا۔ خالو کو تار دے دیا ہے جب تک دوسرے گھر کا انتظام نہ ہو۔ اُن کے یہاں قیام ہوگا۔ (محسن سے) مہربانی کر کے ہم دونوں کا بقیہ سامان بھیج دیجئے گا۔ اگر چچی صاحب کی مرضی ہو۔ ورنہ اس سے بھی ہاتھ دھویا۔

**میر صاحب**: شیخ جی! یہ کیا قیامت ہو رہی ہے؟ آپ ڈیوڑھی میں جا کر صغریٰ کی اماں سے گفتگو کیجئے۔

**شیخ جی**: سنئے حضرت! یہ میرے بس کا کام نہیں ہے۔ میری ڈاڑھی کی جڑیں بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ دوسرے میں تو خود منظور کو مشورہ دیا کرتا تھا کہ الگ گھر میں رہیں مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ اس طرح آناً فاناً روانگی ہوگی۔ (اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے منظور سے) ذرا مجھے سہارا دو تو چل کر اپنی بچی کو رخصت کر دوں۔

(منظور سہارا دیکر اٹھاتا ہے)

**میر صاحب**: (آبدیدہ ہو کر) بیٹا منظور فی امان اللہ! شیخ جی! مجھ سے سعیدہ کو رخصت نہیں کیا جائے گا آپ میری طرف سے آیۃ الکرسی پڑھ کر اس کے بازو پر دم کر دیجئے گا۔ مرضی الٰہی میں کوئی چارہ نہیں۔

(شیخ جی منظور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہیں اور پیچھے پیچھے محسن)

پردہ

# تیسرا منظر

(ڈیوڑھی کے دروازے کے پاس ایک بے پردہ کی رتھ کھڑی
ہے اور اس کے پیچھے ایک چھکڑا ۔ خادمات اندر سے اسباب لاکر
نوکروں کو دے رہی ہیں ۔ جو چھکڑے پر بار کر رہے ہیں ۔ دروازے
کے قریب شیخ جی منظور کے کاندھے پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں ۔
اور ان کے قریب محسن ڈیوڑھی کے اندر سے رقیہ بیگم کی رو رو
کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی ہے )

**رقیہ کی آواز :** سعیدہ ! اب بھی ہوش میں آ جا ۔ اگر تجھے سادات کی آن ۔ کنبے کی آبرو کا خیال نہیں ہے تو اپنے چچا کی ضعیفی پر تو رحم کر ۔ ایسے کیا تیرے دل میں میری محبت ذرہ برابر بھی نہیں ہے ۔ خدا گواہ ہے میں نے تجھے ہمیشہ اپنی بیٹی سے بڑھ کر سمجھا ہے ۔ تیری تربیت اور دیکھ بھال میں اپنی جان ہلکان کر دی تیری انوکھی طبیعت سے کڑھ کڑھ کر جگر کا خون کر دیا ۔ کوئی لحظہ ایسا نہیں تھا جس میں مجھے تیری تندرستی کی فکر نہ ہو ۔ تیرے سودائی پن کا دھڑکا نہ ہو ۔ پانچ برس سے تیرے بیاہ کا ٹینٹا کر رہی ہوں ۔ اب خدا خدا کر کے ٹھکانا ہوا تھا کہ دنیا پلٹ گئی ۔ سادات کا ستارہ ڈوب گیا ۔ پشتینی ریاست اس خدائی خوار جھاجن کے ہاتھ میں چلی گئی ۔ اس مصیبت کے وقت میں تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ۔ میری زندگی کا سہارا چھوڑ کر جا رہی ہے ۔

**سعیدہ کی آواز :** چچی جان ! میں نے کبھی آپ کے سامنے زبان نہیں کھولی ہے ۔ مگر اس وقت جب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرا آپ کا ساتھ چھوٹ رہا ہے ۔ مجھ سے بے چند لفظ کہے نہیں رہا جاتا ۔ آپ یہ ہرگز نہ سمجھئے کہ آپ مجھ سے جس قدر محبت کرتی ہیں مجھے معلوم نہیں یا مجھ پر اس کا اثر نہیں ہوتا ۔ مگر اس بدنصیبی کا کیا علاج ہے ۔ کہ آپ کی محبت نے میری ڈھارس بندھانے کی جگہ میرا دل توڑ دیا ہے

مجھے خوش و خرم رکھنے کی جگہ زندگی سے بیزار کر دیا ہے آپکے گھر میں آئے ہوئے مجھے سات برس ہوئے۔ اس سے پہلے میری زندگی کے دس سال کمال نگر میں ابا جان کے ساتھ گزر چکے تھے۔ جب میں اُس دس سال کا مقابلہ ان سات برسوں سے کرتی ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی کو ہرے بھرے باغ کی ایک جھلک دکھا کے تپتے ہوئے بیابان میں چھوڑ دیا جائے۔ یہ سچ ہے کہ اماں جان کا سایہ بہت چھٹپن میں سر سے اٹھ گیا تھا مگر ابا جان۔ بھائی جان اور شیخ جی کی پیار بھری نظروں کی چھاؤں میں میرا بچپن قصے کہانی کی طرح گزر گیا۔ دسویں برس لقمہ ریزنے آنکھیں پھیر لیں۔ ابا جان اللہ کے پیارے ہوئے اور بھائی اور شیخ جی مجھے لے کر یہاں آئے۔ یہاں میں نے دوسری ہی دنیا دیکھی۔ بہلانے والی شفقت کی جگہ سہما دینے والی چاہ۔ ہنسانے والے پیار کے بجائے۔ رُلانے والی محبت کمال نگر والے گھر کے خوش نما چمن میں کھیلنے کی جگہ مجھے یہاں کالی کالی چار دیواری میں بند ہو کر بیٹھنا پڑا۔ میرے پڑھنے لکھنے کی آزادی پر قیدیں لگائیں گئیں۔ دوسری لڑکیوں تک سے ملنے کی ممانعت ہوئی۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے کتنے دن کس طرح کاٹے۔ اگر شیخ جی اور بھائی جان دل بہلانے والے نہ ہوتے تو میں ضرور گھٹ گھٹ کر مر جاتی۔ آج مجھے بھائی جان ہی مکان میں لے کر جا رہے ہیں۔ جہاں سے سات برس پہلے لائے تھے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ سے رخصت ہوتے وقت آپ کے سارے احسانوں کا جو آپ نے سچے دل سے احسان سمجھ کر کئے تھے بہت بہت شکریہ ادا کروں۔ چچی جان۔ مجھ سے جو خطائیں ہوئی ہوں ان سے درگذر کیجئے۔ اور مجھے ہنسی خوشی جانے کی اجازت دیجئے۔ اچھا آداب عرض ہے۔ صغرا بہن خدا حافظ

(پردہ الٹ کر نکل آتی ہے۔ نوکر منہ پھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں)

**صغرا** : (پکار کر) سعیدہ بہن۔ اللہ کو سونپا۔ خط ضرور لکھنا۔

(دفعتہً پردہ پھر ہٹتا ہے اور رقیہ بیگم برآمد ہوتی ہیں نوکر گھبرا کر چاہتے ہیں بھاگ جائیں مگر پھر کھڑے ہو جاتے ہیں)

**رقیہ بیگم** : لڑکی تو جاتی ہے تو میری ایک بات اور سنے جا۔ اس لڑائی میں تو جیتی میں ہاری مگر اس فتح پر بہت

ارزامت۔ اس وقت تجھے بڑی خوشی ہے کہ چچی کے پنجے سے نکل کر راج کروں گی۔ ملکہ بلقیس کی طرح دنیا بھر میں میری حکومت ہوگی خلق خدا میرے سامنے آنکھیں بچھائے گی۔ مگر یہ دھوکا بہت دن نہیں رہے گا۔ ایک اٹھوارے کے اندر اندر تجھے معلوم ہو جائے گا کہ خدا رسول کی نافرمانی۔ بزرگوں کی بے ادبی کنبے قبیلے سے سرکشی کرکے آدمی کی کیا گت بنتی ہے۔ اگر تجھ پر راہ میں انگلیاں نہ اٹھیں۔ دنیا تیرے نام پر تھڑی تھڑی نہ کرے۔ شریفوں کی بہو بیٹیاں سن کر کانوں پر ہاتھ نہ رکھیں۔ تو میرا نام رقیہ نہیں۔ اور اس بھروسے نہ رہنا کہ جب کہیں ٹھکانا نہ ہوگا تو پھر چچی کی گود میں آن بیٹھوں گی۔ آج سے میں نہ تیری چچی نہ تو میری بھتیجی۔ خدا نے چاہا تو جیتے جی تیری صورت نہ دیکھوں گی۔ جا بھگت اپنے کیے کی سزا۔

(اندر چلی جاتی ہے)

(اندر سے آواز آتی ہے)

چل صغرا یہاں کیا کھڑی ہے۔

(سعیدہ شیخ جی کے پاس آتی ہے۔ وہ کانپتے ہاتھوں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں)

**شیخ جی:** بیٹی! تیری چچی کی باتیں سخت ہیں بالکل سچ ہیں۔ جو کچھ انھوں نے کہا۔ اس سے بڑھ کر تجھے برداشت کرنا ہے مگر ایک بات سیدانی بی بھول گئیں کہ شجاعت کی بیٹی ہے۔

**سعیدہ:** شیخ جی! آپ نے یہ ایک لفظ جو میری ہمت بڑھانے کے لیے کہہ دیا ہے وہ سو تقریروں پر بھاری ہے۔ خدا آپ کو ہم بھائی بہنوں کے سر پر سلامت

**منظور:** شیخ جی۔ آپ جو وعدہ کیا کرتے تھے وہ نہ بھولیے گا جب آپ کو اتنی طاقت آجائے کہ سفر کر سکیں تو چل کر ہمارے ساتھ رہیئے گا اور ہمارے کام میں جو آپ کا اور والد مرحوم کا کام بھی ہے ہماری مدد کیجئے گا۔

**شیخ جی:** (ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے) ہاں مجھے ضرور طاقت آئے گی بیٹا! انسان کی ہوس کی کوئی انتہا نہیں۔ مگر عقل ہوس کو مغلوب کر سکتی ہے۔ میری زندگی کا مقصد آج سے پورا ہونا

شروع ہوتا ہے۔ تم بھائی بہن اپنی بیڑیاں توڑ کر آزاد ہو رہے ہو۔ اور مجھے دل سے یقین ہے کہ تم دونوں اپنی نئی زندگی میں خوش وخرم رہو گے کیونکہ خوشی نام ہے عقیدے اور عمل کا اور یہ چیزیں ملتی ہیں۔ تازی ہوا میں جہالت کی تاریکی اور حبس سے نکل کر بے شک تم دونوں سے جدائی خصوصاً سعیدہ سے چھوٹنا مجھ پر بہت شاق ہے مگر زندگی اور دنیا دوسرے کی ہیں۔ میری نہیں۔ میری عمر کی چند سانسیں باقی ہیں۔ ان میں مجھے شکر کرنے دو۔ اس نئی زندگی پر جو میرے لیے آ رہی ہے میرے عمل کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب میرے لیے صرف عقیدہ باقی ہے اسی میں تسکین ہے اور اسی میں نجات۔

(منظور سے) اچھا بیٹا اب تم سدھارو ریل کا وقت نزدیک ہے۔

(منظور شیخ جی سے بغل گیر ہو کر سعیدہ کو رتھ میں بٹھاتا ہے اور خود بھی محسن کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ گاڑیاں روانہ ہوتی ہیں)

"بسم اللہ مجریہا و مرسا ہا"

(گاڑی میں سعیدہ اور منظور سر نکالے شیخ جی کو دیکھتے جاتے ہیں جو اپنی لکڑی کے سہارے کھڑے ہیں۔ نوکر چاکر سب گاڑیوں کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔ شیخ جی اکیلے رہ جاتے ہیں پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

عصمت چغتائی

# کردار

برج نرائن

حامد علی

رُوپا : برج نرائن کی بیوی

عائشہ : حامد علی کی بیوی

سُورج : برج اور روپا کا لڑکا

خورشید : حامد اور عائشہ کا لڑکا

لکشمی : سُورج کی بیوی

منہارن

دو ٹیڑو سینیں

○

# پہلا منظر

(برج نرائن کا مکان۔ صحن اور برآمدے کا کچھ حصہ۔ صحن میں ایک کھڑکی ہے۔ جس میں سے حامد علی کے گھر کا کچھ حصہ نظر آتا ہے۔ معمولی ساز و سامان۔ دو چار کرسیاں اور سبزہ۔ دیوار کی کھڑکی کے پاس ایک چوکی بچھی ہے۔ جس کے قریب ہی زمین پر ایک چٹائی اور دو تین پیڑھیاں پڑی ہوئی ہیں۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو برج نرائن کا مکان خالی نظر آتا ہے۔ کھڑکی میں سے حامد علی نظر آتے ہیں۔ پلنگ پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ عائشہ ان کی بیوی پاس بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے۔ برآمدے کے پہلو والے دروازے سے برج نرائن کپڑے بدل کر گنگناتے ہوئے نکلتے ہیں)

**برج** : ارے بھئی کتنی دیر کردی۔ کیا آج بھوکا مارنے کا ارادہ ہے؟

**روپا** : (رسوئی سے) اے ہے کہاں دیر ہوئی۔ بس تم بیٹھو میں لاتی ہوں۔

**برج** : (کھڑکی کے قریب چوکی پر پالتی مار کر بیٹھ جاتے ہیں) نو بج چکے جی۔

**روپا** : (اندر سے تھالی لیے آتی ہے) کہیں بجے نہ ہوں۔ نو بجنے میں بیس منٹ ہیں۔ بیکار کو اندھیر مچا دیا کہ دیر ہوگئی۔ ذرا یہ کچوریاں تل رہی تھی۔

**برج** : اوہو ہو۔ تب تو بالکل دیر نہیں ہوئی (کھا کر) واہ

**حامد** : ارے بھابی اسے کچوریاں کھلا کر کاہے کو موٹا کیے دیتی ہو۔

**عائشہ** : تو بہ ہے رہنے دو۔

حامد : (جملہ پورا کرتا ہے) بے چارے کو ٹیبے ہی چلنا دوبھر ہے۔

روپا : ہے ہے بھیّا بڑے ہی ندیدے ہو۔

برج : (کھجوری سے منہ بھرا ہے) سچ کہتے ہو

روپا : (تھالی سے کھجوریاں اٹھا کر کھڑکی سے حامد کو دیتی ہے)

برج : (پریشان ہو کر) ہیں ہیں۔ یہ کیا کرتی ہو۔

روپا : تم کھاؤ میں اور لا دوں گی (حامد سے) لو بھیا مگر بھگوان کیلیے نظر نہ لگاؤ۔

عائشہ : (کھجوریاں لے کر دیتی ہے)

حامد : جیو بھابی! اللہ پاک تم کو سات بیٹے دے۔

روپا : (جھینپ کر) ہائے رام۔ کیا آدمی ہے

برج : کہتا تھا کر نہ دو۔ نیکی کر دریا میں ڈال (منہ بنا کر) ارے کوئی اچار وچار نہیں؟

روپا : کل ہی تازہ ڈالا ہے۔ ابھی اٹھا نہیں۔

عائشہ : (سن کر) کیا اچار چاہئے۔

(اچار نکالتی ہے)

روپا : اب رہنے بھی دو۔

برج : کاہے کو رہنے دو۔ تمہیں تو میسر کھانا برا لگتا ہے۔

عائشہ : (اچار دیتے ہوئے کھڑکی سے) جبھی تو کہتی ہوں میرے یہاں کھانا کھایا کیجیے۔

حامد : ابھی بس رہنے دو۔ کہتا ہوں بھابی سے دو چار کھانے پکانا سیکھ لو تو

روپا : (جلدی میں حمایت میں) یہ تو نہ کہو حامد بھیا۔ عائشہ تو ایسا لاجواب کھانا بناتی ہے کہ کیا کہنے۔

برج : مگر بندر کیا جانے ادرک کا مزہ۔

(ہنس پڑتے ہیں سب)

حامد : اماں کھا بھی چکو۔ یا آج دفتر چلنے کا ارادہ نہیں۔ ارے بھائی نکالو نا اسے گھر سے۔

(منہارن آتی ہے)

برج : (اور روپا) سلام میّا!

منہارن: جیو بٹیا! اے بہو!

روپا : کیا ہے میّا۔ اے بس لگیں کان کھانے کو۔ جاؤ جی یہاں کسی کو چوڑیاں نہیں پہننی۔

منہارن : (بغیر توجہ دیئے بیٹھ کر پوٹلی کھول لیتی ہے) اے بہو! وہ لاجواب دھانی انگیں لائی ہوں کہ کیا بتلائیے۔

روپا : (بغیر چوڑیاں دیکھے) مٹی ڈالواں موئی پاکوں پہ

منہارن : نہ بٹیا سہاگ کی چیز کو ایسا نہیں کہتے۔ یہ دیکھ ————

(مٹھی سے انگیں نکالتی ہے)

برج : اچھا جی ہٹو چلے۔

منہارن : (چونک پڑتی ہے تو ہاتھ سے ایک انگ گر کر ٹوٹ جاتی ہے) اے ہے ———— کہاں چلے بٹیا!

برج : کب سے ٹلی کھیلنے اور کہاں بھیں۔

روپا : (ہنس کر) دفتر جا رہے ہیں ہوا۔

منہارن : اے بٹیا! آج تو نہ جاتے تو اچھا تھا۔

برج : کیوں؟ کیا پھر جاؤ جلوا دیئے تم نے۔

منہارن : اے نوج میں خاک پڑی کا ہے کو جلواتی۔ اے وہ آپ ہی جل رہے ہیں۔ چھنتے میں آج صبیرے صبیر تیوہار ہوئے ہیں۔

حامد : (کھڑکی سے) کون۔ ڈیلی بجٹ میں؟

برج : ہاں کہتی ہیں آج نہ جاؤ۔ اسے بڑی بی یہ تو روز ہی ہوتا ہے۔ پر ہمیں اپنے کو تو سب جانتے پہچانتے ہیں۔

منہارن : پر بٹیا۔ جا تو چھری کسی کو نہیں پہچانتے۔

( برج۔ منہارن کے کہنے سے کچھ فکرمند ہو جاتا ہے )

حامد : اماں کیا آدمی ہو۔ چلتے ہو یا آج بی منہارن سے چوڑیاں پہننے کا ارادہ ہے۔

برج : ( جاتے ہوئے ) بڑی بی! تم تو کسی اخبار کے دفتر میں نوکری کر لو۔

منہارن : ( جانے کے بعد ) اے ہے میں اب کیا کروں گی نوکری۔

( سورج اور خورشید دونوں جھگڑتے ہوئے آتے ہیں )

( منہارن تبھی پوٹلی بجاتی ہے )

ہائیں ہائیں ——— ارے کیا بکتے ہیں ؟

سورج : ( اور خورشید ایک دوسرے کو گھونٹنے لگتے ہیں ) سور پاجی ——— گدھا۔

خورشید : نامعقول بھنگی !

روپا : ارے ارے ——— یہ کیا ؟ ——— ارے سورج ——— خورشید۔ نہیں مانو گے۔

عائشہ : ( ایک کھڑکی سے آتی ہے ) ہائیں ہائیں

( خورشید کو پکڑ کر کھینچتی ہے )

( عائشہ اور روپا دونوں بچوں میں بیچ بچاؤ کرتی ہیں۔ دونوں
اپنے اپنے بچوں کو مارتی اور گھسیٹتی ہیں )

روپا : اسے کیوں مارتی ہو۔ ملچھ تو یہ ہے ( مارتی ہے ) بول ——— اور لڑے گا ——— کیوں؟

عائشہ : نہیں وہ بیچارہ پچکا ہے۔ یہ ہے بدذات ——— کیوں ——— لے ——— لے
اور لڑے گا۔ آج میں اس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گی۔

روپا : ارے چھوڑ دو ( سورج کو مارنے سے رک کر خورشید کو چھڑاتی ہے ) اسے دیکھو چھوڑ دو ——— تمہیں
میری قسم عائشہ۔

عائشہ : نہیں نہیں۔ یہ روز کا جھگڑا فساد مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ آج تو لیں۔

روپا۔ خورشید کو چھڑا لیجاتی ہے۔ تو سورج اس کے ساتھ

سے چھوٹ جاتا ہے )

( عائشہ روپا کا ایک ہاتھ پکڑ کر خورشید کو دوسرے ہاتھ سے

لانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ چھوٹ جاتا ہے )

روپا۔ عائشہ کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ اب دونوں ایک دوسرے

کو ایسے پکڑ لیتی ہیں۔ جیسے وہ لڑ رہی ہیں۔ بچے دور کھڑے

تماشہ دیکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر حیرت سے

مسکراتے ہیں۔ یہ دونوں ایک دم سے رک کر ایک دوسرے

کا منہ حیرت سے دیکھتی ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ تو بچے ہنس پڑتے ہیں

یہ دونوں غصہ ہو کر بچوں کی طرف لپکتی ہیں۔ وہ کھڑکی سے کود

کر عائشہ کے گھر میں بھاگ جاتے ہیں۔ دونوں بری طرح ہنستی

ہیں اور ہانپتی ہوئی چوکی پر بیٹھ جاتی ہیں )

عائشہ : واہ جی اچھا جھگڑا چکایا۔

روپا : بعض بڑے خراب بچے ہیں۔ ( اس کشمکش میں دونوں کی چوڑیاں ٹوٹ گئی ہیں ) ہچ اے ہے۔ ساری چکنا چور ہو گئیں۔

منہارن : ( موقع سے فائدہ اٹھا کر ) یہ دھانی آئیں نئی آئی ہیں۔ بالکل۔

عائشہ : ( چوڑیوں سے متاثر ہو کر روپا کو دیکھتی ہے ) دو دو ڈال لو۔

روپا : تم بھی پہنو۔

عائشہ : میرے لیے لودہ لائے تھے۔ سو پڑی ہیں۔ وہی ڈال لوں گی۔

روپا : تم پہنو گی تو میں بھی پہن لوں گی۔ ورنہ سونے کی ڈال لوں گی۔

منہارن : یہ بی سہاگ تو کانچ کی چوڑی سے ہے۔ لو ادھر لاؤ ہاتھ۔

عائشہ : ( روپا کا ہاتھ بڑھا دیتی ہے )

منہارن : (رو پا کے ہاتھ پر خون دیکھ کر) لو خون نکل آیا۔ توبہ میری کیا فتنے ہیں۔ صبح صبح سہاگن کی چوڑی ٹوٹے یہ کوئی اچھا شگن ہے۔

عائشہ : (متاثر ہو کر سہم جاتی ہے) بڑے شیطان ہیں یہ بچے۔

منہارن : (چوڑیاں پہناتے ہوئے) اور بیٹی تم کام سے کم یا دو جی کو آج نہ جانے دو۔ پتہ ہے۔ شہر میں کیا ہو رہا ہے گلی گلی خون ہو رہے ہیں۔ جدھر دیکھو مار پیٹ۔ چلو میرے تو دو نگوڑے کھڑے ہوتے ہیں۔ ارمی بیٹی۔ تم گھر کی بیٹھنے والی کیا جانو۔ وہ بنو کا لونڈا تھا نا۔

روپا : آہاں ؟

عائشہ : وہی پچھلے رجب لڑکے کا عقیقہ کیا تھا نا۔

منہارن : وہی نگوڑا۔

عائشہ : تو

منہارن : بھول گلی سے گذر رہا تھا۔ دھر لیا۔

روپا : ہائے ہائے رام رے ——— !

(رہتی ہے تو چوڑی ٹوٹ جاتی ہے)

منہارن : اے جنے ہو ہو مت۔ اور للو کے تو تینوں ختم ہو گئے۔

عائشہ : ایں ؟

منہارن : وہ تو چوک میں مسلمانوں نے کاٹ کے ڈال دئیے۔ اور ایک تو منجھلا والا ہوتا تھا وہ ہسپتال کے پاس جو آگ لگائی تھی۔ اس میں پکڑا گیا۔

عائشہ : ہائے خدا میرا تو کلیجہ نکلا پڑتا ہے۔ سنا ہے کلو کے دونوں بچے مدرسے سے آ رہے تھے تو راستے میں

روپا : اے ہے مر گئے ؟

منہارن : ایک تو بچ گیا۔ پر وہ بھی خاک بچا۔ ٹانگ سدا کو بیکار ہو گئی۔ دائیں آنکھ جاتی رہی۔

روپا : ہے بھگوان۔

(چوڑی ٹوٹتی ہے)

**منہارن:** اری بیٹی ہلے نومت جا۔ چہ چہ ——————

**عائشہ:** یا خدا یہ جھگڑا اکب بند ہوگا۔ اللہ پاک اب تو جی گھبرا گیا (منہارن سے) پر بوا اللہ کا شکر ہے ہمارے محلہ میں تو امن ہے۔

**منہارن:** آگ ہی تو ہے پھیلتے پھیلتے پھیلے گی۔

**روپا:** بھگوان نہ کرے۔

**عائشہ:** اس محلہ میں بھی تو ہندو مسلمان ہیں۔ پر دیکھو جھگڑا نہیں ہوتا بھئی یہ مسلمان بڑے غصیل ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات ہوئی اور جا تو لے دوڑے۔

**روپا:** ہنہ۔ تو یہ ہندو کون سے کم ہوتے ہیں۔

**منہارن:** اے بیٹی یہ تو ہندو ہیں نہ مسلمان۔

(منہارن کا چہرہ وحشت زدہ ہو جاتا ہے)

**عائشہ:** (کچھ نہ سمجھ کر) ایں؟

**منہارن:** (خوفزدہ ہو کر چاروں طرف دیکھتی ہے) یہ ——— یہ تو ———

**روپا:** (اس کا بازو چھو کر) میاّ!

**منہارن:** (بڑے رازداری کے انداز میں) یہ تو بھوت ہیں۔

(روپا اور عائشہ ایک دم سہم جاتی ہیں)

**منہارن:** (جس کے چہرے پر عجیب پر اسرار وحشت طاری ہے) ہاں سچ کہتی ہوں میرے گرو جی نے مجھ سے کہا یہ بھوت ہیں۔ آسیب جبھی تو انسانوں کو مارتے ہیں۔

**عائشہ:** پر کیوں؟

**منہارن:** اس لیے کہ یہ شیطان کے چیلے ہیں۔ اور ایک دن یہ ایک دن یہ سب انسانوں کو مار ڈالیں گے۔ اور پھر انہیں کا راج ہوگا۔

( دونوں عورتیں بُری طرح سہم جاتی ہیں )

روپا : ہائے رام! منہارن ماں. بھگوان کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔

عائشہ : (ذرا جھنجھلا کر) اخترؔ ہٹو۔ یہ تو سدا ایسی ہی باتیں اڑاتی ہیں۔ ان کے پیر جی نہ جانیں کیا کہہ دیتے ہیں کریں۔

روپا : یہ سچ تو کہتی ہیں، کون دھرم اس خون خچر کو کہتا ہے جو دھرم کا نام لے کر ـــــــــ اری تیا دہی تازیوں کا جھگڑا ہے نا۔

منہارن : ہاں

عائشہ : خاک پڑے اب تو جیتی ہوئی محرم ہی ختم ہو گیا۔

روپا : ارے محرم کا بہانہ ہے اور ہولی پر جو لٹھ چلے تھے۔ اور پھر پچھلے سال جو چوک میں چاقو چلے تھے۔ کاہے پر چلے تھے منہارن ماں !

منہارن : بھول گئی بٹیا. ارے ہاں نہیں تو ــــ آئے دن کی بات ہے. کسے یاد رہے۔

روپا : ہا! کیسی بری بات ہے،

( تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ روپا جیسے دور جنگل میں کچھ سنتی ہے۔ آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی ہے ـــــــ ارو مارو ـــــــ لینا ـــــ لینا ـــــــ آواز میں دہشت ناک گونج ہے۔ اور ساتھ ساتھ ایسی آوازیں بھی آتی ہیں۔ جیسے کوئی کسی کو قتل کر رہا ہو ـــــــ

ایں؟ عائشہ؟

عائشہ : (بالکل بے خبر ہے) کیا؟

روپا : وہ ـــــــ وہ لوگ آج نہ جانے تو اچھا تھا۔

عائشہ : (اس کے خوف سے خود بھی ڈر جاتی ہے) ہیں؟ نہیں بہن اللہ اپنا رحم کرے گا۔

**منہارن:** (چوڑیاں پہنا کر) لو ـــــ بیٹی۔

**روپا:** سلام میا۔

**منہارن:** جگ جگ جیو ـــــــ بڈھ سہاگن ہو

**عائشہ:** (اپنی طرف جانے کو اٹھتی ہے) ابھی لاتی ہوں دام۔

(جانے کے لیے مڑتی ہے۔ تو کانوں میں وہی وحشت ناک آواز

کپڑو ـــ مارو ــــــ مارو" یہ اس کا تخیل ہے جو سحور

ہو ہو کر اسے یہ آواز سنا رہا ہے۔ چونک کر رک جاتی ہے وحشت

چہرہ پر چھا جاتی ہے۔ خوفزدہ ہو کر منہارن کی طرف مڑتی ہے

تو آواز ایک دم بند ہو جاتی ہے۔ پریشان ہو کر اسے فضا میں

ڈھونڈتی ہے۔ روپا اور منہارن اسے حیرت سے دیکھتی ہیں۔

کیونکہ وہ کچھ نہیں سنتیں (اطمینان کا سانس لے کر) اسے ہے تو بہ

کان بجنے لگتے ہیں۔ کھڑکی سے جاتی ہے)

**روپا:** (پھر وہی غل دور سے اٹھتا ہے۔ روپا سمجھتی ہے یہ اس کا واہمہ ہے۔ مگر منہارن کے وحشت زدہ چہرہ کو دیکھ کر چیخ پڑتی ہے) یہ کیا ہے (کھڑی ہو کر) ارے یہ کیا ہے (آواز بجائے رکنے کے اور بڑھتی ہے

لوگو ـــ ارے عائشہ

(غل بہت زور سے بلند ہوتا ہے۔ اسٹیج پر اندھیرا رینگنا شروع

ہوتا ہے۔ ایک دم سے سامنے کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک

لڑکا گرتا پڑتا داخل ہوتا ہے)

**لڑکا:** قتل ـــــ قتل کر ڈالا ـــــــ کچہری روڈ پہ ـــــــ

**پڑوسن:** (ایک طرف سے بھاگتی آتی ہے) کسے؟

**لڑکا:** سب کو ـــــ سب پانچ آدمی۔ تمام لاشیں ہی لاشیں وہ لا رہے ہیں۔ (بدحواس اور

پاگل سا ہو جاتا ہے) گاڑی میں دھر کر لا رہے ہیں، دونوں کو ——

(کچھ ڈر کر روپا کی طرف دیکھتا ہے)

روپا : (کلیجہ تھام کر کراہنے لگتی ہے) کچھ صاف سمجھ میں نہیں آتا۔

پہلی عورت : (ادھر سے بھاگتی آتی ہے) ہائے رے غضب ہو گیا۔ اری ماں ری —— ای ہی

(گرتے گرتے کھمبے سے رک جاتی ہے)

دوسری عورت : (باندے سے داخل ہوتی ہے) اری کیا سچ مچ —— —— برج نرائن بابو اور

حامد میاں ——

(سہم کر عائشہ کو دیکھتی ہے۔ جو پاگلوں کی طرح کھڑکی میں کھڑی

ہے۔ کہنی سے ٹھوکا مار کر دوسری کو دکھاتی ہے)

لڑکا : (ایسے کھڑا ہے گویا اس نے کچھ شرارت کی ہے)

دوسری عورت : کیوں رے چھوکرے تو نے دیکھا برج نرائن

لڑکا : (جلدی سے) ہاں قرآن قسم اپنی آنکھوں سے کچہری روڈ پر چھپر جل رہے تھے۔ ادھر سے ہندو تھے۔

ادھر سے مسلمان آ گئے۔ برج نرائن بابو کے بہ لگا کر پتھر (سر پر تھپڑ مار کر بتاتا ہے) وہ دھائیں سے

گرے۔ حامد میاں انھیں اٹھانے کو جھکے تو یہ دیا ایک نے پیچھے سے چاقو۔ کمر پر زندا اور

(ہاتھ سے بتاتا ہے۔ سارا یاں سے یاں تک کاٹ کر رکھ دیا۔

عائشہ کو لاش کی طرح چپ چاپ کھڑا دیکھ کر ڈر جاتا ہے اور

بھاگنے کو دروازے کی طرف مڑتا ہے۔)

قرآن قسم —— لاری میں لا رہے ہیں۔

عورت : (روپا کو کرب کی حالت میں دیکھ کر) روپا بہن —— اے روپا بہن (اسے بے ہوش پا کر عائشہ کی

طرف مڑتی ہے) عائشہ آپا! (اس کی صورت دیکھ کر ڈر جاتی ہے —— اس کے پاس جاتی ہے) عائشہ آپا!

(اسے چھوتی ہے تو اس کا سر ڈھلک کر آگے سینے پر گرتا ہے

( چیخ مار کر وہ ڈھیر ہو جاتی ہے۔ اندھیرا بڑھ کر پوری اسٹیج کو ڈھک
لیتا ہے )

# ایک جھلک

( سسکیوں اور آہوں کی جلی گھٹی آوازیں ——— اسٹیج پر گھپ
اندھیرا ہے۔ ایک باریک سی روشنی کی لکیر ایک ہاتھ پر پڑتی ہے۔ جس میں
"دھانی بانکیں" جگمگا رہی ہیں۔ ایک پتھر ایک بوڑھے سے گھڑ دولے ہاتھ میں
ہے۔ وہ "دھانی بانکوں" پر پڑتا ہے۔ کھڑکی کا پٹ کھلتا ہے اور عائشہ کا
ستا ہوا سفید چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ "دھانی بانکیں" ٹوٹتی دیکھ کر وہ بھی اپنا ہاتھ
پاس گرا دیتی ہے۔ اور پتھر دونوں ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دیتا ہے۔ اسٹیج
پر بالکل اندھیرا چھا جاتا ہے )

○

# دوسرا منظر

## دس برس بعد

وہی گھر ہے۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ چند پرانی چیزوں کی جگہ نئی چیزیں آگئی ہیں۔ وہی چوکی کھڑکی سے ذرا ہٹا کر بچھائی ہوئی ہے۔ پاس دو چار کرسیاں پڑی ہیں۔ کیلنڈر سے پتہ چلتا ہے کہ بجائے ۱۹۳۷ء کے اب ۱۹۴۷ء ہے۔

پردہ اٹھتا ہے تو روپا چوکی پر بیٹھی کھانستی نظر آتی ہے۔ اس کی بہو لکشمی پاس مونڈھے پر بیٹھی اس کی سوئیٹر بن رہی ہے۔

روپا : (جو قبل از وقت بوڑھی ہو گئی ہے) بہو!

لکشمی : جی!

روپا : سورج کو مل کے پیسے دیدیئے؟

لکشمی : دیدیئے۔

(عائشہ کے گھر کا دروازہ کھلتا ہے روپا کی اس طرف پیٹھ ہے۔ خورشید نظر آتا ہے۔ وہ اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہتا ہے اور خود روپا کی طرف بڑھتا ہے۔ لکشمی ہنسی روکتی ہے)

روپا : اپنی دھن میں اور اچھی طرح سمجھا بھی دیا ہے۔ یہ نہیں کہ کچھ اور اٹھا لائے

(خورشید اس کے کندھے پکڑ زور سے "ہو" کرتا ہے)

(زور سے اچھل پڑتی ہے) اے ہے۔

(لکشمی زور سے قہقہہ لگاتی ہے)

خورشید : بڑی ڈرپوک ہو ماسی ! (اس کے کندھوں پر پیار سے لد جاتا ہے) میرا بس چلے تو جانتی ہو کیا کردوں ؟

روپا : ارے ہٹ میرے کندھے ٹوٹے۔

خورشید تمہارے ہاتھ میں بندوق دیدوں اور کہوں ہاں چلو میرے شیر !

روپا : (حیرت سے) اسے کہاں چلو۔

خورشید : فیر کرو۔ مارو دشمن کو !

روپا : چل ہٹ یہاں سے۔ میرا کون ہے دشمن۔

خورشید : میں ——— میں ہوں نا !

(اس کے گلے میں جھول جاتا ہے)

روپا : (خوشی سے مسکراتی ہے۔ مگر بن کر ڈانٹتی ہے) ارے ہٹ نابدذات۔

(عائشہ ایک چھوٹا سا کتا لیے آتی ہے)

روپا : ارے منع کرونا اس کو دیکھتی ہو عائشہ۔

(سورج تولیے سے ہاتھ پونچھتا آکر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

عائشہ : ہنہ ! میں کیا دیکھوں۔ تمہیں نے لاڈ میں سر چڑھایا ہے۔ اب بھگتو۔ یہ ٹھیک ہے۔

خورشید : (کتا دیکھ کر) ارے یہ کس کا کتا ہے اماں !

عائشہ : سورج کے پتے کا۔

(لکشمی ذرا جھینپتی ہے)

خورشید : (نہ سمجھ کر) ارے اتنا سا ؟ کیوں بے سورج کے بچے تیرا اتنا سا کتا۔

سورج : (شرما کر ہنستا ہے) ہیں ہیں

(لکشمی اٹھ کر بھاگتی ہے)

خورشید : (گھبرا گھبرا کر سب کو دیکھتا ہے۔ پھر سمجھ جاتا ہے) اچھا تو یہ ٹھاٹ ہیں (زور سے سورج کی پیٹھ پر ہاتھ مارتا ہے) بھئی واہ ——— کمال کردیا۔

روپا : والیسے اس مسٹنڈے کی بھی شادی کرونا ۔ بہت آزاد گھوم لیا۔

خورشید : (روپا سے) ارے تم ہی کرا دُنا ۔ اپنے نالائق بیٹے کی تو جھٹ سے کرالائیں۔

روپا : ارے اس کی بھی تو ہیرالال کے یہاں تیری ماں نے ہی لگائی تھی ۔

(پڑوسن سوپ میں دال لاتی ہے)

روپا : (دیکھ کر) بہو لے بہو! یہ چنے کی دال رکھ دے ۔ اے چندا بہن! اس کی اپنے خورشید کی کہیں بات چیت پکی کرونا ۔ تم نے مرزاجی کی لڑکیوں کا ذکر کیا تھا ۔ جاؤ نا ایک دن ۔

پڑوسن : (ناک چڑھا کر) آ بھوجی میرے کوئی دیوانے کتے نے کاٹا ہے جو مسلمانوں کے محلہ میں جاؤں۔ رام رام کیا اندھیر ہو رہا ہے ۔

خورشید : اُسے تمہیں کون چھیڑے گا ۔ تم تو خود شہر کوتوال ہو۔

سورج : اور کیا کم از کم ہمارے محلہ میں تو انھیں کا راج ہے ۔

منہارن : (ایک دم داخل ہوتا ہے ۔ وہی آن بان) اسے کیسا راج قسم سے راج پلٹ تو نہ جانے کہاں بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ اب تو بس بم راج ہی کا راج ہے ۔ (فوراً لہجہ بدل کر) اسے لو بہو کہاں ہے۔ کیا دھانی بانکیں لائی ہوں کر لیں۔

(دھانی بانکیں" کے نام سے روپا کے ہاتھ لرزنے لگتے ہیں اور عائشہ کے چہرے پر وہی پاگلوں جیسی وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ دونوں سناٹے میں دیکھتی ہیں ۔ خورشید سورج کو اُن کی حالت کی طرف متوجہ کرتا ہے)

لکشمی : (آتی ہے۔ سب کو خاموش دیکھ کر) کیا بات ہے۔ خالہ جی ؟

روپا : (ٹالنے کو) آ ـــــ کچھ نہیں ـــ جاؤ بھی کسی کو چوڑیاں نہیں پہننا ۔

پڑوسن : موئی سونے کے مول ۔

منہارن : سہاگ کی چیز ہے ۔ سونے کے مول بھی سستی ۔

(دھانی بانکیں دکھاتی ہے)

**لکشمی:** اوہ۔ بانکیں تو کسی کرم کی نہیں۔ دم بھر میں ٹوٹ جاتی ہیں۔

**روپا:** (کانپ کر) بھگوان نہ کرے۔ (بہو کو ڈانٹتی ہے) بہو چپ نہیں رہتی۔

**لکشمی:** کیا ہوا ——— میں نے تو کہا ———

**عائشہ:** (خورشید کی طرح لرزتی ہے) چپ، بہو۔ اُن کا دل کمزور ہے۔

(اپنے دل کو آہستہ سے ملتی ہے۔ کمزور ہے ——— یاد آجاتی ہے تو ——— تو کلیجہ پر جیسے چھریاں چل جاتی ہیں۔)

**روپا:** (حالت خراب ہو جاتی ہے) آہ ——— آہ ———!

**خورشید:** اماں ——— خمیرہ کھلا دو۔

**عائشہ:** (مُردہ دلی سے) کھلا دو ——— طاق میں رکھا ہے۔

(خورشید اپنے گھر بھاگتا ہے)

**سورج:** اماں ——— اماں جی!

**روپا:** آہ ——— آہ ——— سورج ——— آج نہ جانا ——— آج تو نہ جا ———

**سورج:** مگر ———

**روپا:** (تندی سے) نہیں ——— ہرگز نہیں۔ میں نہیں سنوں گی ——— میرا کلیجہ کٹا جا رہا ہے۔

(لکشمی اشارہ کرتی ہے)

**سورج:** اچھا ——— نہ جاؤں گا۔

(مگر روپا کی گھبراہٹ اور بڑھتی ہے)

(خورشید خیرہ ڈالتا ہے۔ باورچی خانہ کی طرف بھاگتا ہے۔ دروازے
پر رُک کر جوتا اُتار کر اندر جاتا ہے اور چمچہ لیے نکلتا ہے)
روپا کو دوا کھلائی جاتی ہے۔ عائشہ نہ جانے کس عالم میں
بیٹھی ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں)

**لکشمی**: (اسے دیکھ کر) خالہ جی تم بھی ایک چمچہ کھالو۔

**عائشہ**: (پیار سے دیکھتی ہے۔ پھر سر ہلاتی ہے) صبح کھائی تھی۔

**منہارن**: اے میا کیسی ان دواؤں سے کچھ نہ ہوئے ہے۔ ان دکھیاریوں کے دل کی کون دوا۔ جب سے کٹی
ہوئی لاش دیکھی ہی۔ جیا تو لوٹ گیا۔

**لکشمی**: اسے چپ رہو منہارن ماں ———— تم تو اور بھی

**منہارن**: (بگڑ کر) اے ماں ری بہو۔ بڑوں کو ایسے بولتے لاج ہی نہیں آتی۔

**لکشمی**: تو پھر؟

**روپا**: (سنبھل جاتی ہے) چپ رہو۔

**سورج**: لیٹی رہو۔ اماں۔

**روپا**: نہیں۔ اب جی اچھا ہے۔

(مسکرا کر عائشہ کو دیکھتی ہے۔ وہ بھی مسکرا دیتی ہے۔ مطلع
صاف ہو جاتا ہے)

**سورج**: (بچوں کی طرح مچلتا ہے) اے بھئی خالہ جی ایک دن چھپا یاترا چلیں۔

**خورشید**: ہاں بھئی ———— ماسی ایسی کچوریاں بنوانا کسی سے۔

**لکشمی**: ہٹو۔ میں تو نہ بناؤں گی۔

(خورشید برا مان کر سورج کی طرف دیکھتا ہے)

**سورج**: بنائے گی کیسے نہیں۔

**لکشمی**: بناؤں گی تو پران کو نہ دوں گی۔

(خورشید مظلوم صورت بنا کر دوپا کو دیکھتا ہے)

**روپا**: (پیار سے سرہلاتی ہے) ارے واہ کیسے نہیں دے گی۔ وہی تو یہ شوق سے کھاتا ہے۔

**لکشمی**: کھانے کا شوق ہے تو بیاہ کر کے لائیں۔ بہو بنائے گی۔

**خورشید**: ارے تو کیا کسی سڑک پر سے پکڑ لاؤں کہ چین بنا کچوریاں۔ بڑھاپا ہی سا آئیں گیا جب تو۔

**عائشہ**: چپ رہ لڑکے۔

**لکشمی**: کاہے کو چپ رہے۔ سچ ہی تو کہا۔ ابھی ہمارا تو جی گھبراتا ہے۔ کیجئے نا ان کا بیاہ۔

**خورشید**: اسے بیاہ دیا تو کریں گے۔ ہم تو یوں ہی جائیں گے نا چھٹے۔ چلو جی سورج۔

**سورج**: (چپکے کو بیا ہر تا ہے) لکشمی سے پانی دینا۔

**خورشید**: کیسی ہو۔ ڈیڑھ گھنٹے گھونگھٹ نکال دیتا ہے۔ کیسی بے شرم ہو ہے۔ گھونگھٹ بھی نہیں کاڑھتی۔

**لکشمی**: ہونہہ — کیا کاڑھوں۔

**خورشید**: جیٹھ ہوں میں — کیوں ہاں؟ میں سورج سے بڑا ہوں نا؟ پورا ڈیڑھ مہینہ۔

**لکشمی**: تب ہی تو نہیں کاڑھتے ہو۔

(روپا دوپٹہ سر سے اتار دیتی ہے)

**خورشید**: اچھا آنے دو میری بیوی کو۔ وہ تمہاری ٹھکائی کرے گی۔ ہاں ہیں۔

**لکشمی**: جی ہاں۔ کہیں ہم دونوں مل کر ہی آپ کی مرمت نہ کر دیں کہ مزا آ جائے۔

(خورشید سورج کی طرف شکایتاً دیکھتا ہے)

**سورج**: (اشارہ سے کہتا ہے۔ مجبوری ہے) پر تم دونوں کی لڑائی تو ضرور ہوگی۔

**لکشمی**: واہ کیوں ہوگی لڑائی۔ جی رہنے دیجئے۔ ہم لوگ نہیں لڑا کرتے۔

**خورشید**: (سورج سے) یار بڑی تیز زبان ہو گئی ہے اس کی۔ ذرا سی کتر ڈالو نا۔

**عائشہ**: ٹھیک تو کہتی ہے بہو۔ یہ مرد ہی ہیں جن میں آئے دن سر پھٹول ہوتی رہتی ہے۔

**خورشید:** (لاجواب ہو کر) لو بھیا جواب حملہ شروع ہو گیا۔

(دونوں جھونے لگتے ہیں)

**منہارن:** (ڈھنڈنے ڈھنتے) ویسے نہیں کہتی بیٹا۔ یہ آج کل ہسپتال کے ڈاکٹر پر تین خون ہوئے ہیں۔ ملٹری ڈیوٹی کھڑی ہے

**پڑوسن:** ارے لڑکے تو کیا جھوٹ ہے۔ گلی گلی چھریاں چل رہی ہیں کہ نہیں؟

(روپا سہم کر عائشہ کو دیکھتی ہے)

**سورج:** (کنگھی سے ہانسے کر) ارے کیا کہیں۔ رتی ہو چند اماسی۔ منہارن کی دیکھا دیکھی مجھ میں بھی شوق چرایا۔

**منہارن:** ارے جا جا۔ کل کا لونڈا

**عائشہ:** سچ ہے منہارن بی تم تو بہت بے پر کی اڑایا کرتی ہو۔ اس دن سٹر پٹر کرتی آئیں۔ اسے کہنے لگیں کہ وہ گھسیٹا ہے نا اس کے جڑواں لونڈے ہوئے ہیں۔

**خورشید:** (منہارن کے پاس اکڑوں بیٹھ کر) گھسیٹا کے؟

**منہارن:** ارے ہٹ ادھر۔ اس کی جورو کے۔ ارے تو کیا میں نے جی سے کہہ دیا مجھ سے تو نتھو کی بہو نے کہا تھا کہ اس کی خالہ گئی تھی تو ——

**سورج:** تو اس کی نانی نے بتایا تھا کہ اس کی چچا نے فرمایا تھا کہ اس کی پھوپھیا۔

(سب زور سے ہنستے ہیں)

**منہارن:** (کھسیا کر) اے میں تو میں جاؤں۔ نہ چوڑیاں پہنو نہ کچھ۔ بے ناک کو میری کھوٹی کریں۔

**روپا:** تم سے کہہ دیا تھا میا کہ چوڑیاں نہیں چاہئیں۔ پر تم

**عائشہ:** ہاتیں بنانے کو بیٹھ گئیں۔

**منہارن:** اچھا بابا —— جاویں ہیں بس۔

(گٹھری باندھنے لگتی ہے)

**خورشید:** لے بوا۔ بگڑو مت (ہاتھ بڑھا کر) لو تم مجھے چوڑیاں پہنا دو۔

**منہارن:** (سب کے کھل کھلا کر ہنسنے سے جل کر زور سے خورشید کا ہاتھ جھٹک دیتی ہے) اے چل چاں سے اٹھا

سیانا بنے ہے۔ ہم سے مذاق کرے ہے۔

**لکشمی** : (سورج کے ہاتھ سے گلاس لے کر دو بوند پانی خورشید کے سر پر ڈال دیتی ہے) مارو منہ۔ ان مال نہیں۔

**خورشید** : (ادھر ادھر کرکے کھڑا ہوجاتا ہے۔ لکشمی کو ہنستا دیکھ کر) اچھا (سورج کا کندھا پکڑ کر ہلاتا ہے) دیکھ بے سورج۔ یہ تیری بیوی۔

**سورج** : تو میں کیا کروں۔ ہٹ۔

**خورشید** : (آستین چڑھا کر) اچھا ـــ ـــ ٹھہرو ذرا بہو بیگم۔

(لکشمی بھاگتی ہے)

**روپا** : ارے نا !

**عائشہ** : بہو ـــ بہو ! ارے او خورشید۔ اٹھ سیدھی چوٹ آجائے گی۔

**خورشید** : (گھیر کر لکشمی کو پکڑ لیتا ہے) اب بولو۔ تم رہنے دو۔ اماں آج میں اسے ٹھیک کروں گا۔ اب بتا۔

**روپا** : (چھوٹتی ہی ہے) بس رے ـــ چھوڑ ـــــــ۔

(خورشید ہاتھ پکڑتا ہے تو چوڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں)

**روپا** : (ایک دبی ہوئی چیخ مارتی ہے) آہ !

(خورشید سہم کر چھوڑ دیتا ہے)

(سورج۔ خوفزدہ ہو کر روپا پر دورہ پڑتا دیکھتا ہے)

(روپا لڑکھڑاتی کھڑی ہوجاتی ہے۔ دو قدم بڑھتی ہے)

(عائشہ پتھر کے بت کی طرح بیٹھی رہتی ہے)

(خورشید پریشان اور نادم سا ہوکر جھک کر زمین سے ٹوٹی چوڑی اٹھاتا ہے)

**روپا** : (زور سے چیختی ہے) نہ چھونا ـــــــ یہ ـــــــ یہ ـــــــ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں۔ (زور سے خورشید کو ایک طرف ہٹاتی ہے۔ اور سورج کو دوسری طرف دھکیلتی ہے۔ بہو کو اپنے سینے سے لگالیتی ہے۔ پھر سہم کر چوڑیوں کو دیکھتی ہے) یہ ـــــــ یہ ـــــــ

منہارن: توبہ ہے ۔ ۔ جیسے جیسے سہاگن کی چوڑی ٹوٹے یہ کوئی اچھا شگن ہے ۔

روپا : (ایک کلیجہ پھٹن سا پڑتا ہے ۔ تلملا اٹھتی ہے ۔ گلا پھاڑ کر چلاتی ہے) دور ہو ——— یہاں سے ڈائن کہیں کی ——— نہ جانے کہاں سے آن مرتی ہے ۔

(ایک دم سے دل پکڑ کر گرنے لگتی ہے

(سورج اسے سنبھال کر لٹا دیتا ہے )

منہارن : (نرم پڑ کر) اے لو جی میں نے کیا کیا ۔

پڑوسن : منہ بناتی ہے ۔

(منہارن اس سے بتاتی ہے کہ دماغ خراب ہو گیا ہے )

پڑوسن : اور کیا ۔ جب سے برج بابو کی کٹی ہوئی لاش دیکھی ہے ۔ بس جی ان کے دورے پڑنے لگے ۔

منہارن : چہ چہ ——— آگ لگے میری زبان ———

سورج : (خورشید سے) اب بتاؤ ۔ کیا کروں ۔ ان لوگوں کی تو روز ہی یہ حالت ہوتی ہے اور آج کل میرے یہاں تو بہت کام ہے چھٹی بھی نہیں ملے گی ۔ تم نہ جانے آج ۔

خورشید : (اسر ہلا کر) دھنک ۔ میں تو بھی عارضی ہوں ۔ جھٹ نکال دیا جاؤں گا ۔

روپا : (ہوش میں آجاتی ہے ۔ اور سنتی ہے) اسے تم میری فکر نہ کرو بیٹا ۔ میں تو ——— میں تو دیوانی ہو گئی ہوں ۔ (منہارن سے) منہارن میا ۔ برا تو نہیں لگا ۔ منہ سے بات نکل گئی نگوڑا جی بھی تو ٹھکانے نہیں ہے ۔

لکشمی : آپ لوگ جاییے پر جلدی آنے کی کوشش کیجئے گا ۔

سورج : ہا ——— ہاں ——— کرفیو سے پہلے ہی آجاؤں گا میں ۔ اکو ٹھے ۔

لکشمی : (کرسی پر سے کوٹ اٹھا کر دیتے ہوئے ۔ چپکے سے پیار سے کہتی ہے) جلدی آئیے گا ۔

سورج : (مذاق میں) نہیں ! ہم آج بالکل نہیں آئیں گے ۔

لکشمی : بھگوان نہ کرے ——— آپ کو میری کسم ۔

(آنکھوں میں آنسو لانے کی دھمکی دیتی ہے)

سورج : (پیار سے) اچھا ـــــ بس کام ختم کر کے فوراً تمہارے پاس ـــــ

(لکشمی مسکرا کر منہ بناتی ہے)

خورشید : (جو دونوں کی باتیں سن رہا ہے) چل بے سورج کے بچے۔

(لکشمی دانت کچکچا کر رہ جاتی ہے)

منہارن : آہو چوڑیاں بہن لے ۔ یہ دھانی بانکیں۔ نہیں تو لے یہ گلابی اچھا۔

پڑوسن : اے منہارن وہ پہناؤ ـــــ ربڑ کی چوڑیاں ـــــ ربڑ کی چوڑیاں ـــــ کبھی نہیں ٹوٹتیں۔

منہارن : ارے بہنیا سہاگن کی چوڑی کبھی نہیں ٹوٹتی۔ پر جب ٹوٹتی ہے تو لوہے کی بھی ٹوٹ جاوے ہے لا بیٹی تیرے پہلے سیدھا۔ بسم اللہ

(لکشمی کو چوڑیاں پہنانے لگتی ہے)

روپا : (منہارن کی فلاسفی سے سہم کر) عائشہ! آج لڑکے نہ جاتے تو اچھا تھا۔

لکشمی : (ہر ایک کرم پڑتی ہے تو چوڑی ٹوٹ جاتی ہے) اوہ!

عائشہ : نہیں بہن اللہ روز کی طرح اپنی رحمت کے صدقے میں انھیں صحیح سلامت پہنچائے گا۔

منہارن : (لکشمی سے) اے ہو سیدھی بیٹھ۔

روپا : ہائے بھگوان پر میرا دل کیوں بیٹھا جاتا ہے۔

عائشہ : کچھ نہیں ذرا لیٹ رہو۔ اس پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ کن مصیبتوں سے پالا ہے۔ اب اللہ نے چین دیا ہے تو کیا پھر وہ چھین لے گا۔

لکشمی : (کانپتی ہے تو پھر چوڑی ٹوٹتی ہے) رہنے دو میا۔ میں نہیں پہنتی۔ نہ جانے کیا ہو رہا ہے۔

منہارن : اے واہ واہ رسنو۔ اتنی ڈھیر سی میری چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ اور اب ـــــ واہ

عائشہ : اے تو لو یہ دام سے لو۔

اٹھنی نکال کر پھینکتی ہے )

منہارن: (پیچھے سے اٹھنی اٹھا کر) پرائی بہو کے ہاتھ ننگے تو نہ چھوڑ کر جاؤں گی۔ بدشگونی ہوگی۔

(پھر پہنانے لگتی ہے)

دیپا: (عائشہ سے) کیا سچ مچ دو خون ہوئے؟

پڑوسن: اور نہیں تو کیا جھوٹ موٹ۔ ائے تم دو کا من کے مول رہی ہو۔ موٹر کے اڈے پر تو بم کے اینٹ پتھر چلے پولیس آئی گولی چلی۔ کون جانے کتنے ڈھیر ہوئے۔

دوسری عورت: ا ــــ چہ ــــ ہندو تھے کہ مسلمان۔

پہلی عورت: ہندو ہی ہوں گے بیچارے پولیس بھی تاک تاک کے بس ہندوؤں کو ہی مار رہی ہے

دوسری عورت: ہاں! اور مسلمانوں کو تو بڑا چھوڑ دے ہے۔ پُل کے نیچے جو کے ــــ ــــ سب بے چارے مسلمان۔

منہارن: ارے بوا! نہ ہندو مارے گئے نہ مسلمان۔

تیسری عورت: ایں تو پھر۔

اے احمق اسے گنڈے۔ ایہی مارتے مرتے ہیں۔

دوسری عورت: ہاں یہی سزا ہے ان کی۔

منہارن: کون کی؟ وہ جو مارے گئے۔

دوسری عورت: اور کیا۔ ان پڑھ جاہل ہی مارتے ہیں۔ اور نہیں تو کیا اچھے ہمارے گلیوں میں سر پھٹول کرتے ہیں

منہارن: اور جو گھروں میں گھس کر سوتے مردوں کو حلال کر ڈالا

عائشہ: ہے ہے!

منہارن: چھاتی سے لگے دودھ پیتے بچوں کے کلیجے کاٹ کاٹ کر نالیوں میں ٹھونس دیا۔

لکشمی: اُف ــــ!

(چوڑی ٹوٹتی ہے ضبط کرنے کو منہ میں دوپٹہ ٹھونستی ہے)

**منہارن** : ماؤں کی آنکھوں کے سامنے بچوں کو قتل کر ڈالے۔ باپ بھائی کے سامنے لڑکیوں کی عزت لوٹی۔

**لکشمی** : اوہ ــــــ !

( بری طرح لرز کر ایک طرف ڈھک جاتی ہے )

**منہارن** : کتنوں کو ــــــــ زندہ درگور کر دیا۔

( لکشمی گھٹی ہوئی چیخ مار کر بے حال ہو جاتی ہے )

( دایا بُری طرح کلیجہ مسوس لیتی ہے )

**عائشہ** : اے غارت ہو یہاں سے ( اٹھ کر لکشمی کو سنبھالتی ہے ) خاک تمہارے منہ میں ــــــ لے بیٹی !

جلدی سے پانی لے ( منہارن سے ) اے بڑھیا یہاں جا نا کہ بیٹھی کھیل رہی ہے۔

**منہارن** : اے تو وہ کل سے بیٹھے جب تو برابر تو بے چلائے ہے۔

**دوسری عورت** : سنا ہے پھول گلی میں تو چار آدمیوں کو ایک گاڑی سے باندھ کر زندہ جلا دیا۔

**پہلی عورت** : اور سنا ہے دو لاشیں تو صبح سے پڑی تھیں۔ لوگوں نے کوٹ کوٹ کر قیمہ بنا دیا تھا۔ ایک کا سر تو پتھر سے بارہ دفعہ کچلا۔

**دوسری عورت** : بارہ دفعہ

**پہلی عورت** : ( مزا لے کر ) ہاں ہاں ! دفعہ سارا بھیجہ نکل کر سڑک پر یوں بہہ رہا تھا تمام۔ ادھر ادھر سے بچے آتے تھے۔ اور لاٹھیوں سے پیٹتے تھے۔

**لکشمی** : آہ ــــــ بچے

**منہارن** : ہاں بیٹی۔ ذرا سے بچے بھی بیٹھ جب شیطان سر پر سوار ہو جاتا ہے تو پھر ذرا سے بچے بھی خونی ہو جاتے ہیں۔

**لکشمی** . ( اٹھتے ہوئے ) ہائے رام مجھے بچوں کے کلیجے ہولتے ہے۔

**منہارن** : ارے بیٹی۔ ان کے کلیجے تو گئے۔ یہ تو بھوت ہیں بھوت۔ آسیب !

**لکشمی** : ( سہم کر ) آسیب ؟

**منہارن** : (دبی ہوئی آواز سے) ہاں اندر باہر جاکر دیکھو تو سارا شہر جانو مرگھٹ بنا پڑا ہے۔ گلیاں پڑی بھائیں بھائیں کر رہی ہیں۔

**پہلی پڑوسن** : ہائے! کیا شوبھا تھی شہر کی۔ سب لٹ گئی۔

**منہارن** : (پڑوسن سے) ایسے جب بھرے پورے گھر لٹ گئے۔ سہاگنوں کی مانگیں اجڑ گئیں۔ ماؤں کی گودیں خالی ہو گئیں تو پھر کیا رہ گیا۔

(لکشمی پھر سسکنے لگتی ہے)

**منہارن** : جانو شہر میں مرگھٹ ......... پھیل گیا ہے۔ جس گھر سے سنو بین کی پکار آ رہی ہے۔

**لکشمی** : چھوٹے چھوٹے ... بچے

**منہارن** : بچے بوڑھے جوان۔ جس کی موت آئی۔

**دوسری پڑوسن** : سنا ہے ایک اسی برس کے بوڑھے کو لاٹھیوں سے کوٹ کوٹ کر بھرتہ بنا دیا

**منہارن** : عورتوں کو پکڑ پکڑ کرکے لے گئے اور بازار میں کوڑے کر دیئے

**پہلی پڑوسن** : ادھر بھی بہار میں تو نواکھالی کا بدلہ لیا ہے۔

**عائشہ** : اری یہ کیسا بدلہ۔ مارے گھٹنا اور پھوٹے آنکھ۔ کریں نواکھالی والے اور بھگتیں بہار والے۔ لوگو یہ کیسا بدلہ ہے۔

**دوسری پڑوسن** : لڑائی میں تو یہی ہوتا ہے۔

**منہارن** : ائے رہنے بھی دو بہنا۔ یہ لڑائی ہے؟ مردوں کی۔ لڑائی اسی کو کہتے ہیں۔ ارے لڑنا ہے۔ تو مردانگی سے خم ٹھوک کر میدان میں جا کے لڑو۔ اپنی بہادری کے جوہر دکھاؤ۔ یہ کیا کہ پاگل بھیڑیوں کی طرح نہتے۔ بے کس عورتوں بچوں پر ٹوٹ پڑے۔ اری بوا! یہ لڑائی مردوں کی تو نہیں۔

**دوسری پڑوسن** : سچ کہتی ہے بوا۔ اور کیا۔ یہ تو کوئی بلا ہے جو سب کے سروں پر سوار ہو گئی ہے۔

**لکشمی** : ہے رام کوئی منع کیوں نہیں کرتا۔ بے قصور کیوں مارتے ہیں؟

**پڑوسن** : کون منع کرے۔ آنکھوں پر چربی آ جائے تو پھر کسی کو کچھ نہیں سوجھتا۔

**منہارن :** ابھر حتیٰ رہے کر ) سنا ہے۔ ایک عورت کے پانچوں بچوں کو اس کی چھاتی پر لٹا کر کاٹ ۔

**لکشمی :** ہائے !

( لرزتی ہے اور اپنا ہاتھ چباتی ہے )

**پہلی پڑوسن :** اور وہ جیتی رہی۔ بچوں کی لاشیں چھاتی سے لگائے پڑی رہی۔ پاگل ہو گئی ہے۔ کیوں منہارن بوا۔

**منہارن :** اور کہیں ہیں کر پیٹ والیوں کے پیٹ چیر کر

( لکشمی ہیبت سے آنکھیں پھٹ جاتی ہیں )

**دوسری پڑوسن :** بچے نکال ہیے اور برچھیوں میں پرو کر

**پہلی پڑوسن :** ( لکشمی کی غیر حالت دیکھ کر ٹھوکے سے منہارن کو منع کرتی ہے ) اسے بوا !

**رو پا :** ( جو خود بری طرح لرز رہی ہے اٹھ کر بھینچتی ہے ) دور ہو یہاں سے ڈائنو ( انڈھال لکشمی کو کلیجہ سے لگا لیتی ہے ) میری بچی ! ( منہارن سے ) غارت ہو یہاں سے چڑیل اس کومل سی بچی کا کلیجہ ہلائے ڈالتی ہے اور بھگوان نہ کرے اسے کچھ ہو گیا تو ـــــــ میں کیا کروں گی ؟ نکلو دور ہو یہاں سے !

**منہارن :** ( منہ پھلا کر ) اے واہ اتنی ڈھیر سی بھری چوڑیاں توڑ ڈالیں ۔

**رو پا :** ( اپیس رے کر ) لو ـــــ لو ـــــــ اور جاؤ ۔ ( الجاجت سے ) ہم ویسے ہی دکھیا ہیں اسے ہمیں ستا کر کیا ملے گا بہنیں ۔

**منہارن :** اچھا بابا جاتی ہیں۔ ـــــــ میں تو تمہارے ہی بھلے کو کہہ رہی تھی جو یہ شہر چھوڑ کر چلی جاؤ تو اچھا ہے ۔

**عائشہ :** اری بیا ! تو کہاں چلے جائیں ۔ جدھر دیکھو یہی آگ بھڑک رہی ہے ۔ اب تو چاروں کھونٹ شعلے پھیل گئے ہیں۔ یا مولا رحم کر۔

( بڑبڑاتی ہوئی بڑبڑاتی چلی جاتی ہیں )

**منہارن :** تم جاؤ ـــــ اچھا میں تو چلی ۔

(جاتی ہے)

تاریکی آہستہ آہستہ بڑھنے لگتی ہے۔ تینوں عورتیں قریب قریب
کھسک آتی ہیں۔ تاریکی بھی سمٹ آتی ہے۔ تماشائیوں سے الگ کردہ اور
بھی قریب آجاتی ہیں۔ روشنی ان پر صرف ایک دائرہ میں رہ جاتی ہے
اور پھر وہ دائرہ چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسٹیج پر گھپ اندھیرا
چھا جاتا ہے۔

(پردہ اٹھتا ہے تو روپا پلنگ پر بیٹھی نظر آتی ہے۔ بیکار سی ہاتھ
پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہے۔ ہاتھوں کی پریشان لرزش سے اس کے
دل کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ پاس لکشمی بیٹھی سویٹر بن رہی ہے۔
سویٹر چھوڑ کر گھڑی کو دیکھتی ہے اور اس میں کوک بھرنے لگتی ہے۔ روپا
مڑ کر اس کی اس حرکت کو دیکھتی ہے۔ تو جلدی سے گھڑی رکھ کر
شرمندہ ہو کر سویٹر بننے لگتی ہے۔ روپا اس کی حرکت سے اور
بھی پریشان ہو جاتی ہے)

**روپا** : (جھلا کر) ہو کیوں بار بار گھڑی کو اینٹھتی ہے۔ ٹوٹ جائے گا۔

(لکشمی سر جھکا لیتی ہے)

**روپا** : (لکشمی کی عاجزی سے دل دکھ جاتا ہے۔ پیار سے کہتی ہے) پگلی کہیں کی۔ کوک دینے سے گھڑی کوئی
جلدی چلنے لگے گی

**لکشمی** : (خفیف ہو کر) نہیں تو!

**روپا** : (اور پیار سے) جا کھانا بنا لے۔ ذرا دیر ہو جائے گی تو لڑکا بگڑے گا۔ جا

**لکشمی** : ترکاری تیار ہے۔ پراٹھے ڈال دوں۔

**روپا** : ہاں اور تھوڑی کچوریاں بھی تل لے۔ خورشید کتنا شوق سے کھانے کو جی کرتا ہے۔ وہ لوگ آتے ہی

ہوں گے۔

**لکشمی** : ابھی تو تین بجے ہیں۔

**روپا** : (جھلا کر) ہاں ہاں ——— تو کیا ہے - - ——— بنانے میں دیر بھی لگے گی کہ نہیں۔

**لکشمی** : (سوئٹر رکھ کر جاتی ہے) اچھا۔

تنہائی میں روپا پھر کانپنے لگتی ہے اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھتی ہے۔ بیکاری سے اکتا کر وحشت سے بچنے کے لیے گٹھری کھول کر سینے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر ہاتھ قابو میں نہیں۔ کچھ کام نہیں بنتا کبھی تاگہ چھوٹ جاتا ہے اور کبھی سوئی۔ عاجز ہو کر خاموش کچھ سوچنے لگتی ہے اتنے میں روشنی سمٹ کر اس کے چہرے پر آ گئی ہے۔ ایک دم آنکھوں سے دہشت برسنے لگتی ہے اور کانوں میں ——— مارو ——— - مارو --- بینا بینا ——— کی دور دور آواز آتی ہے جو آہستہ آہستہ بڑھ کر اسے مفلوج کر دیتی ہے۔ روپا کلیجہ پکڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور زور سے چلاتی ہے )

**روپا** : بہو ——— بہو!

(آواز ایک دم رک جاتی ہے)

**لکشمی** : (اندر سے بھاگتی نکلتی ہے آٹے میں ہاتھ بھرے ہیں) کیا ہے اماں - - ماں!

**روپا** : (اپنے کانوں کی دھوکہ بازی کو سمجھ کر شرمندہ ہو جاتی ہے) کچھ نہیں ——— جاؤ ———!

(لکشمی جانے لوٹتی ہے)

**روپا** : (لکشمی کے بیٹھتے ہی روشنی کا دائرہ پھر چھوٹا ہونے لگتا ہے سہم کر کہتی ہے) اے بہو۔

**لکشمی** : (جو خود نہیں جانا چاہتی) جی!

**روپا** : آ ——— ذرا (رکتے جھجکتی ہے) ٹھہر رہنے دے پراٹھے ابھی سے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ آ بیٹھ جا میرے پاس۔

**لکشمی** : آتی ہوں۔ ذرا ہاتھ دھو ڈالوں (اٹھتی ہے پھر سوچ کر) خالہ جی کو بلا دوں۔ اب تو نماز پڑھ چکی ہوں گی۔

**روپا** : (اس کی بات سے خوش ہو کر) ہاں۔ بلا لے۔ کہہ وہاں اکیلی کیا کر رہی ہیں۔ ہاں اور پراٹھے ڈال ہی لے۔ دیر ہو جائے گی۔

**لکشمی** : (عائشہ کی طرف جاتی ہے) خالہ جی۔ نماز پڑھ چکی ہو۔ تو ذرا اماں کے پاس آ جائیے۔

**عائشہ** : اچھا بیٹی۔

**لکشمی** : (اطمینان دلانے کو) ابھی آتی ہوں۔

(چلی جاتی ہے)

**روپا** : ہوں۔

(مطمئن ہو کر ذرا لیٹ جاتی ہے)

(عائشہ دبے پیر روپا کے سرہانے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے اس کے ہاتھ میں تسبیح ہے اور لب پر خدا کا نام ہے۔ تھوڑی دیر کھڑی محبت اور رحم بھری نظروں سے اسے دیکھتی ہے۔ پھر اس پر دم کرتی ہے)

(روپا۔ دم کی ہوا سے آنکھیں کھول کر مسکرا پڑتی ہے۔ اشارے سے اسے اپنے سرہانے بٹھا کر اس کا ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ کر پھر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ عائشہ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے)

**روپا** : (سرور میں آنکھیں نیم بند کئے ہوئے) عائشہ!

**عائشہ** : کیا؟

**روپا** : اگر تم میرے پڑوس میں نہ ہوتیں تو میں کیا کرتی۔

**عائشہ** : (مسکرا پڑتی ہے) وہی جوئیں تمھارے بنا کرتی ۔

**روپا** : (آنکھیں کھول کر اسے بڑی عزت کی نظروں سے دیکھتی ہے) نہیں عائشہ تمھارا دل بڑا مضبوط ہے ۔

**عائشہ** : (اداسی سے ٹھنڈی سانس بھر کر) میرا دل ——— رہنے دو! بس دھڑک رہا ہے جب تک سانس کی ڈوری چلتی ہے ۔ ورنہ اب تو ——— ۔

(گلا رندھ جاتا ہے)

**روپا** : (حیرت سے اس کی کمزوری کو دیکھتی ہے ۔ اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے) تم بہت ہمت والی ہو ۔

**عائشہ** : (ذرا غرور سے مسکرا کر) بڑی بھی ہوں تم سے ۔

**روپا** : (جوانی کی بچی کھچی شوخی سے) ارے ہو! ——— بھلا کتنی بڑی ہوگی ؟

**عائشہ** : (ڈینگ مارتے ہوئے) اے جب تم بیاہ کر آئی تھیں تو کتنی تھیں ۔ یہی کوئی تیرھواں سال ہوگا ۔ اور میں پورے

**روپا** : پندرہ کی تھی ۔ رہنے دو بہت بڑی ہو میں یہی سال ڈیڑھ سال ۔

**عائشہ** : بات کرنے کا سلیقہ بھی نہ تھا ۔ مارے شرم کے گٹھڑی ہی جاتی تھیں ۔

**روپا** : (ہنس پڑتی ہے) ہاں گر پڑوس میں تمھارے سوا تھا بھی کون بات کرنے کے لائق

**عائشہ** : (اپنی ستائش سے جھینپ کر) یہ تو نہ کہو بہنو ۔

**روپا** : (بڑی شرارت سے) پر تم جیسی کسی سے نہ گھٹی

**عائشہ** : ہاں ! یہ تو بات ہے ۔ یاد ہے جب سورج ہونے کو تھا تو ——— اے ہے (ہنستی ہے) بہت ہی بھولی تھیں تم تو ۔

**روپا** : پر تم نے بڑی دیکھ بھال کی تھی میری ۔ راتوں کو جاگنا ۔ بھلا کاہے کو تمھیں میرا اتنا خیال تھا ؟

**عائشہ** : (معصومیت سے) اللہ جانے ۔

(لکشمی بگر ان کے پیچھے کھڑی دوپٹے سے ہاتھ پونچھ رہی ہے ۔
ان کی باتیں سنتی جاتی ہے)

**روپا** : کون جانے پچھلے جنم میں ہم دونوں بہنیں ہوں ۔

عائشہ : (اس انکشاف سے متحیر ہوکر) ہیں ؟ ہاں - اور پھر خدا نے ہمارا امتحان لینے کو الگ الگ پیدا کر دیا -

روپا : اتنا الگ پیدا ہو کر بھی ہم مل گئے

(لکشمی کو دیکھ کر جھینپ جاتی ہے)

لکشمی : (مسرت سے دونوں کو دیکھ کر) ارے خالہ جی آپ کی اور اماں کی صورت بھی تو ملتی ہے -

روپا : (خوشی سے تڑپ کر) ہاں ہاں بہت لوگ کہتے ہیں -

لکشمی : (حیرت اور خوشی سے ٹھٹھک کر سامنے آجاتی ہے) ارے رام تو پھر لگتا ہے آپ سچ مچ بہنیں ہی نہ ہوں -

عائشہ : (ہلکے سے اس کے گال کو چھو کر) پگلی ! بہن ہی تو سب بابا آدم کی اولاد ہیں !

لکشمی : (ایک دم فکرمند اور اداس ہو کر) تو پھر لوگ کیوں آئے دن جھگڑتے رہتے ہیں -

(ایک دم سے دونوں بڑھیوں کے چہروں پر کی عارضی کھلکھلی مسرت اڑ جاتی جاتی ہے اور وہ بے بسی سے ایک دوسرے کو تکتی ہیں - روپا غصہ ہو کر لکشمی کو تکتی ہے - جیسے اس نے ان کے بنے بنائے گھروندے میں ٹھوکر مار دی)

لکشمی : (شرمندہ ہو کر عفو بھری نظروں سے انھیں دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہے - اماں — — !

عائشہ : (موقع کو سنبھالتی ہے) ارے تو کیا سگے بھائی بھائی نہیں لڑتے -

لکشمی : ایسے ایسے جنگلی جانوروں کی طرح ؟ خالہ جی ! ان چھوٹے چھوٹے بچوں — — لاچار عورتوں کو انھیں کیوں مارا ؟

روپا : (لاجواب اور کھسیانی ہو کر) جا بیٹی ! ترکاری تو جل جائے - (زانو ٹیک کر) بہت اچھا اماں -

(اٹھ کر جانے لگتی ہے)

عائشہ : (کندھے پر ہاتھ رکھ کر روک لیتی ہے) سچ کہتی ہے تو - بیٹی یہ انسانوں پر جب بھوت سوار ہو جاتا ہے تو پھر وہ بھی بھوت بن جاتے ہیں - یہ پاگلا پھر تو آنکھیں بند کر کے جو سامنے آجائے اسے ہڑپ کر جاتا ہے -

لکشمی : پر کیوں ؟

**عائشہ** : جیسے گندے تالابوں سے بیماریاں پھیلتی ہیں۔ ایسے ہی گندے دلوں کی کھوٹ آپس کی بھول بن جاتی ہے، شیطان سب شیطان کے کرتوت ہیں۔

**لکشمی** : شیطان کو بھگوان روکتے بھی نہیں۔

**روپا** : روکیں گے۔ ضرور روکیں گے۔

**لکشمی** : اے بھگوان تو پھر کب روکو گے۔

(گھٹنے پر سر رکھ دیتی ہے)

**روپا** : چنتا نہ کر میری لاڈو۔ جب ہمارا منا جنم لے گا تو یہ بھیانک بادل دیش پر سے چھٹ جائیں گے۔

(لکشمی شرما جاتی ہے)

**عائشہ** : انسان کے دل میں نفرت ہے تو محبت بھی ہے۔

**لکشمی** : (شانت سے سہم کر) ہائے بھگوان کہیں بے چارے پریم کو بھی کسی لچھے نے مار ڈالا ہو۔

**عائشہ** : محبت کبھی نہیں مرتی، سو جاتی ہے۔ پھر جاگ اٹھتی ہے۔

**لکشمی** : (حسرت سے) جاگ اٹھے گی۔

**عائشہ** : ہاں اب پچھتاوا آئے گا۔ بے گناہوں کا خون یاد آ کر ڈرائے گا۔

**روپا** : (ہوا میں سونگھ کر) جانے کیوں ایسے خیال پڑتا ہے۔ تیرے دوری کی آگ لگی۔

(کچھ دھواں سا بند ہو گیا ہے۔ آگ بجھ جاتی ہے)

**روپا** : (ٹھنڈی سانس کھینچ کر التجا بھری آواز سے) اے پرمیشور ایسے گندے سمے میں کسی کو جنم نہ دے۔ اے پربھو! یہ بلا دور ہو جائے۔ تو ساٹھ برہمنوں کو بھوگ لگاؤں گی۔ (عائشہ سے) تم کچھ نہیں کرتیں۔

**عائشہ** : (شکست خوردہ ہو کر) تین چلے کھینچ چکی ہوں۔ چوتھا شروع کیا ہے۔ اجمیر شریف منت بھی مان لی ہے۔ پر دیکھو۔ خدا کب سنتا ہے۔

**روپا** : (اطمینان دلانے کو بڑے وثوق سے) سنے گا۔ ضرور سنے گا۔ تم جیسی بھگتنی کی نہ سنے گا تو پھر کس کی سنے گا۔ وہ بالکوں کے لیے تم نے تعویذ نہیں منگائے۔

عائشہ: کل آجائیں گے۔

(دونوں عورتیں ہو کر سو چنے لگتی ہیں۔ روشنی کا دائرہ سمٹ کر عائشہ
کو گھونٹتا ہے۔ چہرہ پر کرب طاری ہو جاتا ہے اور وہی بھیانک
پکار "مارو ــــــ مارو ــــــ لینا
پکڑنا" کانوں میں پہلے آہستہ آہستہ پھر زور سے آنے لگتی ہے)

عائشہ : (وحشت زدہ آنکھیں پھاڑے گلے کو نوچنے لگتی ہے) اوہ ــــــ اوہ

روپا : (جو یہ آواز نہیں سن رہی ہے۔ پریشان ہے) کیا ہوا ـــ عائشہ!

عائشہ : (آواز ایک دم سے بند ہو جاتی ہے) یہ سنا۔

روپا : کیا؟

(لکشمی نکل کر پیچھے آن کھڑی ہوتی ہے)

عائشہ : (آواز کو پھر کان میں پکڑنے کی کوشش کرتی ہے) یہ ــــــ یہ ــــــ تم نے سنا؟

روپا : (تجربہ کی بنا پر سمجھ کر) تو تم نے بھی سنا (طنزاً اس سے کہ یہ صرف ان کا وہم ہیں) میں جانتی تھی کہ
میرے ہی کان بج رہے ہیں۔

لکشمی : (جو پچھلی کھڑی سن رہی تھی سہم کر) کیا؟ ـــ کیا؟ ــــــ میں نے تو کچھ نہیں سنا۔

روپا : (دونوں ڈر جاتی ہیں بات ٹال دیتی ہیں) کچھ نہیں ــــــ کچھ نہیں ــــــ کچھ بھی تو
نہیں۔ (ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہیں)

(لکشمی سہمی ہوئی دونوں کے بیچ میں آن گھستی ہے اور غور سے ان
کے چہروں میں کچھ تلاش کرتی ہے)

روپا : (ڈر کر کہیں وہ بھی خوفناک صدا نہ سن لے) تو جا ــــــ جا ــــــ سو جا
ذرا دیر کو سو جا۔

لکشمی : (سہمی ہوئی) نہیں وہاں مجھے ڈر لگتا ہے۔ (سمٹ کر ہوئے گلے سے) جانو کوئی لال لال خون

میری تو اربے میٹھا ہے۔ مجھ سے کوٹھری میں بھی نہیں جایا جاتا۔

**عائشہ** : اچھا۔ اچھا یہاں لیٹ جا

(زانو پر سر رکھ کر لٹا لیتی ہے)

(یکایک خاموشی میں کشتی کا دائرہ چھوٹا ہو کر قینوں کے گرد سمٹنے لگتا ہے۔ لکشمی سہمی ہوئی سر اٹھا کر خلا میں کچھ سننے کی کوشش کرتی ہے توٹا پھوٹا ڈراؤنا میوزک کانوں میں رینگتا ہے۔ دائرہ چھوٹا ہو کر لکشمی کا دم گھوٹنے لگتا ہے۔ وہی ہزیانی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے ——— مارو ——— مارو۔ لینا ——— لینا ——— کی آوازیں طرح کانوں میں گھستی ہے۔ چیخ مار کر اٹھ بیٹھتی ہے۔)

**لکشمی** : (آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں۔ ہونٹ خشک) آہ!

**روپا** : کیو ؟

**لکشمی** : (بے ہوش کے مارے نیند ٹوٹ گئی ہے اور عائشہ سے چمٹ جاتی ہے) یہ ——— یہ سنا؟ مَیں نے بھی سنا۔

**عائشہ** : کیا؟ ——— بھو؟

**لکشمی** : مارو ——— مارو ——— لینا ——— لینا۔ سنا؟

**روپا** : (اسے کلیجے سے لگا کر بھینچ لیتی ہے) میری بچی۔

**عائشہ** : (روپا کو اشارے سے منع کر کے) کیا۔ کیا؟ وہم ہے کان بجتے ہیں۔ ہم نے تو کچھ نہیں سنا۔

**لکشمی** : (ضد ہٹ کر) نہیں۔ مَیں نے سنا۔ شی۔ چُپ۔ دھیان سے سنو۔

قینوں بڑے غور سے سننے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر موت کا سا سناٹا چھایا رہتا ہے۔ کہ ایک دم سے کوئی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے)

آواز : اے ــــ سورج کی ماں !

( تینوں کی چیخ نکل جاتی ہے )

روپا : میرا لال ــــ میرا سورج ( چیختی دروازے کی طرف دوڑتی ہے ) میرا چاند ( دروازہ کھولتی ہے ایک آدمی کھڑا ہے ) کہاں ہے میرا لال ــــ میرا سورج ۔

آدمی : ارے ارے ، گھبراؤ نہیں ، خورشید کی ماں ۔

( عائشہ کلیجہ پکڑ کر بے حس و حرکت رہ جاتی ہے )

( لکشمی ہاتھ سے اپنی کلائی پر مضبوطی سے چوڑیوں کو پکڑے سناٹے میں رہ جاتی ہے )

آدمی : ( جو گھبرا جاتا ہے ) ارے ۔ ارے ۔ [illegible]

( روپا لڑکھڑا کر دیوار سے سہارا لیتی ہے ، وہاں سے نیچے گر پڑتی ہے )

آدمی : باپ رے ــــ لکشمی کو دیکھ کر اور گھبراتا ہے ) سورج کا فون آیا ہے ( نہایت مجرمانہ انداز سے ) کہ وہ اور خورشید کرفیو کی وجہ سے آج رات کو مرزا جی کے یہاں رہیں گے ــــ اور ــــ مزے میں ہیں دونوں کوئی فکر نہ کریں ۔ نمستے ۔

( ایک کر بھاگ جاتا ہے ۔ مجرموں کی طرح

لکشمی ایک دم اطمینان کا سانس لیتی ہے ۔ ایک کرطاق میں رکھی مورتی کے آگے ماتھا ٹیکا کر اطمینان کی سانسیں لینے لگتی ہے )

( عائشہ آہستہ آہستہ خود ہی جو نک کر رتے ہوئے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیتی ہے )

روپا : ( آنکھیں کھولتی ہے ) ہوں !

لکشمی : ( دوڑ کر جاتی ہے ) ہاں ۔ اٹھو اماں ۔ وہ بالکل اچھے ہیں ۔ ہے رام بیکار میں ایسا ڈر گئے اٹھو ۔

(اٹھاتی ہے)

روپا : وہ آئے کیوں نہیں ؟

لکشمی : کرفیو کے مارے۔ اچھا تو کیا۔

عائشہ : ہاں! اچھا کیا۔

روپا : پر یہاں تو جان آدھی ہو گئی۔ عائشہ آج ادھر ہی سو جاؤ۔ ہاں یہی تو میں بھی سوچ رہی تھی۔ اکیلا گھر تو پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ نماز پڑھ کر آ جاؤں گی۔

(اپنی طرف جاتی ہے)

○

# تیسرا منظر

(پردہ اٹھتا ہے۔ تو تینوں عورتیں غافل سوتی نظر آتی ہیں۔ اسٹیج
پر ہیبت ناک تاریکی پھیلی ہوئی ہے صرف مدھم سی شمعیں ان کے چہرے
ٹمٹما رہے ہیں۔ صرف روشنی کا دائرہ روپا کے اوپر آہستہ آہستہ
دائرہ چھوٹا ہونا شروع ہوتا ہے۔ روپا کے چہرے پر کرب کی کیفیت
طاری ہو جاتی ہے۔ ہاتھ پیر میں تشنج ہوتا ہے اور درد سے کراہتی ہے
جیسے سوتے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔ دائرہ گھٹ کر
صرف چہرے پر رہ جاتا ہے۔ روپا کے کانوں میں دور سے کسی ڈراؤنی
پکار گونجتی ہے۔ جو آہستہ آہستہ قریب آجاتی ہے۔ روپا
تڑپ کر اٹھ بیٹھتی ہے اور ہاتھ پھیلا کر دوڑتی ہے۔)

روپا : (خواب کی حالت میں) نہیں نہیں۔ نہ مارو میرے لال کو ___ بچاؤ ___ بچاؤ
بھگوان کے لیے دیا کرو (بری طرح کلیجہ مسوستی ہے) نہ مارو۔ چھوڑ دو (گڑگڑا کر) اسے چھوڑ دو۔
یہ ہندو نہیں۔ یہ مسلمان نہیں۔ یہ تو مجھ ابھاگن کا بیٹا ہے۔ میرا بیٹا ___ دیکھو ___ دیکھو
میری طرف دیکھو ___ یہ میرے کلیجے کا ٹکڑا ہے۔ اس نے کبھی کسی کو نہیں مارا ___ میں
نے بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ___ نہ بہاؤ اس کا لال لال خون۔ مٹی پر نہ پھینکو ___ یہ
ماں کا دودھ ہے ماں ___ تمہاری بھی تو ہے؟ ___ جس نے تمہیں جنم دیا۔ میں نے بھی
اس کو جنم دیا ہے ___ میں نے بڑے دکھ جھیل کر اسے پالا ہے۔ یہ دیکھو سلائی کرتے
کرتے میری آنکھیں پھوٹ گئیں۔ چکی پیستے پیستے ہتھیلیوں میں گھٹے پڑ گئے (بیکسی سے خیالی بیٹے کو
روکتے ہوئے) ٹھیرو! پرمیشور کے لیے دیا کرو ___ نہ مارو ___ نہ مارو ___

میرے لال کو ——— آہ ——— آہ !

( دونوں ہاتھوں سے خیالی سوئچ کو بجاتی ہے۔ ایک کرسی سے
ٹکرا جاتی ہے )

( عائشہ سوتے ہی کانپتی ہے )

روپا : (زمین پر گر کر سسکیاں بھرتی ہے ) مار ڈالا ——— مار ڈالا میرے بچے کو ——— آہ !

عائشہ کے چہرے پر روشنی کا دائرہ پڑتا ہے۔ سوتے میں اس
کے کان میں بھی وہی موت کی مہیب پکار گونجتی ہے اور کرب سے
بے چین ہو کر عائشہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھتی ہے۔ مار ڈالا
ظالمو ——— تم نے میرے خورشید کو مٹی میں ملا دیا ———
ہیبت زدہ جیسے لاش کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہی
ہے۔ تم نے اس کے سینہ میں چھرا گھونگھول دیا آہ ———
اس کی آنتیں باہر نکل پڑیں۔ (پاگلوں کی طرح کچھ جھک کر سمیٹنے لگتی ہے۔)
تم نے مجھ ادھ مری بڑھیا کا آخری سہارا لوٹ لیا (چیخ کر) انہیں
بے رحم ہاتھوں سے تم نے میرا سہاگ لوٹا تھا ——— میرا
سہاگ مٹیا میٹ کیا تھا۔ آج انہیں ہاتھوں سے میرا کلیجہ نوچ کر
پیروں تلے مسل ڈالا۔ ——— واہ کیا سورما تھا واہ
واہ کیا کہنے (اپنی طرف اشارہ کر کے ) ہڈیوں کے ڈھانچے سے
مقابلہ کرتے ہو ——— بتاؤ کیوں ؟ ——— میں نے
المباحت سے ) تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے میرے گھر کا چراغ
بجھا دیا۔ میں نے تم سے کیا چھینا تھا۔ جو تم نے میرا سب کچھ
چھین لیا ——— مجھے اندھا کر دیا۔ اب بتاؤ میں کہاں جاؤں

کسے ڈھونڈوں۔ کسے پکاروں۔ کس سے انصاف مانگوں ——
یا خدا (آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر) تو دیکھ رہا ہے؟ تو بتا
میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا جو یوں میری ساری زندگی کو دوزخ
بنا دیا —— اور اس نے (خیالی لاش کی طرف اشارہ کر کے)
اس معصوم نے کون سا گناہ کیا تھا (جھک کر خیالی لاش کو پیار
سے چھوتی ہے) میرا خورشید، یہ تیرا لال لال خون (خون ہاتھ میں
لے کر گال پر ملتی ہے) میرا خون! بیکس اور لاچار کا خون! یہ
درندے پی گئے —— اب تو ان کے کلیجے ٹھنڈے ہو گئے
—— پیاس بجھ گئی (پھیر کو دھکیلتی آگے بڑھتی ہے)
ہٹو —— میں اپنے لال کی لاش اٹھاؤں —— نہیں
تو اسے کتے نوچیں گے۔ —— گدھ (سہمی ہوئی چاروں
طرف دیکھتی ہے۔ ملک الموت کے چوبدار میرے بچے کی لاش پر
تاک لگائے بیٹھے ہیں (چارپائی پر اٹکتا کر گرتی ہے اور پیار
سے تکیہ پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ میرے خورشید! چل تجھے دولہا
بناؤں۔ جب میں تیرا بیاہ ہونے والا تھا تو یہ تیری بارات آگئی
یہ لال لال خون کی مہندی رچ گئی —— خورشید! میرے
کلیجے کے ٹکڑے (آہستہ آہستہ آواز ڈوب جاتی ہے۔
اور منہ کے بل گر کر سو جاتی ہے۔)
(اب اکیلی لکشمی سو رہی ہے۔ روشنی کا دائرہ اور ڈراؤنے
کالے کالے سائے اسے چاروں طرف سے گھورتے ہیں۔ اور
وہی آواز —— ماردو —— آہستہ اور پھر

بلند کانوں میں گھستی ہے ——— کلشمی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی

ہوتی ہے۔ اور ہاتھ سے دوسرے ہاتھ سے چوڑیاں چھپا لیتی ہے)

**کلشمی**: (کسی خیالی شے سے بھی چوڑیاں چھپائے جاگتی ہے) نہیں نہیں نہ توڑو ——— نہ توڑو

میری دھانی بانکیں۔ میں نے آج ہی تو پہنی ہیں۔ یہ تو کانچ کی ہیں۔ مد کوڑی کی بھی نہیں۔ تمھارے کس کام

آئیں گی۔ یہ میرا توان سے سہاگ بندھا ہوا ہے ——— آہ! نہ توڑو (ایک دم اپنی مانگ چھپا لیتی ہے)

میری مانگ نہ اجاڑو۔ یہ چاول بھر لال کم کم تمھارے کس کام کی ——— آہ! ——— مار ڈالا۔

(ایکسی سے چپ چاپ کھڑی ہو جاتی ہے اور گھٹی گھٹی آواز سے رو پڑتی ہے) آہ! تم نے ——— تم

نے انھیں مار ڈالا۔ لے چوڑی چھاتی والے جوان۔ میں تو تمھاری بہن سری کی ہوں۔ تم نے بہن کا سہاگ

لوٹ لیا (دوسرے خیالی کردار سے) تم لے لمبی داڑھی والے بابا! ——— تم نے اپنی بیٹی کی مانگ

نوچ ڈالی۔ تم نے ایک نربل لڑکی کو زندہ چتا پر پھونک دیا (آواز گھٹ کر بھیانک ہو جاتی ہے) دھوا

آہ! دھواں ——— میں دھواں ہوں ——— اب کیا ہوگا۔ (بھیانک

صورت ہو جاتی ہے) بولو ——— اب میں کہاں جاؤں۔ کیا کروں؟ یہ پہاڑ سا جیون کیسے

بتاؤں (ایک دم جوش سے) تو پھر مجھے بھی مار ڈالو۔ میرے پتی کے خون میں لتھڑی تلوار کو میرا خون بھی چکھا

دو! ناگن کی طرح پھنکتی ہے) ہاں ہاں ——— پھر میں ان سے جا ملوں گی ——— دیکھتے

کیا ہو ——— جلدی۔

(آنسو بھرے ہیں۔ مگر مسکراتی ہے۔ اور آنکھیں بند کر کے

منتظر کھڑی ہو جاتی ہے۔

تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتی

ہے۔ آنکھوں میں نیا استقلال چمکنے لگتا ہے۔ چہرے پر غرور

اور خودداری جگمگا اٹھتی ہے۔ حقارت سے خیالی بیٹے کو دیکھتی

ہے اور زور سے ڈانٹتی ہے۔

خبردار! مجھے ہاتھ نہ لگانا! ——— میں گربھ وتی ہوں

(غرور سے تن کر) گربھ وتی دیوی ہوتی ہے۔ دیوی کا اپمان

دکرنا۔ اگر تم نے میرے خون کی ایک بوند بھی دھرتی کے سینے

پر ٹپکائی تو سدا کے لیے بانجھ ہو جائے گی۔ میرا خون پی کر مٹی

اناج اگلنا چھوڑ دے گی۔ میرے خون کے دھبے تمہارے ہاتھوں

دھوئے نہ چھوٹیں گے۔ میں نئی دنیا کو جنم دینے والی ہوں۔ میں نئی

آشا کی ماں ہوں۔ اگر تم نے مجھے مار دیا تو تمہارا ناش ہو جائے گا

دنیا جنم جنم تک تمہاری صورتوں پر پھٹکار بھیجے گی۔ تمہارا کہیں

ٹھکانا نہ رہے گا۔ دور ہو جاؤ ——— تمہاری

تلواریں میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتیں۔ تمہارے خنجر میری

طرف نہیں اٹھ سکتے۔ میں نئی دنیا کو جنم دوں گی۔

چہرے پر اطمینان اور سکون چھا جاتا ہے )

(روپا جاگ کر حیرت سے بہو کو دیکھ رہی ہے۔ اس کے الفاظ

روپا کو تقویت پہنچاتے ہیں )

( عائشہ امید بھری نظروں سے بہو کے چہرے کی غیر معمولی روشنی

کو تکتی ہے )

لکشمی : (آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جاتی ہے۔ جیسے وہ کسی بلند مقام پر نہایت اطمینان سے چڑھتی چلی جا رہی ہو)

وہ میری ننھی منی دنیا۔ پریم اور شانتی کا سندیسہ سارے جگ میں پھیلائے گا۔ (بلندیوں کی طرف امید

اور شوق سے دیکھتی ہے) یہ کالے بادل چھٹ جائیں گے نیا سورج جنم لے کر دنیا کو جگمگا دے گا۔

(جذبات کی فراوانی سے آواز گھٹ جاتی ہے اور آنسو بہنے لگتے ہیں) آپس کی کھوٹ مٹ جائے گی۔

عائشہ اور روپا صحن میں رکھے ہوئے دیئے اٹھا کر تھالیاں کساتی

ہیں۔ اللہ دونوں بہو کا چہرہ دیکھنے کو بڑھتی ہیں)

**لکشمی:** بھائی بھائی مل جائیں گے۔ پرکاش !!

روپا اور عائشہ بڑھ کر دیے بہو کے چہرے

کے سامنے کرتی ہیں۔ دونوں دیوں کی کانپتی ہوئی

لویں مل کر ایک دم سے ایک بڑی سی لو چمک

اٹھتی ہے۔ جس کی روشنی میں لکشمی کا چہرہ سورج

کی مانند جھلملا اٹھتا ہے)

**عائشہ اور روپا:** (جذبات سے بے قرار ہو کر) بہو لکشمی!

لکشمی اپنی جیت کے احساس میں مست آنکھیں

بند کیے سر نیچے ڈالے مسکراتی رہتی ہے۔ اس

کے لب آہستہ آہستہ ہلتے ہیں)

پرکاش! پرکاش!!

# شاہجہاں

ایک تاریخی المیّہ

عشرت رحمانی

# افراد

۱۔ شہنشاہ شاہجہاں (علالت کے دوران میں)

۲۔ شہزادہ اورنگ زیب

۳۔ شہزادہ محمد سلطان (اورنگ زیب عالمگیر کا بیٹا)

۴۔ شہزادی جہاں آرا

۵۔ شہزادی زہرۃ النسا (شہزادہ دارا شکوہ کی بیٹی)

۶۔ شہزادہ دارا شکوہ

۷۔ شہزادہ اعظم

۸۔ برہمن

۹۔ چند سردار، دیگر فوجی سپاہی وغیرہ

زمانہ :۔ عہد مغلیہ

مقام :۔ آگرہ

# پہلا منظر

(قلعہ آگرہ)

(شہنشاہ شاہجہاں بستر علالت پر
شہزادہ دارا شکوہ اور جہاں آرا پاس موجود ہیں۔ خواصیں
مورچھل کر رہی ہیں)

---

شاہجہاں :۔ (کھانستے ہوئے) جہاں آرا۔ خواصیں اور خواجہ سرا باہر ہو جائیں۔ (تخلیہ)

. . . . . . . . . . . . . . . .

(سب کا چلنا)

جہاں آرا :۔ جو حکم عالی جاہ!

شاہجہاں :۔ دارا شکوہ! اگر بغاوت کی یہ خبر صحیح ہے تو واقعی یہ بہت بری بات ہے۔ (کھانسی)

دارا :۔ ظل الٰہی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ شجاع نے بنگال میں بغاوت شروع کی ہے اور مراد گجرات میں بادشاہ بن بیٹھا۔ اورنگ زیب بھی اس کا شریک ہو چکا ہے۔

شاہجہاں :۔ (حیرت سے) اورنگ زیب! یہ کیسے ہوا۔ اورنگ زیب سے تو یہ توقع ہمیں کبھی نہیں ہو سکتی مگر اب اس آگ کو جلدی ہی بجھانا ہے۔

دارا :۔ ظل الٰہی! میں اپنے بیٹے سلیمان کو الٰہ آباد سے شجاع کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجتا ہوں۔ اور اس کی مدد کے لیے راجہ جے سنگھ اور سپہ سالار دلیر خاں کو۔

شاہجہاں :۔ ہوں۔

(شاہجہاں کا خاموشی سے حقہ پینا)

**دارا:۔** اور مراد کا مقابلہ کرنے کے لیے راجہ جسونت سنگھ کو بھیجتا ہوں۔ اس طرح یہ شعلے بھڑکنے سے پہلے ہی ختم ہو جائیں گے عالی جاہ!

**شاہجہاں:۔** کیا کہوں دارا۔ سوچتا ہوں۔

(کھانسی)

**دارا:۔** جہاں پناہ آپ کچھ فکر نہ فرمائیں میں باغیوں کا سر کچلنا خوب جانتا ہوں

**شاہجہاں:۔** دارا ہمیں فکر اس بات کی ہے کہ یہ لڑائی بھائیوں میں ہوگی۔

**دارا:۔** ظل الہی!

**شاہجہاں:۔** نہیں دارا لڑائی کی ضرورت نہیں۔ ہم سب کو سمجھا دیں گے نہیں بلاؤ۔ انھیں بے روک ٹوک شہر میں آنے دو۔ یہاں آئیں سب درست ہو جائیں گے۔

(وقفہ۔ جہاں آرا جلدی سے آگے بڑھ کر آتی ہے۔)

**شاہجہاں:۔** کیوں جہاں آرا تو کیا کہنا چاہتی ہے بیٹی۔ کیا سوچ رہی ہے؟

**جہاں آرا:۔** اعلیٰ حضرت اگستاخ رعایا نے بادشاہ کے سر پر جو تلوار اٹھائی ہے۔ وہ انہیں کے سر پر پڑنی چاہئے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتی ہوں۔

**شاہجہاں:۔** جہاں آرا وہ کوئی غیر تو نہیں۔ آخر شہزادے ہیں۔ میرے بیٹے۔ ان میں اورنگ زیب پر مجھے بہت بھروسہ ہے۔ وہ میرا لائق بیٹا ہے۔

**جہاں آرا:۔** بجا ہے ظل الہی۔ مگر بادشاہ کے جھنڈے تلے وہ رعایا کی حیثیت سے ہے۔ اور بیٹا صرف باپ کی محبت ہی کا حقدار نہیں اس کو باپ کا حکم بھی ماننا چاہئے۔ اگر اولاد ٹھیک راہ پر نہ چلے تو اس کو سزا دینا بھی باپ کا فرض ہے۔ اورنگ زیب ہی نے زیادہ سر اٹھایا ہے۔ اس لیے حکومت کا فرض ہے کہ!

**شاہجہاں:۔** (جلدی سے) میرا دل صرف ایک حکومت جانتا ہے۔ اور وہ محبت کی حکومت ہے۔

(سنبھل کر)

بیٹی! یہ شہزادے بے ماں کے ہیں۔ انہیں کس دل سے سزا دوں۔ جہاں آرا۔ وہ دیکھ آنسوؤں کے

بے ہوئے سنگ مرمر کے اس ڈھیر۔ اس تاج محل کی طرف دیکھ۔ پھر انھیں سزا دینے کے لیے کہنا۔ میری دنیا اس محل تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اب نہ دل ہے نہ دماغ!

**جہاں آرا:۔** اعلیٰ حضرت! یہ باتیں ہندوستان کے شہنشاہ کے لائق کب ہیں۔ آپ ہندوستان کی سلطنت کے مالک ہیں۔ رعایا اگر باغی ہو تو اسے بیٹا سمجھ کر معاف کرنا انصاف نہیں۔ محبت کیا فرض کو مٹا سکتی ہے۔ مغلیہ حکومت کے عزم کچھ اور ہیں۔ حضرت اکبر اعظم کا فرض جہاں بانی کمزور محبت کی تقلید کے خلاف ہے۔

**شاہجہاں:۔** جہاں آرا اس بحث کے لیے میرے پاس دل نہیں۔ جواب نہیں۔ اگر کوئی جواب ہے تو صرف وہی محبت۔ خاندانِ مغلیہ کا یہ چراغ اب کتنے دن کا ہے۔ اب اسے جہانبانی کے جبر سے کب سروکار ہے۔

**دارا:۔** ظلِ الٰہی۔

**شاہجہاں:۔** دارا ہمیں صرف یہ فکر ہے کہ اس جھگڑے میں شکست کسی کی بھی ہو غم ہمارے ہی دل پر رہے گا۔ اس لیے سوچتے ہیں کہ لڑائی کی ضرورت نہیں۔ کوئی غلط فہمی ہے۔ ان کی بھول ہے۔ وہ یہاں آئیں۔ ہم انھیں سمجھا دیں گے۔

**دارا:۔** ظلِ الٰہی۔ جو ارشاد عالی جاہ۔ لیکن؟

**جہاں آرا:۔** داراشکوہ! اعلیٰ حضرت علیل ہیں تم ان کی جگہ سلطنت کے فرائض انجام دے رہے ہو۔ کیا اسی طرح کام کرو گے اس کمزوری سے خاندانِ مغلیہ کے چراغ کو بغاوت کی آندھیاں اسی طرح گل کرنے پر تلیں اور تم سینہ سپر نہ ہو۔

**دارا:۔** بیشک یہ درست ہے۔ اعلیٰ حضرت یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے اجازت دیجئے باغیوں کو سزا دوں۔ سلطنت کی توہین کیسے برداشت کی جا سکتی ہے۔ یہ ساری آگ اورنگ زیب کی بھڑکائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جہاں پناہ دل کو سخت کر لیجئے

**شاہجہاں:۔** یا خدا! بادشاہ بنانا تھا تو باپ کا یہ محبت بھرا ہوا دل کیوں دیا ہے۔ لوہے کا کلیجہ اور پتھر کا دل کیوں نہ دیا اور پھر ممتاز کی جدائی کا یہ صدمہ!

**دارا:۔** اعلیٰ حضرت یہ نہ سمجھئے کہ میں حکومت چاہتا ہوں۔ لڑائی کا ارادہ تخت و تاج کے لالچ میں نہیں۔ تخت کی حفاظت کے لیے ہے۔ تاج کی آن رکھنے کے لیے۔

**شاہجہاں:۔** دارا!

**دارا:۔** غلام اجازت کا طالب ہے ظلِ الٰہی!

جہاں آرا:۔ دارا تمہارا جانا لازمی ہے۔ تم جاتے ہو۔ انصاف کے تخت کی حفاظت کے لیے۔ باغیوں کو سزا دینے کے لیے۔ ملک کو خانہ جنگی کی آگ سے بچانے کے لیے۔ اگر بغاوت کے بھڑکتے ہوئے شعلے جلد نہ بجھائے گئے تو مغلوں کی سلطنت اور ہندوستان کا امن کیسے قائم رہ سکتا ہے!

دارا:۔ بسر و چشم .......... جہاں تک ہو سکے گا خونریزی سے گریز کروں گا۔ اور گستاخ باغیوں کو گرفتار کر کے اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش کروں گا۔ جنھوں نے یہ سمجھ کر سر اٹھایا ہے کہ ظل الٰہی کے پاس صرف باپ کی محبت سے بھرا ہوا دل اور نوازش و مہربانی کی نظر ہے۔ میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت شہنشاہ ہیں اور مغل شہنشاہ کی شان و سطوت دکھانے کو دارا کی تلوار کیا نہیں کر سکتی!

شاہجہاں:۔ دارا شکوہ تمہاری یہی مرضی ہے تو جاؤ تمہیں اختیار ہے۔ گستاخوں کو ان کی بے ادبی کی مناسب سزا دو مگر سمجھ سوچ کر۔

دارا:۔ ظل الٰہی جو حکم!

شاہجہاں:۔ ان لوگوں نے یکایک کیوں سر اٹھایا ہے؟ تم نے یہ بھی سوچا یہ بغاوت کی وبا کیسے پھیلی؟

دارا:۔ وہ کہتے ہیں اعلیٰ حضرت کی بیماری کی خبر غلط اڑائی گئی ہے کہتے ہیں تمام وہ دن نہ دکھائے خاکم بدہن حضور اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اور میں اس بہانے سے جہاں پناہ کے نام پر تخت و سلطنت کا مالک بن گیا ہوں۔

جہاں آرا:۔ (جوش کے ساتھ) اس میں نامناسب کیا ہے تم شہنشاہ کے سب سے بڑے بیٹے اور ہونہار ولی عہد ہو۔

دارا:۔ انھیں میری ولی عہدی سے انکار ہے۔ وہ میری بادشاہی قبول کرنا نہیں چاہتے۔

شاہجہاں:۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ان کی یہ مرضی پوری نہیں ہو سکتی۔ تم سب سے بڑی اولاد ہو۔ تم ہی ولی عہد سلطنت ہو۔ جاؤ تمہیں پورا اختیار ہے۔

دارا:۔ ظل الٰہی بندہ رخصت چاہتا ہے۔

(سلام کرتا ہوا دارا چلا جاتا ہے)

شاہجہاں:۔ امان بخدا (وقفہ) دارا چلا گیا۔ سب شہزادے میری خوشی پر راضی تھے۔ کوئی بھی کسی کا مخالف نہیں تھا۔ یہ اچانک کیا ہو گیا یہ آگ کیسے لگی اور نہ جانے کیسے بجھے گی؟

(کھانسی)

# دوسرا منظر

(اورنگ زیب کا خیمہ۔ سرداروں کے ہمراہ بات چیت

اورنگ زیب۔ کوی راج برہمن۔ چند سردار)

اورنگ زیب:۔ کوی کشن تم نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہمارا ارادہ لڑائی جھگڑے کا نہیں۔ ہم اعلیٰ حضرت کی بیماری کی خبر سن کر انھیں دیکھنے جا رہے ہیں۔

برہمن:۔ حضور میں نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اس کے جواب میں ــــــــــ

اورنگ زیب:۔ بھائی داراشکوہ نے کیا کہا؟

برہمن:۔ انھوں نے کہا۔ ہمیں بھائی کی بغاوت کا حال معلوم ہو گیا ہے۔ خود شہنشاہ نے آخری وقت ہمیں حکم دیا تھا کہ باغیوں کا سر کچلنا!

سردار نمبر ۱:۔ شہزادۂ عالم سنا آپ نے؟

اورنگ زیب:۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ یقین نہیں آتا۔ اس کا مطلب ہے کہ شہنشاہ۔

سردار نمبر ۱:۔ جنت مکان،

اورنگ زیب:۔ خاکت بدہن۔ خدا کرے یہ جھوٹ ہو۔ ظلِ الٰہی بیمار ہیں۔

سردار نمبر ۲:۔ شہزادۂ عالم۔ پھر بھی آپ کا قلعہ میں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ شہزادہ داراشکوہ کی نظر آپ کی طرف سے پھری ہوئی ہے۔ اور حضور کی جان و عزت خطرے میں ہے۔

اورنگ زیب:۔ بھائی داراشکوہ! سمجھ میں نہیں آتا ان کا یہ ارادہ کیوں ہوا۔ وہ مجھے باغی سمجھتے ہیں۔ میری سرکوبی کا قصد۔ الٹی بات ہے۔

سردار نمبر ۱:۔ شہزادۂ عالم۔ آپ نے جو عریضہ شہنشاہ کی خدمت میں بھیجا تھا اس کا جواب بھی نہیں آیا۔ اور شہزادہ مراد نے جو کچھ لکھا تھا اس کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔

**اورنگ زیب:۔** سمجھ گیا۔ اب سب باتیں صاف ہو گئی ہیں۔ یہ سب کارروائی داراشکوہ کی ہے۔

**سردار نمبر ۲:۔** بے شک حضور وہ آپ سے لڑنے اور ——

**اورنگ زیب:۔** اور کیا۔ (ہنس کر) مجھ سے لڑنے۔ افسوس دارا نے اورنگ زیب کو اب تک نہیں پہچانا۔ دارا میرا بھائی ہے۔ بڑا بھائی مگر اس کی عقل کو کیا ہو گیا ہے۔

(ایک سردار آتا ہے)

**سردار:۔** حضور جاسوس خبر لایا ہے کہ شہزادہ داراشکوہ کا لشکر قریب آ پہنچا ہے۔

**اورنگ زیب:۔** (غصہ اور جوش سے) آتا ہے تو آنے دو۔ شہنشاہ باپ کی ایک تلوار دو بھائیوں کے سروں پر ناچتی ہے تو —— اس کا کیا علاج۔ اب فوج کو تیاری کا حکم دو۔ ہم کچھ سمجھ رہے تھے یہ کچھ ہو رہا ہے ہم نے سب کچھ سنا اور صبر سے کام لیا۔ ہمارے وکیل عیسیٰ بیگ کا گھر ضبط کر کے اسے قید کیا۔ ہم نے چپ چاپ سُنا۔ ہمارے تمام افسروں کو بیجاپور سے نکال دیا گیا۔ اور اب کھلم کھلا مقابلہ! دارا میرے دشمن بھائی تو نے میرے پیارے شہنشاہ باپ کو مجھ سے چھڑایا ہے۔ آستین کے سانپ!

**سردار نمبر ۱:۔** حضور فوجیں تیار ہیں۔

**اورنگ زیب:۔** کوچ کا حکم دو۔ فوراً بڑھو۔ بجلی کی طرح لپکو اور بڑھتے ہوئے سیلاب کی طرح آگے چلو۔ اس بڑھتے ہوئے گھمنڈ اور دارا کے مغالطہ کو ملیامیٹ کر دو!

**سردار نمبر ۲:۔** عالی جاہ!

**سردار نمبر ۳:۔** جو حکم جہاں پناہ!

# تیسرا منظر

(چند دن بعد۔ اورنگ زیب کا جنگ لڑائی کے بعد)

اورنگ زیب:۔ سب کچھ ہو چکا لڑائی ختم ہو گئی۔ داراشکوہ کو ضد کا نتیجہ مل گیا۔ اب وہ ہماری قید میں ہے۔ میں شہنشاہ کے پاس جا کر خود سب باتوں کی اصلیت معلوم کر لوں گا۔ مجھے یقین ہے ظل الٰہی بہ حیات ہیں۔

سردار نمبر ۱:۔ حضور ہم آپ کو وہاں تنہا ہرگز نہ جانے دیں گے۔ شہزادی صاحبہ وہاں موجود ہیں۔

اورنگ زیب:۔ اورنگ زیب ان باتوں سے نہیں ڈرتا۔ کون جہاں آرا میری بہن۔ مگر وہ میری مخالفت کیوں کریں گی؟

سردار نمبر ۲:۔ اس لیے کہ وہ شہزادہ داراشکوہ کی طرف دار ہیں۔

اورنگ زیب:۔ تو کیا شہنشاہ کو بھی انھوں نے ورغلایا ہوگا؟

سردار نمبر ۲:۔ بیشک حضور۔ آگرہ کی ہوا آپ کے مخالف معلوم ہوتی ہے۔

اورنگ زیب:۔ مگر میں ایک بار قلعہ میں اعلیٰ حضرت کے سامنے جاتا۔ خود دیکھتا، سنتا اور سمجھتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے!

سردار نمبر ۱:۔ حضور ہم آپ کو وہاں نہ جانے دینگے۔ حالات بہت مشتبہ ہیں۔ اور یہ رقعہ شہزادہ شجاع کے نام شہنشاہ کا ملا تھا اس سے زیادہ خطرہ!

اورنگ زیب:۔ سب کچھ معلوم ہو گیا۔ اب نہ جاؤں گا۔ شہزادہ سلطان کو بلاؤ۔

شہزادہ سلطان:۔ حاضر ابا حضور!

سردار نمبر ۱:۔ حضور عالی۔ یہ تو پوری سازش ہے۔

سلطان:۔ حکم، ابا حضور!

اورنگ زیب:۔ ہوں۔ محمد سلطان! حالات ایسے ہیں کہ اب تمہیں تنہا آگرہ کے قلعہ میں جانا ہوگا۔ تم ایک ہزار معتبر سپاہی لے کر جاؤ۔ اور اعلیٰ حضرت کی خدمت میں عرض کرو کہ وہ قلعہ کے خاص محل میں آرام سے تشریف رکھیں اور قلعہ پر اپنی فوج مقرر کر کے شاہی فوج ہٹا دو۔ شہنشاہ پورے شاہی احترام اور شان و شوکت کے ساتھ رہیں۔ مگر ان کے پاس کوئی نہ جا سکے اور نہ کوئی محل سے باہر آ سکے۔ جلد جاؤ۔ اور اس کام کو ہوشیاری سے سرانجام دو!

سلطان:۔ جو حکم ابا حضور۔

(جاتا ــــــ کامل سکوت)

# چوتھا منظر

(قلعہ آگرہ)

**شاہجہاں:۔** جہاں آرا۔ دارا کی شکست بہت بے وقت ہوئی۔ مجھے اورنگ زیب کا انتظار ہے۔ تعجب ہے کہ وہ اب تک قلعہ میں کیوں نہیں آیا۔ میرے حکم سے کبھی اس نے منہ نہیں موڑا۔

**جہاں آرا:۔** میرا بھی یہی خیال تھا اعلیٰ حضرت۔ لیکن۔

**شاہجہاں:۔** کیا۔ لیکن کیا ہوا جہاں آرا؟

**جہاں آرا:۔** حالات کچھ عجیب نظر آرہے ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں سکتی۔

**شاہجہاں:۔** اورنگ زیب کچھ بھی سہی۔ لیکن میرا فرمانبردار بیٹا ہے ہمارا احترام اور ادب اس کا ایمان ہے۔

**جہاں آرا:۔** ظاہر میں یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اعلیٰ حضرت کی بہت عزت اور ادب کرتا ہے۔ ثبوت کچھ اور مل رہے ہیں۔

**شاہجہاں:۔** سمجھ میں نہیں آتا جہاں آرا۔ یہ سب کیسے ہو رہا ہے۔ اورنگ زیب کو کیا ہو گیا!

**جہاں آرا:۔** داراشکوہ کی شکست سے میرا دل ٹوٹ گیا ہے ظلِ الٰہی۔ اورنگ زیب نے اس کی عزت نہیں کی۔ اسے حضور کی محبت ہوتی تو داراشکوہ سے مقابلہ کیوں کرتا۔

**شاہجہاں:۔** ہاں۔ دارا اس کا بڑا بھائی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ دارا ہمیں کتنا پیارا ہے ——

**جہاں آرا:۔** سنا ہے داراشکوہ کے تمام سپاہیوں کو اس نے قید کر لیا ہے۔

**شاہجہاں:۔** ہم داراشکوہ کو لڑائی جھگڑے سے اسی لیے منع کرتے تھے مگر وہ مخالفت پر تلا رہا۔

**جہاں آرا:۔** میں دارا کی یہ توہین اور ہار برداشت نہیں کر سکتی۔ اعلیٰ حضرت۔

**شاہجہاں:۔** اب اس جھگڑے کو ختم ہی کرنے کے لیے تو اورنگ زیب کو یہاں بلا بھیجا تھا۔

**جہاں آرا:۔** ایک دفعہ وہ اس قلعہ میں آئے۔ میں نے بھی ٹھیک انتظام کر لیا ہے۔ کئی سو سپاہیوں

کا ایک دستہ یہاں تیار ہے۔ اورنگ زیب کو اچھی طرح قید کر کے یہاں رکھوں گی۔

**شاہجہان:۔** نہیں جہاں آرا اس کی ضرورت نہیں۔ ہم اسے محبت اور پیار سے قابو میں کرلیں گے

**جہاں آرا:۔** نہیں اعلیٰ حضرت محبت اور پیار کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اب ہم اس سے یہ برتاؤ کیوں کریں؟ اس نے داراشکوہ کا مقابلہ کیا ہے۔

**شاہجہان:۔** جہاں آرا اورنگ زیب اگر بغاوت پر بھی آمادہ ہوگیا ہو تو باپ کی محبت اسے درست کر سکتی ہے۔ میں دارا کو اس سے بچا سکتا ہوں۔ اگر شاہی حکم نہیں تو باپ کے پیار کی نگاہ اس کی نیت اور ارادہ بدل سکتی ہے۔

**جہاں آرا:۔** اعلیٰ حضرت کو میں اس بے عزتی سے بچاؤں گی۔

**شاہجہاں:۔** بے عزتی کیا ہے جہاں آرا۔ خدا کرے ہمارا ایلچی دارا یا شجاع کو مل جائے۔ اور ادھر اسے تسلی ہو جائے۔

**شہزادہ سلطان:۔** ظل الٰہی میں مجرا عرض کرتا ہوں۔

**جہاں آرا:۔** کون۔ محمد سلطان۔

(جھک کر سلام کرتا ہے)

**شہزادہ سلطان:۔** آداب! پھوپھی حضور۔

**جہاں آرا:۔** تمہارے والد اورنگ زیب بھی ساتھ ہیں؟

**سلطان:۔** جی نہیں پھوپھی حضور۔ وہ تو یہاں نہیں آئے۔

**جہاں آرا:۔** پھر تم یہاں اکیلے کیسے آئے سلطان؟

**شاہجہاں:۔** ہاں سلطان تم اکیلے آئے ہو۔ اورنگ زیب کیوں نہیں آئے۔ ہم نے سنا تھا وہ یہاں آرہے ہیں۔

**سلطان:۔** ظلِ سبحانی! ابا حضور نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ اور عرض کی ہے کہ اعلیٰ حضرت قلعہ میں تشریف رکھیں۔ باہر خطرہ ہے۔

**جہاں آرا:۔** (جوش سے) خوب! شہنشاہ کو اس کے بیٹے کا فرمان سنانے آئے ہو کہ وہ قلعہ سے باہر نہ جائیں۔

**سلطان:۔** جی ہاں۔ قلعہ سے باہر تشریف نہ لے جائیں۔ لڑائی جھگڑے نے کچھ ایسی ہی حالت بنادی ہے مصلحت اسی میں ہے۔

**جہاں آرا:۔** مصلحت! کیسی مصلحت؟ شہنشاہ خود سلطنت کی ہر مصلحت کو سمجھتے ہیں۔

**سلطان:۔** اور سلطنت کی بھلائی کے لیے ہی یہ سوچا گیا ہے۔ شہنشاہ کے خلاف عام طور پر بری خبریں مشہور ہیں۔

**شاہجہاں:۔** تو کیا تم وہ بری خبریں سنانے اور ہمیں ڈرانے آئے ہو سلطان!

**سلطان:۔** عالی جاہ قلعہ کے باہر ہماری فوج موجود ہے۔ وہ شہنشاہ کی حفاظت اور قلعہ کی فوج کی دیکھ بھال کرے گی۔ میں یہ عرض کرنے آیا ہوں۔

**جہاں آرا:۔** اچھا پہلے میں تم ہی کو قید کروں گی۔

(دستک)

(سپاہیوں کا آنا)

تلوار دے دو سلطان۔

**سلطان:۔** پھوپھی حضور یہ کیوں؟

**جہاں آرا:۔** تم قیدی ہو۔ باغیوں کے طرف دار ہو۔

**سلطان:۔** ہرگز نہیں۔ ہم بغاوت کی آگ کو دبانا چاہتے ہیں۔

**جہاں آرا:۔** یہ باتوں کا وقت نہیں۔ سپاہیو لے لو تلوار۔

**سلطان:۔** تو اب مجھے بھی اپنی فوج کو قلعہ میں بلانا پڑے گا۔ رقعہ کا مضمون درست معلوم ہوتا ہے۔

**جہاں آرا:۔** تمہاری فوج قلعہ کے اندر کیسے آسکتی ہے کس نے اجازت دی!

**شاہجہاں:۔** میں نے جہاں آرا میں نے۔ میں نے شجاع اور دارا کے پاس جو ایلچی بھیجا تھا معلوم ہوتا ہے وہ

اورنگ زیب کے ہاتھ لگا۔ اور اب اس کو ہم پر اعتماد نہیں رہا ـــــ سلطان! مگر تم ایک بار جاؤ۔ اور اورنگ زیب کو خود یہاں لے آؤ۔

**سلطان:** ۔ میں اباحضور کے حکم سے مجبور ہوں عالی جاہ!

**جہاں آرا:** ۔ خوب کس کے حکم سے مجبور۔ شہنشاہ کی موجودگی میں اس کی اولاد کی اولاد اس طرح حکم چلائے۔ اپنے ابا کے حکم سے مجبور۔ یہ سب داراشکوہ کی بے وقت شکست کا نتیجہ ہے۔

**شاہجہاں:** ۔ تو کیا اب ہم یہ سمجھیں کہ ہم تمھارے قیدی ہیں سلطان!

**سلطان:** ۔ نہیں اعلےٰ حضرت۔ ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ آپ آرام سے محل میں تشریف رکھیں لیکن یہاں سے باہر........

**شاہجہاں:** ۔ باہر نہیں جا سکتا۔ گویا میں قید ہوں۔ کیا یہ سچ ہے۔ یا ہم خواب دیکھ رہے ہیں ـــــ شہنشاہ شاہجہاں! ـــــ تم میرے پوتے تلوار لیے کھڑے ہو۔ کیا ایک ہی دن میں دُنیا پلٹ گئی۔ ایک دن جس کے غصے کی لال آنکھیں دیکھ کر اورنگ زیب کانپ اٹھتا تھا اس کے ـــــ اس کے بیٹے کے ہاتھ میں۔ آج ـــــ وہی شاہجہاں قید میں ہے۔ بیمار۔ ضعیف۔ اس کو تم سب نے پاگل سمجھ لیا ہے۔ مفلوج۔ مجبور۔ جہاں آرا! یہ کیا؟ تیرے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ منہ سے آواز نہیں نکلتی۔ تیری رنگت بدل گئی۔ کیا ہوا بیٹی۔ گھبرائی کیوں ہے۔ ہم ابھی زندہ ہیں۔ شاہجہاں زندہ ہے!

**جہاں آرا:** ۔ کچھ نہیں اعلیٰ حضرت۔ میرے دل کا جو حال ہے وہ آپ پر۔ ۔۔

**شاہجہاں:** ۔ سلطان تم نے سوچا ہے کہ تم لوگوں کی ان حرکتوں کو ہم اسی طرح بیٹھے بیٹھے برداشت کرلیں گے۔ تم نے سوچا ہے یہ ضعیف بوڑھا ہے۔ تمھاری جھڑکیاں سن لے گا ـــــ بوڑھا سہی مگر شہنشاہ ہوں تمھاری یہ ہمت، یہ حوصلہ۔ یہ بغاوت۔ یہ سرکشی۔ لے آؤ ہماری تلوار۔ ہمیں ابھی قلعہ کے باہر فوج کو لے جانا پڑے گا۔ (وقفہ) کیا کوئی نہیں۔ یہ خاموشی کیسی۔ ہمارے حکم پر کوئی آواز نہیں۔

**سلطان:** ۔ قلعہ سے سب سپاہی اٹھا دیے گئے ہیں۔ اعلیٰ حضرت!

شاہجہاں:۔ کس کے حکم سے؟

سلطان:۔ ہمارے سپاہی جہاں پناہ کی حفاظت کریں گے۔ ابّا حضور نے غلام کو یہی حکم ۔

شاہجہاں:۔ حکم۔ اورنگ زیب کا حکم۔ کیا خوب۔ سُنا جہاں آرا ! مت گھبرا بیٹی۔ ابھی ہم اس قلعہ سے باہر جا کر۔ ایک دفعہ اپنے سپاہیوں کو تیار کر لیں گے۔ کھڑے ہو جائیں گے تو اب بھی اس بوڑھے شاہجہاں کی فتمندی کے نعروں سے اورنگ زیب کانپ اٹھے گا۔ زمین پر گھٹنے ٹیک دیگا۔ ایک بار صرف ایک بار باہر نکل پاتا سلطان ہم ایک بار قلعہ کے باہر جائیںگے پھر ایک بار!

سلطان:۔ عالی جاہ۔ میں ابّا حضور کے حکم کا پابند ہوں۔

شاہجہاں:۔ اور کیا ہم تمہارے کوئی نہیں ——— تمہارا باپ اپنے باپ کی مخالفت کرے تو کیا تم اس کے پابند ہو گے۔ سلطان میں تمہارا دادا اور شہنشاہ ہوں۔ تم میری اولاد ہو۔ دروازہ کھول دو۔

سلطان:۔ اعلیٰ حضرت! مجھے جو حکم ملا ہے اسے ٹال نہیں سکتا۔ اور یہ حضور کی مخالفت نہیں ہے حفاظت ہے ——— معاف کیجئے۔ حضور میں باپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ مجھے جانا چاہیئے۔

شاہجہاں:۔ چلا گیا۔ چلا گیا۔ آخر وہی ہوا جس کا کھٹکا تھا۔ جہاں آرا تو چپ کیوں ہے!

جہاں آرا:۔ کیسی عجیب بات ہے۔ اورنگ زیب تمہارا بیٹا سلطان تمہارے حکم کا ایسا پابند اور تم اپنے ضعیف باپ کو محبت کے بدلے میں نظر بند رکھنا چاہتے ہو۔

شاہجہاں:۔ بیٹی جہاں آرا یہ میرا قصور ہے۔ آنکھیں کھل گئیں۔ اولاد کو والدین جیسا چاہیں بنا سکتے ہیں۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ مجھنی ہے جہاں آرا۔ آج مجھے اپنے ہی کیے کا پھل اولاد سے مل رہا ہے۔ میں نے جنت مکان بزرگ شہنشاہ کے ساتھ کیا کیا ہے!

جہاں آرا:۔ ظلِ الٰہی! قلعہ کی چہار دیواری میں بند بچوں کی طرح رونے چلّانے سے کیا فائدہ۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے شاہی ہمت سے اٹھئے۔ سلطنت کے خلاف جو زہریلی ہوا پھیلی ہوئی ہے اُسے قہر کی ایک نظر سے بدل ڈالیے۔

شاہجہاں:۔ ہاں بیٹی! ہمیں سب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ تو بھی میری مددگار بن۔ کہاں ہیں۔ کہاں ہیں۔ سلطنت مغلیہ کے جاں نثار۔ چلو۔ بڑھو۔ اس بغاوت کو کچل ڈالو۔

(سب کے آگے بڑھنے کی آواز)

# پانچواں منظر

(شاہجہاں ثمن برج سے جمنا اور سامنے تاج کا نظارہ کر رہا
ہے۔صبح صادق کا وقت۔ ملاح گاتے کشتیاں چلاتے
گزر رہے ہیں۔ شاہجہاں دماغی انتشار میں مبتلا ہے)

**شاہجہاں** سورج نکل آیا۔ ویسا ہی چمک دار اور سُرخ رنگ جیسا ہمیشہ سے تھا۔آسمان ویسا ہی نیلا ہے۔ جمنا اٹھلاتی، بل کھاتی اسی چال سے بہہ رہی ہے۔اس پار کے درختوں کا رنگ ویسا ہی ہے سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا میں برسوں سے دیکھتا آرہا ہوں۔کچھ بھی نہیں بدلا۔ صرف میں ہی بدل گیا ہوں۔

میں آج اپنے ہی بیٹے کی حراست میں ہوں۔ معصوم بچے کی طرح کمزور اور مجبور۔کبھی غصّہ سے گرج اٹھتا ہوں۔ لیکن یہ فضول بادل کا گرجنا۔ بیکار ہائے ہائے کرنا۔اس طرح کڑھ کڑھ کر اندر ہی اندر گھلتا جارہا ہوں۔ ہندوستان کا بادشاہ شاہجہاں!

دُنیا کتنی اندھی اور بے کیف ہے جہاں آرا۔کیا تو مسکرا رہی ہے اس دنیا کے اندھے پن پر افسوس نہیں کرتی۔ وہ سُنا۔ وہ کیسا شور ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ جانتی ہے۔ داراشکوہ کی فتحیابی کی خوشخبری۔ یہ اس کا شور ہے۔شاید تو بھی اسی لیے ہنس رہی ہے۔

(شاہجہاں کی دماغی حالت بدلتی جارہی ہے)

**جہاں آرا:۔** مجھے مسکرانے کی مجال نہیں۔خوابوں سے بھی مسکرانا چھین لیا گیا ہے۔دارا کی فتحیابی ——— آہ ——— وہ اب کہاں؟

**شاہجہاں:۔** سچ کہتی ہے۔مگر وہ سن۔کیا یہ دُنیا کے نادان لوگ اس کے اندھے پن پر ہنس رہے ہیں۔یہ شور کیسا ہے سنتی ہے؟

جہاں آرا:۔ نہیں اعلیٰ حضرت۔ میں نے نہیں سُنا۔

شاہجہاں:۔ سچ ہے تو دُنیا کے چھل کپٹ سے دور ہے۔ تیرا دل اس کے مکر و فریب کو کیا سمجھے۔ مگر جہاں آرا! اورنگ زیب! کاش اورنگ زیب دارا کو اس سلطنت کا مالک بنتے دیکھ لیتا۔

جہاں آرا:۔ اعلیٰ حضرت!

شاہجہاں:۔ یہی سوچتا رہتا ہوں جہاں آرا۔ یہ سب کیا ہوا۔ تو کیا چاہتی ہے۔ دارا کی آرزو کیا تھی۔ ہم نے کیا چاہا۔ وہ کیوں نہ ہو سکا۔ یہ کیوں ہُوا۔

جہاں آرا:۔ کیا ہوا ظلِ الٰہی؟

شاہجہاں:۔ جو کبھی نہ ہونا چاہئیے تھا بیٹی۔ وہ سب ہو گیا۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ سب کیسے ہو رہا ہے۔ اورنگ زیب ——— اورنگ زیب آج بار بار بلانے پر پہلے سامنے نہیں آتا۔ اور کوئی دارا کی سچی خبر نہیں لاتا۔ کوئی کہتا ہے قید میں ہے۔ کوئی کہتا ہے دوسرے جہان میں ہے۔

جہاں آرا:۔ یہ سب دھوکا ہے۔ ظلِ الٰہی۔

شاہجہاں:۔ دھوکا۔ یہ ساری دنیا ہی دھوکا ہے۔

جہاں آرا:۔ دھوکا ظلِ الٰہی۔

شاہجہاں:۔ ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ اورنگ زیب بھی اسی دھوکے میں ہو، جہاں آرا!

جہاں آرا:۔ کس دھوکے میں ظلِ الٰہی!

شاہجہاں:۔ کسی نے اسے مغالطہ میں ڈالا ہے۔ وہ شاہ جہاں کا عزیز بیٹا ہے۔ اورنگ زیب ہے۔

جہاں آرا:۔ ظلِ الٰہی۔ آج اورنگ زیب کی بادشاہت کا دہلی اور آگرہ میں اعلان ہو رہا ہے۔ کہتے ہیں وہ بادشاہ بنا بیٹھا ہے۔

شاہجہاں :۔ کہتے ہیں اچھوٹی دنیا کے اندھے کہنے والوں پر یقین نہ کر۔ جہاں آرا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اورنگ زیب یہ جرأت کیسے کر سکتا ہے۔

جہاں آرا :۔ جو شخص اپنے پیارے باپ کو قید کر سکتا ہے۔ وہ کیا نہیں کر سکتا۔ ظل الٰہی!

شاہجہاں :۔ نہیں جہاں آرا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کیا اورنگ زیب کو اتنی تمیز نہیں کہ اس کا باپ ابھی زندہ ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ تخت پر نہیں بیٹھ سکتا۔

جہاں آرا :۔ کیوں نہیں اعلیٰ حضرت۔

شاہجہاں :۔ اور اس پر اس گستاخی پر بھی دنیا کے کام اسی طرح چل رہے ہیں۔

جہاں آرا :۔ یہ کیسی دنیا اسی طرح اپنے کام کیے جا رہی ہے۔ قیدی اور ضعیف شہنشاہ کا کسی کو خیال نہیں۔

شاہجہاں :۔ قیدی شہنشاہ۔ یہ تو کہہ رہی ہے جہاں آرا۔ ہم قیدی ہیں؟

جہاں آرا :۔ اورنگ زیب نے یہی سمجھا ہے ظل الٰہی۔ اور اب دنیا کو وہ یہی سمجھا رہا ہے۔

شاہجہاں :۔ کاش ایک بار اس محل کے باہر جا سکتا تو دنیا کو سمجھا دیتا کہ اورنگ زیب اور شاہ جہاں کیا ہیں۔ جہاں آرا تو ایک بار مجھے قلعہ کے باہر لے جا سکتی ہے؟

جہاں آرا :۔ ظل الٰہی۔ قلعہ کے ہر دروازے پر ہزاروں ہتھیار بند سپاہی پہرہ دے رہے ہیں۔

شاہجہاں :۔ میری وفادار رعایا کا ایک آدمی بھی اس کے خلاف آواز نہیں نکالتا۔

جہاں آرا :۔ نہیں اعلیٰ حضرت۔ انسان کتے کی طرح خوشامدی ہے۔ جو اسے ایک ٹکڑا دے سکتا ہے اس کے پاؤں چاٹ سکتا ہے۔ دم ہلانے لگتا ہے۔ مکار، مطلبی دُنیا!

شاہجہاں :۔ مطلبی دُنیا۔ سچ ہے جہاں آرا۔ ہم نے ان پر کیسے کیسے احسان کیے ہیں۔ کسی کو ہم پر ترس نہیں آتا۔ اپنے شہنشاہ پر ترس ——— بیمار، ضعیف اور نظر بند شہنشاہ پر ترس!

**جہاں آرا** :- اب دنیا میں ترس اور رحم کا نام نہیں رہا۔ آسمان اور زمین بدلے ہوئے ہیں۔ دنیا کی خدا بھی ہمارے خلاف ہے۔

**شاہجہاں** :- ہوا کرے بیٹی۔ مت گھبرا۔ اگر تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو کیا ہے۔ سب دیکھ لوں گا سب سمجھ لوں گا۔

**جہاں آرا** :- عالی جاہ! آپ آرام فرمایئے۔ رات زیادہ گئی ہے۔ چلئے خواب گاہ چلیے۔

**شاہجہاں** :- خواب! جہاں آرا۔ مغل شہنشاہ کو خواب یاد دلا رہی ہے۔ شہزادی، میری بچی جو تیری مرضی۔

(دونوں جاتے ہیں۔ شہزادی زہرۃ النسا آتی ہے)

**زہرۃ النساء** :- اُف کس قدر تند یہ طوفان۔ اور شہنشاہ کی یہ حالت۔ خدا کرے ظل الٰہی کی آنکھ لگ گئی ہو وہ آرام میں ہوں۔ رات آدھی سے زیادہ گذری ہے۔ کہیں بیدار نہ ہو جائیں۔

(شاہجہاں دیوانگی کی حالت میں برآمد ہوتا ہے)

**شاہجہاں** :- کس کی مجال ہے کہ دارا کا خون کرے۔ میں شہنشاہ شاہجہاں خود اس کی نگہبانی کر رہا ہوں اپنے پیارے دارا کو بچاؤں گا۔ اسے شہنشاہ بناؤں گا۔ اورنگ زیب ناچیز ہے۔ ہم اگر اشارہ کریں تو اورنگ زیب کانپ اٹھے گا۔ ہم حکم دیں آندھی اٹھو آندھی اٹھے گی۔ کہیں بجلی گرا تو بجلی گرے گی۔

(بادل گرجتا ہے)

**زہرۃ النسا** :- کیسا بادل گرج رہا ہے۔ زمین و آسمان ہوا اور پانی میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اور یہاں ہمارے دادا حضرت کا یہ عالم!

**شاہجہاں** :- ہتھیار سنبھالو۔ وہ آرہے ہیں۔ فوجیں آراستہ کرو۔ جنگی باجے بجاؤ۔ جھنڈا اُٹھاؤ۔ وہ آرہے ہیں۔ چلو! جنگ کے لیے چلو۔ کون ہے! دور ہو۔ خون کے پیاسے۔ مجھے نہیں پہچانتا۔ میں شاہجہاں ہوں۔

**زہرۃ النسا** :- ظل الٰہی!

**شاہجہاں** :- تم۔ میرے ہٹتے ہی وہ دارا کو مار ڈالیں گے۔ پاس نہ آنا۔ خبردار۔

زہرۃ النسا:۔ دادا حضرت! آرام فرمایئے۔ آدھی رات ہے۔ آپ کا مزاج ناساز! —

شاہجہاں:۔ پاس نہ آنا۔ تم لوگوں کی سانس میں زہر ہے۔ آگے قدم نہ بڑھانا۔ ہمارے سامنے دم مارنے کی مجال! خبردار!

زہرۃ النسا:۔ اعلیٰ حضرت! رات زیادہ ہوگئی ہے۔ آرام کے لیے چلیے۔

(جہاں آرا آتی ہے)

جہاں آرا:۔ کیسا پُردرد نظارہ ہے۔

زہرۃ النسا:۔ پھوپھی حضور۔ آپ بھی بیدار ہوگئیں۔

جہاں آرا:۔ بادل کی گرج سے آنکھ کھل گئی۔ کیا اعلیٰ حضرت کی طبیعت پھر ناساز ہے؟

زہرۃ النسا:۔ جی ہاں۔

جہاں آرا:۔ رات کی دوا پی ہے؟

زہرۃ النسا:۔ جی ہاں۔ دی تو ہے۔ لیکن معلوم نہیں آج نیند آنے میں دیر کیوں ہورہی ہے؟

شاہجہاں:۔ دیوانے پن ہیں، کس نے کیا —— کس نے کیا!!

(چلّانا)

زہرۃ النسا:۔ کیا دادا حضرت؟

شاہجہاں:۔ خون۔ خون۔ وہ خون نکل رہا ہے۔ تمام فرش بھیگ گیا ہے۔ دھواں اٹھ رہا ہے۔

جہاں آرا:۔ اعلیٰ حضرت۔ اعلیٰ حضرت۔ سونے چلئے۔

(ہوا کا شور اور بجلی کی کڑک)

شاہجہاں:۔ جہاں آرا۔ جی چاہتا ہے جہاں آرا۔ اس رات کی آندھی پانی طوفان میں یہ سفید بال نوچ کر ہوا میں اڑادوں۔ اورنگ زیب سمجھتا ہے ہم قیدی ہیں۔ نادان! مغل شہنشاہ ایک نظر کی جنبش سے تجھے راہ راست پر لاسکتا ہے۔ آہ۔ دارا۔ میرے دل کا سکون۔

(آگے بڑھتا ہے اور نیچے کی طرف گھورتا ہے)

(جہاں آرا کا سنبھالنا)

**جہاں آرا :-** اعلیٰ حضرت! آپ وہاں نیچے کیا دیکھ رہے ہیں ؟

**شاہجہاں :-** جہاں آرا۔ ہٹ جا۔ وہ دارا کو لیے جا رہے ہیں۔ ہم اسے بچائیں گے۔ اس کا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔ ہٹ جاؤ۔ خبردار!

**جہاں آرا :-** آپ اب کیسے بچا سکتے ہیں ظل الٰہی! دارا شکوہ کو ہم اب کہاں پائیں گے۔

**شاہجہاں :-** آہ ظالموں نے اسے کیا کر دیا۔ کہاں چھپا دیا۔

(تیزی سے آگے بڑھتا ہے دونوں شہزادیاں آگے پیچھے ساتھ دوڑتی اور سنبھالتی ہیں)

**شاہجہاں :-** ہم پاگل نہیں ہو گئے ہیں جہاں آرا! سمجھ کر بات چیت کر سکتے ہیں۔ کوشش کر کے اپنا مطلب سمجھا سکتے ہیں۔

**جہاں آرا :-** میں جانتی ہوں۔ اعلیٰ حضرت!

**شاہجہاں :-** لیکن ہمارا دل ٹوٹ چکا ہے۔ دارا۔ شجاع۔ مراد کوئی بھی نہیں۔

**جہاں آرا :-** خدا جانے کیا ہوا ہے۔ اور کیا ہونے والا ہے۔ خدا اعلیٰ حضرت کو تسکین دے۔

**شاہجہاں :-** یہ کون۔ یہ کون ہے ؟

**جہاں آرا :-** شہزادے اعظم تم یہاں ؟

**شہزادہ اعظم :-** اعلیٰ حضرت۔ مجھے ابا حضور نے بھیجا ہے۔ یہ عریضہ حاضر خدمت ہے۔

**جہاں آرا :-** (جوش سے) غضب۔ اب یہ کوئی نیا شگوفہ کھلنے والا ہے۔

**اعظم :-** نہیں پھوپھی حضرت۔ غلام یہ عریضہ لے کر حاضر ہوا ہے۔ ابا حضور کا معافی نامہ۔ اور یہ پانچ سو اشرفیاں اور چار ہزار دینار نذر۔

**جہاں آرا :-** کسی لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت نہیں۔ اعظم سب کچھ سامنے آ چکا ہے۔

**شاہجہاں :-** کہنے دے جہاں آرا۔ اعظم، اورنگ زیب کو بہر صورت ہمارے پاس آنا چاہئے تھا۔

اعظم :۔ اعلیٰ حضرت! ابا حضور نے ہر چند کوشش کی۔ کئی بار حاضری کا ارادہ ہوا مگر غلط خبروں کے جال سے نہ نکل سکے۔ ابا حضور کو ان حالات سے بہت غم ہے۔ وہ بہت نحیف ہو گئے ہیں۔ صحت بھی اچھی نہیں۔

شاہجہاں :۔ نحیف ہو گیا ہے۔ اورنگ زیب۔ میرا باغی سپہ سالار، میرا بچہ بیمار ہے۔ اورنگ زیب!

اعظم :۔ یہ سب خانہ جنگی کی مصیبت نے کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت کتنی بھاری غلط فہمی کیسی جھوٹی باتیں!

شاہجہاں :۔ یہ پڑھو۔ یہ عریضہ پڑھو اعظم! (عریضہ)

اعظم :۔ اعلیٰ حضرت!

بعد ادب التماس ہے کہ جو کچھ غلط فہمیاں اس دوران میں ہوئیں وہ درمیان کے غلط سمجھانے والوں کے باعث ہوئیں۔ ظلِ الٰہی کے علم میں برخود غلط لوگوں نے حقیقت نہ آنے دی اور فدوی کو موردِ عتاب والزام قرار دیا۔ اعلیٰ حضرت کے حضور میں فدوی حاضر ہو کر حقیقت آشکار کرنا چاہتا ہے۔ اور معافی کی غرض سے اجازت کا طلبگار ہے

فدوی
محی الدین اورنگ زیب

شاہجہاں :۔ میرا لختِ جگر۔ میرا جی بیٹھا جاتا ہے۔ خدایا۔ یہ سب کیا عجیب خواب۔

جہاں آرا :۔ کیا خوب۔ اورنگ زیب۔ یہ تو خوب تماشہ ہے۔ بزرگ باپ شہنشاہ کو مغالطہ دے رہا ہے۔

شاہجہاں :۔ خاموش۔ جہاں آرا۔ خاموش۔ میرا بیٹا مجھ سے معافی مانگ رہا ہے۔ میں باپ ہوتے ہوئے اسے کیسے ٹھکرا سکتا ہوں۔

جہاں آرا :۔ آپ کو کیا خبر۔ باپ کے دل کا طوفان تو نہیں جان سکتی۔ میرے دل میں کیا قیامت مچی ہوئی ہے۔

جہاں آرا :۔ ظلِ الٰہی۔ وہ بیٹا جس نے حکومت کے لیے باپ کو قید کیا۔ اس کے خواب کی ایسی خوشگوار تعبیر!

اعظم :۔ پھوپھی حضور۔ ہم نے سلطنت کی حفاظت کے لیے قلعہ پر پہرہ لگایا۔ اور جہاں پناہ کی حفاظت کے لیے قلعہ بند کیا۔ اب قلعہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یہ تاج حاضر ہے۔ تخت راہ دیکھ رہا ہے۔ اعلیٰ حضرت تشریف لے چلیں۔ اور اس کو رونق بخشیں یہ حکومت کا خواب ——

شاہجہاں :۔ نہیں ہمیں تاج و تخت کا ارمان نہیں۔ ہمیں یہ کچھ نہیں چاہیئے۔ اب یہ سب اورنگ زیب کا ہے۔ اور خواب! بیٹا۔ وہ یاد نہ دلاؤ۔ ان سب کی معافی۔

جہاں آرا :۔ اعلیٰ حضرت! بھائی داراشکوہ کے قتل کی معافی نہیں۔ سب گستاخیوں کی معافی۔

**شاہجہاں:** ۔ کچھ نہ کہو جہاں آرا۔ اب وہ کہاں۔ اب سمجھ لینے دے۔ تلخیوں کو بھول جانے دے
چھ سات برس کے غم اور جدائی کو بھلا دے۔ پاگل بنا دینے والے صدموں کا بدل آج اس
تھوڑی سی خوشی سے بھول جانے دیتے اور تو بھی اورنگ زیب کو معاف کر دے اعظم اورنگ زیب
کی طرف سے تم جہاں آرا سے معافی مانگو۔

**اعظم:** ۔ پھوپھی حضور ہمیں معاف کیجئے۔

**جہاں آرا:** ۔ اعظم۔ یہ تم کہہ رہے ہو مگر اورنگ زیب کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔ اور میرے دل میں باپ
کی محبت کا جوش نہیں جو اب آسانی سے ان باتوں کو بھلا دوں۔

**شاہجہاں:** ۔ اورنگ زیب بھی تیری طرح بے ماں کا ہے۔ معاف کر بیٹی۔ اس کی ماں اگر اس وقت
زندہ ہوتی تو وہ کیا کرتی جہاں آرا۔ اپنی اولاد کی محبت تمہاری ماں میرے پاس امانت رکھ گئی ہے۔
اس کی آخری وصیت مجھے یاد ہے۔ یہ سامنے کے پردے اٹھا دے۔

(جہاں آرا اب بھی چپ ہے)

جہاں آرا آنکھ اٹھا کے دیکھ۔ اس نورانی صبح کے وقت جمنا کی طرف دیکھ۔ وہ کیسی صاف ہے تیری
ماں کے دل کی طرح شفاف۔ اور دیکھ محبت کے آنسوؤں کا سفید ڈھیر۔ جدائی کے صدموں سے
پتھرائی ہوئی آنسوؤں کی کہانی۔ یہ خاموش، ساکت، بے داغ محل، تاج! اس نورانی محل کی
طرف دیکھ۔ اور سب کچھ بھلا دے۔ اور یہ سمجھ بیٹی تو اس دنیا کو جتنا خراب سمجھتی ہے وہ ایسی نہیں۔
بادل چھٹ چکے۔ طوفان کی تاریکی ختم ہو رہی ہے۔ صبح کے کا طوفان! آہ۔ تارے نکلتے
آرہے ہیں۔ وہ دیکھ۔ تاج پر چاندنی چٹک رہی ہے۔ (جہاں آرا کی ہچکیوں کی آواز)
آ ہم بھی یہ دو دن کی چاندنی دیکھ لیں۔

(جہاں آرا روتی رہتی ہے)

جہاں آرا صبر۔ میری نور عین صبر! صبر!!

(شاہجہاں اور جہاں آرا دونوں خاموش تاج محل کے منظر کو دیکھتے رہتے ہیں۔ جہاں آرا روتی رہتی ہے۔ رفتہ رفتہ تاریکی چھا جاتی ہے)

# نفرت کا بیج

از

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایم اے

# افرادِ تمثیل

(جس ترتیب میں سامنے آتے ہیں)

| | |
|---|---|
| سرفراز | ایک چھاپے خانے کا مالک |
| خاور | رضی کا کتا |
| اجمل | وجاہت کا متلاشی |
| شاکر | امتیاز کا وفادار دوست |
| امتیاز | ایک نیک سیرت دوست |
| افسر | امتیاز کا ملازم |
| اختر | خود غرض دوست جو مایوسی کے بعد دشمن بن جاتا ہے |
| سلیمہ | امتیاز کی بیوی |
| اکرام | امتیاز کا دوست، نواب صاحب کا معتوب |
| کوتوال | |
| محرر | |
| سپاہی | |

زمانہ ——— بیسویں صدی

محلِ وقوع ... ایک دیسی ریاست کا دارالسلطنت اور برطانوی ہندوستان کا ایک شہر

# پہلی مجلس

ایک وسیع کمرہ ہے ۔ کمرے کی وسعت سے اگر مکان کی وسعت
کا اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت بڑا مکان ہے ۔
کمرے میں نہایت عمدہ اور قیمتی سامان ہے ، جس سے صاحب
مکان کے ذوق سلیم کا اندازہ ہوتا ہے ۔ سامان سے ہی یہ
بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کمرہ نشست گاہ ہے ۔ فرش پر عمدہ اور
نفیس ایرانی قالین ہیں ۔ صوفے آرام دہ اور خوش وضع ہیں ، میزیں
منبت کاری کا عمدہ نمونہ ہیں ۔ ان میں سے اکثر کشمیر کی بنی ہوئی ہیں ۔
ایک کونے میں بخاری ہے ۔ اس کے اوپر بعض نوادر رکھے ہوئے
ہیں اور اکثر مغل نقاشوں کے شاہکار ہیں ۔ جنھیں معلوم ہوتا ہے کہ
بڑی محنت سے جمع کیا گیا ہے ۔ غرض معلوم ہوتا ہے کہ صاحب خانہ
کے پاس دولت ہے ۔ اور وہ دولت کو خرچ کرنا جانتا ہے ۔ ۔
۔۔۔۔ اس کمرے میں پشت کی جانب یعنی اس سمت جو اس وقت
ناظرین کے سامنے ہے کوئی دروازہ نہیں ہے ۔ ایک دروازہ داہنی
طرف ہے ۔ دوسرا دروازہ بائیں ہاتھ کی طرف ہے جو حاضرین سے
قریب اور پشت کی دیوار سے دور ہے لیکن وہ نظر نہیں آتا اس لیے
کہ اس کے سامنے ایک پردہ پڑا ہے ( ۔۔۔ جس وقت پردہ اٹھتا
ہے تو کمرے میں تین آدمی داخل ہوتے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ ان میں

سے ایک شخص کے بشرے سے معلوم ہوتا ہے کہ عادتاً خوشامدی
اور کینہ پرور ہے ...... لیکن اس وقت وہ مسکرا رہا ہے۔
اس کا نام اجمل ہے۔ دوسرا شخص خوبصورت تو کیا بدصورتی میں
بھی ممتاز ہے۔ رنگ کالا ذرا چپٹی ناک اور منہ پہ چیچک کے داغ
بشرے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت چالاک آدمی ہے ...... تیسرا
آدمی دبلا پتلا اور ذرا جھک کر چلنے والا ہے۔ یہ کبھی آنکھیں ملا کر
کسی سے باتیں نہیں کرتا۔ اور دونوں ہاتھوں کو عام طور پر
ملائے رکھتا ہے۔ اگر ہمارے لیے اس سے ہاتھ ملانا ممکن ہوتا
تو ہم دیکھتے کہ اس کے ہاتھ ہمیشہ پسینہ سے تر رہتے ہیں اور ان پر
ہڈی اور چمڑے کے علاوہ گوشت کا نام نہیں ہے .........

دوسرے آدمی کا نام سرفراز اور تیسرے کا خادم ہے ...... ہمیں
چونکہ ان تینوں کی ساری زندگی معلوم ہے ہم ان کے بشرے کو
دیکھ کر ان کے دل کا حال بتا سکتے ہیں۔ لیکن کسی فراخ دل ناتجربہ کار
یا ایسے شخص کا جو دھوکہ کھانے سے پہلے کسی انسان کی طرف
سے بدظن ہونا گناہ سمجھتا ہے ان کے پنجہ میں پھنسنا کچھ
ایسا دشوار نہیں ہے ...... یہ تینوں آکر قریب بیٹھ
جاتے ہیں)

**سرفراز۔** آدمی بالکل پاگل ہے ...... ناتجربہ کار، محض گاؤدی۔

**خادم۔** ابی اسے انگلیوں پہ نچاؤ ......... ایسوں سے کام نکالنا چاہیئے۔
بیوقوفوں کا بس ایک مصرف ہے کہ عقلمند ان سے فائدہ اٹھائیں۔

**اجمل۔** اس نے پڑھ لکھ کر ڈبو دیا۔ ادبی دنیا میں اس کا شہرہ ہے۔ علمی قابلیت مسلم ہے ...... لیکن

قوتِ عمل بالکل نہیں۔

خاور۔ قوتِ عمل؟ کتاب کے کیڑے میں قوتِ عمل کہاں سے آئی؟

سرفراز۔ نہیں تم نہیں جانتے ...... میں اسے جانتا ہوں اس میں قوتِ عمل بلا کی ہے۔ لیکن گدھا ہے۔ دھوکے میں آ جاتا ہے۔ آدمی کو نہیں پہچانتا۔

اجمل۔ ہاں اسی لیے تو عمل کی دنیا میں ناکام ہے۔ مردم شناس ہو تو پھر دھوکا کیوں کھائے۔ یہ دنیا بے وقوفوں کے لیے نہیں ہے، خیر اس پہ ذرا روغن قاز ملو اور شیشے میں اتارو اسی کی طرف سے خدشہ ہے اگر یہ راستے میں حائل نہ ہو تو پھر کوئی مشکل نہیں۔

خاور۔ یہ کیا دشوار ہے؟ خوشامد بہر کرا کر دی خوشامد!

سرفراز۔ نہیں ہم سے تو کسی کی خوشامد ہوتی نہیں ...... لیکن اجمل کے ہم نیازمند ہیں، سچی بات ہے۔ ان کی وجہ سے گدھے کو بھی باپ بنالیں گے۔

خاور۔ بات یہ ہے کہ یہ اگر اس جگہ پر ہو جائیں تو ہمارا بھی دل خوش ہے۔ ہم تو خیرخواہ ہیں ......
(اجمل کی طرف متوجہ ہو کر) آپ کو خواہ یقین آئے یا نہ آئے، لیکن ہمارے دل میں آپ کی طرف سے ایسی عقیدت ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

سرفراز۔ بھئی یہ بات ہے کہ محبت آسمان سے تو برستی نہیں۔ آدمی کی مہربانی اور اخلاق سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

خاور۔ اور آپ کی نوازشیں تو ایسی ہیں کہ دشمن کو گرویدہ کر لیں۔

سرفراز۔ اجی دشمن گرویدہ ہیں۔

اجمل۔ یہ آپ کی نوازش ہے ...... اب تک یہ حضرت آئے نہیں!

خاور۔ ملازم نے کہا ہے ذرا دیر میں آتے ہی ہوں گے۔

اجمل۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ نواب صاحب اس شخص کے اتنے گرویدہ کیوں ہیں؟

سرفراز۔ ایک بے وقوف دوسرے کا ہمیشہ گرویدہ ہوتا ہے۔

**اجمل** - بات یہ ہے کہ اس کی نام نہاد نیکی کا لوگوں پر اثر پڑتا ہے ....... بیوقوفی کو دنیا نیکی سمجھ لیتی ہے اور پھر اس کی گرویدہ ہو جاتی ہے۔

**خاور** - ایسا گاؤدی آدمی اتنی ہمت اور ہوشیاری کہاں سے لائے کہ دوسرے کو نقصان پہنچا سکے .... ..... اسی لیے لوگ اسے فرشتہ سمجھتے ہیں۔

**اجمل** - اجی سازش ہے۔ ایسے آدمی سے بچنا چاہیے۔ میں خوب جانتا ہوں یہ سب نیکی اور بھولاپن بناوٹی ہے۔

**خاور** - بس آپ نے جناب پہچانا ہے اس آدمی کو ........ ورنہ محض بھولے پن سے نواب صاحب کو شیشے میں اتار لینا ممکن نہیں۔

**سرفراز** - یعنی سب سے زیادہ مکاری یہ ہے کہ آدمی اپنی مکاری کو بھی چھپالے۔ یہ اجمل کی مردم شناسی ہے کہ اس آدمی کو تاڑ لیا۔

**خاور** - (پاؤں کی آہٹ سن کر) دیکھو کوئی آتا ہے۔ ممکن ہے وہی ہو!

(شاکر داخل ہوتا ہے ...... زیادہ عمر نہیں ہے اور صورت سے مخلص معلوم ہوتا ہے)

**شاکر** - آداب عرض!

**اجمل** - آداب عرض (شاکر تینوں سے مصافحہ کرتا ہے)

تشریف رکھیے (سب بیٹھ جاتے ہیں)

**شاکر** - امتیاز صاحب تشریف نہیں رکھتے؟

**سرفراز** - ملازم نے کہا ہے کہ آتے ہی ہوں گے ........ خدا جانے کہاں غائب رہتے ہیں۔ گھر پر تو ملتے نہیں۔

**شاکر** - کام بہت رہتا ہے .......... نواب صاحب ہمیشہ مشورے کے لیے طلب کرتے رہتے ہیں۔

خاور۔ (جی اپنے جوڑ توڑ میں لگے رہتے ہیں۔ انسان کے دل میں آگے بڑھنے کی خواہش ہی پیدا نہ ہو۔ ایک مرتبہ اگر پیدا ہوگئی تو خدا حافظ ہے۔

شاکر۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ ان جیسا بے غرض اور مخلص آدمی دنیا میں مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ مجھ پر ان کے اتنے احسان ہیں اور میں انھیں اتنی اچھی طرح جانتا ہوں کہ......

سرفراز۔ (بات کاٹ کر) درست ہے۔ آپ تو ان کے عزیز دوست ہیں.......

خاور۔ جی ہاں۔ لیکن ان بڑے آدمیوں کی دوستی بھی حواری پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے...... ان میں اخلاص کہاں سے آیا؟

شاکر۔ آپ کا خیال ہے...... مجھ جیسے حواریوں سے ان کا کیا فائدہ؟ (اجمل کی طرف متوجہ ہو کر) آپ محض ملاقات کے واسطے تشریف لائے ہیں یا کچھ کام بھی ہے؟

اجمل۔ مجھے ذرا سا کام بھی ہے۔

شاکر۔ ایسا کام تو نہیں کہ میں حارج ہوں؟

اجمل۔ جی ایسا کیا کام ہوتا؟ بہرحال میں تخلیہ میں گفتگو کر لوں گا۔

(باہر سے موٹر کے آنے کی آواز آتی ہے)

معلوم ہوتا ہے تشریف لے آئے۔

شاکر۔ مجھے تو بس ایک بات عرض کرنا تھی۔ میں آپ کی صحبت میں کیوں مخل ہوں۔ باہر جا کر عرض کر دوں گا۔

اجمل۔ آپ ہمارے سامنے نہیں کہنا چاہتے...... خیر مناسب ہے۔ آپ وہاں جا کر گفتگو کر لیں...... جب تشریف لائیں گے تو میں گفتگو کر لوں گا۔

شاکر۔ مناسب ہے۔ (جاتا ہے)

خاور۔ خوشامدی ٹٹو۔ دل میں تو یہ بھی وہی کہتا ہوگا جو ہم کہتے ہیں لیکن زبان پر تعریف ہی تعریف ہے۔

سرفراز۔ ابھی حمد و ثنا کی تسبیح پڑھتا ہے۔ ایسے لوگوں سے مجھے تلخی ہے جو خوشامد میں غرق ہوں!

خاور۔ کہو تو دو ایک ایسی جماؤں کہ ان کی اکڑ جائے۔

سرفراز۔ ہاں بھئی ایسوں کا یہی علاج ہے۔

اجمل۔ ابھی مشکل ہے!

خاور۔ کیا مشکل ہے؟ دیکھتے رہو کیسی جماتا ہوں۔

سرفراز۔ اسی صحبت میں رہے۔ دیکھیں کیا جادو کرتے ہیں؟

خاور۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانا مناسب نہیں ہے۔ لیکن دیکھو۔

اجمل۔ یہ شاکر خود کوشش نہ کر رہا ہو۔

خاور۔ ممکن ہے کر رہا ہو، لیکن ناممکن ہے..... عمر کم ہے۔

اجمل۔ اور تجربہ کچھ نہیں۔

سرفراز۔ ابھی آپ کو کہاں پہنچتا ہے!

خاور۔ بھلا پہنچ سکتا ہے؛ ناممکن!

(کسی کے پاؤں کی آہٹ ہوتی ہے..... معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص دروازے میں داخل ہوا)

اجمل۔ معلوم ہوتا ہے آ گئے۔

(باہر سے امتیاز کی آواز آتی ہے)

امتیاز۔ (زور سے) شاکر! اطمینان رکھو، میں آج ہی کوشش کروں گا۔

(امتیاز داخل ہوتا ہے۔ کشادہ پیشانی، کشیدہ قامت، چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوچنے کا عادی ہے لیکن آنکھوں میں اب تک بچپن کی سادگی ہے۔ اور مسکرانے کے طریقے

سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش مزاج ہے سب کھڑے

ہو جاتے ہیں۔ سلام کے بعد مصافحہ ہوتا ہے)

تشریف رکھیے۔ (سب بیٹھ جاتے ہیں۔ امتیاز خود بھی بیٹھ جاتا ہے) معاف کیجیے گا۔ آپ کو انتظار

کرنا پڑا۔ مجھے اتفاق سے دیر ہو گئی۔

**اجمل** ۔ جی ہاں آپ کی مصروفیات کا کیا ٹھکانا ہے۔

**سرفراز**۔ تمام ریاست کا کام آپ کے شانوں پر ہے۔ دنیا بھر کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

**امتیاز**۔ یہ تو درست نہیں ہے۔ البتہ بعض اہم معاملات میں نواب صاحب مشورہ کے لیے طلب

فرما لیتے ہیں . . . . . . .

نواب صاحب نے جب سے آپ کو مشورے میں شریک فرما لیا ہے ریاست کی حالت بدل گئی ہے۔

. . . . . اس حسن انتظام کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔

**امتیاز**۔ یہ آپ حضرات کی محبت ہے کہ آپ ایسا فرماتے ہیں۔ درنہ حقیقت یہ ہے کہ تمام امور میں نواب

صاحب کی رائے صائب ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ مشورہ سب سے لے لیتے ہیں۔ لیکن فیصلہ خود غور

فرما کر کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی کے مشورے کو نہیں مانتے۔

**خاور**۔ آپ کے مشورے کو کیونکر ٹال سکتے ہیں؟ اگر ٹالیں گے تو نقصان کریں گے۔

**سرفراز**۔ ایسے مشیر کسی کو کہاں ملتے ہیں؟ اور یہ نواب صاحب کی قدردانی ہے کہ انھوں نے

آپ کو منتخب کیا۔

**امتیاز**۔ قدردانی نہیں، قدر افزائی ہے۔

**اجمل**۔ ہم نواب صاحب کی قابلیت کے اس دن سے قائل ہو گئے جس دن سے انھوں

نے آپ کو منتخب کیا ہے۔

**خاور**۔ جی ہاں! حاکم کی قابلیت کا یہ کوئی معمولی ثبوت نہیں ہے کہ وہ صحیح مشیروں کا

انتخاب کرے۔

**سرفراز۔** غور فرمائیے نا کتنی ایسی ریاستیں ہیں جو مشیروں کی کوتاہ بینی سے خراب ہو رہی ہیں۔

**امتیاز۔** یہ آپ کا حسن ظن ہے کہ میرے متعلق ایسا خیال کرتے ہیں۔

**اجمل۔** حقیقت یہ ہے کہ ہمیں آپ سے ایسی عقیدت ہے کہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔

**سرفراز۔** آپ کے سامنے کیا عرض کروں۔ ہم نوجوان بھی بیٹھتے ہیں آپ کی تعریف کرتے ہیں اور ہم کیا دنیا تعریف کرتی ہے۔

**خاور۔** ہمارے لیے تو یہ امر مزار افتخار کا سبب ہے کہ آپ کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل ہے۔

**سرفراز۔** اسی وجہ سے ہمیں یہ جرأت ہوئی ہے کہ جو بات بھی ہو آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کر دیں۔

**امتیاز۔** یہ عین نوازش ہے کہ آپ حضرات اس قدر کرم فرماتے ہیں۔

**اجمل۔** آپ کی خدمت میں حاضری تو ہمارے لیے سعادت ہے۔

**امتیاز۔** آپ مجھے ناحق شرمندہ کرتے ہیں۔

**سرفراز۔** اس وقت بھی حاضری کا ایک سبب تھا۔ اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔

**امتیاز۔** ضرور فرمائیے۔

**خاور۔** آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت گورنمنٹ اور ریاست کے مابین بعض اہم معاملات کے متعلق گفت و شنید ہو رہی ہے۔

**امتیاز۔** جی ہاں! میرے علم میں ہے

**خاور۔** ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ اس وقت اس سلسلہ میں وکیل کا تقرر جو عمل میں آئے گا اس میں آپ ایک سفارش کر دیں۔

**امتیاز۔** کیا، فرمائیے، میرے امکان میں ہوگا تو میں کر دوں گا۔

**خاور۔** ہماری خواہش ہے کہ اس جگہ اجمل صاحب مقرر ہو جائیں

**سرفراز۔** بات یہ ہے کہ اس جگہ کے لیے ان سے زیادہ موزوں کوئی شخص مشکل سے ہی ملے گا۔

**اجمل۔** مجھے اس قسم کے کام میں کچھ تجربہ بھی ہے۔ اس سے پہلے ایک معاملہ میں جو تقرر ہوا تھا۔ اس میں میں وکیل کے مددگاروں میں سے تھا۔

**امتیاز۔** (ذرا غور کرنے کے بعد) یہ معاملہ ایسا ہے جس میں نواب صاحب غالباً خود ہی تقرر کریں گے اور سفارش نہیں مانیں گے۔

**اجمل۔** لیکن اگر آپ فرمائیں تو.........

**امتیاز۔** میرا خیال ہے کہ میرے کہنے کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

**اجمل۔** لیکن اگر آپ سفارش کر دیں تو کیا مضائقہ ہے؟ اور اگر نواب صاحب نے آپ سے مشورہ طلب کیا؟

**امتیاز۔** اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ امیدوار کون کون ہیں....... جب تک پورے حالات معلوم نہ ہوں میں کیونکر رائے قائم کر سکتا ہوں۔

**اجمل۔** ہماری عقیدت مندی اور نیازمندی کا بھی تو کچھ خیال فرمائیے۔

**امتیاز۔** مجھے آپ کی محبت کا کامل خیال ہے اور اگر آپ سے بہتر کوئی امیدوار نہ ہوا تو میں ضرور کوشش کروں گا۔

**اجمل۔** یہ تو آپ کی دیانت سے اس وقت بھی توقع تھی جب کہ ہمیں نیازمندی کا شرف حاصل نہ تھا۔ اب نیازمندی کا بھی خیال فرمائیے۔

**امتیاز۔** یہ خیال فرمائیے کہ یہ موقع ایسا ہے کہ ریاست کی بقا ہونے کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ ایسے موقع پر ہم سب کو ذاتی اغراض سے کنارہ کش ہو کر مسئلہ پر غور کرنا چاہیے۔ میں یہ وعدہ کیونکر کر سکتا ہوں کہ اگر یہ خدمت کوئی بہتر انجام دے سکتا ہو تو اس کے تقرر کی سفارش نہیں کروں گا؟

**اجمل۔** آپ خود تو اس کام کے لیے جانا نہیں چاہتے؟

**امتیاز۔** جی نہیں۔

**اجمل۔** کوئی ایسا شخص تو نہیں ہے۔ جس سے آپ نے وعدہ کر لیا ہو؟

**امتیاز۔** کوئی نہیں ۔

**سرفراز۔** تو پھر آپ یہ وعدہ فرمالیجیے کہ اگر کوئی امیدوار اجمل صاحب ہی کی قابلیت کا ہوا تو آپ انھیں ترجیح دیں گے ۔

**امتیاز۔** یقیناً اگر تمام امور میں یکسانیت ہوئی تو میں اپنے دوست کو ضرور ترجیح دوں گا ۔

(افسر داخل ہوتا ہے)

کیوں ؟ کیا بات ہے ؟

**افسر** حضور ٹیلیفون پر اختر صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں ۔

**امتیاز۔** اچھا آتا ہوں ۔ (افسر جاتا ہے)

(اپنے مہمانوں کی طرف دیکھ کر، اجازت ہے ، ابھی حاضر ہوتا ہوں)

(جاتا ہے)

**خاور۔** پوری طرح جمی نہیں ۔

**سرفراز۔** مجھے تو اطمینان ہے ۔

**اجمل۔** کیونکہ ؟

**سرفراز۔** یہ خود جانا نہیں چاہتے اور نہ کسی اور دوست کو بھیجنا چاہتے ہیں لہٰذا آپ کے لیے ہی کوشش کریں گے ۔

**اجمل۔** اور اگر کوئی امیدوار ہوا ؟

**سرفراز۔** ہوا کرے ! لیکن آپ جیسا امیدوار کہاں سے آئے گا ؟

**اجمل۔** کہیں شاکر تو اس کے ذہن میں نہیں ہے ؟

**خاور۔** ممکن تو ہے ۔

**اجمل۔** بات یہ ہے کہ اس شخص میں اتنی عقل کہاں ہے کہ جھوٹ بول سکے ؟ اگر شاکر ذہن میں ہوتا تو کہہ دیتا ۔

**خاور** ۔ اجی وہ بچہ، ناتجربہ کار، وہ کیا ذہن میں ہو سکتا ہے ۔

**اجمل** ۔ دشمن نتواں حقیر و بے چارہ شمرد ۔

**خاور** ۔ پھر؟

**اجمل** ۔ وہ جو تدبیر سوچی تھی کہ اس کے خلاف کچھ جما دی جائے ۔

**سرفراز** ۔ کیا مضائقہ ہے

**اجمل** ۔ تو رہے ۔

**خاور** ۔ بہت اچھا ۔

(پاؤں کی آہٹ ہوتی ہے ......... سب خاموش ہو جاتے

ہیں سامنے میں امتیاز داخل ہوتا ہے ۔ سب پھر کھڑے ہو جاتے ہیں)

**امتیاز** ۔ تشریف رکھیے ۔

(سب بیٹھ جاتے ہیں)

**خاور** ۔ اگر آپ اجازت دیں تو ایک بات عرض کروں ۔

**امتیاز** ۔ فرمائیے ۔

**خاور** ۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو ناگوار گزرے ۔

**امتیاز** ۔ نہیں ناگوار کیوں گزرے گا ؟

**خاور** ۔ محض اپنی عقیدت کی وجہ سے عرض کرتا ہوں ۔

**امتیاز** ۔ اس قدر تمہید! کیا بات ہے ؟

**خاور** ۔ ابھی اجمل صاحب اور سرفراز صاحب کی موجودگی میں شاکر صاحب کی باتوں سے ایسا مترشح ہوتا

تھا کہ انھیں آپ سے کچھ شکایت ہے ۔

**امتیاز** ۔ شاکر کو؟ شاکر کو شکایت ہو سکتی ہے ؟

**خاور** ۔ بجا ہے، آپ کو یقین آنا دشوار ہے ۔ اس لیے کہ آپ نے ان پر مسلسل نوازشیں کی ہیں .... لیکن

وہ تو بہت شاکی ہیں۔

**امتیاز**۔ (حیرت سے) شاکی؟ کس بات کے؟

**سرفراز**۔ آپ کے برتاؤ کے۔ کہتے ہیں کہ آپ کی نخوت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا اور آپ انسانیت سے پیش نہیں آتے!

**امتیاز**۔ حیرت ہے۔

**خاور**۔ کہتے تھے کہ جب تک نواب صاحب سے گاڑھی نہیں چھنتی تھی یہ حالت نہ تھی۔ اب تو دماغ عرش معلی پر رہتا ہے۔

**اجمل**۔ وہ کسی بات پر بہت ہی ناراض تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کوئی کام عرصہ سے اٹکا ہوا ہے جو آپ نے نہیں کیا۔

**امتیاز**۔ شاکر سے مجھے ایسی امید نہ تھی۔ میں ابھی معاملہ صاف کر لوں گا۔

**خاور**۔ اجی اس کی کیا ضرورت ہے۔ بعض اوقات انسان جذبات سے متاثر ہو کر ایسی باتیں کہہ دیتا ہے جو کبھی مناسب نہیں ہوتیں۔ بعد میں پشیمان ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں پشیماں نہ کرنا چاہیے۔

**امتیاز**۔ لیکن میں تو صفائی کا قائل ہوں۔

**اجمل**۔ صفائی میں عجلت مناسب نہیں ہوتی۔ ہم نے تو اس وجہ سے عرض کر دیا کہ کہیں آپ غلطی میں ہی نہ رہیں۔ اور معاملہ خواہ مخواہ بڑھ جائے۔

**امتیاز**۔ یہ آپ کی عنایت ہے۔

**اجمل**۔ تو اچھا، اب تخفیف تصدیعہ!

**امتیاز**۔ تشریف لے جائیں گے؟

**خاور**۔ جی ہاں، اب تو اجازت ہی دیجئے۔

(سب کھڑے ہو جاتے ہیں)

**اجمل**۔ (مصافحہ کرتے ہوئے) یاد رکھیے گا!

**امتیاز۔** جی ہاں، بھلا بھول سکتا ہوں ، ( قادر اور سرفراز مصافحہ کرتے ہیں ) آپ لوگ تو بہت دنوں میں کہیں آتے ہیں ۔

**اجمل۔** آپ کی مصروفیات کی وجہ سے زیادہ حاضر نہیں ہو سکتے ۔

**امتیاز۔** ایسی کیا مصروفیت رہتی ہے ۔ آیا کیجیے ۔

**اجمل۔** بہت اچھا ۔ حاضر ہوا کریں گے ۔ اب اجازت ہے ۔

**امتیاز۔** آداب عرض (سب آداب عرض کرتے ہیں اور جاتے ہیں) افسر (داخل ہوتا ہے)

(شاکر صاحب کو ذرا بلانا)

**افسر۔** بہت اچھا ۔ (جاتا ہے)

(دو لمحہ میں شاکر داخل ہوتا ہے ۔ امتیاز اتنی دیر ایک رسالہ کی ورق گردانی کرتا ہے جو ایک طرف میز پہ پڑا تھا)

**شاکر۔** مجھے یاد فرمایا ہے ؟

**امتیاز۔** ہاں بیٹھ جاؤ (شاکر بیٹھ جاتا ہے)

شاکر تمھیں مجھ سے شکایت ہے ؟

**شاکر۔** آپ سے شکایت ؟ مجھے آپ سے کیا شکایت ہو سکتی ہے ۔ کیا اس تمام محبت اور نوازش کے بعد جو آپ نے ہمیشہ برتی ہے مجھے کوئی شکایت ہو سکتی ہے ؟

**امتیاز۔** بعض اوقات ایسی باتیں ہو جاتی ہیں جو ناگوار گزریں ۔

**شاکر۔** آپ کو یہ خیال کیونکر ہو گیا کہ مجھے شکایت ہے ۔

**امتیاز۔** تم نے کسی کے سامنے میری شکایت کی ؟

**شاکر۔** حاشا وکلا ! آپ کی شکایت کسی کے سامنے ؟ میں اس قدر کمینہ نہیں ہوں ۔

**امتیاز۔** دو باتیں یاد رکھو ۔ اگر تمھیں اپنے کسی دوست سے شکایت ہو تو اس کے سامنے اس کا اظہار کر دو اور صفائی کر لو ۔ اگر وہ شکایت کا برا مانے تو دوستی کے قابل نہیں ۔ اور اگر تم اپنے دل میں

بات رکھو اور اس سے صفائی کے ساتھ نہ کہہ دو تو تم دوستی کے قابل نہیں اور نہ دوستی قائم رہ سکتی ہے۔

**شاکر۔** درست ہے، لیکن ........

**امتیاز۔** ٹھہر جاؤ۔ ابھی میری دوسری بات باقی ہے ...... اگر کسی دوست سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو یہ سمجھ لو کہ وہ معذور تھا۔ اگر دوست پر اعتماد نہ ہو تو دوستی فضول ہے۔

**شاکر۔** بجا ارشاد ہوا۔ لیکن میرے دل میں نعوذ باللہ کوئی ایسا ہے کہ آپ کے خلاف کوئی خیال ہی پیدا نہیں ہوا۔ حیرت ہے کہ آپ کو یہ خیال کیونکر ہو گیا؟

**امتیاز۔** مجھ سے چند لوگوں نے بیان کیا ہے کہ تم شاکی ہو!

**شاکر۔** وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ سراسر اتہام ہے کہ میں شاکی ہوں۔

**امتیاز۔** مجھے یقین آگیا۔ تم نے نہیں کہا۔

**شاکر۔** وہ کون لوگ ہیں؟

**امتیاز۔** یہ معلوم کرنے سے کیا فائدہ؟ خواہ مخواہ تلخی پیدا ہوگی۔

**شاکر۔** (آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) بتا دیجئے کیا مضائقہ ہے؟

**امتیاز۔** کیا فائدہ؟ اگر کچھ فائدہ ہوتا تو بتا دیتا۔

**شاکر۔** (اسی طرح) آپ کو یقین ہے کہ میں شاکی نہیں ہوں؟

**امتیاز۔** ہاں یقین ہے (گلے سے لگا لیتا ہے) اب تو یقین آگیا؟

**شاکر۔** آپ کے کہنے کا مجھے ہمیشہ یقین ہے۔

**امتیاز۔** مجھے تم پر کامل اعتماد ہے۔ اچھا جاؤ اپنا کام کرو۔

(شاکر جاتا ہے، افسر داخل ہوتا ہے)

**امتیاز۔** کیوں؟ کیا بات ہے؟

**افسر۔** حضور اختر صاحب تشریف لائے ہیں۔

**امتیاز** - بلاؤ - (افسر جاتا ہے ....... امتیاز خود دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ اتنے میں اختر آ جاتا ہے)

**اختر** - امتیاز (اختر کو خوبصورت کہہ سکتے ہیں، گورا رنگ، ناک نقشہ درست، پستہ قد، لیکن آنکھیں چمکتی ہوئی۔ اور چہرے پر ایسے خطوط ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا کا غصہ ور ہے۔ اور اگر کسی سے ایک مرتبہ ناراض ہو جائے تو بخشنے والا نہیں ہے ....... ہاتھوں کو عام طور پر آزاد نہیں رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں کے میل کو دھو دھو کر چھڑا رہا ہے)

**امتیاز** - اختر (بڑھ کر مصافحہ کرتا ہے) آؤ بیٹھو۔ (اختر بیٹھتا ہے) آنے سے پہلے ٹیلیفون کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا تمھیں بھی وقت مقرر کرنے کی ضرورت ہے؟

**اختر** - نہیں یہ بات نہیں ہے۔ یہ وقت ایسا ہی ہے۔ شاید تم گھر پر نہ ہوتے۔

**امتیاز** - ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اچھا کیا کہ معلوم کر دیا۔

**اختر** - بھئی اس وقت تو میں ایک کام سے آیا ہوں، اور تم سے وہ کام بے تکلف کہے دیتا ہوں۔

**امتیاز** - ہاں مجھ سے تکلف کی کیا ضرورت ہے؟

**اختر** - ریاست کا گورنمنٹ سے جو تصفیہ ہے اس سلسلہ میں سُنا ہے کہ کوئی وکیل مقرر ہو گا۔

**امتیاز** - ہاں ہو گا تو!

**اختر** - میں اس جگہ مقرر ہونا چاہتا ہوں۔ تم یہ کام کرا دو۔

**امتیاز** - ذرا سوچ کر کہا اچھی بات ہے۔ میری رائے میں بھی تم سے زیادہ کوئی اور مناسب نہیں ہے۔ یہ کام نہایت عقلمندی اور ہوشیاری کا ہے۔ اور تم اسے انجام دے سکتے ہو۔ نواب صاحب سے ضرور ذکر کروں گا۔

**اختر** - ذکر کیا کرنا ہے۔ بس تم تو مجھے مقرر کرا ہی دو۔

**امتیاز** - بھائی یہ درست ہے کہ نواب صاحب مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے کہ وہ میرے کہنے پر ہی عمل کرتے ہیں۔ ان کی قوت ارادی بہت قوی ہے۔ اور بعض اوقات وہ کسی کی نہیں سنتے اس کے

علاوہ ان کی رائے اکثر درست بھی ہوتی ہے۔

**اختر۔** تم تو اپنی سی کوشش کر دو!

**امتیاز۔** ضرور میں یقیناً کامل کوشش کروں گا۔ اور مجھے امید ہے کہ نواب صاحب مان جائیں گے۔

**اختر۔** بھئی یہ کام کر دو تو بہت ہی اچھا کرو!

**امتیاز۔** میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔

**اختر۔** (کھڑا ہو جاتا ہے) اچھا تو اب جاتا ہوں۔

**امتیاز۔** ایسی عجلت کیا ہے؟ چائے پی کر جانا۔

**اختر۔** نہیں بھئی۔ مجھے اور جگہ بھی جانا ہے اور کسی سے ملاقات کرلوں۔

**امتیاز۔** نذیر صاحب سے مل ہوا اور دو ایک ایسے دیکھو جن سے نواب صاحب عام طور پر مشورہ کرتے ہیں

**اختر۔** اچھا تو وقت خراب کرنا مناسب نہیں۔ تم تو پکے ہو نا؟

**امتیاز۔** بھئی تم میرے دوست ہو اور دوست بھی کیسے عزیز! اس کے علاوہ میں تمھیں ایمانداری سے اس کا اہل سمجھتا ہوں، اگر اہل نہ سمجھا ہوتا تو تم سے کہہ دیتا۔

**اختر۔** اچھا بھئی رخصت۔

**امتیاز۔** اپنی کوششوں کے نتیجہ سے اطلاع دینا۔

**اختر۔** ہاں، ضرور (جاتا ہے)

(افسر داخل ہوتا ہے)

**افسر۔** حضور، بیگم صاحبہ فرماتی ہیں، چائے تیار ہے اور وہ منتظر ہیں۔

**امتیاز۔** اچھی بات ہے۔ (جاتا ہے)

(افسر پیچھے پیچھے جاتا ہے، پردہ گر جاتا ہے)

---

# دوسری مجلس

(وقت ساڑھے سات بجے شام)

(وہی کمرہ ہے جو پہلی مجلس میں تھا۔ جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو سلیمہ بیٹھی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے بہت کچھ دار عورت ہے..... اتنے میں باہر سے امتیاز کی آواز آتی ہے؛

**آواز۔** میں اس وقت تھکا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر میں۔

(سلیمہ کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنے شوہر کے استقبال کے لیے بڑھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شادی کے باوجود ان دونوں کی محبت میں خنکی پیدا نہیں ہوئی ہے...... امتیاز داخل ہوتا ہے اور بیوی کو دیکھ کر مسکراتا ہے)

**سلیمہ۔** بہت دیر لگی؟

**امتیاز۔** ہاں ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں کہ مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔

**سلیمہ۔** کیا؟ پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں؟

**امتیاز۔** ہاں۔

**سلیمہ۔** نواب صاحب نے کسے مقرر کیا؟

**امتیاز۔** مجھے!

**سلیمہ۔** تمھیں؟

**امتیاز۔** ہاں مجھے!

**سلیمہ۔** تمھارا تو بالکل ارادہ نہ تھا!

امتیاز۔ قطعہ برابر نہیں، لیکن مجبور ہو گیا!

سلیمہ۔ کیا ماجرا ہوا؟ تم نے تو اختر کی سفارش کی تھی؟

امتیاز۔ کی تھی اور پوری طرح کی۔ لیکن نواب صاحب اگرچہ ان کی قابلیت کے معترف ہیں۔ لیکن انھیں اس کام کے لیے مناسب نہیں سمجھتے۔

سلیمہ۔ تم نے انھیں بتایا کہ اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

امتیاز۔ غلط فہمی کس قسم کی؟

سلیمہ۔ اختر سمجھیں گے کہ تم نے ان سے وعدہ کیا، اور پھر اپنا تقرر کرا لیا۔

امتیاز۔ نہیں بیگم، تم اختر کو نہیں جانتیں وہ ایسے تنگ خیال نہیں۔

سلیمہ۔ تم اختر کو اچھی طرح نہیں جانتے۔

امتیاز۔ میں نے نواب صاحب سے ہر چند اپنی معذوری کا ذکر کیا۔ لیکن وہ مانتے ہی نہیں .......... ان کا خیال ہے کہ اگر میں نہیں گیا تو ریاست کو سخت نقصان پہنچ جائے گا۔

سلیمہ۔ تمھارا خود کیا خیال ہے۔

امتیاز۔ تمام صورت حال کو ایمان داری سے سمجھنے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرا جانا ہی بہتر ہوگا۔

سلیمہ۔ کیونکر؟

امتیاز۔ میں صورت حال سے اس درجہ واقف ہوں جس قدر کہ خود نواب صاحب، اور اس کے علاوہ جس افسر سے گفت و شنید ہوگی وہ مجھے جانتا ہے۔

سلیمہ۔ ذرا یہ تو غور کر لو کہ کہیں تمھاری خود غرضی تو در پردہ دھوکا نہیں دے رہی ہے۔

امتیاز۔ میں نے کافی غور کر لیا۔ اور مجھے اپنی کوئی خود غرضی نظر نہیں آئی۔ تم خود سوچو مجھے کیا فائدہ ہے؟ اور اگر فائدہ نظر آتا تو میں خود پہلے سے کوشش کیوں نہ کرتا۔

**سلیمہ۔** ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ تمہارے جانے سے ریاست کو فائدہ پہنچتا نظر آتا ہے۔

**امتیاز۔** معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ نواب صاحب نے جس طرح تمام معاملہ پیش کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر میں نہ گیا تو ریاست کو نقصان پہنچے گا۔

**سلیمہ۔** یہ سوچ لو کہ اختر سے بالکل بگڑتی ہے۔

**امتیاز۔** میں اختر کو ایسا نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے کہ جب اختر کو تمام حالات کا علم ہو جائے گا تو وہ ناراض نہیں ہوں گے۔

**سلیمہ۔** افسوس تم دنیا کی روش کو نہیں پہچانتے۔ تم جیسے خود ہو ویسا ہی دوسروں کو سمجھتے ہو۔

**امتیاز۔** سلیمہ! تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ نواب صاحب اختر کو ہرگز نہیں مقرر کریں گے۔ انھیں اس معاملہ میں ان پر اعتماد نہیں۔ اس کے علاوہ ریاست کا فائدہ اسی میں ہے کہ میں وکالت کا فرض انجام دوں۔ ایسی حالت میں اختر کو بُرا نہیں ماننا چاہیے۔

**سلیمہ۔** نہیں چاہیے! لیکن چاہیے اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اختر کو ہرگز بُرا نہیں ماننا چاہیے! لیکن وہ بُرا مانیں گے۔

**امتیاز۔** اختر میں اتنی عقل ہے کہ وہ صورت حال کو سمجھ لیں اور بُرا نہ مانیں۔

**سلیمہ۔** تم اپنی شرافت سے ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہو۔ تم میں اتنی شرافت ہے کہ دوستوں پر اعتماد کرو۔ لیکن اختر میں اتنی شرافت نہیں ہے کہ وہ تم پر اعتماد کریں۔ وہ اسے تمھاری سازش کا نتیجہ سمجھیں گے۔

**امتیاز۔** سلیمہ! اختر میرے دوست ہیں، جب تک وہ میرے دوست ہیں میں انھیں کینہ سمجھنے کا مجاز نہیں ہوں۔

**سلیمہ۔** میرا خیال ہے کہ تم اس قسم کے حسن ظن سے بہت نقصان اٹھاؤ گے۔

**امتیاز۔** پھر میں کیا کروں؟ دوستوں پر اعتماد نہ کروں؟

**سلیمہ۔** میں یہ نہیں کہتی، البتہ یہ ضرور کہتی ہوں کہ دوستوں کو پرکھنے کی کوشش کرو۔ اختر تمھارے گہرے

دوست سہی لیکن وہ بہت خود غرض آدمی ہیں انھیں بہت جلد اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

**امتیاز۔** تم یہ کیونکر کہتی ہو؟

**سلیمہ۔** انھوں نے حشمت کو آج تک نہیں بخشا۔ اگرچہ تم حشمت کو بے قصور سمجھتے ہو۔

**امتیاز۔** خیر، اب جو ہونا تھا ہو چکا۔ میرا خیال ہے کہ تمھارا اندازہ غلط ہے۔ اختر کی طرف سے ایسی بدگمانی نہ کرو۔

(افسر داخل ہوتا ہے)

**افسر۔** حضور خاور صاحب ملنے آئے ہیں۔

**سلیمہ۔** پھر تھوڑی سی سیاست شروع ہو گئی میں جاتی ہوں۔

(اٹھ کر بائیں ہاتھ کے دروازے سے جاتی ہے)

**امتیاز۔** بلاؤ۔ (افسر جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں خاور داخل ہوتا ہے)

**خاور۔** السلام علیکم!

**امتیاز۔** وعلیکم السلام۔ تشریف رکھیے۔

**خاور۔** مبارکباد کے لیے حاضر ہوا تھا۔

**امتیاز۔** کیسی مبارکباد؟

**خاور۔** معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے آپ کو وکیل مقرر کیا ہے

**امتیاز۔** یہ تو کوئی مبارکباد کی بات نہیں ہے۔ میری خواہش تو یہ نہیں تھی کہ میں مقرر ہو جاؤں۔

**خاور۔** نہیں بھلا آپ کی خواہش کیا ہوتی! اس سے آپ کی عزت افزائی نہیں بلکہ عہدے کی عزت افزائی ہے۔

**امتیاز۔** عزت افزائی کا ذکر تو فضول ہے۔ نہ میری عزت افزائی ہے نہ عہدہ کی البتہ نواب صاحب کے اعتماد سے میری عزت افزائی ضرور ہوتی ہے۔

**خاور۔** اس عہدے کے لیے آپ سے زیادہ مناسب کوئی شخص بھی نہ تھا۔ اجمل صاحب سے بھی یہ فرض انجام نہیں پا سکتا تھا۔

امتیاز۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

خاور۔ جناب وکالت وہ بھی ایسے نازک موقعے پر، اور اجمل صاحب! تو یہ بھلا ان سے یہ کام ممکن تھا۔
یہ ریاست کی خوش قسمتی ہے کہ آپ نے یہ عہدہ قبول فرما لیا۔

امتیاز۔ یہ آپ کی محبت ہے۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ میں اگر یہ نہ سمجھتا کہ میں اس کام کو بہتر انجام دے سکوں گا
تو اس عہدے کو قبول نہ کرتا۔

خاور۔ بالکل بجا ہے۔ اگر آپ ریاست کا فائدہ نہ دیکھتے تو یہ وبال اپنے سر کیوں لیتے! اس سلسلے میں ایک
گزارش میری بھی ہے۔ اگر ارشاد ہو تو عرض کر دوں۔

امتیاز۔ ہاں، فرمائیے، ضرور۔

خاور۔ اگر آپ اس خادم کو اپنی ماتحتی میں لے چلتے تو بندہ پرور، ہوتی۔

امتیاز۔ اپنی ماتحتی میں؟ میرے ساتھ تو صرف ایک سیکرٹری جا رہا ہے۔

خاور۔ جی ہاں، میں سیکرٹری کی حیثیت سے جانا چاہتا ہوں۔

امتیاز۔ مجھے افسوس ہے کہ میں شاکر کا تقرر کر چکا ہوں۔

خاور۔ او کے لیے کوئی اور جگہ نکال لیجیے۔

امتیاز۔ میں نے عرصے سے وعدہ کر رکھا تھا کہ موقع ملتے ہی ان کے روزگار کی کوئی صورت نکال لوں گا۔ اس زمانے میں
ایسا موقع آسانی سے نہیں ملتا۔ اگر کوئی اور جگہ ہوئی تو آپ کا خیال رکھوں گا۔

خاور۔ بات یہ تھی کہ میں آج کل بے روزگاری سے بہت پریشان تھا۔ اس وجہ سے عرض کیا۔

امتیاز۔ مجھے اس کا احساس ہے۔ لیکن میں فی الحال مجبور ہوں۔ شاکر کی ضرورت بھی کم نہیں ہے۔ وہ بھی
بے کاری سے تنگ ہیں۔

خاور۔ آپ کو اختیار ہے..... معاف کیجیے گا۔ آپ کا بہت وقت خراب کیا۔

امتیاز۔ نہیں، کچھ مضائقہ نہیں، مجھے افسوس ہے کہ خدمت نہ کر سکا۔

خاور۔ آداب عرض۔

**امتیاز۔** آداب عرض ہے۔ ......... (خادم جاتا ہے)

(اکرم داخل ہوتا ہے، گھبرایا ہوا، پریشان اور غصہ کی

حالت میں، لباس بھی درست نہیں)

**اکرم۔** اب بغاوت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا۔ میں نے ہرچند کوشش کی کہ معاملہ درست

ہو جائے لیکن نہیں ہوتا۔

**امتیاز۔** کوئی تازہ واردات؟

**اکرم۔** تازہ واردات؟ میں نے سُنا ہے کہ مجھے قتل کرنے کی سازش ہو رہی ہے۔

**امتیاز۔** تمھیں قتل کرنے کی؟ کس سے سُنا؟

**اکرم۔** ایک آدمی ہو۔ ساری دُنیا کی زبان پر یہی چرچا ہے۔ سُنا ہے کہ سازش پوری ہو چکی ہے...... مجھ

سے تو یہ کہا گیا کہ آپ بھی اس میں شریک ہیں۔ لیکن مجھے یقین نہیں آیا.............. پھر حقیقت

واضح ہو گئی کہ آپ کو یہاں سے بھیجا ہی اس لیے جا رہا ہے کہ آپ کی عدم موجودگی میں میرا

کام تمام کر دیا جائے۔

**امتیاز۔** تمھارا خیال غلط ہے۔ مجھے نواب صاحب کے خیالات کا پورا علم ہے۔ ان کے ذہن میں کبھی یہ

بات نہیں ہے کہ تمھیں قتل کرایا جائے۔ وہ معاملہ فہم ہیں اور اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم

سے کتنا ہی عناد سہی لیکن تمھیں قتل کرانے سے نقصان ہی نقصان ہے۔

**اکرم۔** نہیں۔ آپ اپنی شرافت کی وجہ سے ایسا حُسن ظن رکھتے ہیں۔ ورنہ میری اطلاع درست ہے۔ خود

ایسے لوگوں سے مجھ تک پہنچی ہے جو آپ کے دوست ہیں۔

**امتیاز۔** تمھاری اطلاع غلط ہے۔ اگر تم خود نواب صاحب سے مل کر غلط فہمیاں دور کر لو تو اچھا

ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ تمھیں خطرناک سمجھتے ہیں۔ لیکن تمھیں خواہ مخواہ نقصان پہنچانا

نہیں چاہتے۔ اگر تمھارا رویہ بدل جائے تو وہ بھی بدگمانی چھوڑ دیں گے۔

**اکرم۔** اصل میں آپ تو کسی کی طرف سے بدظن ہوتے ہی نہیں۔ اس کا کیا علاج ہے۔ ورنہ میں حالات

کو اچھی طرح جانتا ہوں........

**امتیاز**۔ تم میرے کہنے سے مان جاؤ اور کوئی ایسی حرکت نہ کرو کہ تمھیں اور ریاست کو نقصان پہنچے.... مجھے مہلت دو میں اس معاملہ کو سلجھا دوں گا۔

**اکرم**۔ اچھی بات ہے، میں ابھی خاموش رہتا ہوں۔ لیکن جان سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں ہوتی اگر ہوتی ہے تو عزت۔ یہاں جان اور عزت دونوں خطرے میں، لہٰذا اگر آپ کی عدم موجودگی میں کوئی صورت پیش آئی تو پھر جو کچھ بھی ہو مجھ سے جو ہوگا کر گزروں گا۔

**امتیاز**۔ لیکن کسی کام میں عجلت نہ کرنا..... اگر خواہ مخواہ سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے کسی مصیبت میں مبتلا ہو گئے تو ناحق نقصان اٹھاؤ گے۔

**اکرم**۔ اچھی بات ہے، اس وقت خاموش ہوں۔

**امتیاز**۔ ہاں جاؤ اطمینان سے رہو۔ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

(اکرم جاتا ہے، افسر داخل ہوتا ہے)

**افسر**۔ حضور سرفراز صاحب دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔

**امتیاز**۔ انھیں بھی بھیج دو

(سرفراز داخل ہوتا ہے)

آیئے تشریف رکھیے (بیٹھتا ہے) کیونکر تکلیف کی؟

**سرفراز**۔ مبارکباد کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ اچھا ہوا۔ اجمل صاحب مقرر ہو جاتے تو کام پوری طرح انجام نہیں پاتا اور خرابی واقع ہوتی۔

**امتیاز**۔ (حیرت سے) لیکن آپ تو اجمل صاحب کی اس قدر سفارش کر رہے تھے اور ان کے ساتھ آئے تھے۔

**سرفراز**۔ کیا عرض کروں وہ پکڑ لائے۔ انسان دوستی میں مجبور ہو جاتا ہے ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ میرے دوست ہیں مگر انھیں وکالت سے کیا واسطہ تھا وہ سارا بنا بنایا کام بگاڑ جاتا۔

امتیاز۔ سرفراز صاحب میں تو اس کا قائل ہوں کہ انسان جو کچھ کسی کے منہ پہ کہے وہی اس کے پیٹھ پیچھے بھی کہے۔ مجھے یہ بہت بُرا لگتا ہے کہ منہ پر کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ!

سرفراز۔ جی ہاں! یہ ہے تو درست۔ لیکن آپ جانتے ہیں اس کا نام دنیا ہے۔ یہ ایمانداروں کا ساتھ نہیں دیتی۔ اس میں کچھ نہ کچھ مکاری سے ہی کام نکالنا پڑتا ہے۔

امتیاز۔ دنیا میں ایمان داری سے بھی کام نکل سکتا ہے۔

سرفراز۔ جی ہاں نکلتا ہوگا۔ میں نے ایمانداری کو کامیاب ہوتے کم دیکھا ہے۔

امتیاز۔ اگر میں آپ کے کہنے سے اجمل صاحب کا تقرر کرا دیتا تو کتنا نقصان پہنچتا۔

سرفراز۔ میں نے جب سفارش کی تھی تو میرا یہ خیال ہرگز نہ تھا کہ آپ اس پر عمل کریں گے۔ اس لیے کہ مجھے آپ کی عقل مندی پر کامل یقین تھا۔ میں تو صرف اجمل صاحب کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ اگر میں آپ کو اس قدر مدبر اور مردم شناس نہ سمجھتا تو ہرگز سفارش نہ کرتا۔

امتیاز۔ شکریہ! لیکن بعض اوقات انسان اپنی رائے کو دوستوں کی رائے کا پابند بھی کر لیتا ہے..... خیر مبارک باد کا شکریہ! اگرچہ میں نے صرف فرض شناسی سے مجبور ہو کر اس عہدے کو قبول کیا ہے اور اس میں ذاتی وجاہت کے خیال کو مطلق دخل نہیں ہے۔

سرفراز۔ جناب ہو سکتا تھا! آپ اور ذاتی وجاہت کا خیال!۔ دونوں میں تضاد ہے۔ آپ کب تشریف لے جائیں گے؟

امتیاز۔ کل صبح کو۔

سرفراز۔ تو پھر آپ کا زیادہ وقت خراب کرنا نہیں چاہتا..... بس ایک امر قابل گذارش ہے۔ اجازت ہو تو عرض کر دوں؟

امتیاز۔ ضرور، نہایت بے تکلفی سے!

سرفراز۔ آپ کو علم ہے کہ میرا ایک چھاپہ خانہ ہے۔ جو ایک عرصہ سے کام کر رہا ہے۔

امتیاز۔ جی ہاں، معلوم ہے، میری بعض کتابیں بھی چھپی ہیں۔

**سرفراز۔** یہ گذارش بھی کہ آج کل کاروبار کا حال خدا ابتر ہے۔

**امتیاز۔** میں نے اس عرصہ میں کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔

**سرفراز۔** جی نہیں میری گذارش یہ تھی کہ ریاست کا کچھ کام مجھے مل جاتا نہایت مہربانی ہوگی۔

**امتیاز۔** لیکن میں تو کل یہاں سے جا رہا ہوں۔

**سرفراز۔** آپ کا ایک سفارشی خط کافی ہوگا۔

**امتیاز۔** میرا خط۔ کس کے نام؟

**سرفراز۔** مدارالمہام کے نام۔

**امتیاز۔** اچھی بات ہے۔ میں لکھ دوں گا کہ آپ کے چھاپے خانے کو بھی کبھی کبھی کام مل جایا کرے۔

**سرفراز۔** شکریہ، مجھ پر تو آپ نے اتنے احسان کیے ہیں کہ میں بیان بھی نہیں کر سکتا۔ اجازت چاہتا ہوں۔ آداب عرض۔

**امتیاز۔** آداب عرض۔

(ابھی سرفراز جانے بھی نہیں پاتا کہ اختر داخل ہوتا ہے)

**اختر۔** وکیل صاحب آداب عرض۔

**امتیاز۔** اختر بیٹھ جاؤ، میں تمام صورت حال تمھیں سمجھا دوں تا کہ تمھارے دل میں کوئی غلط فہمی نہ رہے۔

**اختر۔** غلط فہمی! میرے دل میں کیا غلط فہمی ہو سکتی ہے؟

**امتیاز۔** (جو اختر کے مقصود کو غلط سمجھتا ہے) یہ تمھاری شرافت ہے کہ تمھیں مجھ پر اس قدر اعتماد ہے۔ مجھے تم سے ایسی ہی اُمید تھی۔

**اختر۔** (جواب غصہ کو ضبط نہیں کر سکتا) ہاں شرافت! میری شرافت پہ اعتماد! کاش تمھیں اپنی شرافت پہ بھی اعتماد ہوتا!

**امتیاز۔** (نرمی سے) مجھے اپنی شرافت پر بھی اعتماد ہے۔ تم ذرا نرمی سے تمام معاملہ تو سن لو!

**اختر**۔(اور بھڑک کر) تمام معاملہ سُن لیں؟ معاملہ یہ ہے کہ تم مجھ سے جھوٹ بولے۔ مجھے دھوکے میں رکھا۔ تم کمینے ہو اور دوسروں سے شرافت کی اُمید رکھتے ہو؟

**امتیاز**۔میرے دل میں تمھاری عزت اس بات سے اور بڑھ گئی ہے کہ اپنے دل کی بات صفائی سے بیان کر رہے ہو۔ مگر تمھاری رائے غلط ہے۔

**اختر**۔ہاں تم تو صفائی کی عزت کرو گے ہی۔ تم تو خود مکار اور جھوٹے ہو لہٰذا صفائی اور سچائی کی عزت ضرور کرو گے!

**امتیاز**۔(پھر نرمی سے) اختر تمھارے غصّہ کی کوئی انتہا ہے؟ اگر تم تمام معاملات کو اچھی طرح سمجھ لیتے تو ایسی باتیں نہ کرو...... مجھ میں ہزار کوتاہیاں سہی لیکن مکاری اور دغا بازی میری طینت میں ہرگز شامل نہیں۔

**اختر**۔(اسی غصّے کی حالت میں) تم نے مجھے دھوکا نہیں دیا؟

**امتیاز**۔(اسی نرمی سے) نہیں

**اختر**۔(اسی غصّے کے ساتھ) تم خود وکیل نہیں بن گئے؟

**امتیاز**۔(نرمی سے) ہاں بن گیا، لیکن ایسے حالات میں کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے نواب صاحب سے تمھاری سفارش کی تھی۔ اور پورا زور دیا تھا لیکن وہ راضی نہیں ہوئے۔

**اختر**۔اور جب تم نے اپنی سفارش اس سے کم زور سے کی تو وہ تمھارے سامنے سجدے میں گر پڑے اور تمھیں وکیل بنا دیا

**امتیاز**۔نواب صاحب سے میں نے وکیل بننے کی درخواست نہیں کی انھوں نے خود ہی زور دیا اور......

**اختر**۔اور تم کو قبول کرنی پڑی۔

**امتیاز**۔ہاں، مجھے قبول کرنی پڑی۔ اس لیے کہ نواب صاحب نے معاملات کی جو صورت بیان کی اسے دیکھتے ہوئے میرا قبول نہ کرنا غداری ہوتا۔

**اختر**۔غالباً میرے خلاف۔

**امتیاز** ۔ اختر تم ذرا غصّہ کو کم کر دو تو معاملہ کو سمجھ جاؤ گے ۔

**اختر** ۔ (نہایت تیزی سے) بس میں سمجھ گیا مجھے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ تمھاری عادت سے اچھی طرح واقف ہو گیا ۔

**امتیاز** ۔ جو حقیقت تھی وہ میں نے بے کم و کاست بیان کر دی ۔ اگر تم ایک دیرینہ دوست اور بہی خواہ کے متعلق بدگمانی سے باز نہیں آ سکتے ۔ تو یہ میری قسمت ہے ۔

**اختر** ۔ جی ہاں ، بدقسمتی ہے . . . . . . . یقیناً بدقسمتی ہے ۔ اس کا تمھیں اس وقت احساس نہیں ہے لیکن انشاء اللہ ہو جائے گا . . . . . . . کر دیا جائے گا ۔ دھوکے باز دل کو ان کی دغا بازی کا ضرور انعام ملنا چاہیے ۔

**امتیاز** ۔ میں اس کے جواب میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ خدا تمھیں غصّے کے بھوت سے نجات دلائے ۔

**اختر** ۔ غصّے کا بھوت ! یہ غصّے کا بھوت نہیں ہے ، یہ فریب اور مکاری کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا جذبہ ہے ۔

**امتیاز** ۔ (ترنم سے) نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت !
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(اختر نہایت غصّہ سے امتیاز کو دیکھتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے ۔ امتیاز تھوڑی دیر تک مبہوت بیٹھا رہتا ہے ۔ تھوڑی دیر میں سلیمہ آتی ہے)

**سلیمہ** ۔ میں برابر کے کمرے میں تھی ۔

**امتیاز** ۔ یہ شخص دیوانہ ہے ؟ غصّے کی کوئی انتہا نہیں ۔

**سلیمہ** ۔ میں نے ہزار بار کہا کہ تم اپنی شرافت سے دوسروں کی طبیعت کا اندازہ لگانا چاہتے ہو ۔

**امتیاز** ۔ گڑے مُردے اکھاڑنے کی کیا ضرورت تھی ۔

**سلیمہ** ۔ جب کسی پست حوصلہ اور تنگ نظر انسان کو کوئی مایوسی ہوتی ہے تو وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا ۔

ناملیمی کو برداشت کرنے کے لیے بھی بلند ہمتی کی ضرورت ہے۔

**امتیاز۔** جب خفقہ کم ہوگا تو آخر کیا افسوس ہوگا۔

**سلیمہ۔** غلط! اس شخص کو تم نہیں جانتے۔ جتنا وقت گزرے گا اس کی نفرت زیادہ ہوتی جائے گی۔

**امتیاز۔** وقت گزرنے پر غصہ دھیمہ پڑ جائے گا۔

**سلیمہ۔** اس شخص کے دل میں کینے کی آگ زیادہ تیزی کے ساتھ بھڑکتی جائے گی۔ اس نے تمھیں دھمکی دی ہے، تم اسے مذاق نہ سمجھو۔

**امتیاز۔** لیکن وہ میرا دوست ہے۔

**سلیمہ۔** اسی وجہ سے اس کے دل میں دشمنی کی آگ اور تیز ہوگئی۔ وہ غیر کو معاف کر سکتا ہے۔ لیکن تمھیں معاف نہ کرے گا۔ اس لیے کہ وہ تم پر اپنا حق سمجھتا ہے۔

**امتیاز۔** اس کا کچھ علاج ہے؟

**سلیمہ۔** میرے نزدیک کچھ نہیں...... تم اپنی شرافت سے علاج کرنا چاہو گے اور اس کا مزاج بدتر ہوتا جائے گا...... خیر دیر ہو گئی چلیے کھانا کھاؤ۔

**امتیاز۔** چلو۔

(سلیمہ جاتی ہے)

افسر!

(افسر داخل ہوتا ہے)

صبح کی گاڑی سے جاؤں گا۔ اسباب تیار رہے۔ بستر، پندرہ بیس دن کے لیے کپڑے، کتابیں میں خود رکھ لوں گا۔

**افسر۔** بہت اچھا حضور!

(امتیاز جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

---

# تیسری مجلس

(تقریباً پندرہ دن کے بعد ، وقت بعد غروب آفتاب)

(ایک ایسا کمرہ ہے جو بظاہر دارالمطالعہ معلوم ہوتا ہے۔ یا اسے دفتر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس لیے کہ اگرچہ مختصر سی کتابیں موجود ہیں لیکن نہ اتنی کہ مالک مکان پر زیادہ پڑھنے کا شبہ ہو۔ میز، کرسی، کاغذات اور دفتر کے دوسرے لوازم موجود ہیں۔ ایک آرام کرسی اور دو چار اور کرسیاں پڑی ہیں ......

کمرے کا سامان خاصہ ہے۔ لیکن اس میں نفاست نہیں ہے۔ اس کا یہ سبب نہیں کہ مالک مکان نے روپیہ نہیں خرچ کیا ہے۔ بلکہ یہ سبب ہے کہ اس میں ذوق سلیم کا فقدان ہے ..... کتابوں کی الماری ایک گوشہ میں ہے۔ میز وسط میں، اور کرسیاں بغیر ترتیب کے ادھر اُدھر پڑی ہیں ....... اس کمرے میں اختر جو صاحب خانہ ہے اور اجمل داخل ہوتے ہیں)

**اختر** ۔ بھئی مجھے چکنی چپڑی باتیں تو آتی نہیں۔ اگر چکنی چپڑی باتیں سننی ہوں تو اس کے لیے امتیاز صاحب موزوں ہیں ...... میں تو صاف صاف کہتا ہوں بری بات لگے تو میرے منہ پر کہہ دینا۔

**اجمل** ۔ جی آپ نے کس کا ذکر کیا!

**اختر** ۔ (خود میز کے سامنے بیٹھتا ہے اور ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے) بھئی بیٹھ جاؤ ..... تم نے سنا ہے کہ امتیاز صاحب کی عیاری کے زخم خوردہ ہو۔

**اجمل** جی ہاں مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے وکیل مقرر کرا دیں گے اور پھر حضرت خود بن بیٹھے۔

**اختر** ۔ اور مجھ سے بھی وعدہ کیا تھا ....... دنیا اسے نیک سمجھتی ہے۔ لیکن ایک ہی دن میں ایک ہی زبان سے دو آدمیوں سے وعدہ کیا۔

**اجمل** ۔ اجی مکاری کا بادشاہ ہے ۔ ہزاروں چھوٹے مرے ہوں گے تب یہ پیدا ہوا تھا ۔

**اختر** ۔ اور پھر بھی ان کی کمی پوری ہوئی تو در کنار، ہزاروں سال تک اور چھوٹا پیدا ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہی ...... پھر؟

ع چہ بیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

**اجمل** ۔ مجھ سے تو آپ جو کچھ کہیں اس کے لیے تیار ہوں!

**اختر** ۔ کہنا آسان ہے ..... کرنا مشکل!

**اجمل** ۔ کہہ کر تو دیکھیے ..... کر دکھاؤں گا!

**اختر** ۔ بہت مشکل ہے اجمل صاحب بہت مشکل ۔ بڑی ہمت کی ضرورت ہے ۔ انتقام لینا آسان کام نہیں ۔

**اجمل** ۔ انتقام؟ لیکن کیسا انتقام؟ یعنی کس قسم کا انتقام، کس طرح؟ میرے ذہن میں تو کوئی طریقہ نہیں آتا ...... جو میرے پاس کسی نوکری کی سفارش کرانے ہے آیا ۔ اس دعا کے علاوہ کہ خدا اسے نیچا دکھائے ۔ میں کیا کر سکتا ہوں ۔

**اختر** ۔ دعا؟ اجی دعا سے کیا ہوتا ہے! جب بوڑھی عورتوں سے کچھ بن نہیں پڑتی تو بد دعا دیتی ہیں ۔ جنگ طرابلس میں مسلمانوں نے بہت دعا مانگی تھی کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں ۔ خیر انتقام اس پر منحصر ہے کہ تم کس حد تک ناراض ہو ...... اگر تمھیں واقعی ایسے شخص کے خلاف غصہ ہے جس نے دوست بن کر تمھیں نقصان پہنچایا تو تم انتقام لے سکتے ہو اور اچھی طرح انتقام لے سکتے ہو ۔

**اجمل** ۔ میں تیار ہوں ..... طریقہ بتاؤ ۔

**اختر** ۔ تم قسم کھاؤ کہ تمھیں جو تدبیر بتائی جائے گی اس کا کسی حال میں کسی دوسرے سے ذکر نہ کرو گے ۔

**اجمل** ۔ میں قسم کھاتا ہوں ۔

**اختر** ۔ (اٹھ کر الماری کی طرف جاتا ہے اور ایک کتاب اٹھا لاتا ہے) یہ قرآن ہے ...... اسے ہاتھ میں لے کر قسم کھاؤ ۔

**اجمل** ۔ (ہاتھ میں قرآن لے کر) میں قسم کھاتا ہوں ۔

اختر۔ اس قسم کے بعد تم میرے بھائی ہو۔

(مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اجمل مصافحہ کرتا ہے)

اجمل۔ آج سے ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اس شخص کا اقتدار ختم ہو جائے۔

(خاور داخل ہوتا ہے)

خاور۔ (اجمل کی طرف اشارہ کرکے) ٹھیک ہیں؟

اختر۔ ہاں کیوں نہیں! کیا اب بھی وہ لوگ جنھیں اس بدمعاش نے نقصان پہنچایا ہے متحد نہ ہوں گے۔

خاور۔ مبارک ہو...... پھر گیا ہے۔ معرکہ جیت لیا ہے۔

(اتنے میں سرفراز داخل ہوتا ہے)

سرفراز۔ (بیٹھ کر) یہ اجمل صاحب ایسے بھولے ہیں کہ خدا کی پناہ! بڑی مشکلوں سے مانے ہیں......

اختر۔ اور اب تک ان کا خیال ہے کہ انتقام دشوار ہے......

سرفراز۔ جناب ارادہ قوی چاہیے، سب ممکن ہے۔

اختر۔ ان شاء اللہ ایسا نیچا دکھائیں گے کہ یاد رکھے۔ اتحادِ عمل کی ضرورت ہے (خاور کی طرف دیکھ کر) ڈاک سے کچھ ہاتھ لگا؟

خاور۔ ہاں ایک خط اکرم کے نام!

اختر۔ کھول کر پڑھا؟

خاور۔ نہیں (لفافہ نکال کر) لو پڑھو۔

(اختر اٹھ کر ایک اسپرٹ لیمپ لاتا ہے اور ایک برتن میں پانی...... لیمپ کو روشن کرکے اس پر پانی رکھتا ہے......) میں نے یہ خط بڑی مشکل سے اڑایا ہے...... امتیاز اور اکرم کی بہت گاڑھی چھنتی ہے...... اکرم نواب صاحب کا دشمن ہے۔ اگر امتیاز کچھ لکھ سکتا ہے تو اسی کو لکھ سکتا ہے۔

سرفراز۔ خیال تو ٹھیک ہے لیکن ذرا مشکل ہی ہے کہ کچھ نواب صاحب کے خلاف لکھے بہت چالاک آدمی ہے!

پھر بھی ممکن ہے لکھ دیا ہو۔

ہاں اسی وجہ سے تو ہم نے چٹھی رساں سے مل کر یہ انتظام کیا ہے۔ کہ جس خط کی مہر سے معلوم ہو کہ

**اختر** ۔ (خط دیتا ہے) دیکھو کوئی صورت نکلتی ہے؟

**سرفراز** ۔ (خط کو غور سے پڑھ کر) خط میں تو کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن ہیں اگر اس میں ادنیٰ تصرف سے

زہر پیدا کر دوں تو قائل ہو جاؤ گے؟

**اختر** ۔ لیکن تم کیا کرو گے؟

**سرفراز** ۔ پہلے مٹھائی کھلاؤ...... اور پھر روپیہ خرچ ہوگا۔

**اختر** ۔ کچھ تو بتاؤ...... کیونکر کرو گے

**سرفراز** ۔ نہایت آسان ہے۔ اس خط کا فوٹو لے کر بلاک بنواتا ہوں...... لائن بلاک ہوگا۔

**اختر** ۔ پھر؟

**سرفراز** ۔ فقرہ فقرہ کٹوا لیا جائے گا اور بعض الفاظ علیحدہ کیا لیے جائیں گے۔ بعض الفاظ کے بلاک زیادہ بنوا لیے

جائیں گے اور پھر ان سب کو ترتیب دے کر ایسا مضمون پیدا کر دیا جائے گا جو بہت زہریلا ہو......

**اجمل** ۔ کیونکر؟

**سرفراز** ۔ دیکھو یہ مضمون بن سکتا ہے سنو!

برادرم! السلام علیکم و رحمتہ اللہ

تمہارا خط آیا، حالات کو پڑھ کر تشویش ہوئی۔ میں واقعی یہ سمجھتا ہوں کہ تم خطرے میں ہو۔

**اختر** ۔ "اس وجہ سے نہیں کہ" کہاں گیا؟

**سرفراز** ۔ اڑ گیا۔ بلاک کے ٹکڑوں کو احتیاط سے کاٹ کر دوبارہ کمپوز کیا جائے گا؟

**اختر** ۔ شاباش، چلو، آگے چلو۔

**سرفراز** ۔ (پڑھتا ہے) تم خطرے کو فرضی نہ سمجھ لو اور دفاع کی کوشش کرو۔

**اجمل** ۔ حقیقی کی جگہ "فرضی" کہاں سے آگیا۔

**سرفراز** ۔ یہی کمپوزنگ کی خوبی، آگے فرضی کا لفظ ہے۔ یہاں سے حقیقی نکال کر فرضی لگا دیا گیا۔

**خاور** ۔ بھئی کمال ہے۔

**سرفراز** ۔ (آگے پڑھتا ہے) ظاہر ہے کہ حالات کے بدتر ہونے کا یقین ہے ۔ اس لیے تم صبر سے کام نہ لو اور عجلت کرو۔

**اختر** ۔ ٹھیک ہے۔ "فرضی خطرے کے دماغ میں" اڑ گیا اور "نہ" "عجلت کے بعد سے اٹھ کر" "کام" کے بعد لگ گیا۔

**سرفراز** ۔ (آگے پڑھتا ہے) نواب صاحب کو نقصان پہنچانے کی کوشش ضروری ہے۔

**خاور** ۔ ضروری کہاں سے لاؤ گے ؟

**سرفراز** ۔ بہت دور سے لایا ہوں ...... خط کے اخیر میں ہے !

**اختر** ۔ اچھا آگے چلو۔

**سرفراز** ۔ (پڑھتا ہے) اور اگر کسی نقصان کا اندیشہ نہ بھی ہو تو بھی پیشقدمی کے طور پر تدبیر اختیار کرنی احتیاط ہے

میری درخواست ہے کہ ہر افواہ کو بے بنیاد نہ سمجھ لو۔ بلکہ یاد رکھو کہ افواہیں بالعموم صحیح ہوتی ہیں اس مشورے کو ضروری سمجھو۔

والسلام

تمہارا مخلص

امتیاز

**اختر** ۔ میں لکھتا ہوں ذرا پھر پڑھنا۔

**سرفراز** ۔ اچھا (پڑھتا ہے) (اختر لکھتا ہے)

برادرم السلام علیکم و رحمۃ اللہ

تمہارا خط آیا۔ حالات کو پڑھ کر تشویش ہوئی۔ میں واقعی یہ سمجھتا ہوں کہ تم خطرے میں ہو۔ تم خطرے کو فرضی نہ سمجھ لو اور دفاع کی کوشش کرو۔ ظاہر ہے کہ حالات کے بدتر ہونے کا یقین ہے۔ اس لیے تم صبر سے کام نہ لو اور عجلت کرو۔ نواب صاحب کو نقصان پہنچانے کی کوشش ضروری ہے اور اگر کسی نقصان کا اندیشہ بھی ہو تو بھی پیشقدمی کے طور پر تدبیر اختیار کرنی احتیاط ہے میری درخواست ہے کہ ہر افواہ کو بے بنیاد نہ سمجھ لو۔ بلکہ یاد رکھو کہ افواہیں بالعموم صحیح ہوتی ہیں۔ اس مشورے کو ضروری سمجھو۔ والسلام

تمہارا مخلص

امتیاز

**اجمل** ۔ بھئی میں تمہارے دماغ کی تعریف کرتا ہوں۔

**خاور** ۔ کمال تو یہ ہے کہ باہر کا ایک لفظ بھی نہیں۔ سب لفظ خط ہی میں سے نکالے ہیں۔

اجمل ۔ اور سارا خط اس طرح امتیاز کے خط میں ہو گا ۔

سرفراز ۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ..... بڑی دیدہ ریزی کی ضرورت ہے بلاک کی سطریں کاٹنی ۔ پھر فقروں کو الگ کرنا اور پھر جوڑ کر
چھاپنا مذاق نہیں ہے ۔ پہلے تو اس خط کا فوٹو لیا جائے گا ۔ پھر بلاک بنے گا ۔ پھر وہ کٹے گا ۔ اور دوبارہ کمپوز
ہو گا اور اس سے خط چھاپ کر اس کی تصویر لی جائے گی اور پھر نیا بلاک بنے گا یہ کام خاصا دشوار ہے اور اس کے لیے روپیہ چاہیئے ۔

اختر ۔ تم روپے کی پروا ... کام شروع کر دو ، کیا خرچ ہو گا ؟

سرفراز ۔ ایمانداری کا کام ہوتا تو بھی خاصہ خرچ ہوتا ۔ اب تو اس کام سے جس جس کا بھی تعلق ہے وہ
رشوت مانگے گا ۔ اور دینی پڑے گی ۔ کچھ نہیں تب بھی کم از کم دو ہزار روپے تو ہوں ۔

اختر ۔ دو ہزار ! دو ہزار تو بہت ہیں ؟

سرفراز ۔ جناب کچھ بھی نہیں ..... پانچ چھ آدمیوں کے ہاتھ سے کام نکلے گا ۔ دو دو سو روپے تو رشوت کے ہوں ۔ اور پھر
خطو بیل تو آپ کا خادم ہوں ۔ لیکن یہ کام فقط میرے ہی بس کا نہیں ہے ۔ اس میں تو کئی آدمی شریک ہوں گے ۔ ان کا
منہ بند کرنا آسان نہیں ہے ۔ ہر شخص خود نہایت آسانی سے بے ایمانی کر لیتا ہے ۔ لیکن جب وہ اپنا ضمیر دوسرے کے ہاتھ بیچتا ہے تو اچھی قیمت مانگتا ہے ۔

اجمل ۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے ۔ دو ہزار اس کام کے لیے زیادہ نہیں ہیں ۔

خاور ۔ (اختر سے) اور دو ہزار سے زیادہ تو آپ پیدا کر لیں گے ..... امتیاز کے بعد وکالت کے لیے آپ سے
زیادہ کون موزوں ہو گا ۔

اختر ۔ لیکن وکالت سے ایسی کیا آمدنی ہو گی ؟ امتیاز تو تنخواہ بھی نہیں لے رہا ہے ، میں بھی بے تنخواہ کے کام کروں گا ۔

خاور ۔ جناب کیا فرماتے ہیں کیا گورنمنٹ سے امتیاز کو رشوت نہ ملتی ہو گی ؟ ان کاموں میں تو گھر بھر جاتے ہیں ۔

اجمل ۔ ہاں یہ کام ہے کرنے کے قابل ۔ اس خط کی تصویر ہر اخبار میں ہو !

سرفراز ۔ نہیں ، ہرگز نہیں ، امتیاز کو تو تردید کا موقع ہی نہ دینا چاہیے ......

اجمل ۔ تردید کیا کرے گا ؟ اس کی مانے گا کون ؟

اختر ۔ اس سے اکرم کا بھی خاتمہ ہے ۔

ع چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار

**خاور۔** اور جناب والا، شاعر بھی رفو چکر، نوکری ختم، خوشامد کا پھل مل جائے گا۔ اب تو مصرعہ درست کرنا پڑے گا۔

چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ سہ کار

**اجمل۔** بس نوٹ ہے..... (سرفراز سے) کتنا عرصہ لگے گا۔

**سرفراز۔** تین چار دن۔

**اختر۔** (خوشی سے اپنے ہاتھوں کو اسی طرح ملتا ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے) بس کام بن گیا، امتیاز کو تو قدر عافیت معلوم ہو جائے گی۔ انتقام کس قدر خوشگوار ہے۔

**سرفراز۔** اچھا، میں تو جاتا ہوں۔ دیر مناسب نہیں ہے۔

**اختر۔** ہاں بھئی جاؤ۔

**سرفراز۔** آداب عرض (جاتا ہے)

**اختر۔** (اجمل سے) بھئی کچھ روپیہ تو تمھیں بھی دینا چاہیے۔

**اجمل۔** ہاں، اس شرط پر کہ اگر وارث ہو تو میں بھی شریک ہوں۔

**اختر۔** ہاں، ضرور

**اجمل۔** اچھی بات ہے دے دوں گا۔ کس قدر؟

**اختر۔** جتنے کے حصہ دار بنو..... ہزار؟

**اجمل۔** اتنا نہیں ہے۔ پانچ سو کا انتظام کر دوں گا۔

**اختر۔** تو جاؤ، انتظام کرو۔

**اجمل۔** اچھا۔ (جاتا ہے)

**اختر۔** یہ بے وقوف اجمل، بالکل احمق ہے۔

**خاور۔** محض گدھا، ایسا نہ ہو کہ پھوٹ پڑے!

**اختر۔** نہیں اسی لیے شریک کر لیا ہے۔ یہ بھی ناراض ہے امتیاز سے، بہت ہی خفا ہے۔ اس لیے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اختر۔ خاور میں تمھیں اپنا سکریٹری بناؤں گا

خاور۔ یہ آپ کی مہربانی ہے ......

اختر۔ لیکن تمھیں اس کے لیے کام کرنا پڑے گا۔

خاور۔ میں حاضر ہوں۔

اختر۔ تم میرے منافع میں شریک رہو گے۔

خاور۔ آپ کے حکم کا مطیع رہوں گا

اختر۔ تو پھر تم کو ایک بہت بڑا کام کرنا پڑے گا

خاور۔ میں حاضر ہوں۔

اختر۔ انعام بڑا ہوگا، اور کام بھی بڑا۔

خاور۔ میں بھی تیار ہوں۔

اختر۔ (پھر وہی قرآن لاتا ہے) تو قسم کھاؤ

خاور۔ (قرآن کو ہاتھ میں لے کر) میں قسم کھاتا ہوں!

اختر۔ ممکن ہے یہاں کوئی آجائے۔ چلو برابر کے کمرے میں چلو۔

خاور۔ چلیے۔

(دونوں جاتے ہیں)

(پردہ)

---

# چوتھی مجلس

## پہلا نظارہ

(وقت دس بجے شب)

(ایک خوابگاہ ہے، مغربی وضع سے آراستہ، کپڑے ٹانگنے کی الماریاں، کپڑے رکھنے کی درازیں، پلنگ، چھوٹی میز، ایک آرام کرسی اور دو ایک کرسیاں قرینے سے چنی ہوئی ہیں۔ جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو ناظرین کو چارپائی اور دو کرسیاں قریب نظر آتی ہیں۔۔۔ آرام کرسی پر اس وقت امتیاز سونے کا لباس پہنے بیٹھا ہے اور ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔۔۔۔۔ دروازے پر کوئی دستک دیتا ہے)

**امتیاز:**۔ آجاؤ۔

(شاکر داخل ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ ہاتھ میں ایک اخبار ہے اور کسی قدر پریشان نظر آتا ہے)

کہو؟ کیا بات ہے۔

**شاکر:**۔ جناب آپ نے یہ اخبار ملاحظہ فرمایا

**امتیاز:**۔ کون سا اخبار؟

**شاکر:**۔ ہمدرد ریاست

**امتیاز:**۔ نہیں، وطن کے اخبارات پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ کوئی خاص بات ہے۔

**شاکر:**۔ جی ہاں، ملاحظہ فرمائیے (اخبار دیتا ہے)

(یہ آپ کے خط کا چربہ ہے)

**امتیاز:**۔ (غور سے پڑھتا ہے، اور ذرا حیرانی کے بعد) جعل سازی، پکی جعل سازی ہیں نے یہ خط اکرم کو ہرگز نہیں لکھا۔۔۔۔۔ میرے خط کے مضمون کو بالکل مسخ کر دیا گیا ہے، لیکن ہر لفظ میرے ہی خط کا ہے۔

شاکر:۔ اس کی تردید ہونی چاہیئے۔

امتیاز:۔ یقیناً میں کل ہی تردید کردوں گا ...... یا ابھی تار سے تردید کردوں۔

شاکر:۔ کیا محض تردید کافی ہوگی؟

امتیاز:۔ ہاں ہونی چاہئے۔ اس لیے کہ کھلی جعل سازی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ میں ایسا خط کبھی نہیں لکھ سکتا تھا۔

شاکر:۔ یہ درست ہے کہ آپ ایسا خط نہیں لکھ سکتے تھے، لیکن جو لوگ آپ کا خط پہچانتے ہیں۔ انھیں غلط فہمی میں ڈالنے کے لیے یہ عکس کافی ہے۔

امتیاز:۔ لیکن اس قسم کے لوگ کون ہیں؟ اس سے کون غلط فہمی میں پڑ سکتا ہے؟

شاکر:۔ خود نواب صاحب! آپ کے دوست۔

امتیاز:۔ نواب صاحب میری طرف سے بدگمان نہیں ہو سکتے۔ انھیں میرے اوپر بہت اعتماد ہے۔

شاکر:۔ آپ اس معاملہ کو اس قدر غیر اہم تصور نہ فرمائیں۔ بدگمانی کو پیدا ہوتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ لہٰذا اس کی تردید بہت جلدی ہونی چاہیئے .. اور میرا تو خیال ہے کہ محض تردید ہی کافی نہیں ہوگی بلکہ تردید کے ساتھ ثبوت بھی ضروری ہے۔ محض آپ کے فرما دینے سے کہ یہ خط آپ کا نہیں ہے۔ کام نہیں چلے گا۔

امتیاز:۔ ثبوت؟ ثبوت کیا ہو سکتا ہے؟

شاکر:۔ اسی لیے میں نے عرض کیا کہ اس معاملہ کو بہت اہم سمجھنا چاہیئے۔ آپ کا اصل خط کہاں ہے؟... معلوم کرنا چاہیئے کہ وہ اکرم تک پہنچا یا نہیں۔

امتیاز:۔ اکرم کے پاس پہنچتا تو وہ کسی کو نہیں دیتا ...... یہ جعل سازی تو کسی طرح اسی خط کو دیکھ کر کی گئی ہے۔

شاکر:۔ اس معاملہ کو خفیہ پولیس کے ہاتھ میں دینا چاہیئے اور نواب صاحب پر تمام حالات کو واضح کر دینا چاہیئے کہ وہ پولیس پر زور ڈال کر معاملے کی تحقیقات کرائیں۔ ورنہ آپ کی ذات پر بڑا حرف آتا ہے۔

امتیاز:۔ اچھی بات ہے ...... نواب صاحب کو میری طرف سے تار دے دو کہ اخبار میں جعلی خط کو دیکھ کر تشویش ہوئی اس لیے اس کی پوری تفتیش کرائی جائے۔ میں خط بھی لکھتا ہوں

شاکر:۔ تار تو میں ابھی دے دوں گا تاکہ علی الصباح نواب صاحب کو مل جائے اور خط آپ کل بھیج دیں......

ذرا سوچ کر بتا دیجیے بہتر ہوگا کہ آپ خط اسی وقت لکھ لیں اور کسی کو کیا رہ بچے کی ڈاک سے بھیج دیا جائے۔

امتیاز:۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟

شاکر:۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے دشمنوں نے ڈاک اور تار والوں سے سازش کی ہے۔ اور آپ کے خط کو ڈاک سے اٹھایا گیا ہے۔

امتیاز:۔ بہت ممکن ہے۔

شاکر:۔ اس لیے ضروری ہے کہ تار اور ڈاک پر اعتبار نہ کیا جائے۔ بلکہ اپنا آدمی بھیجا جائے۔

امتیاز:۔ مناسب ہے کسی کو بھیج دو..... لیکن یہ حرکت کی کس نے؟ اس قسم پیدا دوسری کس کو ضرورت تھی۔

شاکر:۔ میرا خیال ہے کہ یہ حرکت آپ کے دوست اختر کی ہے۔

امتیاز:۔ اختر کی؟ اختر اس قدر کمینہ نہیں ہیں اور انھوں نے میرے خط کے جواب میں لکھا تھا کہ ان کا دل صاف ہے۔ اور اب انہیں کوئی شکایت نہیں ہے

شاکر:۔ آپ کو ان کی طرف سے بہت حسن ظن ہے..... لیکن ان کے علاوہ کسی کی حرکت نہیں ہو سکتی ...... مجھے یقین ہے کہ اگر سرفراز کے مطبع کی تلاشی لی جائے تو تمام جعل کھل جائے۔

امتیاز:۔ سرفراز کے چھاپے خانے کی؟ تمہارا خیال ہے کہ سرفراز بھی اس میں شریک ہے۔

شاکر:۔ سرفراز اور اختر کا دوستانہ ہے اور یہ جعل بغیر مطبع کی مدد کے بن نہیں سکتا۔ یہ جعل ساز اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتے ہیں۔ وہ اتنے ہوشیار نہیں کہ پکڑنے میں نہ آئیں۔

امتیاز:۔ تم ناحق شبہ کرتے ہو۔ مانا کہ چھاپہ خانہ شامل ہے لیکن یہ کیونکر ثابت ہوا کہ سرفراز ہی کا چھاپہ خانہ اس جعل کا ذمہ دار ہے۔ وہ مجھ سے کیوں ناراض ہوگا!

شاکر:۔ آپ کو کیا معلوم! اور دنیا کی تمام ناراضگیاں صرف معقول ہی نہیں ہوتی ہیں۔ زیادہ تر دنیا کامیابی سے ناراض ہوتی ہے..... جب تک کوئی شخص ترقی نہیں کرتا وہ سب کا دوست ہوتا ہے۔ دنیا میں آگے بڑھنا ہی گناہ ہے

امتیاز:۔ تم ایسی باتیں نہ کرو..... دنیا ایسی بری جگہ نہیں ہے۔ نہ دنیا والے ایسے کینے ہیں..... تم معاملہ کو پولیس پر چھوڑ دو۔ وہ جسے قصور وار سمجھے گی گرفتار کرے گی۔ اس کے علاوہ یہ معاملہ اس قدر اہم نہیں ہے

تم جاؤ آدمی کو تیاری کا حکم دے دو۔ میں خط لکھ رکھوں گا تھوڑی دیر میں لے جانا۔

**شاکر:۔** آپ اس پر ضرور زور دیجئے کہ سرفراز کے چھاپے خانے کی تلاشی لی جائے۔

**امتیاز:۔** میں ایسا نہیں کر سکتا!

**شاکر:۔** اس سے سخت نقصان پہنچے گا۔

**امتیاز:۔** پہنچا کرے۔ لیکن میں کسی دوست پر شبہ نہیں کر سکتا۔

(شاکر مایوسی کے ساتھ امتیاز کی طرف دیکھتا ہے اور جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

# دوسرا نظارہ

(وقت ...... اسی رات کو بارہ بجے)

(وہی کمرہ ہے جو پہلے نظارہ میں تھا.... لیکن تاریکی ہے۔ ہم اس وقت کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ ذرا سی دیر میں آنکھیں تاریکی کی عادی ہو جائیں گی۔ اور اگر نہ بھی ہوں گی تو اسٹیج کی روشنی کو ذرا سا تیز کر دیا جائیگا تاکہ ہم اچھی طرح دیکھ سکیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس وقت ہم دیکھ سکیں گے کہ امتیاز آرام سے سو رہا ہے .... ذرا سی دیر میں دروازہ کھلتا ہے اور اس میں ایک شخص داخل ہوتا ہے..... اس کے ہاتھ میں ایک رومال ہے اور وہ اس لیے کہ اس کی انگلیوں کے نشان نہ لگ جائیں کسی چیز کو بھی چھوتا رومال سے پکڑتا ہے۔ دروازہ وہ اس طرح خاموشی سے بند کر دیتا ہے کہ مطلق آواز نہیں ہوتی۔ اور پھر اسے مقفل کر دیتا ہے۔ اور دروازے کے قفل کی کنجی اس کے پاس ہے۔ یہ قفل دروازے میں پیوست ہے جیسا کہ مغربی دروازوں میں ہوتا ہے..... اور اندر باہر دونوں طرف سے بند ہو سکتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ آگے بڑھتا ہے اور اپنی جیب سے ایک رومال اور شیشی نکالتا ہے تو شیشی کی دوا رومال پر ڈالتا ہے۔ اور پہلے اس کی ہوا امتیاز کو دیتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اسے بالکل قریب لے جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر تک قریب رکھتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ڈاکٹر کسی مریض کو کلوروفارم سنگھا رہا ہو۔ جب اسے یقین آجاتا ہے کہ امتیاز بیہوش ہو گیا تو جیب سے دوسری شیشی نکالتا ہے اور اس کی دوا امتیاز کا منہ کھول کر ڈال دیتا ہے اور پھر ناک پکڑ لیتا ہے تاکہ امتیاز منہ سے سانس لینے پر مجبور ہو..... جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ امتیاز کے حلق میں وہ آ گئی تو وہ دوسری شیشی کو میز پر رکھ دیتا ہے اور پہلی شیشی اور رومال کو جیب میں رکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک پتلی سی ڈور جیب میں سے نکالتا ہے، ڈورا سے امتیاز کی انگلی میں باندھ دیتا ہے اور اس کا دوسرا سرا دروازے کی اوپر کی کھڑکی میں سے باہر پھینک دیتا ہے۔ پھر دروازے کو آہستہ سے کھول کر باہر دیکھتا ہے جب یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی نہیں ہے تو باہر نکل جاتا ہے اور دوبارہ آہستہ سے بند کر دیتا ہے۔ تھوڑی دیر میں دیکھتے ہیں کہ کنجی جس سے اس آدمی نے اندر سے دروازہ بند کیا تھا ڈور پر پھسلتی ہوئی آتی ہے اور ہلکے ہلکے جھٹکوں سے امتیاز کی انگلی تک پہنچ جاتی ہے..... اگر اس وقت کوئی قوت دروازے کے اوپر کی کھڑکی پر روشنی ڈالے (اور کوئی سبب نہیں کہ ڈرامہ پیش کرنے والے ایسا نہ کریں) تو ہمیں کھڑکی میں سے قاتل کا چہرہ نظر آئے گا۔ جس کے سر پر اس قسم کی سیاہ نقاب ہے جو چہرے پر بھی آ جاتی ہے جیسے یورپ کے مجرم ارتکاب جرم کے وقت اکثر پہن لیتے ہیں تاکہ انہیں کوئی پہچان نہ سکے ..... جب قاتل کو یقین ہو جاتا ہے کہ کنجی امتیاز کے پلنگ پر پہنچ گئی ہے تو اس کا چہرہ کھڑکی سے غائب ہو جاتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ڈور کو زور سے جھٹکا دیا کہ وہ انگلی سے علیحدہ ہو گئی اور اس کے بعد وہ کھینچ لی گئی ... کمرے میں پھر وہی سکوت ہے جو پہلے تھا۔ لیکن یہ سکوت موت کی خاموشی ہے۔

(پردہ)

# پانچویں مجلس

(وقت پانچ دن کے بعد دس بجے صبح)

(کوتوالی کا بڑا کمرہ ہے، جس میں کوتوال اور محرر موجود ہیں۔ ..... ایک بڑی میز پانچ چھ کرسیاں، ایک بنچ، میز پر کاغذات اور روزنامچوں کا انبار ..... یہ اس کمرے کا سامان ہے۔ پولیس کے کمروں میں جیسا جیسا سامان موجود ہوتا ہے ویسا ہی اس کمرے میں بھی ہے ..... کوتوال وردی پہنے صدر میں بیٹھا ہے اور محرر داہنے ہاتھ کی طرف، جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو ایک سپاہی سرفراز کو ہتھکڑی پہنائے داخل ہوتا ہے۔)

**کوتوال:۔** (کرسی کی طرف اشارہ کرکے) بیٹھ جائیے (سرفراز بیٹھ جاتا ہے) زیادہ اچھا یہی ہے کہ اب تمام معاملے کو قبول کرلیجئے ..... چھپانے سے کیا فائدہ؟

**سرفراز:۔** آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے ..... اس طرح بے جا حراست میں رکھنے کے آپ ذمہ دار ہیں۔

**کوتوال:۔** ہاں، میں ذمہ دار ہوں ..... اپنی ذمہ داری پر کام کر رہا ہوں، آپکے دوست چھمی رسال نے تمام معاملہ اگل دیا۔

**سرفراز:۔** وہ کیا جانتا ہے، وہ کیا اگل سکتا ہے؟

**کوتوال:۔** خاور کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس لیے کہ اس نے ہی چھمی رسال سے خط حاصل کیا تھا۔

**سرفراز:۔** ایک ایسے خط کا حاصل کرنا اور شائع کردینا جو ریاست اور مفادِ عامہ کے خلاف ہو کوئی جرم نہیں ہے۔

**کوتوال:۔** کوئی جرم نہیں، بالکل درست ہے ..... لیکن اگر جعل ثابت ہوتا ہو اور وہ اس لیے کہ ایک ذی مرتبہ اور دیانت دار کارکن کو نقصان پہنچایا جائے تو؟

**سرفراز:۔** جعل؟ جعل کیسا؟

**کوتوال:۔** اصل یہ نہیں تھا جو شائع کیا گیا ہے؟

**سرفراز:۔** کیوں کر؟ پھر بلاک کیسے بن گیا؟

**کوتوال:۔** بلاک جس طرح بنا ہے ہمیں معلوم ہے۔ تلاشی سے اصل بلاک کے ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں ..... تم نے خط

اور اس کی تصویر کو تو تلف کر دیا۔ لیکن بلاک کے ٹکڑے تلف نہیں ہونے پائے تھے کہ ہم نے گرفتار کر لیا۔

سرفراز:۔ غدار، بے ایمان، رشوت کھا گئے اور کام پورا نہ کیا۔ نمک حرام۔

کوتوال:۔ ہاں، ٹھیک ہے۔ نوکروں کی کوتاہی

سرفراز:۔ تو پھر (سوچنے لگتا ہے)

کوتوال:۔ کیا خیال آیا؟

سرفراز:۔ (بلند آواز سے) اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو چھاپہ خانہ میں کام کرتے ہیں۔

کوتوال:۔ جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے...... خاور قبول کر چکا ہے تم اور اختر اس معاملے میں شریک ہو......

(اس کے علاوہ ایڈیٹر "......" کی شہادت موجود ہے کہ خط جا کر اختر نے دیا اور تم ساتھ تھے۔

سرفراز:۔ اگر تمام معاملہ کھل گیا ہے تو پھر مزید تحقیقات کی ضرورت کیا ہے؟

کوتوال:۔ یہ ضرورت ہے کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ قصور تمہارا زیادہ ہے یا اختر کا؟

سرفراز:۔ میرا یا اختر کا؟ اختر نے سب کچھ کرایا ہے، میں تو آلۂ کار تھا۔

کوتوال:۔ اور خاور؟ خط تو وہ لایا تھا۔

سرفراز:۔ اختر کے اشارے سے۔

کوتوال:۔ (بلند آواز سے) کوئی ہے؟ (سپاہی آتا ہے اور سلام کرتا ہے)

کوتوال:۔ اختر اور خاور کو لاؤ۔ (سپاہی جاتا ہے)

کوتوال:۔ اور اس میں کون شریک تھا؟

سرفراز:۔ روپیہ ادھار اجمل نے دیا تھا۔

کوتوال:۔ اچھا! یہ حضرت اب تک بچے ہوئے ہیں...... روپیہ کیوں کر دیا تھا۔

سرفراز:۔ اختر کے نام چیک تھا

کوتوال:۔ اچھا تو یہ حضرت بھی پھنسے۔ (سپاہی اختر اور خاور کو لاتا ہے)

کوتوال:۔ مقدمہ آپ دونوں کے خلاف تیار ہے...... جعل سازی اور اس میں امداد۔

**اختر:**۔ میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے ....... جب عدالت میں مقدمہ جائے گا تو دیکھ لوں گا۔

**کوتوال:**۔ یہ ثبوت ہے کہ تم نے سرفراز کو روپیہ دیا.... جس دن اس خط کی اشاعت ہوئی ہے۔ اس سے تین دن پہلے۔

**اختر:**۔ روپیہ دینا کوئی جرم تو نہیں ہے .......

**کوتوال:**۔ نہیں، لیکن جب روپیہ جعل بنانے کے لیے دیا جائے تو ضرور جرم ہے۔

**اختر:**۔ میں نے قرض دیا تھا۔

**کوتوال:**۔ قرض اگر دیا تھا تو کوئی دستاویز؟ رسید؟

**اختر:**۔ اگر تم اتنے سے ثبوت میں مقدمہ چلانا چاہتے ہو تو عدالت میں معلوم ہو جائے گا۔

**کوتوال:**۔ تم ایڈیٹر "ہمدرد ریاست" کے پاس اس خط کی اشاعت کے لیے گئے تھے؟

**اختر:**۔ ہاں اپنا فرض سمجھ کر گیا تھا۔

**کوتوال:**۔ ٹھیک ہے۔ اچھا فرض ادا کیا کہ ریاست کے ایک بہی خواہ کو بدنام کیا۔ یہاں تک کہ اس نے خودکشی کر لی۔

**سرفراز:**۔ (حیرت سے) امتیاز نے خودکشی کر لی۔

**کوتوال:**۔ ہاں، امتیاز اپنے کمرے میں مردہ پائے گئے۔ انھوں نے کمرہ اندر سے مقفل کر لیا۔ اور پرک ایسڈ کھا کر خودکشی کر لی۔

(ایک ایک شاکر داخل ہوتا ہے)

**شاکر:**۔ اچھا موجود ہیں؟

**کوتوال:**۔ شاکر صاحب؟ کیا بات ہے؟

**شاکر:**۔ (خاور کی طرف اشارہ کر کے) اس شخص نے امتیاز صاحب کو قتل کیا ہے۔

**خاور:**۔ (زرد پڑ جاتا ہے) میں نے؟

**شاکر:**۔ ہاں، تم نے!

**خاور:**۔ ثبوت؟

**شاکر:**۔ ثبوت یہ کہ تم قتل کی رات کو کہاں تھے؟

**خاور:**۔ اس سے مطلب؟

شاکر:- اس سے یہ مطلب کہ تم نے قتل کیا۔ اس کا ثبوت موجود ہے کہ تم قتل کرنے کے لیے یہاں سے ایک رات کو گئے اور قتل کے
دوسرے دن یہاں آ گئے۔

خاور:- میں کام سے گیا تھا۔

شاکر:- رات کے پونے بارہ بجے تم اپنے ہوٹل سے امتیاز صاحب کے ہوٹل کی طرف گئے۔ وہاں سوا بجے تمھیں ہوٹل سے
نکلتے دیکھا گیا۔ اور تم نے دربان سے کہا کہ تمھیں مجھ سے کام تھا ۔۔۔۔

خاور:- میں امتیاز صاحب سے ملنے گیا تھا۔

شاکر:- جھوٹ۔ میں برابر کے کمرے میں تھا۔ امتیاز صاحب پونے بارہ بجے سو چکے تھے۔ میں نے دستک کی آواز تک نہیں سنی۔ اگرچہ میں برابر کے کمرے میں تھا۔ اور
اتفاق سے جاگ رہا تھا۔ کسی نے ان سے باتیں نہیں کیں۔ اسکے علاوہ تم خوب جانتے ہو کہ رات کے بارہ بجے کے بعد تم ان سے نہیں مل سکتے تھے۔

خاور:- دربان مجھے … پہچانتا تھا … اس نے میرا نام کیوں کر بتایا؟

شاکر:- اس نے تمھارا حلیہ بتایا ...... اور اس کی تصدیق تمھارے ہوٹل سے ہو گئی۔

خاور:- افسوس پردہ فاش ہو گیا! اعتراف کیا ہو گا۔

اختر:- میں کیا جانوں …؟

خاور:- بدمعاش تو نے ہی تو مجھ سے قتل کرایا۔

اختر:- جھوٹ!

یاد رکھو کہ ریوالور جو تم نے خریدا ہے۔ اور تمھارا نام کتاب میں درج ہے۔ وہ ریوالور جس سے امتیاز کو قتل کیا گیا۔
کوتوال صاحب! میں نے تمام ثبوت مرتب کر لیے ہیں .... ملزموں کی عدم موجودگی میں بیان کر دوں گا۔
(اختر سے) کم بخت! اب وکیل بننے کی بجائے پھانسی پر لٹکو گے
تم جو کہتا وہاں بھی میرے طریقے ہی … ... ساتھ ہی لٹکو گے۔
(اختر سے) تم نے اس دن نفرت کا بیج بویا تھا ... ... اب درخت بڑھ کر سایہ دار ہو گیا ہے۔ اس کے نیچے
آرام سے سو ..... امتیاز کو تو سلا چکے اب تمھاری اور تمھارے دوست کی باری ہے۔

(پردہ)

# انکار

مجتبیٰ حسین

○

## کردار

مولوی صاحب

بشیر : ایک مزدور

علی : ایک تعلیم یافتہ نوجوان۔ بشیر کا دوست

نجمہ : مولوی صاحب کی لڑکی

بشارت : مولوی صاحب کے ہاں کا آنے جانے والا ایک آدمی۔

ہاری

دوسرے آدمی

○

# پہلا منظر

(مولوی صاحب کی بیٹھک۔ سامنے تخت ہے جس پر سفید چادر بچھی ہوئی ہے اور گاؤ تکیہ لگا ہوا ہے۔ تخت کے سامنے ایک بڑا سا اگالدان ہے۔ تخت کے دونوں جانب پرانے قسم کے مونڈھے رکھے ہوئے ہیں۔ دو ایک نئی کرسیاں تخت سے بالکل لگی ہوئی رکھی ہیں۔ دیوار پر کچھ کتبے لٹکے ہیں۔ ایک اسلامی کیلنڈر بھی ہے۔ مونڈھے پر دو حاجت مند قسم کے آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ حاجت مندی ان کے چہرے سے ظاہر ہے۔ کرسی پر چالیس پینتالیس سال ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ شیروانی زیب جسم اور جناح کیپ زیب سر ہے۔ چہرے پر چالاکی اور عیاری کے نقوش ثبت ہیں۔ سب حضرات مولوی صاحب کی آمد کے منتظر ہیں)

**مونڈھے پر بیٹھا ہوا آدمی**: (اپنے پاس کے دوسرے آدمی سے) کچھ معلوم ہے جناب مولوی صاحب کب برآمد ہوں گے؟

**دوسرا آدمی**: صاحب کچھ کہہ نہیں سکتا میں آج یہاں پہلی بار آیا ہوں۔

(کرسی پر بیٹھا ہوا آدمی سگریٹ نکالتا ہے۔ اور رعونت آمیز بے تکلفی سے پینے لگتا ہے)

**پہلا**: (دوسرے آدمی سے) آپ یہاں کسی کام سے آئے ہوئے ہیں؟

**دوسرا**: (لہجہ میں خفیف سا طنز ہے) جی ہاں معلوم تو یہی ہوتا ہے۔

پہلا : (چونک کر اور تعجب سے دیکھتے ہوئے) معلوم تو یہی ہوتا ہے ؟ یعنی !

دوسرا : میں یہ آپکے بارے میں عرض کر رہا تھا۔

(کرسی پر بیٹھا ہوا آدمی مسکراتا ہے۔ پہلا آدمی کچھ بے چینی محسوس کرتا ہے۔ مگر کچھ سمجھ کر پھر مخاطب ہوتا ہے)

پہلا : جی ہاں ! مجھے تو کام ہے۔ مولوی صاحب سے۔ ایک سفارشی چٹھی لینا ہے (رک کر) شہر کا ایک فیکٹری میں ایک جگہ خالی ہے۔ اسی کے لیے کوشش کر رہا ہوں ——— آپ کو معلوم ہے یہ فیکٹری کہاں ہے ؟

دوسرا : مجھے تو معلوم نہیں ہے ——— مولوی صاحب کو معلوم ہوگی۔

پہلا : (اسی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے) اب دیکھیے پوچھوں گا مولوی صاحب سے (پھر ذرا تھم کر مخاطب ہوتا ہے) فیکٹری کا مالک انگریز ہے۔ اسی کے نام چٹھی لینا ہے۔ ——— آپ کا کیا خیال ہے۔ مناسب ہے یا نہیں۔

(دوسرا آدمی اس سلسلہ سے تقریباً اکتا چکا ہے)

دوسرا : بہت مناسب ہے۔

پہلا : سنا ہے۔ مولوی صاحب انگریزی بہت اچھی جانتے ہیں۔

دوسرا : میرا خیال ہے آپ عربی میں چٹھی لکھوا کر لے جائیے۔

(کرسی پر بیٹھا ہوا آدمی مسکراتا ہے)

پہلا : مگر جناب۔ عربی وہ انگریز کیا جانے۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟

دوسرا : میرا خیال ہے۔ انگریزوں سے بہتر عربی کوئی نہیں جانتا ——— !

پہلا : واقعی ——— ! ہو سکتا ہے اور اب تو انھیں یہاں عربی سیکھنی ہی پڑے گی۔ (گفتگو ابھی ختم ہو جاتی مگر وہ پھر چھیڑ دیتا) اور کوئی جگہ ہے آپ کی نظر میں ؟

دوسرا : فی الحال تو کوئی ہے۔

(یوں جواب دیتا ہے گویا ابھی تک مختلف جگہوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھا ہوا آدمی دوسری سگریٹ جلاتا ہے)

**پہلا** : اگر موقع خیال رکھیگا (سوچ کر) مگر آپ سے ملاقات کہاں ہوگی؟

**دوسرا** : جس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے) چلئے مولوی صاحب کے یہاں۔

**پہلا** : آپ یہاں روز آتے ہیں؟

**دوسرا** : (اکتا کر کھڑا ہوتا ہے) جی ہاں! اب روز آیا کروں گا (نہایت مودبانہ طور پر اس سے کہتا ہے) اچھا تو اب اجازت عطا فرمایئے۔

**پہلا** : (تعجب سے) مگر مولوی صاحب سے تو آپ ملے ہی نہیں۔

**دوسرا** : بس ہو چکی ملاقات۔ آج اتنی ہی کافی تھی۔

(چلا جاتا ہے)

(مولوی صاحب کا نوکر ہاتھ میں حقہ لیے برآمد ہوتا ہے۔ پہلا آدمی تعظیماً کھڑا ہو جاتا ہے)

**کرسی پر بیٹھا ہوا آدمی** : (ملازم سے مخاطب ہوتا ہے) فجو مولوی صاحب سے کہہ دو۔ بشارت آیا ہے۔

(پہلا آدمی پھر بیٹھ جاتا ہے)

**ملازم** : ابھی کہتا ہوں بشارت میاں

(وہ چلا جاتا ہے دو آدمی اور آتے ہیں۔ —— نوکر ہاتھ میں خاصدان لیے ہوئے آتا ہے —— بشارت میاں پوچھتے ہیں)

**بشارت** : کیوں کہہ دیا؟

**ملازم** : جی! بس وہ اٹھ چکے ہیں پلنگ سے۔

(ملازم دوبارہ واپس جانے لگتا ہے کہ مولوی صاحب برآمد ہوتے ہیں۔ ملازم پردہ ہٹاتا ہے)

**مولوی صاحب** : (بلند/دار لہجہ میں) السلام علیکم! (بشارت کو دیکھ کر) اخاہ بشارت میاں۔ کئی دنوں بعد

دکھائی دیئے۔ کہاں رہے بھئی اتنے دنوں۔ ہمیں تمہارا توکل بڑا انتظار رہا۔ اور سب خیریت ہے؟

**بشارت**: اللہ کا فضل ہے۔ آپ لوگوں سے فرصت پالیں تو کچھ عرض کروں گا۔

**مولوی صاحب**: (پہلے آدمی سے مخاطب ہوتے ہیں) آپ نے کیسے زحمت فرمائی؟

**پہلا آدمی**: حضور! وہ شولا آئل فیکٹری میں ایک جگہ خالی ہے ـــــ میں غریب مہاجر ہوں حضور۔ آپ

اگر توجہ فرمائیں میرا مطلب ہے۔ اگر سفارشی چٹھی لکھ دیں اُن کو تو ہے، میرے بچے دعا دیں گے

آپ کو حضور ـــ آپ کے خط سے جگہ مل جائے گی وہاں حضور ـــــ

**مولوی صاحب**: مگر بھئی مجھے وہاں کون جانتا ہے ـــــ میں کیسے لکھوں؟

**پہلا آدمی**: حضور آپ کو تو ساری دنیا جانتی ہے ـــــ فیکٹری کا افسر انگریز ہے مگر حضور کا چھٹی

**مولوی صاحب**: انگریز ہے ـــــ؟

**پہلا آدمی**: مگر حضور! آپ کی چٹھی ملتے ہی وہ مجھے نوکری دے دے گا

**مولوی صاحب**: انگریز افسر ہے تو کسی انگریز سے خط لکھوا لیجئے (مولوی بیچارے کو رد کیا جانے

حقہ کا کش لگاتے رہیں)

**پہلا آدمی**: حضور۔ پاکستان کا بچہ بچہ آپ کو جانتا ہے ـــــ آپ کا ایک لفظ کافی ہے ـــــ حضور ـــــ

ہاں اگر انگریز کو خط لکھنے میں کوئی اعتراض ہو تو

**مولوی صاحب**: اعتراض بھلا کیا ہو سکتا! میری ذات سے اگر کسی مسلمان کا فائدہ ہو سکتا ہے ـــ تو

مجھے تو بندے کے پاس خط لکھنے میں کوئی عذر نہیں ہے ـــــ انگریز تو پھر بھی اہلِ کتاب ہے

ـــــ لیکن آپ کل تشریف لائیں تو ملتان سے لکھوں گا ـــــ دیکھئے آج

(لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں)

**پہلا آدمی**: (اٹھتے ہوئے) ضرور حاضر ہوں گا حضور ـــــ جو آپ مناسب سمجھیں۔ سلام علیکم

(مولانا زیرِ لب جواب دیتے ہیں)

(وہ جاتا ہے۔ مولوی صاحب اب لاسٹر سے مخاطب ہوتے ہیں)

**مولوی صاحب**: آپ حضرات کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟

**ایک آدمی**: میں انجمن مہاجرین کا سیکرٹری ——— مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلے میں ہزاروں دشواریاں آئے دن پیش آتی رہتی ہیں ——— آپ کی امداد اس معاملے میں درکار ہے ——— مہاجرین کے واسطے ——— آپ کو تو معلوم ہی ہوگا ——— کوئی خاص انتظام نہیں ہو سکا ——— آپ کی توجہ کے بغیر یہ کام بن نہیں سکتا۔

**مولوی صاحب**: (حقے کا ایک کش لگاتے ہیں) جناب جی! یہ تو درست فرمایا آپ نے مگر ذمہ داری ہے کس کی؟ ——— میں حکومت کو سخت ترین الفاظ میں سمجھا چکا ہوں ——— مگر اس امر خاص میں کچھ آپ لوگوں سے بھی عرض کرنا ہے (حقے کا ایک اور گہرا کش لگاتے ہیں ذرا توقف کرتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں) مہاجرین نے اپنے اطوار اور عادات سے کوئی مستحسن مثال نہیں پیش کی ——— ان تمام شبہات کو دنیا نے [illegible] بنالیا۔ جو قوم کو قعر ذلت میں گرا دیتی ہیں۔ جیسے آپ نے یہی کہنا ہے جب تک قوم اپنے اخلاق کو درست نہیں کرتی اللہ [illegible] اس قوم کی حالت [illegible] اس وقت تک اس کی فلاح و بہبود ممکن نہیں۔ خواہ کوئی مسئلہ ہو ——— اب دیکھئے کتنی عورتیں بے وارث و والی پھر رہی ہیں۔ ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ ان مغویہ عورتوں کی طرف سے مجرمانہ چشم پوشی کی جا رہی ہے۔ جو ہندوستان سے برآمد ہوئی ہیں ——— قوم کے پاس ——— معاف کیجئے گا ——— اتنا روپیہ تو ہے کہ گرجہ [illegible] بازار کی سیر کرسکے۔ مگر ان ناکردہ گناہ عورتوں کا کوئی بندوبست نہیں ہو سکتا بندہ پرور اسلام میں چار چار شادیاں جائز ہیں اگر دو دو شادیاں بھی لوگ کرلیں تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

(حقے کا ایک لمبا کش لگاتے ہیں)

**دوسرا آدمی**: جی ہاں بجا ارشاد ہے ——— مگر آپ کو مہاجرین کے بارے میں کچھ تو کرنا ہوگا۔

**مولوی صاحب**: خدا گواہ ہے میری کوئی ساعت ایسی نہیں گزرتی جب ان کے حق میں دعا نہ کرتا ہوں۔ مجھ سے جو کچھ بھی ممکن ہے دامے، درمے، قدمے، سخنے سعی کرتا ہوں۔

**دوسرا آدمی**: قبلہ کل سلطان ہال میں شام کو مہاجرین کا ایک عظیم الشان جلسہ ہے اگر آپ اس کی صدارت

قبول فرمائیں تو بڑی عنایت ہوگی۔

**مولوی صاحب:** میں تو گوشہ نشین آدمی مجھے ان جلسوں وغیرہ سے باز رکھیئے۔

**وہی آدمی:** جناب مولانا! آپ کی موجودگی سے ہم لوگوں کو تقویت ہوگی۔

**مولوی صاحب:** مجھے تو یہیں اللہ اللہ کرنے دیجئے۔ میں یہیں سے آپ لوگوں کے لیے دعا کرتا رہوں گا۔

**دوسرا آدمی:** حضور آپ کی صدارت کا اعلان ہو چکا ہے ———— اس کے علاوہ آپ کے بغیر جلسہ ہو ہی نہیں سکے گا

بڑے بڑے افسران بھی آرہے ہیں۔

**مولوی صاحب:** تو پھر ٹھیک ہے مجھے لے جا کر کیا کیجئے گا ———— ان لوگوں کی موجودگی کافی ہے۔

**دوسرا آدمی:** مگر حضور آپ کی ذات مقدس اگر آپ نہ ہوں گے تو جلسہ ہی نہیں ہو سکے گا ———— آپ کو ضرور چلنا ہوگا۔

**مولوی صاحب:** جب آپ مجبور کرتے ہیں تو انشاء اللہ حاضر ہو جاؤں گا ———— کب ہے؟

**دوسرا آدمی:** کل شام کو ———— بڑی عنایت ہے حضور نے صدارت قبول فرمائی۔

(دونوں اٹھتے ہیں)

**پہلا آدمی:** کل شام کو میں کار لے کر حاضر ہوں گا۔

**مولوی صاحب:** بہت خوب!

(جاتے ہیں السلام علیکم، السلام علیکم ذرا دیر خاموشی رہتی ہے۔ بشارت کرسی ذرا آگے بڑھاتا ہے)

**مولوی صاحب:** کہو بشارت!

**بشارت:** مولانا اسی سلسلہ میں حاضر ہوا ہوں ———— بازیافتہ عورتوں کے کیمپ میں کل کچھ اور لڑکیاں آئی ہیں ———— کل سے ان بیچاریوں کا روتے روتے بُرا حال ہو رہا ہے بیان آنے کو تو آ گئی ہیں مولانا مگر اب انھیں سوائے تاریکی کے کچھ اور نظر نہیں آتا (سرد آہ بھرتا ہے) کہاں جائیں، کیا کریں، کیا نہ کریں۔ پہاڑ ایسی زندگی بسر کرنی ہے۔ ———— خدا رحم کرے۔

اُن کے حال پر۔

(آہستہ سے سرہلاتا ہے)

مولوی صاحب: بخیر ———— تو مقصد یہ ہے کہ خط لکھ دوں۔

بشارت: جی ہاں مولانا آپ خط لکھ دیجئے ———— وہ میرے حوالے کر دی جائیں ———— میں انھیں انشاء اللہ مناسب رشتہ دلادوں گا ———— ورنہ کیمپ میں تو ان کی زندگی ستیاناس ہو جائے گی۔
———— ترس آتا ہے مولانا ان کے حال پر! کیا زمانہ آگیا ہے۔ میں نے عہد کرلیا ہے اس وقت تک آرام نہیں کروں گا جب تک ان غریب لڑکیوں کا سہارا نہ تلاش کرلوں گا۔

(آہ سرد بھرتا ہے)

مولوی صاحب: خدا اجر نیک دے ———— مگر خط لکھنے سے قبل میں بشارت میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔
(کار کے ہارن کی آواز آتی ہے۔ موٹر گھرگھراتی ہوئی آکر رک جاتی ہے گفتگو منقطع ہو جاتی ہے۔ دونوں دروازے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ سوٹ بوٹ میں ایک "پاکستانی صاحب" داخل ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب ونکھیتے ہیں تخت سے استقبال کے لیے نیچے اترتے ہیں)

مولوی صاحب: السلام علیکم ———— بہت دنوں بعد آپ نے کرم فرمایا۔

صاحب: ادھر مصروفیات ہی کچھ ایسی ہیں مولانا (بشارت پر نظر پڑتی ہے وہ چپ سے ہو جاتے ہیں جیسے پہلے سے پہچانتے تھے۔ مگر غیر متوقع طور پر یہاں اُن سے مڈبھیڑ ہو گئی ہے۔ پھر وہ سنبھل کر مولوی صاحب سے پوچھتے ہیں)
آپ کی ان سے کب سے جان پہچان ہوئی؟

مولوی صاحب: (لہجہ میں پس و پیش ہے) میں تو انھیں ———— یہ سمجھئے کہ میں تو انھیں ابھی گھڑی دو گھڑی سے (وہ رک جاتے ہیں پھر براہ راست صاحب سے سوال کرتے ہیں) آپ ان سے واقف ہیں کیا؟

صاحب: جی ہاں میں تو انھیں جانتا ہوں۔

**بشارت** : (مودبانہ تبسم کے ساتھ) یہ حضور کی بندہ شناسی ہے (یہ مولوی صاحب کی طرف اشارہ کرکے) مولوی صاحب میرے پرنسپل فرماتے ہیں آپ ہی لوگ نہ جانیں گے تو کون جانے گا۔

**صاحب** : کیوں بشارت کیسے آئے یہاں ؟

**بشارت** : چلا آتا ہوں کبھی کبھی سلام کرنے مولانا کو۔ اب دیکھئے اسی بہانے آج حضور کے درشن ہو گئے۔

**صاحب** : اچھے تو ہے۔ کیا حال چال ہیں۔

**بشارت** : آپ ہی لوگوں کے سہارے جی رہا ہوں ـــ بڑا کرم ہے ـــ ورنہ ـــ

**مولوی صاحب** : تشریف رکھیے (سب بیٹھتے ہیں) اور فرمائیے سب خیریت ہے بال بچے تو اچھے ہیں۔

**صاحب** : ہاں سب اچھے ہیں ـــ چھوٹے لڑکے کو نزلہ ہو گیا ہے۔

**مولوی صاحب** : (انتہائی تشویش کا اظہار کرتے ہیں) نزلہ ہو گیا ہے لب! آپ فوراً کسی اچھے طبیب سے رجوع کیجئے اس معاملے میں جناب اگر میری رائے مانئے تو ڈاکٹر سے بہتر طبیب ہوتا ہے۔

**صاحب** : دکھانے کا ارادہ تو ہے مگر دفتر فرصت دے تب نا۔ سارا کام میرے سر آ پڑا ہے۔

**مولوی صاحب** : میرا مشورہ ہے آپ چند روز کی چھٹی لے کر کہیں باہر چلے جائیے ـــ دیکھئے نزلے کے علاج میں کوتاہی سے کام نہ لیجئے گا نزلہ سارے امراض کی جڑ ہوتا ہے ـــ بیگم تو اچھی ہیں ؟

**صاحب** : اچھی کیا ہیں ـــ بس ان دنوں ہاضمہ کی شکایت چلی جاتی ہے۔ آپ کے گھر میں تو اچھی ہیں ؟

**مولوی صاحب** : ان کا تو اس حادثہ کے بعد جیسے دل ہی مردہ ہو گیا ہے ـــ ہر وقت خاموش رہتی ہیں۔ اب کیا کیا جائے۔

**صاحب** : مولانا ماں کا دل ہے ـــ جب مجھے اس کا افسوس ہے تو ماں پھر ماں ہے ـــ بڑی ذہین لڑکی تھی مولانا ـــ مگر ـــ

(آہ سرد بھر کر خاموش ہو جاتے ہیں)

**مولوی صاحب** : جی ہاں قضا و قدر کو یہی منظور تھا۔

**صاحب**: کوئی خبر نہیں ملی ـــــ کبھی کبھی پتہ لگا لیا کیجئے۔

**مولوی صاحب**: اب کیا خبر ملے گی ـــــ اسے تو ظالموں نے مار ڈالا ـــــ ہم تو صبر کر کے بیٹھ گئے ہیں ـــــ خدا بہتر جانتا ہے۔ دل پر کیا گزرتی ہے ـــــ اس کی تصویر آنکھوں میں پھرا کرتی ہے۔ ـــــ آپ کی بیگم سے تو بہت مانوس ہو گئی تھی۔

**صاحب**: جی ہاں بیگم اکثر اس کا تذکرہ کیا کرتی ہیں۔ ـــــ انھیں تو بڑا ملال ہے۔ پھر یہاں آپ کو جو رنج ہو تھوڑا ہے۔

**مولوی صاحب**: (آہ سرد بھر کر) تقدیر میں یہی لکھا تھا (فارغ ہو جاتے ہیں پھر دفعتاً انھیں کچھ یاد آجاتا ہے) ہاں پرسوں شب میں میرے ہاں زنانی میلاد شریف ہے۔ بیگم سے فرما دیجئے گا۔ ضرور تشریف لائیں گی گھر میں بھی اصرار ہے۔ بہت دنوں سے آپ کی بیگم سے ملاقات نہیں ہوئی ـــــ پھر ان کے آنے سے ذرا غم غلط ہو جائے گا۔

**صاحب**: میں ضرور بھیج دوں گا انھیں۔ وہ تو خود آنا چاہتی تھیں۔

**مولوی صاحب**: پھر آپ لائے کیوں نہیں انھیں ـــــ میری طرف سے بہت بہت شکریہ ادا کر دیجئے گا اور فرما دیجئے گا کہ پرسوں ضرور تشریف لائیں ورنہ سخت شکایت ہو گی۔

**صاحب**: اچھا تو اجازت دیجئے۔

(دونوں صاحب کو دروازے تک پہنچانے جاتے ہیں پھر لوٹ کر گفتگو میں مشغول ہو جاتے ہیں)

**مولوی صاحب**: بشارت میاں تم انھیں جانتے ہو؟

**بشارت**: آپ کی دعا سے کیسے نہیں جانتا ـــــ تو مولوی صاحب د: لکھ دیجئے نا

**مولوی صاحب**: مگر ایک بات سنو۔ (ادھر ادھر دیکھ کر) ذرا قریب آؤ۔ اور قریب آؤ۔ (دھیرے دھیرے گفتگو ہوتی رہتی ہے)

**بشارت** : (سر لا آرہا ہے) جی ہاں! جی ہاں — بالکل اطمینان رکھیے — جی ہاں۔

**مولوی صاحب** : اچھا تو میں لکھے دیتا ہوں (داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) مگر بھئی کسی غیر شرعی امر کے مرتکب نہ ہونا — ورنہ گناہ میری گردن پر ہوگا۔

**بشارت** : لاحول ولا قوۃ مولوی صاحب — آپ ایک مسلمان سے ایسا کہتے ہیں۔

**مولوی صاحب** : ہاں بھئی! میں شرع کے دائرے سے ایک قدم باہر نہیں رکھ سکتا۔

**بشارت** : ایسی ویسی کوئی بات ہوتی تو میں آپ کے پاس آتا ہی نہیں مولانا۔

**مولوی صاحب** : ہاں بھئی تم جانو۔

(وہ لکھنے کے لیے قلم نکالتے ہیں کہ ایک مزدور داخل ہوتا ہے۔ قدم کی چاپ سن کر مولوی صاحب آنکھ اٹھاتے ہیں۔ بشیر کو دیکھتے ہیں)

**مولوی صاحب** : (زیر لب) بدبخت اس وقت کہاں سے نازل ہوا (پھر بلند آواز سے) تم کل آنا اس وقت مجھے فرصت نہیں ہے۔

**بشیر** : مولوی صاحب! میں تین دن سے برابر آرہا ہوں — میں نے مزدوری کی ہے — بھیک مانگنے نہیں آیا ہوں — اپنے پیسے لینے آیا ہوں۔

**مولوی صاحب** : کل حساب کر دیا جائے گا۔ اس وقت فرصت نہیں ہے۔

**بشیر** : حساب تو اسی دن ہو چکا تھا مولوی صاحب! ایک مہینہ کی مزدوری ہے — مکان کی — ریٹ کیا ہوا ہے — سب طے ہو چکا تھا۔

**مولوی صاحب** : قارون کا خزانہ تھوڑے ہی طے ہوا تھا۔ تم تو قارون کا خزانہ مانگ رہے ہو۔

**بشیر** : قارون کو تو مولوی صاحب آپ جانیں — میرے کو تو مزدوری چاہیئے۔

**بشارت** : کچھ خبر بھی ہے مولوی صاحب کا کام تو لوگ مفت میں کر دیا کرتے ہیں — بڑا ثواب ہے اس میں۔

**بشیر** : مولوی صاحب بھی میرا کام مفت کر دیا کریں۔

بشارت: (بگڑ کر) بڑے بدتمیز ہو — ایک پیسہ نہیں ملے گا۔

بشیر: ملے گا کیسے نہیں حلق سے نکال لوں گا — حرام کے پیسے نہیں مانگتا۔ پسینہ بہایا ہے۔

بشارت: نکل جاؤ یہاں سے — ابھی نکل جاؤ (آگے بڑھتا ہے۔ بشیر اسی طرح جما ہوا کھڑا رہے) نکل جاؤ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ (بشیر ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ بشارت کی جرأت جواب دینے لگتی ہے) کہہ دیا کہ نکل جاؤ۔

بشیر: مولوی صاحب سمجھا دیجئے اسے۔

مولوی صاحب: جانے دو بشارت کس کے منہ لگے ہو۔ جانتے نہیں ان لوگوں کا دماغ خراب ہو چکا ہے کبھی پیٹ بھر کھانے کو ملتا اور نہ معلوم کیا کرتے۔

بشیر: مولوی صاحب خرافت تو آپ میں ہے — واہ کیا ایمان داری ہے — زبان نہ کھلوایئے مولوی صاحب —

مولوی صاحب: بھائی تم پرسوں شام کو آنا — میں یہیں رہوں گا — سب حساب بیباق کر دیا جائے گا۔

بشیر: اچھا — مگر مولوی صاحب —

مولوی صاحب: ہاں بھئی ہاں۔ کہہ تو دیا۔

(بشیر جاتا ہے اور مولوی صاحب اور بشارت پھر منہمک ہو جاتے ہیں)

مولوی صاحب: دماغ خراب ہو گیا ہے ان لوگوں کا۔

بشارت: آج تو میں نے چھوڑ دیا آپ کے کہنے سے — مگر کسی دن خبر ضرور لوں گا — ہاں مولوی صاحب خط لکھ دیجئے۔

مولوی صاحب: (قلم اٹھا کر) مگر بھئی شرط یہی ہے کہ کوئی غیر شرعی

بشارت: آپ پورا اطمینان رکھیئے۔

(مولوی صاحب لکھتے ہیں)

پردہ

○

# دوسرا منظر

(پردہ اٹھتا ہے۔ تو مولوی صاحب جلسے کی صدارت کرتے نظر

آتے ہیں۔ انجمن مہاجرین کے سیکرٹری اُن کے قریب ہی بیٹھے

ہیں۔ ایک مقرر تقریر کر رہا ہے)

**مقرر** : جناب صدر و معزز حاضرین جلسہ! مہاجرین کے مسائل پر فاضل مقرروں نے کافی روشنی ڈالی ہے۔ مہاجرین پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہیں ـــــــ ان کی فلاح و بہبود پاکستان کی فلاح و بہبود ہے ـــــــ میں ان الفاظ کے ساتھ اس ریزولیشن کی پرزور تائید کرتا ہوں کہ مہاجرین کو جلد از جلد آباد کیا جائے اور اغوا شدہ عورتوں کا کھوج لگا کر انھیں اُن کے گھر پہنچا دیا جائے۔

(تالیاں)

**جناب صدر** : کسی کو اس تجویز کی مخالفت میں کچھ کہنا ہے؟

(جلسے سے آواز آتی ہے ــــ مجھے کہنا ہے۔ ایک نوجوان جس

کے چہرے پر بال پریشان ہیں۔ مگر ذہانت اور عزم کے نشان

پائے جاتے ہیں ــــ آگے بڑھتا ہے۔ ڈائس پر آتا ہے)

**نوجوان** : بھائیو! ابھی تک جنھوں نے تقریریں کیں اُن کا منشا صرف اتنا ہے کہ اُن کو یا اُن کے چند عزیزوں اور دوستوں کو جائیدادیں اور مکان، کاروبار اور نوکریاں مل جائیں ـــــــ یہ مسئلہ صرف مہاجرین کا نہیں ہے۔ یہ ہر اس شخص کا ہے جو بیروزگار، مفلس اور بے گھر ہے۔ آج جن غریبوں کے پاس گھر نہیں وہ بھی اپنے وطن میں مہاجر ہیں ـــــــ گھر کے معنی دیواریں نہیں ہوتیں۔ گھر کے معنی بال بچے، آرام کے سامان، کھانے پینے کی چیزیں اور رہنے کی جگہ ہے مگر آج کون آرام سے ہے۔ کس کے بال بچے چین سے ہیں ــــ ہمارے بال بچے بے تربیت بیمار اور بے کار ہیں ــــ آج کسی کو بھی سکون نہیں

کوئی بھی مطمئن نہیں —— آج ہماری زندگی ایک سزا ہے —— ہمارا گھر قید خانہ ہے کھیتوں پہ —— فیکٹریوں پر اور بڑی بڑی نوکریوں پر کس کا قبضہ ہے؟ —— کس کے گھر آباد ہیں غریبوں کے یا امیروں کے۔ کون پردیس میں بھی دیس سے بہتر ہے —— کون دیس میں بھی پردیسی ہے —— یہ مسئلہ صرف مہاجرین کا نہیں (ہوٹنگ شروع ہوتی ہے۔ پھر کیا ہے؟ آپ بیٹھ جائیے —— دوسری طرف سے آواز آتی ہے۔ —— خاموش رہو سننے دو) زمین ہماری نہیں۔ کارخانے ہمارے نہیں۔ اگر یہ ہمارے نہیں تو کوئی بھی آباد نہیں۔ سب مہاجر ہیں۔ سب خانہ بدوش ہیں (آوازیں یہ غدار ہے نکالو اسے بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ) غور سے سن لیجیے (آواز: ہم نہیں سنیں گے) آپ کو سننا پڑے گا۔ اس وقت تک کسی عورت کی عصمت محفوظ نہیں جب تک ناداری۔ بے کاری۔ قحط اور جہالت ہمارا گلا دبائے ہوئے ہے (آپ کا گلا دبا دوں گا یہ کمیونسٹ معلوم ہوتا ہے) آپ اغوا شدہ عورتوں کو یہاں لا کر قحبہ خانوں میں ڈال دینا چاہتے ہیں یا انھیں (ہم نہیں سنیں گے اسے نکالو) یا انھیں ————

شور بڑھتا ہے۔ لوگ ڈائس کی طرف جھپٹتے ہیں۔ کرسیاں اٹھ
جاتی ہیں۔ ایک کرسی نوجوان پر آ کر پڑتی ہے —— وہ سر
تھام لیتا ہے)

پردہ

# تیسرا منظر

(رات کا وقت۔ ایک گندی سی کھولی۔ بشیر بستر پر لیٹا ہوا بیڑی
پی رہا ہے۔ —— نوجوان داخل ہوتا ہے۔ سر پر زخم اور
چوٹ کے آثار ہیں کھولی کے اندر مدھم روشنی ہے۔ چراغ جل رہا ہے)

**بشیر** : لو ختم ہو گیا جلسہ کیا طے پایا؟

**خلیل** : طے کیا پایا خاک! یار لوگ جلسہ اس واسطے کرتے کب ہیں کہ کوئی چیز طے پائے۔

**بشیر** : ہاں بھئی۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں؟

**خلیل** دلبشیر —— یہ جلسے یہ تقریبیں صرف اس لیے نہیں کرتے کہ نادار اور ٹھکرائے ہوؤں کی طرف
سے آواز بلند کریں —— بلکہ اس لیے جمع ہوتے ہیں کہ انھیں بیچ میں ڈالیں —— چند نعروں میں ان کی
آوازیں دبا دیں۔ ان کی صدا تالیوں کی گونج میں گم ہو جائے اور وہ سو جائیں —— ہمیشہ
کے لیے سو جائیں۔

**بشیر** : خلیل بھیا آخر ہو کیا وہاں —— بڑی کٹی کٹی باتیں کر رہے ہو۔ سنا ہے بڑے بڑے عالم بڑے
بڑے مولانا آئے تھے۔

**خلیل** : بس سمجھ لو کہ کیا ہوتا رہا —— تمہارے مولانا بھی تشریف فرما تھے —— صدر بنے بیٹھے
تھے (رک کر) پیسے ملے تمہیں؟

**بشیر** : کل جانا ہے —— کل نہیں دیا تو پھر خیریت نہیں ان کی —— مفت کا کھا کھا کر عادت
بگڑ گئی ہے۔

(خلیل زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ جاتا ہے)

**خلیل** : ذرا بیڑی دینا بشیر!

(بشیر بیڑی بڑھاتا ہے۔ خلیل دیا سلائی جلاتا ہے [illegible] روشنی اس کے
چہرے پر پڑتی ہے جس سے زخم صاف دکھائی دینے لگتے ہیں
بشیر کی نظر اب زخموں پر پڑتی ہے یک بیک وہ چٹائی سے اٹھ کر
بیٹھ جاتا ہے ــــ اس کا چہرہ سخت ہو جاتا ہے ــ خلیل
بیڑی کا کش لگانے کے بعد کسی سوچ میں کھو گیا ہے)

**بشیر** : خلیل بھیا! (خلیل چونک کر دیکھتا ہے) یہ چوٹیں بھیا؟

**خلیل** : کیا؟

**بشیر** : (کھڑا ہو جاتا ہے) آج جلسہ میں کیا ہوا؟

**خلیل** : (مسکراتا ہے) دیکھ ہی رہے ہو جو کچھ ہوا (بیڑی کا ایک کش اور لگاتا ہے) بشیر وہاں مہاجروں کو آباد کرنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مردوں کو جلد نکاح کے مشورے دیئے گئے ــــ مجھے گالیاں دی گئیں ــــ تعجب ہے میں چپ نہ رہا تو ــــــ سارے بھی رو میاں ــــــ !

**بشیر** : (سر ہلاتا ہے) نہ ہوا ہمارا جلسہ (اس کی آنکھیں دور کہیں دیکھنے لگتی ہیں) محال تھی خلیل بھیا یونین کے وہ لوگ چلے جاتے ابھی مزدوروں کے جلسے میں آ کر بولیں تو معلوم ہو۔

**خلیل** : ارے بھئی تمہاری کیا بات ہے ــــــ تم ان داتا ہو ــــ ان داتا!

(مسکراتا ہے)

**بشیر** : تم تو پٹ کے چلے آئے خلیل بھیا ــــ میں ہوتا تو بغیر پیٹے نہ آتا۔ ــــــ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے

**خلیل** : (مسکراتا ہے) ہنسنے کی بات تو ہے۔ بھئی تم اپنا مقابلہ ہم سے کیوں کرتے ہو ــــ تم مزدور ہو دھرتی کی آس۔ ہم خالی خولی باتیں بنانے والے۔

**بشیر** : اچھا اب ذرا اس پر کوئی دوا لگا لو۔

**خلیل** : ٹھیک ہو جائے گا ــ دوا ــــ دوا ــــ کیا ہوگی!

**بشیر** : (مسکراتا ہے) پیسے ہیں میرے پاس۔

**خلیل** : تو پھر کھانا کھایا جائے گا۔

**بشیر** : (سنجیدہ لہجہ میں) مگر بھیا یہ زخم ـ

(رُک جاتا ہے)

**خلیل** : بشیر! خلیل اب تمہارے ساتھ رہتا ہے — اسے اب ان زخموں کی اتنی پرواہ نہیں ہے

**بشیر** : خلیل بھیا! آپ باتیں خوب کرتے ہیں۔

**خلیل** : (پُرخلوص لہجہ میں) سچ کہتا ہوں بشیر۔ اب تک میں ایک آوارہ گرد، بے کار اور بیزار آدمی تھا۔ مگر
تمہاری صحبت نے مجھے زندگی کی گرمی دی — وہ زمین دی جس پر میں اب تک نہیں چلا تھا
— تمہاری اندھیری کوٹھڑی میں مجھے وہ روشنی ملی جو آنسوؤں میں موتی کی چمک بھر دیتی ہے
— جو راہ کو روشن کر دیتی ہے — میں نے اب تک دکھ درد کو دُور سے دیکھا
تھا — مگر تمہارے ساتھ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا — میں نے انہیں چھُوا
— چکھا — محسوس کیا — میں کل تک تنہا تھا۔ مگر آج بشیر یہ محسوس ہوتا ہے
جیسے دنیا بھر کے مزدور دنیا بھر کے کسان دنیا بھر کے مفلس اور دُکھیارے میرے ساتھ ہیں — میرا
ہاتھ تھامے ہوئے ہیں۔ — مجھے وہاں لے جا رہے ہیں جہاں غریب نہیں امیر نہیں۔ جہاں اُونچ نیچ نہیں۔
بشیر! تم نے مجھے ———

(رُک جاتا ہے — بشیر پر اپنی محبت بھری نظریں جما دیتا ہے —)

**بشیر** : معلوم ہوتا ہے بھوک زیادہ لگی ہے خلیل بھیا!

(دونوں مسکرا لیتے ہیں)

**پردہ**

# چوتھا منظر

(رات کا وقت ـــــ مولوی صاحب کا مکان ـــــ خاموشی
چھائی ہوئی ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہے ـــــ اندھیرے میں
ایک سایہ حرکت کرتا ہے اور دھیرے دھیرے مولوی صاحب کے
مکان کی طرف بڑھتا ہے
دروازے پر آکر رک جاتا ہے ـــــ پھر آہستہ سے زنجیر کھٹکھٹاتا
ہے ـــــ اندر سے کوئی آواز نہیں آتی ـــــ وہ زنجیر
زرا زور سے کھٹکھٹاتا ہے ـــــ ذرا دیر خاموشی رہتی ہے پھر
آہستہ سے کواڑ کھلتا ہے، مولوی صاحب لالٹین لیے ہوئے کھڑے
ہیں دروازے سے منہ نکال کر جھانکتے ہیں)

**مولوی صاحب:** کون صاحب ہیں ؟

(کوئی جواب نہیں آتا)

**مولوی صاحب:** کون صاحب ہیں۔ جواب کیوں نہیں دیتے ؟

سایہ آگے بڑھتا ہے۔ چوکھٹ پر آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مولوی صاحب
گھبراتے ہیں)

**مولوی صاحب:** آپ ـــــ آپ اپنا نام کیوں نہیں بتاتے ـــــ وہیں رہیے ـــــ وہیں رہیے

(لالٹین آگے بڑھاتے ہیں، آنیوالے کے چہرے پر روشنی پڑتی ہے
پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک لڑکی نظر آتی ہے۔ مولوی صاحب
ذرا غور سے دیکھتے ہیں۔ ان کے بدن میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے

(ان کی آواز بے قابو ہو جاتی ہے)

**مولوی صاحب**: تم — تم — نمّی تم —— تم کون ہو — بولو تم کون ہو — نمّی — نمّی!

(مولوی صاحب کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ روشنی تھرا رہی ہے) تم کون ہو — نمّی!

(مولوی صاحب کی آواز چیخ میں بدل جاتی ہے)

(اندر سے آواز آتی ہے "کون نمّی" کسے پکار رہے ہو۔

میری نمّی آئی ہے —— کس سے باتیں کر رہے ہو۔)

(آن کی بیوی دروازے کی طرف لپکتی ہے)

(کہاں ہے نمّی — میری نمّی کہاں ہے! وہ سامنے آجاتی ہیں)

**نعیمہ**: امّی جان —— امّی جان!

(وہ آگے بڑھتی ہے۔ مولوی صاحب دفعتاً سامنے آکر کھڑے

ہو جاتے ہیں۔ ان کا بدن کانپنے لگتا ہے)

**مولوی صاحب**: (آہستہ لہجہ میں) نمّی وہیں رہو!

**نعیمہ**: ابّا جان!

(لہجہ میں تعجب ہے)

**مولوی صاحب**: گھر میں قدم مت رکھو نمّی!

(ان کی آواز حلق میں جھنجھلا رہی ہے)

**نعیمہ**: کیوں ابّا جان —— آخر میرا کیا قصور ہے؟

**مولوی صاحب**: تم — تم —— تمہارا قصور — تمہارا قصور؟

ان کا ہاتھ بری طرح کانپتا ہے۔ لالٹین گر کر زمین پر

چور چور ہو جاتی ہے —— گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے

—— اندھیرے میں ان کی آواز آتی ہے ——

میرے سینے سے لگ جاؤ بیٹی! — میری ننّھی —— تم
اب کہیں نہیں جانا (ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز بھی آتی ہے) میں
تمہیں اندھیرے میں دیکھ رہی ہوں ننّھی —— تم
کتنی دُبلی ہو گئی ہو —— تم زرد پڑ گئی ہو — بیٹی
تم کانپ کیوں رہی ہو —— تم اب یہیں رہو — تم
کہیں نہ جانا!

پردہ

○

# پانچواں منظر

(مولوی صاحب کا مکان — رات ہو چکی ہے۔ زنان خانہ
میں مولوی حسنات کی بیوی سر جھکائے بیٹھی ہوئی ہے — مولوی صاحب
بے چینی کے عالم میں ٹہل رہے ہیں۔ ٹہلتے ٹہلتے — رک کر
وہ بیوی سے فیصلہ کن لہجے میں مخاطب ہوتے ہیں)

**مولوی حسنات:** میں اچھی طرح سوچ چکا ہوں — یہ آخری حکم ہے میرا — میں اس بارے میں کچھ نہیں سن سکتا۔

**بیوی:** تمہارا دل کیسا پتھر کا ہو گیا ہے؟

**مولوی حسنات:** پتھر کا دل! تمہیں کیا پتہ دل — مگر میرا سارا وقار — میرا سارا اثر ختم ہو جائے گا۔ لوگ مذاق اڑائیں گے — جینا حرام ہو جائے گا جینا! میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ مجھے باہر نکلتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔

**بیوی:** کس لئے تمہارے وقار کو — اولاد سے کوئی منہ موڑ لیتا ہے — توبہ ہے الٰہی!

**مولوی حسنات:** بکو مت ضد نہ کرو میلاد کے لیے عورتیں اب آتی ہی ہوں گی — وقت بہت تھوڑا ہے سارا راز فاش ہو جائے گا پھر میں کیا کروں گا — کہاں جاؤں گا — کہاں جاؤں گا میں

**بیوی:** تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ وہ کہاں جائے گی۔ ذرا اسے بھی سوچا ہے؟

**مولوی حسنات:** جہاں جی چاہے مجھ سے کیا مطلب ہے۔ یہاں کیوں آئی — یہاں کیوں آئی!

**بیوی:** اُس کا گھر ہے۔

**مولوی حسنات:** ہونہہ! اس کا گھر ہے (ٹہلتے ہیں) اُس کا گھر ہے ہونہہ! اُسے جانا ہی پڑے گا — میرا حکم ہے۔ میں اس گھر کا مالک ہوں۔

**بیوی** : مگر وہ جیتے گی کہاں۔ اور ایسے وقت جب کہ

(وہ رُک جاتی ہے —— مولوی صاحب کو دکھ بھری نظروں

سے دیکھتی ہے)

(مولوی صاحب ایکدم زرد پڑ جاتے ہیں —— وہ بیوی

کے پاس آجاتے ہیں)

**مولوی صاحب** : کیا مطلب ہے تمہارا؟

**بیوی** : اس کا اب کہیں جانا ٹھیک نہیں ہے۔

**مولوی صاحب** : (جھک کر اور انتہائی بے بسی کے عالم میں پوچھتے ہیں) کیوں؟

بیوی اب بھی چپ رہتی ہے۔ صرف انھیں دیکھتی رہتی ہے۔

مولوی صاحب ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے جم گئے ہیں)

**مولوی صاحب** : بولتی کیوں نہیں ہو، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تمہاری خاموشی سے ڈر لگ رہا ہے —— بولو

بولو! کیا بات ہے —— مجھے یوں مت دیکھو۔ میں نے کیا کیا ہے —— میں نے کیا کیا ہے۔

**بیوی** : تم سمجھتے کیوں نہیں۔ نبی ایسے وقت کہاں جا سکتی ہے؟

**مولوی صاحب** : (سر تھام کر بیٹھ جاتے ہیں) میرے مولا اب کیا ہوگا۔ میں کہاں جاؤں —— نہیں نہیں

یہ نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی ساری عمر کی عزت وقار کو نہیں کھو سکتا —— میں اپنی عزت نہیں گنوا سکتا

میلاد کا وقت قریب آ رہا ہے —— نبی! تو یہاں نہیں رہ سکتی۔ (چیختے ہیں) نبی تو یہاں نہیں رہ سکتی۔

(نبی آتی ہے)

**نعیمہ** : جی ابا جان!

**مولوی صاحب** : (چونک کر) کیا کہا ابا جان! —— نہیں نہیں —— تم فوراً نکل جاؤ

فوراً نکل جاؤ میرے گھر سے۔ یہ میرا گھر ہے —— میں تمہارے لیے اپنی عزت و آبرو نہیں گنوا

سکتا —— تم چلی جاؤ یہاں سے۔ ابھی چلی جاؤ۔

(اس کی آواز میں کوئی کیفیت نہیں ہے)

**بشیر**: آپ میرے ساتھ چلیے گا؟

**نعیمہ**: کسی کے ساتھ بھی چلی جاؤں گی۔

دونوں چلتے ہیں — سامنے سے بشارت آ رہے — وہ
دونوں کو غور سے دیکھتا پھر کھانس کر زور سے کہتا ہے "سلام علیکم
بشیر میاں!"
(بشیر کوئی جواب نہیں دیتا چلا جاتا ہے)

**پردہ**

○

# چھٹا منظر

بشیر کی کھولی۔ اندر سے خلیل کے گنگنانے کی آواز آتی ہے

"گذر ہی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے"

ذرا دیر بعد بشیر اور نعیمہ پہنچتے ہیں۔ بشیر پہلے داخل ہوتا ہے

(نعیمہ بعد میں۔ خلیل گنگنانا بند کر دیتا ہے۔ خلیل بشیر کو دیکھتا ہے)

**خلیل**: ملا پیسہ!۔

**بشیر**: پیسہ تو آج نہیں ملا۔ پھر جاؤں گا۔

(خلیل نعیمہ کو دیکھتا ہے بیگانگی سے پوچھتا ہے)

**خلیل**: اوہو ——— آپ ——— آپ کون ہیں!

**بشیر**: یہ میری بہن ہے۔

**خلیل**: بہن ہے تمہاری! بڑی خوشی ہوئی ——— پیسہ ہے ان کے پاس!

**بشیر**: آج کسی کے پاس پیسہ نہیں ہے۔

**خلیل**: آج پھر ان کے کھانے کا کیا انتظام ہوگا؟

**نعیمہ**: نہیں میں تو کھا کر آئی ہوں۔

**خلیل**: (ایسی سسکی آتی ہے) تب تو پھر چین سے بیٹھئے۔ ہم لوگ تو روز ایک دن یوں ہی چین سے گذار دیتے ہیں۔ آپ تشریف رکھئے۔ ——— بالکل آرام سے بیٹھ جائیے۔ اپنا ہی گھر سمجھئے (نعیمہ بیٹھ جاتی ہے) ——— ہاں اب ٹھیک ہے۔ اور ہاں میں اپنا تعارف کرا دوں گا ——— میرا نام خلیل ہے۔ میں بشیر ——— یعنی آپ کے بھائی جان کا دوست ہوں (ذرا سے توقف کے بعد پھر بولتا ہے) آج تو بشیر فٹ بال کی پہننے کو طبیعت چاہتی ہے ——— یہاں تو بڑی گرمی ہے

(سانس سے کر بدن پر پھونکتا ہے)

**بشیر:** ہاں بھیا ہے تو ـــــ میں بھی چلوں گا۔

(دونوں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

**نعیمہ:** آپ دونوں یہیں تشریف رکھیے۔ میں باہر سو رہوں گی۔ آپ کیوں زحمت کریں۔

**خلیل:** ہم لوگ تو روز اس کھولی میں ـــــ میرا مطلب ہے، اس گھر میں ـــــ اس کاشانے میں آرام فرماتے ہیں ـــــ آج آپ کی باری ہے۔ ـــــ چلو بھائی۔

(دونوں جاتے ہیں)

پردہ

○

# ساتواں منظر

(مولوی صاحب کی وہی بیٹھک۔ بشارت آتا ہے۔ ابھی بہت
سویرا ہے۔ کمرے میں کوئی نہیں۔ بشارت آواز دیتا ہے)

**بشارت:** مولوی صاحب! ۔۔۔ مولوی صاحب!!

(اندر سے آواز ۔۔ اچھا! ۔۔ اچھا!!)

**مولوی صاحب:** (باہر آتے ہیں ان کا چہرہ پژمردہ تھکا ہوا اور بے رونق معلوم ہوتا ہے۔ جیسے بیمار رہے ہوں)
ارے بھئی تم ۔۔۔ اتنے سویرے ۔۔۔ کیوں خیریت تو ہے؟

**بشارت:** سب خیریت ہے (مولوی صاحب کو غور سے دیکھتا ہے) آپ اتنی خیریت سے ہیں۔ آپ کچھ پریشان سے
نظر آتے ہیں مولوی صاحب:

**مولوی صاحب:** نہیں تو ۔۔۔ رات ذرا دیر تک جاگ گیا تھا۔ گھر میں میلاد تھی۔

**بشارت:** خیر جانے بھی دیجیے اس کو ۔۔۔ مجھے آپ سے ایک خاص بات پوچھنی ہے۔

(وہ مولوی صاحب پر نظریں جما دیتا ہے)

**مولوی صاحب:** (گھبرا کر) مجھ سے؟ کون سی خاص بات!

(وہ بے اطمینانی سے پہلو بدلنے لگتے ہیں)

**بشارت:** گھبرایئے نہیں اطمینان سے بیٹھ جایئے۔

**مولوی صاحب:** (بظاہر مسکرا کر جس سے ان کی پریشانی اور نمایاں ہو جاتی ہے) کیوں بھئی کیا بات ہے
آخر اس قدر غور سے کیوں دیکھ رہے ہو۔ بار بار۔

**بشارت:** مولوی صاحب سچ بتایئے گا۔ دیکھیے چھپایئے گا نہیں

**مولوی صاحب:** (رومال سے پسینہ پونچھتے ہیں) پوچھو بھی تو ۔۔۔ آخر کون سی ایسی بات ہے۔

**بشارت:** یہ بشیر آپ کے یہاں کب سے آنے جانے لگا ہے؟

**مولوی صاحب:** (قدرے اطمینان کی سانس لیتے ہیں) بشیر ——— بشیر سے کیا مطلب؟

**بشارت:** یہی میں پوچھ رہا ہوں ——— بشیر سے کیا مطلب؟ ——— اور وہ لڑکی کون تھی جو کل رات آپ کے یہاں سے نکل کر اس کے ساتھ گئی ہے۔

**مولوی صاحب:** (اُن پر پھر پریشانی بھوٹ پڑتی ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں) اس کے ساتھ گئی ہے؟

**بشارت:** دیکھئے مولانا چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کسی اور کو بھی اگر اس کاروبار میں شریک کرتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر کم از کم مجھ سے کہہ تو دیا ہوتا۔

**مولوی صاحب:** کون سا کاروبار ——— میں سمجھا نہیں!

**بشارت:** (ذرا آگے جھک کر اور مولوی صاحب پر نظریں جما کر) مولانا اس قدر معصوم نہ بنئے ——— یہی لڑکیوں والا۔ اچھا بتائیے آپ ہی کے گھر سے بشیر لے گیا ہے۔

**مولوی صاحب:** کسے لے گیا ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا۔

**بشارت:** مولانا! میں نے کل رات اُسے آپکے مکان سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔

(وہ مولوی صاحب کے چہرے پر اپنے جملہ کا ردعمل دیکھتا ہے۔
مولوی صاحب کے چہرے پر دوبارہ پسینہ آجاتا ہے۔ وہ گھبرائی آواز میں کہتے ہیں)

**مولوی صاحب:** کسے؟

**بشارت:** اُسی لڑکی کو جسے آپ نے بشیر کے حوالے کیا ہے

**مولوی صاحب:** (چُپ رہتے ہیں۔ پسینہ پونچھتے ہیں۔ بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر چپ ہو جاتے ہیں۔ پھر جیسے سوچتے ہوئے بولتے ہیں) ابھی وہ قصہ یوں ہے کہ بشیر کی ——— تم جانتے ہی ہو۔ بشیر کی منہ بولی باجی تھی اسے میں نے کل شام کو بلایا تھا۔ تمہارے تو سامنے ہی باتیں ہوئی تھیں۔ دیکھا نہیں تھا تم نے کتنا بدتمیز تھا وہ ——— تو بھئی وہ قصہ یوں ہے۔

(رُک جاتے ہیں)

**بشارت:** اچھا! میں سمجھ گیا تو آپ نے مزدوری کا بدلہ چکایا ہے۔ مگر مولانا! یہ آپ نے اچھا نہیں کیا آپ نے بھی کس کمینے سے یارانہ جوڑا ہے (رُک کر) اگر میں بشیر کے خلاف کوئی کارروائی کروں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟

**مولوی صاحب:** مجھے! مجھے کیا اعتراض ہوگا۔

**بشارت:** آپ کو بیان دینا ہوگا کہ یہ لڑکی بشیر بھگا کر لایا ہے۔

**مولوی صاحب:** مگر بھئی میں یہ کیسے کر سکتا ہوں ——— میرے گھر کی ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔

(وہ بے چینی سے ٹہلنے لگتے ہیں)

**بشارت:** آپ کی عزت پر کوئی آنچ نہ آئے گی ——— فرض کیجئے یہ لڑکی عورتوں کے کیمپ سے بھگائی گئی ہے۔

**مولوی صاحب:** (پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہیں) پھر!

**بشارت:** پھر کچھ نہیں ——— آپ بری الذمہ ہیں ——— ٹھنڈے ٹھنڈے بشیر میاں جیل چلے جائیں گے ——— سب بندوبست میں کردوں گا۔ عورتوں کے کیمپ سے ثبوت میں فراہم کردوں گا ——— آپ مطمئن رہیے۔ ——— آپ سے کوئی واسطہ نہیں (ٹھہر کر) لیکن ایک بات ہے اگر وہ آپ کو بطور گواہ یا شناخت کے لیے بلائے تو آپ انکار کر دیجئے گا۔ سمجھے؟

**مولوی صاحب:** (سوچتے ہوئے) ہاں انکار کر دوں گا۔

(مغموم انداز میں سر ہلاتے ہیں)

**بشارت:** ہاں! آپ انکار کر دیجئے گا۔ ——— آپ اسے نہیں پہچانتے ——— آپ نے اسے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ بشیر نے دشمنی سے آپ پر اتہام لگایا ہے۔

**مولوی صاحب:** (آپ ہی آپ کہتے ہیں۔ جیسے خواب میں کہہ رہے ہوں) میں اُسے نہیں پہچانتا ——— میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا ہے۔

**بشارت** : (جاتے ہوئے) اور بشیر نے دشمنی سے آپ پر اتہام لگایا ہے۔

**مولوی صاحب** : (دہراتے ہیں ایک معمول کی طرح) اور بشیر نے دشمنی سے اتہام لگایا ہے۔

**بشارت** : اچھا اب اجازت دیجیے۔

(چلا جاتا ہے)

**مولوی صاحب** : (بڑبڑاتے ہیں) اچھا اب اجازت دیجیے ——— مَیں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا ہے۔
مَیں اُسے نہیں پہچانتا۔

(وہ چیختے ہیں اور سر تھام کر تخت پر بیٹھ جاتے ہیں)

**پردہ**

O

# آٹھواں منظر

(بستر رل کھولی ـــــ بیڈ لیمپ اسرگیا ہوا ہے ـــ خلیل اللہ نعیمہ موجود ہیں ـــــ خلیل کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔ نعیمہ ایک کپڑا سی رہی ہے۔ نعیمہ خلیل کو دیکھتی ہے۔ کچھ بولنا چاہتی ہے مگر خلیل کو محو مطالعہ دیکھ کر خاموش رہتی ہے مگر خلیل بدستور پڑھنے میں مشغول ہے ـــــ آخر کار وہ پوچھتی ہے)

**نعیمہ** : کتاب بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہے؟

**خلیل** : (مسلسل پڑھتے ہوئے) بہت دلچسپ!

**نعیمہ** : (مسکرا کر) اور سبق آموز بھی۔

**خلیل** : (اسی طرح کتاب لئے پڑھتے ہوئے) اور سبق آموز بھی۔

**نعیمہ** : اور شاید ختم بھی نہ ہو؟

**خلیل** : اور شاید ختم بھی ـــ (فقرہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ کتاب ہٹاتا ہے ـــ مسکراتا ہے ـــ) یقیناً ختم ہو سکتی ہے (کتاب بند کرتا ہے) کہئے ارشاد حکم ـــ

(اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

**نعیمہ** : حکم (ایک فرمائشی تبسم اس کے لبوں پہ دوڑ جاتا ہے) اچھا آپ کتاب ہی پڑھئے۔

**خلیل** : دیکھئے کل سے آپ کام شروع کر دیجئے ـــ آپ کی تنہائی دور ہو سکے گی۔

**نعیمہ** : کون سا کام ـــــ!

**خلیل** : ہزاروں کام ہیں۔ محنت مزدوری ـــ لکھنا پڑھنا ـــ یہی کپڑے سیا کیجئے۔

**نعیمہ** : مگر کپڑے سینے کو ملے گا کون؟

خلیل : ہر وہ شخص جس کے پاس کپڑے ہیں —— اس پڑوس میں نکل کر دیکھیے تو —— ہمارے لیے ہزاروں
آدمی ہیں جو روزی کی سلائی نہیں دے سکتے۔ آپ انہیں اگر سستے داموں پر سی کر دے دیجیے گا تو وہ بخوشی کپڑے
دیں گے —— وہ علاوہ آرڈر تو ہمارے اور شہر کے بک کر لیجیے۔ اطمینان رکھیے سب کپڑے چلے گے۔ آپ
سی کر دیے جائیں گے

نعیمہ : (مسکراتی ہے) نوازش ہے۔

خلیل : نوازش تو یہاں نہیں ہے —— فی الحال اسی قمیض سے کام چلا رہا ہوں (رک کر) آپ کے پاس تو ہنر ہے۔
آپ پڑوس کی بہت سی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سینا پرونا سکھا سکتی ہیں۔ آپ اگر مجبوری اور لاچاری محسوس
کریں تو سارا قصور آپ کا ہے۔

نعیمہ : میں خود سوچ رہی تھی کہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔ یہ مہمانداری کب تک ہوگی۔

خلیل : (ہنستے ہوئے) آپ تو ماشاء اللہ بہت ذہین معلوم ہوتی ہیں (اٹھتے ہوئے) میرا مطلب آپ نے غلط سمجھا
مہمانداری بڑے بڑے گھروں میں ہوا کرتی ہے۔ ہمارے گھر جہاں دن کی روشنی نہیں پہنچتی۔ جہاں رات کو چراغ
نہیں جلتے۔ جہاں تمام دن کام کرنے کے بعد دو وقت کی روٹی نہیں ملتی۔ وہاں

نعیمہ : سچ ہے وہاں مہمانداری کہاں ہو سکتی ہے !

خلیل : دیکھیے۔ آپ پھر غلط سمجھ رہی ہیں —— وہاں خوب مہمان داری ہوتی ہے —— گھر گھر لگاتار
ہے۔ ہم سب مہمان ہیں —— بڑے بڑے سیٹھ —— بڑے بڑے جاگیردار سب ہمارے
مہمان ہیں —— ہم مزدوری کرتے ہیں۔ پیسہ وہ بناتے ہیں۔ ہل ہم جوتتے ہیں۔ فصلیں وہ کاٹتے
ہیں —— ہم فاقہ کرتے ہیں۔ دعوتیں وہ اڑاتے ہیں۔ خیال فرمایا آپ نے!

نعیمہ : جی ہاں سمجھ گئی!

خلیل : غلط تو نہیں سمجھیں۔

نعیمہ : جی نہیں!

خلیل : اسی لیے کام کرنا ہوگا آپ کو —— ہم سب کو کام کرنا ہوگا ہم مفت خورے نہیں ہیں —— ہم ——

(دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ خلیل دروازہ کھولتا ہے۔ دروازے پر چند پولیس کے آدمی۔ ایک سن رسیدہ تھانیدار اور بشارت موجود ہے)

**تھانیدار:** بشیر کو بھیج دو۔

**خلیل:** کیوں کیا بات ہے؟

**تھانیدار:** تم سے کوئی مطلب نہیں ہے۔

**خلیل:** آخر بات کیا ہے ـــــ میں بھی تو سنوں

**تھانیدار:** کوئی بھی بات ہو۔ تم باہر بھیجو اُسے۔

**خلیل:** وہ گھر پر نہیں ہے۔

**تھانیدار:** کہاں گیا ہے؟

**خلیل:** اب وہ آجائے تو اس سے پوچھ لیجئے گا ـــــ آپ باہر تشریف رکھیں۔

(جانے کے لیے مڑتا ہے)

**تھانیدار:** (پولیس مین سے) اسے حراست میں لے لو۔

(نعیمہ آتی ہے ـــــ یہ رنگ دیکھ کر زرد پڑجاتی ہے)

**خلیل:** دیکھئے تھانیدار صاحب! اتنی تعلیم سے بہرہ ور ہوں کہ حراست کے معنی سمجھ لیتا ہوں۔

**تھانیدار:** جب تک ملزم نہیں آتا۔ تمھیں یہیں رکنا پڑے گا۔

**خلیل:** ملزم! ـــــ کون ملزم؟

(بشیر آتا ہے بشارت تھانیدار صاحب سے آہستہ سے کہتا ہے)

**بشارت:** تھانیدار صاحب آگیا آپ کا آدمی۔

(تھانیدار بشیر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پولیس کے آدمی اُسے پکڑ لیتے ہیں)

**بشیر:** بات کیا ہے!

تھانیدار: یہ ہم تمہیں حوالات میں جا کر بتائیں گے۔

بشیر: کوئی کھیل ہے حوالات لے جانا۔ پہلے جرم بتاؤ۔

تھانیدار: (جیب سے کاغذ نکال کر) تمہیں عورتوں کے کیمپ سے اس لڑکی کے بھگانے کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔

(بشیر چونک کر نعیمہ کو دیکھتا ہے۔ نعیمہ بشیر کو دیکھتی ہے — خیل

ساکت کھڑا رہتا ہے)

بشیر: لڑکی کے بھگانے کے جرم میں؟ (پھر نرم لہجہ میں کہتا ہے) آپ کو دھوکا ہوا ہے تھانیدار صاحب — یہ

مہاجر کیمپ کی لڑکی نہیں ہے۔

بشارت: تھانیدار صاحب یہ جھوٹ بکتا ہے۔

بشیر: دیکھو جی — تم چپ رہو ورنہ اچھا نہ ہوگا — اس دن تو چھوڑ دیا تھا — آج —

تھانیدار: سیدھے سیدھے چلتا ہے کہ نہیں؟

بشیر: دیکھو داروغہ جی! بزرگوں کی دعا کرو — عقل کی دوا کرو — کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس۔

تھانیدار: بغیر ثبوت کے پولیس کچھ نہیں کرتی۔ عورتوں کے کیمپ کا کاغذ ہمارے پاس موجود ہے۔

بشیر: کاغذ موجود ہے؟ یہ پٹی مجھے نہ پڑھاؤ — یہ لڑکی مولوی صاحب کے گھر سے آئی ہے — اسی لڑکی سے

پوچھ لیا جائے۔

بشارت: اس لڑکی کا کیا اعتبار!

بشیر: تیری بات کا اعتبار ہے۔ بڑا آیا کہیں کا (بشارت کی طرف بڑھتا ہے — پھر کچھ سوچ کر تھم جاتا ہے)

تھانیدار صاحب! اگر اس لڑکی کا اعتبار نہیں تو مولوی صاحب کو بلالو۔

بشارت: مولوی صاحب ایسی ذلیل جگہ آنا پسند نہ کریں گے۔

بشیر: وہ تو سب معلوم ہے — مگر انھیں یہاں آنا ہی پڑے گا۔ میں ثبوت دوں گا کہ یہ لڑکی

ان کے گھر سے آئی ہے۔

بشارت: اور اگر ثابت نہ کر سکے۔

بشیر: تھانیدار صاحب: مولوی صاحب کو بلاؤ میری بات مانو۔ آپ کو دھوکا ہو رہا ہے۔

تھانیدار: اچھی بات ہے (ایک سپاہی کو بھیجتے ہیں) بشارت میاں کے ساتھ چلے جاؤ مولوی صاحب کو بلا لاؤ

(دونوں جاتے ہیں)

تھانیدار: (لڑکی سے) کیا نام ہے تمھارا؟

(نعیمہ خاموش رہتی ہے)

خلیل: (اب بولتا ہے) جابر کیمپ سے آئی ہے۔ آپ کو تو معلوم ہوگا؟

تھانیدار: تم چپ رہو۔ میں چیک (CHEK) کرنا چاہتا ہوں ——— کیا نام ہے تیرا — بولتی کیوں نہیں؟

(وہ سخت لہجے میں پوچھتے ہیں ——— نعیمہ کا رنگ بدل جاتا ہے۔ دفعتاً اس کے چہرے سے شرم اور گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے۔ اس کی آواز کڑی ہو جاتی ہے)

نعیمہ: میرا کوئی نام نہیں ہے۔

تھانیدار: کوئی نام نہیں ہے ——— چھپانے سے فائدہ ہمارے پاس نام موجود ہے۔

نعیمہ: پھر پوچھنے سے فائدہ؟

خلیل: آپ چیک (CHEEK) کرنا چاہتے ہیں۔

تھانیدار: تم چپ رہو جی۔ کیا نام ہے تیرا۔

نعیمہ: میرا نام! میرا نام سیتا ہے۔ میرا نام مریم ہے۔ میرا نام!

تھانیدار: اتنے سب نام!

نعیمہ: اور بہت سے نام ہیں۔ کتنے نام بتاؤں۔

تھانیدار ——— تم ہو کون ———!

نعیمہ ——— میں عورت ہوں ———!

**تھانیدار:** یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔

**نعیمہ:** تم کچھ نہیں دیکھ سکتے ——— تم صرف نظر ہو۔

**تھانیدار:** کون ہے تُو۔ بتاتی کیوں نہیں۔

**نعیمہ:** میں عورت ہوں ——— بیوی ——— بہن ——— ماں ——— میں عورت ہوں ———

(مولوی صاحب۔ بشارت اور سپاہی داخل ہوتے ہیں۔ مولوی

صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔)

**تھانیدار:** بڑی چرب زبان ہے تُو۔ بڑی بے شرم ہے۔

**بشیر:** تھانیدار صاحب نے ابھی تک قابو میں رکھے گا۔

**نعیمہ:** شرم ——— تمہیں مجھ سے آنکھیں ملاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ ——— یہ تم باتیں کر رہے ہو

——— تم! ——— تم جنگلوں میں مارو۔ بہنوں کی عزت لوٹی۔ اس وقت لاج نہ آئی ———

تم نے ہزاروں عورتوں کے ننگے جلوس نکالے۔ اس وقت شرم نہ آئی۔ آج تم مجھے شرم دلانے آئے ہو۔

**بشارت:** تھانیدار صاحب! آپ بھی کس بے حیا کے منہ لگے ہیں۔ مولوی صاحب آگئے ہیں۔ آپ دریافت کر لیجئے۔

**تھانیدار:** مولوی صاحب معاف فرمائیے گا ——— آپ کو بڑی زحمت ہوئی ——— آپ اس لڑکی کو پہچانتے ہیں؟

(سب کی نظریں مولوی صاحب پر جم جاتی ہیں۔ مولوی صاحب عجیب

بے بسی کے عالم میں ہیں ——— ان سے بولا نہیں جاتا)

**تھانیدار:** آپ پہچانتے ہیں اسے

(مولوی صاحب کے ہونٹ کانپ کر رہ جاتے ہیں وہ کچھ نہیں کہہ پاتے)

**بشارت:** مولوی صاحب! آپ بہت نرم دل ہیں مگر یہ معاملہ اب پولیس میں جا چکا ہے۔ تھانیدار صاحب کو آپ کے

جواب کا انتظار ہے وہ آپ کی وجہ سے ابھی تک ٹھہرے ہوئے ہیں۔

**مولوی صاحب:** میں ——— میں ——— اسے ——— میں اسے ———

**تھانیدار:** ہاں ——— ہاں ——— فرمائیے۔

**مولوی صاحب** : یہ اسے ـــ میں اسے ـــــ

(یکایک وہ ٹوٹ جاتے ہیں اور زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ نعیمہ کی آنکھیں حقارت سے چمک اٹھتی ہیں۔ وہ آگے بڑھتی ہے ۔ ایک نظر مولوی صاحب پر ڈالتی ہے۔ پھر انتہائی تحقیر سے کہتی ہے)

**نعیمہ** : میں اسے نہیں جانتی۔

**بشیر** : (چونک کر) نعیمہ بہن! نعیمہ بہن!!

**نعیمہ** : ہاں بشیر بھیا! میں اسے نہیں پہچانتی ـــ میں اسے نہیں پہچانتی ـــ

**بشارت** : دیکھا! تھانیدار صاحب! میں آپ سے پہلے ہی کہتا تھا ـــــ مفت میں مولوی صاحب کو تکلیف دی گئی۔ ان کی طبیعت آج بہت خراب تھی صرف آپ کی وجہ سے یہاں تک آ گئے۔

**تھانیدار** : (سپاہیوں سے بشیر کی طرف اشارہ کرکے) لے چلو اسے۔

**خلیل** : چھوڑ دیجئے بشیر کو ـــــ اس لڑکی کو میں لایا ہوں۔

(سب حیرت سے خلیل کو دیکھتے ہیں)

**بشارت** : تم لائے ہو؟

**خلیل** : ہاں! میں لایا ہوں ـــ یہ میری بیوی ہے ـــ عورتوں کے کیمپ سے اسے میں لایا ہوں۔

(نعیمہ کا چہرہ متضاد جذبات کی آماجگاہ بن جاتا ہے)

**تھانیدار** : یہ تمہاری بیوی ہے۔ کیا ثبوت ہے!

**خلیل** : کیا ثبوت ہے ـــــ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ نہیں ہے؟

**تھانیدار** : کب ہوئی تمہاری شادی؟

**خلیل** : سن ۴۷ء

**تھانیدار** : سنہ ۴۷ء میں۔

**خلیل** : ہاں! اسی سن میں۔

تھانیدار : مگر کیا ثبوت ہے ؟

خلیل : (نعیمہ کی طرف رخ کر کے) نعیمہ ! انھیں ثبوت چاہیے ہماری شادی کا ثبوت —— تھانیدار صاحب !
کیا ثبوت ہے آپ کی شادی ہو چکی ہے ؟

تھانیدار : میری شادی ہو چکی ہے —— میرے لڑکے موجود ہیں۔

خلیل : مگر یہی ثبوت ہے —— تو میں

(نعیمہ آگے بڑھ کر خلیل کو روکتی ہے)

نعیمہ : خلیل صاحب !

خلیل : نعیمہ ! تم ان لوگوں کو نہیں پہچانتی —— یہ ہر بات میں ثبوت مانگتے ہیں۔ یہ انسانوں کو قانون۔ سونے اور
چاندی کے ذریعے سے پہچانتے ہیں۔ —— یہ معصوم بچوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ ان کے
پاس ثبوت نہیں —— یہ انھیں —— معصوم بچوں کو سماج کے باہر کر دیتے ہیں اور
جب وہ بڑے ہو کر —— چاندی سونے کے ثبوت لاتے ہیں تو پھر سماج میں لے لیتے ہیں۔ یہ ہمارے بچے کو بھی۔

نعیمہ : خلیل صاحب !

(نعیمہ کسی طرح خلیل کو روک دینا چاہتی ہے)

خلیل : نعیمہ ! ہمارا بچہ۔ تھانیداروں اور مولویوں —— دلالوں اور ساہوکاروں کے ثبوت کا محتاج نہیں ہوگا۔ ہم
اس کے ذمہ دار ہیں —— ہر وہ شخص ذمہ دار ہے جو اولاد والا ہے —— نہیں تو —— اسے بھی اپنی اولاد
کا ثبوت دینا ہوگا۔

بشارت : دیکھیے تھانیدار صاحب یہ مانی ہوئی دراز ہی —— کچھ حد ہے ان بدمعاشوں کی۔ بے ہودگی کی۔ کس ڈھٹائی سے
اپنی بے حیائی کا اعلان کر رہے ہیں۔

تھانیدار : (پولیس والوں سے) دونوں کو لے چلو (دونوں پکڑ لیے جاتے ہیں) اور اسے (نعیمہ کی طرف اشارہ کر کے)
عورتوں کے کیمپ میں پہنچا دو۔

نعیمہ : میں وہاں نہیں جاؤں گی —— مجھے چھوڑ دو —— مجھے چھوڑ دو —— میں وہاں نہیں جاؤں گی

میں وہاں کیوں جاؤں (سپاہی بشیر اور خلیل کو لے جانا چاہتے ہیں) تم سبھوں نے مل کر میرا سہاگ لوٹ لیا۔ تمہیں اب بھی چین نہیں ——— تم آج بھی میرا سہاگ لوٹنے آگئے ہو۔ ——— میں وہاں نہیں جاؤں گی۔

(سپاہی بشیر کو لے جاتے ہیں نعیمہ چیختی ہے۔ بشیر بھیا! بشیر بھیا!!)

**بشیر** (جاتے ہوئے) بہن! میں آؤں گا تم گھبراؤ نہیں۔ میں ضرور آؤں گا۔ میں ضرور آؤں گا ——— میرے ساتھ تمہارے کروڑوں بھائی آئیں گے۔ جو تمہاری توہین کا بدلہ لیں گے۔ آج ہمارے ہاتھ بندھے ہیں۔ مگر کل ہمارے ہاتھ کھل جائیں گے ——— سچ کی جیت ہوگی بہن! بھلا ضرور جیتے گا ——— تم رؤ مت۔ میں آؤں گا ——— میں ضرور آؤں گا

(بشیر اور خلیل اور دوسرے لوگ چلے جاتے ہیں۔ بشارت مولوی صاحب کو سہارے سے لے جاتے ہیں۔

مولوی صاحب جاتے جاتے نعیمہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ نعیمہ منہ پھیر لیتی ہے۔)

پردہ

O

# حبّہ خاتون

پروفیسر محمد مجیب

◎

# کردار

زون : حبّہ خاتون
اُس کی ماں :
تین آدمی :
سید مبارک : ایک صوفی
عطا محمد : ان کا شاگرد
عبداللہ راتھر : زون (حبہ خاتون) کا باپ
شہزادہ یوسف : بعد کو یوسف شاہ
محمد بٹ :
علم شیر خاں ماگرے :
علی خاں چک :
عزیز راتھر : حبہ خاتون کا شوہر

ولی عہد : (یعقوب شاہ)
ایک جوان عورت : عطا محمد کی بیوی
بابا خلیل اللہ : ایک صوفی
قاضی ابو محمد :
اُن کے شاگرد :
دلنواز : قوال
اس کے دو ساتھی :
چوبدار :
نسرین : ایک خواص
دو خواصیں :
دو نوجوان :

مجمع کے لوگ

# پہلا ایکٹ

## پہلا منظر

*اسٹیج کے دائیں طرف زدا پیچھے مکان کا دروازہ بائیں طرف چشمہ اس کے کنارے شمشاد کا درخت۔ پشت پر پہاڑوں کا منظر۔ زدن گھر سے اچھلتی کودتی نکلتی ہے۔ جیسے تارے سے سُر نکلتا ہے۔ چشمے کے پاس جاتی ہے مسکراتی ہوئی۔ رک رک کر کچھ کہتی ہے۔ پھر لپک کر شمشاد سے لپٹ جاتی ہے۔ اس کے تنے پر گال رکھ دیتی ہے۔ اس سے پیار کی باتیں کرتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی نظر پہاڑوں پر پڑتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ان کے بھی گلے ملے مگر ٹھٹھک کر رہ جاتی ہے۔*

**زدن** ، (شکایت کے لہجے میں شمشاد سے) دیکھو تو ان پہاڑوں کو۔ جانتے ہیں کہ میرا ان سے لپٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔ مگر وہ چُپ سادھے بیٹھے رہتے ہیں۔ نہ ایک قدم آگے نہ پیچھے۔ میں بھی ان کی طرف پیٹھ پھیر لوں گی (کچھ دیر سوچ کر) وہ ہیں بھی تو بے تکے۔ کہیں ایسا سناٹا کہ آدمی آواز کے نام تک کو بھول جائے۔ کہیں ایسا شور کہ پیر لڑکھڑانے لگتے ہیں کبھی نظر کر اوپر چڑھاتے چڑھاتے تھکا دیتے ہیں۔ کبھی اتنے زور سے نیچے دھکیلتے ہیں کہ نظر کے ساتھ آدمی خود بھی گر نے لگتا ہے۔ یہ بھی بھلا کوئی طریقہ ہے (پہاڑوں کی طرف پیٹھ کر لیتی ہے اور اس طرح منتظر رہتی ہے۔ گویا پہاڑ اس کی شکایت سُن کر اس سے کچھ کہیں گے پھر کنکھیوں سے پیچھے کی طرف دیکھتی ہے اسے کوئی جواب نہیں ملتا) اچھا نہ بولو۔ دیکھوں کب تک چُپ رہتے ہو۔

(زون شمشاد سے ٹیک کر چشمے کے پاس بیٹھ جاتی ہے اور اس کے
بہاؤ کو دیکھنے لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے چہرے سے ہر جذبے
کے آثار مٹ جاتے ہیں۔ پھر وہ اس طرح بولنے لگتی ہے کہ گویا اندر
سے کوئی طاقت اسے مجبور کر رہی ہے )

**زون** : میرے دل سے گیت نکلتے۔ تیرے ساتھ بہتے۔ نہ جانے کہاں تک بہتے —— کسی کو پتہ نہ چلتا کہاں سے آئے ہیں۔ کس کے دل سے نکلے ہیں۔ کوئی سمجھتا۔ یہ وہ ہوا ہے جو جنگلوں کو گدگدایا کرتی ہے۔ کوئی کہتا۔ یہ پہاڑوں کا سناٹا ہے۔ چشمے کے ساتھ بہہ کر آگیا ہے دل کو آرام پہنچانے۔ محنت کا پسینہ پونچھنے —— میرے دل سے گیت نکلتے —— عورتیں انہیں گود میں اٹھا لیتیں۔ لڑکیاں ان کے ساتھ کھیلتیں —— مرد آنکھیں نیچی کر لیتے —— میرے گیت —— کہاں گیا میرے گیت (خاموشی، توبہ!) دل سے کچھ نکلتا نہیں۔ بس بوجھ بڑھتا جاتا ہے (چہرے پر تکلیف کے آثار) مرجانا آسان ہے۔ جیتے رہنا مشکل —— کوئی ان گیتوں کو میرے دل سے نکال لیتا۔ نکال کر پھینک دیتا! آخر ان سے فائدہ کیا؟ (آہستہ آہستہ نظر اٹھا کر پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے) اور ان پہاڑوں سے کیا فائدہ؟ لاکھ محبت کرو دور ہی رہتے ہیں۔ ان کی طرف دیکھو تو نظر کو پکڑ لیتے ہیں دل کو مسوس دیتے ہیں۔ کوئی تسکین نہیں۔ کوئی تسلی نہیں۔ اکیلے کو اکیلا چھوڑ دیتے ہیں —— ہم تو موت کا اچار کھا کر زندہ رہتے ہیں (یکبارگی کیفیت بدل جاتی ہے۔ شمشاد کی شاخوں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر) اچھا خیال ہے۔ موت کا اچار۔ کچھ نہ ہو تو اچار ہی کھاؤ (کھڑی ہو کر آنکھیں چمکاتے ہوئے) اچار۔

**زون کی ماں** : (اندر سے) زون! زون!!

**زون** : جی اماں!

**زون کی ماں** : (دروازے کے پاس سے) اری کیا کر رہی ہے باہر؟

**زون** : باتیں کر رہی ہوں۔

**ماں** : (باہر آ کر) باتیں کر رہی ہے۔ کس سے؟

**زدان** : (خوشی کے ساتھ چیختا کر) چشمے سے۔ شمشاد سے۔ پہاڑوں سے۔ اپنے آپ سے۔

**ماں** : (زدان کی طرف بڑھتے ہوئے) تجھے کیا ہو گیا ہے لڑکی۔ دیوانوں کی طرح چلا رہی ہے۔ معلوم نہیں آج لوگ آنے والے ہیں ؟

**زدان** : کیسے لوگ ؟

**ماں** : کیسے لوگ آئیں گے ؟ تجھے معلوم نہیں کہ تو سیانی ہو گئی ہے۔ سید صاحب تیرے استاد کی خوشی تھی کہ تجھے فارسی پڑھا لکھا دیں۔ تب تیرا بیاہ ہو۔ نہیں تو اب تک تو سسرال میں کئی سال گزار چکی ہوتی۔

(زدان منہ بنا کر چپ ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں اسٹیج کے بائیں طرف پیچھے تین آدمی نظر آتے ہیں۔ ماں زدان کو اپنے کپڑوں میں چھپا لیتی ہے۔ آدمی مکان کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور پھر کوئی انھیں اندر بلا لیتا ہے)

**ماں** : (رازداری کے لہجے میں) تیرے ابا کے ایک بہت عزیز دوست ہیں۔ عمر بھر ان کا ساتھ رہا ہے۔ تبت کے کئی سفر کر چکے ہیں۔ تو تو خود ہی جانتی ہے کہ تو پیدا بھی نہیں ہوئی تھی جب انھوں نے طے کر لیا تھا کہ ہماری طرح کا رشتہ ہوگا۔ بیچے۔ خوش حال لوگ ہیں بستی میں ان کی عزت ہے۔ تیرے ابا نے آج شاہ صاحب کو بھی بلایا ہے۔ اُن کی دعا میں بہت اثر ہے (خاموشی) اچھا اب تو یہاں چپکی بیٹھی رہ۔ مجھے جا کر مہمانوں کی خاطر کرنا ہے۔

(ماں مکان کے اندر چلی جاتی ہے۔ زدان سر جھکا کر پھر چشمے کے بہاؤ کو دیکھنے لگتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا ایک ہاتھ اس طرح حرکت کرنے لگتا ہے۔ گویا وہ ایک لے کی روانی کو بتا رہی ہے۔)

ون تو ذہ وین کمہ بمرے[1] ——— ون تو ذہ وین کمہ بمرے ——— دل تازہ کرو تھم دلبرے[2]

دل تازہ کرو تھم دلبرے ——— ون تو ذہ وین ون کمہ بمرے ——— بیو کرچس

---

[1] بتا تو سہی، میں تیرے بغیر دن کیسے گزاروں گی [2] اے دلبر تو نے میرا دل لے لیا ہے۔

—— آمڑ برشے[1] —— از تم برے ماشے برشے[2] —— دل تازہ کرو تھم دلبرے

از تم برے لمے برے —— دل تازہ کرو تھم دلبرے (وہ سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ گانا بند ہو جاتا ہے

صرف ہاتھ حرکت کرتا رہتا ہے) کھُر —— چانڈ —— سکھ —— کھُر چانڈ سکھ۔

کرتاہ برشے[3] —— وں ترشہ دِیں دِن کھُر برے ——

(اسی دوران میں سید مبارک ایک نوجوان مرید عطا محمد کے ساتھ آتے

ہیں۔ اور زون کی کیفیت دیکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ زون کی نظر

ان پر پڑتی ہے تو وہ گھبرا کر چپ ہو جاتی ہے اور اپنا منہ چھپا لیتی ہے)

**سید مبارک:** مجھے معلوم تھا کہ عبداللہ راتھر کے مکان کے سامنے چشمہ ہے۔ یہ معلوم نہ تھا کہ اس میں سُر بہتے ہیں۔

(زون کے قریب جا کر) کیوں بیٹی تمہارا ہی نام زون ہے نا (زون کوئی جواب نہیں دیتی) میں تمہارے لیے دعا کرنے آیا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے بہت سی دعائیں دینا ہوں گی —— میں پہلی دفعہ آیا تھا تو تم کھیلتی پھرتی تھیں۔ ایک بار تمہیں استاد سے فارسی پڑھتے دیکھا تھا۔ خدا تمہیں یہ علم، یہ طبیعت مبارک کرے۔

(زون کے پاس بیٹھ کر) اچھا اب شرماؤ نہیں۔ گیت کو اپنے گلے میں چھپا کر نہ رکھو۔ مجھے گیتوں کا بہت شوق ہے۔ اور کشمیری گیت میں نے سنے ہی نہیں۔

(سید مبارک اس کے منتظر ہیں کہ زون گانا شروع کرے۔ وہ سر جھکائے

بیٹھی رہتی ہے —— کچھ دیر خاموشی رہتی ہے)

**عطا محمد:** حضور آپ اجازت دیں تو مولانا روم کی وہ غزل سناؤں جو آپ کو بہت پسند ہے۔

**سید مبارک:** بہت اچھا خیال ہے۔ ضرور سناؤ۔

(عطا محمد ذرا دیر گنگنانے کے بعد، دھیمی مگر جذبات سے لبریز

آواز سے گانا شروع کرتا ہے۔ زون چونک پڑتی ہے۔ غزل

سنتے سنتے اس کی جھجک بالکل دور ہو جاتی ہے اور وہ اس کے معنی

---

[1] میں تیری محبت سے بھرپور ہوں۔ [2] تو میرے گھر کے اندر داخل ہو جا، میں تیرے لیے چھوٹے چھوٹے بکرے ذبح کروں گی۔

[3] تیرے چہرہ دیکھے سے میری راحت پیدا ہوگی۔

سے لطف اٹھانے لگتی ہے )

**عطا محمد:**

چرا از اندیشہ، بے چارہ گشتی — فرو رفتی بہ غم، غم خوارہ گشتی
چرا از اندیشہ، بے چارہ گشتی — فرو رفتی بہ غم، غم خوارہ گشتی

ترا من پارہ پارہ جمع کردم

ترا من پارہ پارہ جمع کردم — چرا از وسوسہ صد پارہ گشتی
ز دارالملک عشقم رخت بستی — دریں غربت چنیں آوارہ گشتی

زمیں را بہر تو گہوارہ کردم

زمیں را بہر تو گہوارہ کردم — فسردی تختہ گہوارہ گشتی
رواں کردم ز بہرت آب حیواں — تو سوئے خشک رو د خارہ گشتی
چرا از اندیشہ بے چارہ گشتی — فرو رفتی بہ غم، غم خوارہ گشتی
ترا من پارہ پارہ جمع کردم — چرا از وسوسہ صد پارہ گشتی

چرا ز اندیشہ، بے چارہ گشتی

( غالباً گانے کی آواز سن کر عبداللہ دالقمر گھر سے نکل آتا ہے اور سید مبارک کی طرف لپکتا ہے۔ اس کے پیچھے وہ تین آدمی بھی جو چلے گئے تھے۔ نکل پڑتے ہیں۔ آخر میں نعمان کی ماں گھر سے نکلتی ہے۔ جنہوں آدمیوں کو سماع کی محفل غالباً پسند نہیں آتی اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر چہرے اور آنکھوں سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں )

**عبداللہ:** ( غزل ختم ہونے کے بعد مصافحہ کرتے ہوئے ) حضور شاہ صاحب! یہ آپ نے مجھ پر کیا غضب کیا کر تشریف لائے۔ اور یہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ آپ نے تو مزاج پرسی کا موقع نہ دیا۔ غفلت کی معافی چاہتا ہوں۔

سید مبارک : مہمان مطمئن ہو تو میزبان کے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ میں جس غرض سے یہاں آیا تھا وہ کر رہا ہوں ——— زون کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اس کی پیشانی پر شخصیت کا جلوہ ہے۔ خدا نے چاہا تو یہ صرف اپنے زمانے کے لوگوں کو نہیں متاثر کرے گی۔ بلکہ بعد کو آنیوالی نسلیں بھی اسے یاد کریں گی۔

عبداللہ : حضور کی دعا سے سب کچھ ہو سکتا ہے

سید مبارک : (ذرا سوچ کر) اس وقت مجھے نہ معلوم کیوں خیال آ رہا ہے کہ زون کا نام حبہ ہو تو بہتر ہے ہم اسے آج سے حبہ کہا کریں گے

عبداللہ : حضور کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ آج سے یہ حبہ کہلائے گی۔ اب حضور اندر تشریف لے چلیں اور خادم کو کچھ تواضع کرنے کا موقع عنایت فرمائیں۔

سید مبارک : نہیں میرا تو یہیں بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ جگہ بہت اچھی ہے۔

(تینوں آدمی جو اب تک عبداللہ کے پیچھے کھڑے رہے ہیں۔ بڑھ کر سید مبارک سے مصافحہ کرتے ہیں۔ سید مبارک ان پر ایک نظر ڈال کر پھر توجہ نہیں کرتے اور حبہ کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ شمشاد کے پیچھے منہ چھپا لیتی ہے۔ تینوں آدمی ہٹ کر اسٹیج کے دائیں طرف آ جاتے ہیں۔ عبداللہ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی طرف متوجہ ہو یا سید مبارک کی طرف)

پہلا آدمی : (اپنے ساتھیوں سے) اب ہمیں رخصت ہو جانا چاہیئے۔

دوسرا آدمی : اور نہیں کیا۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ لڑکی اس طرح بیٹھ کر گانا سنے۔

تیسرا آدمی : ہاں دیکھو کیسی بے شرم ہے خود بھی گا رہی ہے۔

دوسرا آدمی : کہیں یہ لڑکی ہماری لڑکیوں کو خراب نہ کرے۔

پہلا آدمی : نہیں! میں سمجھتا ہوں سسرال میں اس کی اصلاح ہو جائے گی بہرحال شاہ صاحب کی موجودگی میں

تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔

(آخر کار عبداللہ راتھر طے کر لیتا ہے کہ اُسے ان تینوں سے مخاطب
ہونا چاہیے اور وہ اٹھ کر ان کی طرف آتا ہے)

پہلا آدمی: عبداللہ! بھئی اب ہمیں اجازت دو۔

عبداللہ: ایسی جلدی کیا ہے۔ ذرا دیر تو اور ٹھہرو۔

تیسرا آدمی: نہیں اب ہمیں جانے دو۔

دوسرا آدمی: ہاں ہمارا چلا جانا ہی بہتر ہے۔

(عبداللہ کے چہرے سے پریشانی اور تکلیف ظاہر ہوتی ہے۔ مگر
کوئی جواب اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ تینوں آدمی اس سے معانقہ
کر کے اور سید مبارک کو سلام کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں)

سید مبارک: عبداللہ راتھر! بھئی مجھے بہت افسوس ہے کہ میرا ایسے وقت آنا ہوا۔ جب یہ لوگ یہاں موجود تھے۔

عبداللہ راتھر: حضور۔ آپ کیا فرماتے ہیں۔ آپ کا تشریف لانا کبھی بے موقع ہو سکتا ہے۔ ہمارے لیے تو آپ
جس وقت بھی تشریف لائیں بڑی سعادت ہے

سید مبارک: نہیں۔ میں اس وقت نہ آتا تو بہتر تھا۔ میرے لیے اب ایک بڑا اخلاقی مسئلہ پیدا ہو گیا ہے ——
حبہ کو میں نے ابھی گاتے سنا تھا۔ اس کی آواز معمولی آواز نہیں۔ اس کا شوق معمولی شوق نہیں —— مگر
تمہیں بات کیسے سمجھاؤں۔

ماں: حضور! زون۔ لیجئے وہی پرانا نام زبان پر آگیا۔ حبہ کو میں نے کبھی کبھی گنگناتے سنا ہے۔ بچی ہے
میں نے منع نہیں کیا۔

سید مبارک: عبداللہ! برا نہ مانو —— تو تم سے ایک بات کہوں۔

عبداللہ راتھر: حضور ارشاد فرمائیں۔

سید مبارک: میں جانتا ہوں کہ اس میں نقصان کا بھی اندیشہ ہے۔ لیکن آدمی کو جی بھر کے آدمی ہونا چاہیے۔

# دوسرا منظر

(ایک تیکھا ٹیلہ جس کی اوپر کی سطح ہموار نظر آتی ہے۔ ذرا دائیں بائیں سے پیچھے سے ایک راستہ آتا ہے۔ جو گھوم کر سامنے کو نکلتا ہے۔ ٹیلے پر سوائے سخت گھاس کے کچھ بھی نہیں۔ اس کا مٹیالا رنگ منظر پر حاوی ہے۔ جیسے بہت دور پہاڑوں کی چوٹیوں پر تھوڑی تھوڑی برف دکھائی دیتی ہے۔ دوپہر کا وقت ہے اور دھوپ بہت تیز ہے۔ حبہ خاتون تھکی ماندی اور نڈھال ماتھے پہ کنگھے بیٹھی ہے اس طرح کہ اگر کوئی ٹیلے کے پیچھے سے آئے تو وہ اسے دیکھ نہ سکے)

**حبہ خاتون:** (جیسے تیسے کسی قدر رونی آواز میں۔ بھرائے ہوئے گلے سے)

چارہ کرومیوں مالنو ہو[1]   چارہ کرومیوں مالنو ہو

وارہ ریس سیت وارہ چھس تو[2]

چارہ کرومیوں مالنو ہو   چارہ کرومیوں مالنو ہو

(اور بھی زیادہ تھکی آواز میں)

چارہ کرومیوں مالنو ہو
وڈکمن۔ گنڈر گولو[3]

چارہ کرومیوں مالنو ہو
حبہ خاتونہ دلو اشارہ[4]
دل ہشارا مالنو ہو[5]

---

[1] میکے والو میرا چارہ کرو۔ [2] سسرال والوں کے ساتھ میں اچھی حالت میں نہیں ہوں [3] کہ کریوں سے پڑھنا میرے لئے مشکل ہو رہا ہے [4] حبہ خاتون نے اشاروں میں سب کچھ بتا دیا [5] ہوشیار دل میکے والو۔

**عبداللہ راتھر** : جی حضور بجا ہے۔

**سیّد مبارک** : نہیں میری بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔ ممکن ہے لوگ اسے برا مانیں کہ حبّہ کو گانے کا شوق ہے
مگر تم اسے منع نہ کرنا۔ بعد کو جو کچھ ہو سمجھنا خدا کی مرضی ہے ـــــ خدا جس کو جیسا پیدا کرے۔ اس کو ویسا
ہی ہونا چاہئیے۔ کسی توفیق سے انکار کرنا کسی سچے شوق کو مارنا کفرانِ نعمت ہے۔

**عبداللہ راتھر** : اچھا! جی حضور! ان معاملوں کو آپ بہتر سمجھتے ہیں۔

**سیّد مبارک** : اچھا! اب مجھے اجازت دو۔ میری طبیعت ذرا بے چین ہوگئی ہے۔

(سید مبارک اور عطا محمد رخصت ہوتے ہیں۔ ان کے جانے کے
بعد کچھ دیر خاموشی رہتی ہے)

**ماں** : اب چلو۔ اندر چلو میرا گھر کا سارا کام پڑا ہے

**عبداللہ راتھر** : ہاں چلو۔

**ماں** : شاہ صاحب نے نام اچھا رکھا ہے ـــــ حبہ ـــــ خدا لڑکی کو یہ نام مبارک کرے کیوں ری!
تو یہاں کتنی دیر بیٹھے گی؟

**حبّہ** : جب تک چشمہ بہتا رہے گا۔

**ماں** : اب یہ پھر دیوانی باتیں کرنے لگی۔ اچھا جلدی سے۔

(ماں اور باپ اندر چلے جاتے ہیں۔ حبہ شمشاد کی ٹہنی لگائے
سوچ میں کھڑی رہتی ہے)

**پردہ**

(ترنم سے سرشار ہوکر حبہ خاتون پورا گیت دوبارہ گاتی ہے۔ اسی
دوران میں شہزادہ یوسف ٹیلے کے پیچھے سے دبے پاؤں آتا ہے
ہے اور حبہ خاتون سے کچھ دور خاموش کھڑا رہتا ہے جب حبہ خاتون
تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاتی ہے۔ تو وہ اور آگے بڑھتا ہے
مگر اب بھی وہ حبہ خاتون کے پیچھے ہے اور وہ اس کو دیکھ نہیں
سکتی )

**یوسف**: یہ آواز کسی حور کی ہوتی اگر یہاں آنا ممنوعہ ہوتا۔ میں کہتا کہ صورت بھی کسی حور کی سی ہے۔ اگر وہ میری
نظروں سے چھپائی نہ جاتی۔

حبہ خاتون ادھر مڑ جاتی ہے اور اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش
کرتی ہے

**یوسف**: اے حور تیرا نام کیا ہے؟

(حبہ خاتون کوئی جواب نہیں دیتی)

**یوسف**: مجھے معلوم نہیں تھا کہ حوریں کشمیری زبان میں گیت گا لیتی ہیں۔ مگر بات نہیں کر سکتی ہیں۔

**حبہ خاتون**: میں آدمی ہوں۔ مجھ سے آدمی کی طرح بات کیجیے۔

**یوسف**: (ذرا جزبز ہوکر) مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کا لڑکا آدمی کی طرح بات نہ کرے

**حبہ خاتون**: اجنبی کو شریف عورتوں سے بات نہ کرنا چاہیے میرے لیے بادشاہ کا لڑکا بھی اجنبی ہے۔

**یوسف**: میں نے بتا دیا کہ میں کشمیر کا شہزادہ یوسف ہوں۔ اب میں اجنبی نہیں رہا۔ اب تم بتاؤ کہ تمھارا نام کیا ہے۔

**حبہ خاتون**: میرا نام میرے گھر والوں سے پوچھیے۔

**یوسف**: تمھارے میکے والوں سے یا سسرال والوں سے؟

(حبہ خاتون شرمندہ ہوکر سر نیچا کر لیتی ہے)

**یوسف**: میں تمھارے اوپر کوئی ظلم نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے تم جیسا گیت گانے والا جیسا کہ میں نے اب تک

نہیں سنا ہے۔ تمھاری آواز اتنی سریلی ہے کہ آدمی کی آواز ہو نہیں سکتی۔ میں شہزادہ اور اجنبی ہوں۔ تب بھی آدمی تو ہوں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں تمھیں آسمانی دولت نہ سمجھوں۔ تمھیں حور نہ کہوں۔ تمھارا پتہ نشان معلوم کرنا نہ چاہوں۔

**حبہ خاتون:** اچھا اب بس کیجیے۔ میں مٹی تھی۔ مٹی میں مل گئی۔ میرا کوئی پتہ نشان نہیں۔

(محمد بٹ۔ علم شیر خاں اگر سے اور علی خاں چک ٹیلے کے پیچھے سے آتے ہیں۔ یوسف انھیں دیکھ کر محمد بٹ کو اپنے پاس بلاتا ہے)

**یوسف:** یہاں قریب کوئی بستی ہے؟

**محمد بٹ:** ہے عالی جاہ! کوئی دو میل پر۔

**یوسف:** یہ عورت وہیں رہتی ہوگی۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کون ہے۔ تم ذرا جلدی سے جاؤ اور وہاں پوچھو کہ ایسی کوئی عورت ہے جو کشمیری ماہیے گیت گاتی ہے۔ اگر پتہ چلے تو اس کے گھر والوں کو اپنے ساتھ لے آؤ۔ یہ خود کچھ بتاتی نہیں۔ اور میں اس کا پتہ نشان معلوم کیے بغیر جا نہیں سکتا۔

**محمد بٹ:** عالی جاہ! آپ اس دھوپ میں تکلیف کیوں اٹھایئے۔ یہ عورت آسانی سے آپکے ساتھ چلنے پر راضی ہو جائے گی۔ سری نگر پہنچ کر آپ حکم دیجیے گا کہ اس کے گھر والے دربار میں حاضر کیے جائیں۔

**یوسف:** اور اگر یہ ہمارے ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوئی۔

**محمد بٹ:** (حبہ خاتون کی طرف بڑھتے ہوئے) میں اسے ابھی راضی کرتا ہوں۔

**علم شیر خاں:** محمد بٹ۔ سوچ سمجھ کر کام کرو۔ ہم اس وقت کل چار ہیں اور شکار کے لیے نکلے ہیں۔ اگر یہ عورت چیخی چلائی اور گاؤں والوں نے ہم کو گھیر لیا تو مشکل پڑ جائے گی۔ ایسے شکار کو لاد کر لے جانے کے لیے ذرا انتظام کی ضرورت ہے۔

**علیخاں چک:** ہر طرح کے شکار کے لیے الگ سے مشق کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ سب کچھ کر لوگے۔

**محمد بٹ** : میں دہقانوں کی سرشت کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ تم لوگ خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔

**علی شیر خاں** : ہم سب جانتے ہیں کہ تم بہادر ہو۔ مگر اس وقت تو عالیجاہ کے ارشاد پر عمل کرو۔

**یوسف** : (حکومت کا انداز اختیار کر کے) ہاں! ہم نے تمھیں جو حکم دیا ہے اس کی تعمیل کرو (حبہ خاتون سے) تم نے کہا تھا کہ میرا نام گھر والوں سے پوچھو۔ وہی کر رہا ہوں۔

**حبہ خاتون** : یہ ظلم ہے۔

**یوسف** : ظلم؟ میرے منہ پر کہتی ہو کہ میں ظلم کرتا ہوں۔ ظالم ہوں۔ یہ ہمت تم میں کہاں سے آئی؟

**حبہ خاتون** : (غصے میں کھڑی ہو کر۔ یوسف کی آنکھ سے آنکھ ملا کر) جی ہاں۔ یہی کہتی ہوں کہ یہ ظلم ہے۔ اور آپ کا جی چاہے تو اپنی تلوار سے میری ہمت آزما لیجئے۔

**یوسف** : (تلوار پر ہاتھ رکھتا ہے۔ پھر سوچ کر) معلوم ہوتا ہے کہ تم نے سسرال میں اتنا ظلم سہا ہے کہ اب بادشاہ کے ظلم سے بھی نہیں ڈرتی ہو (حبہ خاتون سر جھکا لیتی ہے) نہیں۔ یہ بھی نہیں۔ مجھے تمھاری شرافت کی داد دینی چاہیے تھی۔ اپنے سسرال کے لوگوں کا اعتبار نہیں مجھے ظلم کی دعوت دے کر اپنے آپ کو بچانا چاہتی ہو [illegible] اچھا اگر تمھاری سسرال کے لوگ تمھاری طرح شریف نکلے تو میں تمھارے [illegible] چھوڑ کر چلا جاؤں گا سمجھوں گا کہ ایک حور نے اپنا گیت سنایا اور نظر سے غائب ہو گئی۔ ورنہ [illegible] تمھارے سر پر تاج رکھوں گا اور کہوں گا کہ آسمان سے ایک حور میری ملکہ بننے کے لیے اتر آئی ہے۔

**حبہ خاتون** : اپنا گھر چھوڑ کر آنا عزت نہیں۔ عورت کی عزت اس کے گھر میں ہوتی ہے۔

**یوسف** : تمھارے گھر والوں کی عزت ہوتی تو تم مجھے فخر کے ساتھ بتاتیں کہ میں فلاں گھر کی ہوں۔

**حبہ خاتون** : میں آپ کے ظلم سے ڈرتی ہوں۔

**یوسف** : یہ بات ہے۔ تم مجھ سے نہیں ڈرتی ہو (احساس کمتری کو مٹانے کے لیے) اگر تم یہ سمجھو کہ میں تم سے ڈرتا ہوں۔ تم شریف ہو تو میں شہزادہ ہوں۔ تم گاتی ہو تو میں موسیقی کا قدر دان ہوں۔ تم کشمیری میں گیت کہتی ہو تو میں فارسی میں غزل کہتا ہوں —— تم مجھے اپنی محبت دو گی تو میں تمھیں اپنی سلطنت دیدوں گا۔

**حبہ خاتون:** میں ایسا سودا نہیں کر سکتی۔

**یوسف:** آدمی مجبور ہو کر سبھی کچھ کر لیتا ہے۔

**حبہ خاتون:** جی ہاں! ظالم کے ظلم کو بھی سہہ لیتا ہے۔ مگر ظالم کو بھی سوچنا چاہیئے کہ اس کا اختیار کب تک چلے گا۔

**یوسف:** تم سے حجت کرتے کرتے میری زبان خشک ہو گئی ہے۔

**حبہ خاتون:** میں مظلوم کا خون پہلے ہی حاضر کر چکی ہوں۔

(محمد بٹ۔ عزیز راتھر (حبہ خاتون کے شوہر) کے ساتھ داخل

آتا ہے۔ عزیز پر وحشت طاری ہے)

**محمد بٹ:** عالی جاہ! یہ دہقان مجھے ٹیلے کے قریب ہی مل گیا۔ یہ اس عورت کا شوہر معلوم ہوتا ہے۔

**یوسف:** (عزیز کو گھور کر اُوپر سے نیچے تک دیکھتا ہے) مجھے تو نہیں معلوم ہوتا۔ تیرا نام کیا ہے اور تو کیا کرتا ہے؟

(عزیز جواب دینا چاہتا ہے۔ مگر اس کی گھگھی بندھ جاتی ہے۔

وحشت میں وہ ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں پر گر جاتا ہے)

**محمد بٹ:** عالی جاہ! یہ زمیندار ہے اور اس کا نام عزیز راتھر ہے۔

**یوسف:** (عزیز راتھر سے) کیوں۔ یہ عورت تیری بیوی ہے؟

(عزیز جواب دینا چاہتا ہے۔ مگر آواز نہیں نکلتی۔ صرف

سر ہلا دیتا ہے)

**یوسف:** مجھے تو اس قابل نہیں معلوم ہوتا کہ ایسی عورت تیرے گھر میں رہے۔ تجھے اس کو طلاق دے دینا چاہیئے۔

(محمد بٹ کے کان میں کچھ کہتا ہے)

**محمد بٹ:** (عزیز سے) چل تیری قسمت جاگ اُٹھی۔

(عزیز کا ہاتھ پکڑ کر الگ لے جاتا ہے اور ناگرے اور ملیماں جک

کو اشارے سے بلاتا ہے۔ پھر وہ عزیز کے کان میں کچھ کہتا ہے

عزیز استرار کے لیے سر ہلاتا ہے اور دونوں صاحب

بھی ہر کے بعد سر ہلاتے ہیں۔ محمد بٹ جیب سے ایک تھیلی نکال
کر عزیز کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے اور اشارہ کرتا ہے کہ چلتا
بنے۔ حبہ خاتون بڑی مایوسی کے ساتھ یہ تماشا دیکھتی ہے اور
یوسف برابر حبہ خاتون کو دیکھتا رہتا ہے )

**یوسف** : (حبہ خاتون سے بڑی نرمی کے ساتھ) آپ نے مجھے ظالم کہا تھا۔ اب بتائیے کہ ظالم کون ہے؟

(حبہ خاتون بے بس ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ اور رونے لگتی ہے
یوسف اپنے مصاحبوں کے پاس جاتا ہے اور سب دبی آواز
میں مشورہ کرتے ہیں )

**پردہ**

○

# دوسرا ایکٹ

## پہلا منظر

(یوسف شاہ کے محل میں دیوانِ خاص۔ دائیں طرف درباری اور وزیر دست بستہ بیٹھے ہیں۔ ان میں ولی عہد یعقوب شاہ اور محمد بٹ سب سے آگے ہیں۔ ان کے کچھ پیچھے علم شیر خاں ماگرے اور علیوان چک دکھائی دیتے ہیں۔ اسٹیج کے بائیں طرف فرش سے ایک قدم اونچا پلیٹ فارم ہے جس پر شاہی تخت رکھا ہے۔ تخت کے پیچھے اوٹ ہے اور اوٹ کے دوسری طرف گاؤ تکیہ اور قالین ہے تخت پر یوسف شاہ۔ گاؤ تکیے کا سہارا لیے حبہ خاتون بیٹھی ہے)

**یوسف شاہ**: محمد بٹ! اب اور کیا کام باقی ہے؟

**محمد بٹ**: میری عقل جن معاملوں کی وجہ سے حیران تھی۔ وہ سب ظل اللہ کی روشن ضمیری نے سلجھا دیے ہیں۔ اب غلام کا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے۔

(ولی عہد کی طرف دیکھتا ہے)

**ولی عہد**: عالی جاہ! میں ایک عرض لے کر آیا ہوں ——— دنیا کا کوئی حصہ جہاں انسان آباد ہیں، شر و فساد سے خالی نہیں۔ عالیجاہ جیسے رعایا پرور اور صاحب بصیرت حکمران امورِ سلطنت کی طرف پوری توجہ کرتے ہیں۔ عدل و انصاف کا فرد بن جاتے ہیں تو مخالفت کرنے والے اور کوئی بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ عالی جاہ کی فرض شناسی اس کا موقع نہیں دیتی ہے کہ رعایا کی شکایتوں کو بغاوت کا حیلہ بنایا جائے۔ اس لیے حضور کے اور ملکۂ جہاں کے ذوق کو اعتراض کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ رعایا کو جان اور مال اور معاش کی طرف

سے پورا اطمینان ہے۔ وہ راگ اور غزل گوئی کا شوق کیوں نہ کرے۔ مگر نہیں حضور کا ایک مخالف جس کے
سر پر دو پانے کیلئے علم کا عمامہ باندھ دیا گیا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ راگ اور موسیقی اور سماع سب حرام ہیں اس
کا چرچا کرنے والے بے دین ہیں اور اگر کوئی بادشاہ اس کا چرچا کرے تو اس کے خلاف بغاوت کر کے اُسے
تخت سے اُتار دینا چاہیئے۔ یہ بات میرے کانوں تک میرے مطربوں اور قوالوں نے پہنچائی۔ اُن کا
بیان تھا کہ ظل اللہ کی مخالفت کے لیے ایک جماعت تیار کی گئی ہے جو اس معاملے میں لڑنے مرنے پر تلی ہے
بعض گویوں پر اس جماعت نے حملے کئے۔ گویّے ڈر کر شہر سے بھاگ گئے۔ جو ہیں وہ اپنی جان خطرے میں سمجھتے
ہیں۔ ظل اللہ کا ارشاد ہو تو میں اپنے مطربوں اور قوالوں کو حاضر کراؤں۔

**یوسف شاہ:** نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ تم بتاؤ کہ تم نے کیا کیا؟

**ولی عہد:** ظل اللہ! میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس قصّہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں اور اس شورش کو رفع کر دوں
مگر ملکۂ جہاں نے منع فرمایا۔

**یوسف شاہ:** ملکۂ جہاں نے کس بنا پر منع فرمایا؟

**حبّہ خاتون:** عالی جاہ! قاضی ابو محمد بہت بڑے عالم ہیں۔ ساری دنیا میں ان کی شہرت ہے۔ جو بات وہ کہتے
ہیں دین اور اخلاق کی بات ہے۔ ان پر ہاتھ اٹھانا علم اور دین کی ایسی توہین ہوگی جس سے عالی جاہ
سارے جہان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدنام ہو جائیں گے۔ عالی جاہ کو قوت کے بجائے تدبیر سے کام
لینا چاہیئے۔

**یوسف شاہ:** پھر آپ نے کوئی تدبیر بھی سوچی؟

**حبّہ خاتون:** جی ہاں! میں نے سنا تھا کہ قاضی صاحب شاعر ہیں۔ اب دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ
انھوں نے بہت سی غزلیں کہی ہیں۔ ان میں اتنا ترنم ہے کہ قاضی صاحب پر راگ کا اثر ضرور ہوگا
وہ راگ اس لیے نہیں سنتے کہ اپنے علم کے مطابق وہ اسے حرام سمجھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ کبھی
راگ سن لیں گے تو ان کا دل اُن کے علم کا حکم نہ ماننے گا اور لامحالہ ان کے قال کو رد کر دے گا۔ لوگوں میں
مشہور ہو گیا کہ قاضی صاحب کو غزل سن کر وجد آگیا تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ موسیقی کا دین سے بھی

تعلق ہے۔ اس کے بعد قاضی صاحب ہم پر اعتراض نہ کر سکیں گے۔ آپ بابا خلیل اللہ سے درخواست کیجئے کہ وہ قاضی صاحب کے پاس تشریف لے جائیں اور ان سے فرمائیں کہ عالی جاہ پر ان کی تلقین کا بہت اثر ہوا ہے۔ وہ آج خلوت میں ان سے ملنا چاہتے ہیں۔

**یوسف شاہ:** میں خلوت میں ایک عالمِ دین سے ملنا چاہتا ہوں؟

**حبیبہ خاتون:** جی ہاں! میں آپ کے قریب ہوں گی۔ بابا خلیل اللہ بھی موجود رہیں گے۔

**یوسف شاہ:** ملکہ جہاں فرماتی ہیں کہ وہ اس معاملے کو حسنِ تدبیر سے طے کر دیں گی۔

**ولی عہد:** مجھے ملکہ جہاں کی کامیابی کا پورا یقین ہے۔

(محمد بٹ کچھ کہنا چاہتا ہے کہ پیچھے شور سنائی دیتا ہے۔ ایک چوبدار داخل ہوتا ہے اور آداب بجا لاتا ہے)

**چوبدار:** ظلِ اللہ محل کے چوکی داروں نے ایک بدمعاش کو پکڑا ہے جو حرم سرا میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

**محمد بٹ:** اس کے لیے ظلِ اللہ کو تکلیف دینے کی ضرورت نہ تھی۔ بدمعاش کی وہیں پر گردن مار دینا چاہیے تھا۔

**یوسف شاہ:** ہاں ہاں! اور نہیں کیا۔

**حبیبہ خاتون:** عالی جاہ! اس بدمعاش کو میں خود سزا دینا چاہتی ہوں۔

**یوسف شاہ:** ملکہ عالم سزا دینا آپ کا کام نہیں۔

**حبیبہ خاتون:** یہ بدمعاش حرم سرا میں گھسنا چاہتا تھا۔ اس نے میری اور حرم شاہی کی دوسری عورتوں کی آبرو پر حملہ کیا۔ اس کی سزا خود تجویز کرنے کی اجازت دیجئے۔

**یوسف شاہ:** ملکہ جہاں کی خواہش ہے کہ اس بدمعاش کی سزا خود تجویز فرمائیں۔ اُسے ان کے سامنے حاضر کرو۔

**محمد بٹ:** ظلِ اللہ اب خادموں کو دربار برخاست کرنے کا حکم دیں۔ خدا ظلِ اللہ کو شاد اور سلطنت کو آباد رکھے۔

وزیر اور درباری آداب بجا لاتے ہیں اور رفتہ رفتہ چلے جاتے ہیں۔ ایک خواص آکر دٹ کو ہٹا دیتی ہے۔ دوسری ننھی نقشین میز لا کر رکھ دیتی ہے۔ تیسری ایک طشت میں صراحی اور پیالہ اور تھوڑے

کی پیالی لاکر رکھ دیتی ہے۔ تینوں خواصیں چلی جاتی ہیں۔ حبہ خاتون ذرا
بائیں طرف ہٹ کر یوسف شاہ کے لیے جگہ کرتی ہے )

**حبہ خاتون:** آپ نے حال چال! اب سنیے کہ مجرم کے لیے میں نے کیا سزا تجویز کی ہے۔

**یوسف شاہ:** پہلے اپنے قہوہ کی پیالی لو۔ پھر مجھے پیار بھرا پیالہ دو۔ اس کے بعد جرم و سزا کے معاملے پر غور کریں گے۔

**حبہ خاتون:** میں آپ سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ نشہ نہ لایئے۔ آپ نہیں مانتے۔

**یوسف شاہ:** (پیالہ ہے یہ شراب انڈیل کر اور حبہ خاتون کی طرف دیکھتے ہوئے۔) اسے خدا کرے کہ تم جو تاج ہو میرے سر پر تاج ہے۔ مگر اس تاج سے میرے سر کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ پھر بھی ایسی باتیں کرتی ہو جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ بھلا نشہ تو میرے سامنے موجود ہے۔ پھر وہ کس طرح نشہ کیسا ہے؟

**حبہ خاتون:** میرے لیے سمجھانا کچھ آسان نہیں ہے —— کئی سال ہوئے جب ایک روز صبح کو اٹھی تو اک نشے میں چور تھی۔ میرے گھر کے پاس ایک چشمہ بہتا تھا۔ چشمے کے کنارے ایک شمشاد کا درخت تھا۔ میں نے چشمے کو پیار کیا۔ شمشاد سے لپٹ گئی۔ چاہتی تھی کہ پہاڑ میرے پاس آ جائیں۔ مجھ سے گلے ملیں۔ وہ نہیں آئے تو رو پڑی۔ پھر میں شمشاد کے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھ گئی اور چشمے کے بہاؤ کو دیکھنے لگی۔ کہ اس لہر کے ساتھ معلوم ہوتا تھا میرے دل و دماغ میں نشے کی لہریں اٹھتی ہیں۔ دل میں ایک شوق بھرا ہے جو سینے کو چیر کر نکلنا چاہتا ہے۔ میں نے گنگنانا شروع کیا۔ میرے ہاتھ بادل ساز کے تاروں کی طرح کانپنے لگے۔ میرا پہلا گیت چشمے کی طرح پھوٹ نکلا —— کیا دیکھتی ہوں کہ ایک صوفی اپنے نوجوان مرید کے ساتھ سامنے کھڑے ہیں۔ انھوں نے میرے نشے کی کیفیت پہچان لی۔ میرے پاس اس طرح بیٹھ گئے کہ گویا میرا گانا سننا چاہتے ہیں۔ مگر میں گھبرا گئی۔ دل سے جو سُر نکلنا چاہتے تھے۔ وہ گلے میں پھنس گئے۔ جیسے آپ کی تپلی گردن کی صراحی میں شراب پھنس جاتی ہے۔ نوجوان مرید نے کہا مولانا روم کی ایک غزل سناتا ہوں اور بڑی خوش الحانی سے ایک غزل سنائی —— مجھے اپنے اوپر قابو نہیں رہا تھا۔ شاید میں بھی اس کے ساتھ گانے لگی

( یوسف شاہ باتیں کرتے کرتے ایک اور پیالا خالی کر دیتا ہے )

**یوسف شاہ** : (مسکرا کر) کیا اس موقع پر کسی نے نشے میں نشہ نہیں ملایا تھا؟

**حبّہ خاتون** : جی نہیں۔ ایک سچے سُر نے زندگی کے ساز کو جگا دیا —— اب ایک کہانی سنیے۔ ایک نوجوان مُرید اپنے پیر کے ساتھ کسی زمیندار کے گھر گیا۔ وہ سوچتا ہوگا کہ تو شمع کی جانے گی دعائیں کرنے کی درخواستیں کی جائیں گی۔ جیسا کہ معمولاً ہوتا ہے۔ گھر کے سامنے اُس نے ایک لڑکی کو بیٹھے دیکھا۔ اس کے پیر اس لڑکی کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ اور پیر بعد لڑکی کی کیفیت دیکھ کر اس نے ایک غزل چھیڑ دی۔ بہار کی ہوا کے جھونکے آئے —— کلی چٹک گئی —— کئی برس بعد جب اس نوجوان کی شادی ہو چکی تھی —— اس کا گھر بار تھا —— بچے تھے —— اس نے لوگوں کو کشمیری گیت گاتے سنا۔ یہی گیت کوئی کسی کے ترنم کسی کی غمگینی نے اسے وہ صبح وہ چشمہ۔ وہ غزل یاد دلا دی تا وہ اس ملکہ جہاں پر عاشق ہو گیا۔ بیوی بچوں کو بھول گیا —— دیوانہ ہو گیا —— ہاہا بھول گیا کہ ایک نشے کو دوسرے میں نہیں ملانا چاہیے۔

**یوسف شاہ** : (کچھ رقابت کچھ غصے میں) واقعی اس بدمعاش کا سر اس کے بدن سے جدا کر دینا چاہیے تھا۔

**حبّہ خاتون** : اس کی بیوی نے میرے پاس فریاد کی۔ میں نے اس سے کہا کہ جاؤ اپنے شوہر سے کہہ دو کہ آج رات کو حرم سرا میں آ جائے۔ اسے ملکہ جہاں کا وصل نصیب ہوگا۔ شرط یہ ہے کہ خواب گاہ بالکل تاریک ہے۔ اور وہ ملکہ جہاں سے کوئی بات نہ کرے۔

**یوسف شاہ** : (غصے کو دباتے ہوئے) اور یہ سب آپ مجھ سے بیان کر رہی ہیں۔

**حبّہ خاتون** : (جی ہاں) آپ کی داد چاہتی ہوں —— نسرین!

(نسرین اندر آ کر آداب بجا لاتی ہے۔ حبہ خاتون آنکھ سے اشارہ کرتی ہے۔ نسرین باہر جا کر ایک نوجوان عورت کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ وہ شاہانہ لباس پہنے ہے۔ اس کا بدن زیوروں سے جگمگا رہا ہے۔ بادشاہ کو دیکھ کر وہ سر جھکا لیتی ہے)

**حبّہ خاتون** : علی جاہ! آج رات کی ملکہ جہاں سے ملاقات کیجیے۔

( یوسف شاہ حیرت سے کبھی حبہ خاتون کبھی جوان عورت کو دیکھتا ہے۔ پھر لمبی سانس لیتا ہے اور مسکرا کر اپنے سر سے تاج اُتار کر حبہ خاتون کے سر پر رکھ دیتا ہے )

**یوسف شاہ :** اب میں سمجھا۔ یہ اسی آدمی کی بیوی ہے۔ ... اچھا اب اس مجرم کو بھی پیش کیجئے۔

**حبہ خاتون :** عالی جاہ! یہ کشمیری گیت ہے۔ فارسی کی غزل نہیں۔ میں اپنی آمر کو رسوا نہیں کر سکتی۔ میں نے حکم دیا ہے کہ اس مجرم کو غسل دیں۔ اس کے بدن پر خوشبوئیں ملیں۔ اسے ملکہ جہاں کے لائق بنائیں۔ اس کے بعد وہ ایک حجرے میں جو اس لئے آراستہ کیا گیا ہے ملکہ جہاں کا انتظار کرے گا۔

**یوسف شاہ :** (شرما کر) میرا تاج مجھے واپس کر دیجئے۔ اس کے آنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

( حبہ خاتون کے سر سے تاج اتار کر اپنے سر پر رکھ لیتا ہے۔ حبہ خاتون کے اشارے پر خواص جوان عورت کو لے کر چلی جاتی ہے )

**یوسف شاہ :** اچھا! اب کیا کریں؟

**حبہ خاتون :** بابا خلیل اللہ قاضی ابو محمد کو بادشاہ اور ملکہ کے تائب ہونے کی مبارک خبر سنا چکے ہوں گے۔ قاضی صاحب نیک کام میں دیر کیسے لگا سکتے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔

**یوسف شاہ :** (صراحی اور پیالے کی طرف دیکھ کر) اور یہ جو ہے اس کو کیا کروں؟

**حبہ خاتون :** اب تو آپ کی توبہ خالی پیٹ پر نہ ہوگی۔ برتن ہٹوا دیجئے۔

**یوسف شاہ :** مگر میں عالم دین سے تو گفتگو نہیں کر سکتا۔

**حبہ خاتون :** تائب کے لیے خاموشی زیادہ مناسب ہے۔ قاضی صاحب آپ کی زبان کی عاجزی دیکھ کر بہت مطمئن ہوں گے۔

**یوسف شاہ :** اور کیا قاضی صاحب اس کو پسند کریں گے کہ آپ ان سے گفتگو کریں۔

**حبہ خاتون :** میری زبان میری مضراب ہے ...... آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے بابا خلیل اللہ کو معاملہ اچھی طرح سمجھا دیا ہے ...... آپ نے یہ قصہ نہیں سنا ہے کہ ایک شرابی کسی عالم کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے طبیب نے انگور کا رس پینے کو کہا ہے۔ مگر میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اس میں نشہ نہ پیدا ہو جائے آپ میری

ہدایت کیجئے۔ عالم کے پاس وہ ملا نئی قسم کا رس لاتا ۔ اور اس کے نشے کے بارے میں فتویٰ لیتا ۔ آخر میں

دونوں ہم مشرب ہو گئے ۔

**یوسف شاہ :** یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی ۔ اس کا مطلب کیا ہے ؟

**حبہ خاتون :** مطلب بیان کرنے سے بات بگڑ جائے گی ۔ ذرا صبر کیجئے ۔

**یوسف شاہ :** قاضی صاحب چاہے جتنی دیر تہ آئیں ۔ میں صبر کروں گا

( پیالہ بھر کر پیتا ہے ۔ پھر کچھ گنگنانے لگتا ہے ۔ آخر میں یہ مصرع

سنائی دیتا ہے " برباد دو زلف بت کشمیر نزاء مے " )

( نسرین اندر آتی ہے اور آداب بجا کر حبہ خاتون کے کان میں کچھ

کہتی ہے ۔ حبہ خاتون صراحی اور پیالے کی طرف اشارہ کرتی ہے

اور نسرین طشت اٹھا لیتی ہے )

**یوسف شاہ :** ہائیں ! کیا قاضی ابو محمد آ گئے ؟

**حبہ خاتون :** جی ہاں ! جب تک نسرین اوٹ کھڑی کرے گی اور اگر کی بتیاں جلائے گی ۔ اس وقت تک قاضی صاحب

پہنچ جائیں گے ۔

( نسرین اگر بتیاں جلاتی ہے اور اوٹ کھڑی کر کے چلی جاتی ہے )

**یوسف شاہ :** اور وہ آ جائیں گے تو میں ان سے کروں گا کیا ؟ آپ نے تو کچھ بتایا نہیں ؟

**حبہ خاتون :** آپ بڑھ کر ان سے مصافحہ کیجئے گا ۔ "السلام علیکم" "تشریف لائیے" اور تکلیف دینے کی معافی چاہتا

ہوں" کہہ کر انھیں تخت کی طرف لے آئیے گا ۔ پھر کہئے گا کہ آج اس تخت کو زینت بخشئے ۔

**یوسف شاہ :** بے چارہ تخت ! ۔

**حبہ خاتون :** آپ یہ کہہ دیں گے تو قاضی صاحب کو تخت سے بڑی ہمدردی ہو جائے گی اور اس کے پائے مضبوط

ہو جائیں گے ۔

**یوسف :** اچھا ـــــــ اچھا ـــــــ اب باقی سبق بھی پڑھا دیجئے

**حبہ خاتون:** آپ ان سے تخت پر بیٹھنے کو کہیں گے۔ تو وہ بہت خوش ہو جائیں گے۔ اور فرش پر بیٹھ جائیں گے۔

**یوسف شاہ:** میں ان سے جتنی دور بیٹھوں گا بہتر ہوگا نا؟

**حبہ خاتون:** بابا خلیل اللہ کو اپنے اور ان کے درمیان بٹھا لیجئے۔ آپ دور بیٹھیں گے تو ان کی نظر آپ پر زیادہ رہے گی۔

**یوسف شاہ:** پھر؟

**حبہ خاتون:** ان کی خدمت میں حبہ خاتون کا دست بستہ سلام عرض کر دیجئے گا۔

**یوسف شاہ:** اچھا۔ یہ تو سمجھ میں آ گیا۔ اب یہ بتا دیجئے کہ توبہ کن کن چیزوں سے کروں اور کب کروں۔

**حبہ خاتون:** توبہ کرنا ہو تو اسی وقت کر لیجئے۔ اس کے بعد توبہ سے مجھے دلچسپی نہیں۔

**یوسف شاہ:** مگر قاضی صاحب اس کے بغیر راضی کیسے ہوں گے؟

**حبہ خاتون:** یہ آپ بابا خلیل اللہ پر چھوڑ دیجئے۔

**یوسف شاہ:** اچھا! ان کو آپ سبق پڑھا چکی ہیں؟

(چوبدار اندر آتا ہے اور آداب بجا لاتا ہے)

**چوبدار:** ظل اللہ! حضرت بابا خلیل اللہ۔ قاضی ابو محمد اور ان کے چند شاگرد تشریف لائے ہیں۔ فرماتے ہیں ظل اللہ نے انھیں یاد فرمایا ہے۔

**حبہ خاتون:** انھیں بلا لو۔

(چوبدار چلا جاتا ہے۔ یوسف شاہ کھڑا ہو جاتا ہے اپنے کپڑے درست کرتا ہوا اوٹ کی طرف آتا ہے اور ایک دو قدم دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

**یوسف شاہ:** (خدا بجوم کر)

کردم ز شراب ناب توبہ ○ وز گفتن ناصواب توبہ

**حبہ خاتون:** بس بس عالی جاہ! اتنی توبہ کافی ہے۔

( دروازے سے پہلے چوبدار داخل ہو کر آداب بجا لاتا ہے۔ پھر بابا
خلیل اللہ آتے ہیں۔ ان کے پیچھے قاضی ابو محمد اور ان کے چند شاگرد۔
بابا خلیل اللہ مسکرا کر قاضی ابو محمد غیر جانبدار لہجے میں "السلام علیکم"
کہتے ہیں۔ قاضی صاحب اور ان کے شاگرد دیوانِ خاص کی دیواروں
اور چھت کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔ اسی دوران یہاں تین آدمی اور چھ
اپنے کپڑوں میں ساز چھپائے ہیں۔ چپکے سے داخل ہوتے ہیں اور ایک
کونے میں بیٹھ جاتے ہیں )

**یوسف شاہ:** (قاضی ابو محمد کی طرف بڑھ کر) السلام علیکم (معانقہ کرتا ہے) آپ نے میرے اوپر بڑا کرم کیا جو اس
وقت تشریف لائے۔ تکلیف دینے کی معافی چاہتا ہوں (تخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) آج اس تخت
کو زینت بخشئے۔

( قاضی ابو محمد کے چہرے سے خوشی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر وہ سر ہلا کر فرش
پر مؤدبانہ بیٹھ جاتے ہیں )

**بابا خلیل اللہ:** عالی جاہ! علم اور عالم کے احترام کے لیے کافی ہے۔ اگر آپ ہمارے ساتھ فرش پر تشریف رکھیں! (بابا
خلیل اللہ قاضی ابو محمد کی بغل میں بیٹھ جاتے ہیں اور یوسف شاہ کو اپنے پاس بٹھا لیتے ہیں۔ چوبدار پیالیوں میں چائے لاتے
ہیں اور سب کو پیش کرتے ہیں۔ جب سب چائے کے دو ایک گھونٹ پی چکتے ہیں تو بابا خلیل اللہ قاضی ابو محمد سے
مخاطب ہوتے ہیں) قاضی صاحب یہ تکلف کرنے اور بات کو طول دینے کا وقت نہیں ہے جیسا کہ میں آپ سے
عرض کر رہا تھا۔ آپ کی تلقین کا عالی جاہ اور ملکۂ جہاں

**یوسف شاہ:** قاضی صاحب! حبہ خاتون آپ کی خدمت میں دست بستہ سلام عرض کرتی ہیں۔

**قاضی ابو محمد:** (اسی غیر جانبدار لہجے میں) وعلیکم السلام۔

**بابا خلیل اللہ:** عالی جاہ اور ملکۂ جہاں پر آپ کی تلقین کا بہت اثر ہوا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دربار کی پرانی روایتیں چلی
آ رہی ہیں۔ بہت سے لوگوں کی پرورش اس پیشے کے ذریعے ہوتی ہے۔ جسے آپ نے حرام قرار دیا ہے۔ عالیجاہ

اور ملکہ جہاں کی درخواست ہے کہ آپ انہیں اس بارے میں ہدایت دیں کہ راگ اور گانے کی کون سی شکل جائز ہے اور کون سی نہیں ہے ۔ غزل کے کون سے مضمون مناسب ہیں کون سے نہیں ہیں ۔ مثلاً غزل میں معشوق کا ذکر تو جائز ہے نا !

**قاضی ابو محمد** : اگر اس سے مراد معشوق حقیقی ہو ۔

**بابا خلیل اللہ** : معشوق حقیقی کا تصور انسان کو بے خود کر سکتا ہے ؟

**قاضی ابو محمد** : بے شک کر سکتا ہے ۔

**بابا خلیل اللہ** : معشوق حقیقی سے لگاؤ پیدا کرنے کے لیے ۔ انسان سرے سے غزل پڑھ سکتا ہے

**قاضی ابو محمد** : ہاں مگر اس طرح نہیں کہ گانے کا مزا غالب آ جائے ۔

**بابا خلیل اللہ** : عالی جاہ ، ملکہ جہاں چاہتے ہیں کہ آپ چند غزلیں سن لیں اور ان کے بارے میں ارشاد فرمائیں ۔ کہ کس کا مضمون مناسب ہے کس کا نہیں ۔ بعض غزلیں تحت اللفظ میں پڑھی جائیں گی وہ بعض سر سے ۔

آپ نیک کلمہ جو مقرر فرمائیے عالیجاہ اور ملکہ جہاں وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کی ہدایت کی ہر طرح پابندی کی جائے اور ہر ممنوعہ سے پرہیز کیا جائے گا ——— دلنواز ذرا قریب آ جاؤ ۔

( ان تینوں آدمیوں میں سے جو کونے میں بیٹھے ہیں ۔ ایک آ کر سامنے بیٹھ جاتا ہے ۔ اس کے ہاتھ میں ساز بھی ہے )

**قاضی ابو محمد** : ساز کے ساتھ غزل پڑھنا بھی حرام ہے ۔ ساز کو الگ رکھ دو ۔

( دلنواز ساز کو الگ رکھ دیتا ہے )

**دلنواز** : ( پہلے تحت اللفظ اور پھر ترنم سے پڑھتا ہے )

اے نسیم سحر آرام گہ یار کجاست
منزل آں مہ عاشق کش عیار کجاست

**قاضی ابو محمد** : اس شعر کا مضمون مشتبہ ہے ۔

شب تار است و رہ وادی ایمن در پیش
آتش طور کجا موعد دیدار کجاست

**قاضی ابومحمد**: اس شعر پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ہر کہ آمد بجہاں نقش خرابی دارد

در خرابات بپرسید کہ ہشیار کجاست

**قاضی ابومحمد**: (ذرا متاثر ہو کر) اس میں "خرابات" کا لفظ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

**باباخلیل اللہ**: اب کوئی اور غزل سناؤ۔ رنگ بدلتا ہے تو اچھا ہے۔

**دلنواز**: (ذرا دیر گنگنا کر گاتا ہے)

صبا بلطف بگو آں غزال رعنا را

کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را

**قاضی ابومحمد**: سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ (جھومتے ہیں)

غرور حسنت اجازت مگر نہ داد اے گل

کہ پرسشے نہ کنی عندلیب شیدا را

**قاضی ابومحمد**: واہ واہ سبحان اللہ

(دلنواز گویا اپنے خیال میں ساز کو ذرا چھیڑتا ہے)

**قاضی ابومحمد**: نہیں نہیں۔ ساز نہیں۔ ساز نہیں۔ ورنہ لہو و لعب کا احتمال ہو جاتا ہے (جھوم کر) "غرور حسنت اجازت مگر نہ داد اے گل"

(دل نواز اسی شعر کو زیادہ ترنم کے ساتھ دہراتا ہے۔ پھر آگے گاتا ہے)

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی

بیاد آر محبان بادہ پیما را

ندانم از چہ سبب رنگ آشنائی نیست

سہی قدان سیہ چشم ماہ سیما را

بجز ایں قدر نتواں گفت در جمالِ تو عیب
کہ خالِ مہر و وفا نیست روئے زیبا را
صبا بلطف بگو آں غزالِ رعنا را
صبا بلطف بگو ـــــ

(اس غزل کے ختم ہوتے ہی حسنہ خاتون ایک غزل ساز کے ساتھ گانا شروع کر دیتی ہے۔ قاضی ابو محمد اچانک عورت کی آواز سن کر گھبرا جاتے ہیں۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ پہلے خاموش رہتے ہیں۔ پھر خود لطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔ دلنواز اُن کی حالت کو غور سے دیکھتا ہے اور جیسے ہی اسے خیال ہوتا ہے کہ قاضی ابو محمد اعتراض نہ کریں گے وہ لے اٹھانے لگتا ہے اور ساز کو بھی آہستہ آہستہ چھیڑنے لگتا ہے)

حسنہ خاتون

گر چشم پوشم از تو بہ دل جلوہ گر توئی
ور دیدہ باز یا کشم در نظر توئی
گہ در لباسِ ناز گہے خرقۂ نیاز
ہر لحظہ جلوہ گر بہ لباسِ دگر توئی
چوں زلفِ خویش قصہ مطول چرا کنی
از عرش تا بہ فرش سخن مختصر توئی

(تیسرے شعر کے بعد حسنہ خاتون ذرا رک جاتی ہے۔ دلنواز نئی غزل شروع کر دیتا ہے اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتا ہے کہ قریب آجائیں۔ اب قاضی صاحب کے سامنے تینوں قوال ہیں۔ اوٹ

کے پیچھے سے حبہ خاتون بھی لے اٹھاتی رہتی ہے )

**قوال :**

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

بہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم

( حبہ خاتون اسی شعر کو دہراتی ہے ۔ پھر دلنواز کے ساتھی ۔)

بتے رنگیں ادائے سرو بالائے لب لعلے

سراپا آفت دل بود شب جائے کہ من بودم

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

سراپا آفت دل بود شب جائے کہ من بودم

بہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

( حبہ خاتون اور قوال اسی طرح مصرعوں کی الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں
قاضی ابو محمد پر حال کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے )

**دلنواز :**

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

بہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو

**حبہ خاتون**

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو

**قوال**

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو

**دلنواز**

محمد شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

سب :

محمود شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

(قاضی ابومحمد جھومتے ہیں۔ ہاتھ پیر جھٹکتے ہیں۔ چیختے ہیں۔ بابا خلیل اللہ قوال۔ اوٹ کے پیچھے جب خاتون اور یوسف شاہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قاضی ابومحمود کے شاگرد اس طرح سامنے آ جاتے ہیں کہ تماشائیوں کو کچھ نظر نہیں آتا۔ قوالی جاری رہتی ہے)

پردہ

○

# تیسرا ایکٹ

(وہی منظر جو کہ دوسرے ایکٹ میں تھا۔ یوسف شاہ تخت پر بیٹھا
ہے۔ اس کے سامنے صراحی اور پیالہ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ
دیر سے شراب پی رہا ہے۔ ولی عہد۔ محمد بٹ۔ علم شیر خاں ماگرے
اور دوسرے درباری بیٹھے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کا رخ بادشاہ
کی طرف نہیں ہے۔ وہ گویا آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ اوٹ کے
پیچھے حبہ خاتون بیٹھی ہے۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے
پس پردہ رہنا اس کے لیے بڑا بار ہے اور بڑی بے لبسی پر بہت
الجھ رہی ہے۔ پردہ اٹھتا ہے تو دربار میں خاموشی ہے)

**محمد بٹ**: ظل اللہ دیکھ لیا۔ اسلام آباد سے جو زمیندار شکایتوں کی لمبی فہرست لے کر آیا تھا وہ جھوٹا ثابت ہوا۔ وہ مقام پر پہلے جا کر ذرا سختی سے جانچ کی گئی تو اس نے قبول دیا کہ وہ صرف حاکم کو بدنام کرنا چاہتا تھا۔ ظل اللہ نے یہ بہت اچھا طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنے خادموں پر ذمہ داری ڈالتے ہیں اور سرکشوں کے مکر و فریب سے باز پرس نہیں کرتے۔

**یوسف شاہ**: (ایک گھونٹ شراب پی کر) ہاں میں نے پہلے ہی یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا تو بہت اطمینان رہتا۔

**حبہ خاتون**: عالیجاہ! یہ کس زمیندار کا ذکر ہے۔

**یوسف شاہ**: آپ سمجھتی ہیں کہ میں ہر زمیندار کا نام یاد رکھ سکتا ہوں۔ ہوگا کوئی؟

**محمد بٹ**: حضور اس کا نام علی محمد ہے۔ آپ ارشاد فرمائیں تو اس کے متعلق دفتر سے تمام کاغذات منگوا کر حاضر کر دوں؟

**یوسف شاہ**: (شراب کا ایک گھونٹ اور پی کر) نہیں جی! آج کے لیے بس ایک معاملہ کافی ہے — آخر

یہ سید مبارک آئے کیوں نہیں؟

**محمد بٹ:** ظل اللہ! میں نے تو پہلے ہی حضرت عالی میں عرض کیا تھا کہ اُسے بلانا بے کار ہے وہ ہرگز نہ آئے گا۔

**حبہ خاتون:** سید صاحب بہت سچے اور ہمت والے آدمی ہیں وہ ضرور تشریف لائیں گے۔

**ولی عہد:** ملکہ جہاں! یہ عجیب بات ہے کہ حکومت کا کام کرنے والے جس شخص کو مفسدوں اور غداروں کا سرغنہ کہتے ہیں اسی کا آپ عزت سے ذکر کرتی ہیں۔ اس طرح حکومت کیسے چل سکتی ہے؟

**حبہ خاتون:** ہاں خواجہ! اس طرح حکومت نہیں چل سکتی۔

**یوسف شاہ:** پھر آپ کیا چاہتی ہیں۔ میں کیا کروں؟

**حبہ خاتون:** میں چاہتی ہوں کہ آپ خود حکومت کریں۔

**یوسف شاہ:** ملکہ جہاں! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ ایک آدمی حکومت کا سارا کام کرے۔ جن لوگوں کو میں نے ذمہ دار بنایا ہے۔ ان کا بھی تو کچھ حق ہے۔

**حبہ خاتون:** جی نہیں عالی جاہ! حق صرف جمہور کا ہے۔

**یوسف شاہ:** آپ اب جمہور جمہوریت کیا کرتی ہیں۔ کیا آپ کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جمہور میں کوئی اپنا اثر پیدا کر کے مجھ سے تخت و تاج چھین لے گا۔

**حبہ خاتون:** جب آپ بادشاہ ہیں تو جمہور میں کسی دوسرے کا اثر کیوں ہو!

**یوسف شاہ:** آپ نے ابھی سنا ہے کہ سید مبارک نے دارالسلطنت میں فساد برپا کرنے کے لیے نمک حراموں کی ایک جماعت تیار کی ہے۔ اس کے بعد بھی آپ جمہور کا نام لیتی ہیں۔

(چوبدار اندر داخل ہو کر آداب بجا لاتا ہے)

**چوبدار:** ظل اللہ! سید مبارک حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔

**یوسف شاہ:** اسے حاضر کرو۔

سید مبارک خاموشی کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور "السلام علیکم" کہہ کر ایک طرف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یوسف شاہ غصے اوپر

سے نیچے تک دیکھتا ہے۔ مگر نشے کے سبب اس کی نظر جمتی نہیں )

**یوسف شاہ** : سید مبارک ! ادھر سامنے آؤ۔ ہم نے سنا ہے کہ تم شہر میں فساد کرانے کے لیے ایک جماعت تیار کر رہے ہو !

**سید مبارک** : عالی جاہ ! آپ جانتے ہیں کہ فقیروں کا کام تالیفِ قلوب ہے۔ میں وہی کر رہا ہوں۔

**یوسف شاہ** : یہ تالیفِ قلوب کا بالکل نیا طریقہ ہے۔

**سید مبارک** : مجھ سے لوگ اپنی مصیبتیں بیان کرتے رہتے ہیں۔ میں جس طرح سمجھ میں آتا ہے ان کو تسلی دیتا ہوں۔ اب کچھ عرصے سے لوگوں میں پریشانی بہت بڑھ گئی ہے انھیں اس کا دکھ ہے کہ عالی جاہ انھیں دیدار کا کوئی موقع نہیں عنایت فرماتے اُن کے حال کی طرف توجہ نہیں فرماتے جو فریاد کرنے آتا ہے۔ اس کے ساتھ اور بھی زیادہ سختی کی جاتی ہے۔ اب وہ میرے گرد جمع ہو آتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ ان کی شکائتیں آپ تک پہنچاؤں۔

**محمد بٹ** : جہاں پناہ ! یہ بات کس قدر غلط ہے کہ آپ رعایا کے حال سے باخبر نہیں حکومت کا سارا کام دستور کے مطابق چل رہا ہے اور کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کی جاتی لیکن بعض لوگ ہیں جو اپنی بدنیتی کی وجہ سے سرکشوں کی حمایت کرتے ہیں اور فتنے کی آگ بھڑکاتے رہتے ہیں۔

**سید مبارک** : عالی جاہ ! مجھے پورا یقین ہے کہ آپ رعایا کو آسانی سے مطمئن فرما سکیں گے۔ بس یہ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر عالیجاہ کو منظور ہو تو میں کل یا پرسوں لوگوں کو عیدگاہ میں جمع کروں اور آپ ان کی تسلی فرما دیں۔

**علم شیر خاں ماگرے** : ظل اللہ ! مجھے اس میں عذر ہے مجھے شہر کا حال معلوم ہے اور اس کی بنا پر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ظل اللہ کا ایسے مجمع میں تشریف لے جانا جس میں بدمعاشوں اور غنڈوں کو مرعوب رکھنے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا ہو۔ بہت خطرناک ہوگا۔

**سید مبارک** : عالیجاہ ! میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ آپ کی رعایا آپ سے بہت محبت کرتی ہے اور آپ کو اپنے بیچ میں دیکھ کر اسے بہت تسلی ہوگی۔ آپ اپنی رعایا پر اعتبار فرمائیے۔

**حبہ خاتون** : عالی جاہ ! میری بھی یہی درخواست ہے۔

**ولی عہد** : جہاں پناہ ! آپ رعایا پہ اعتبار ضرور فرمائیں مگر اس کے ساتھ احتیاط بھی لازمی ہے۔

**سید مبارک** : عالی جاہ ! میں اس کا ذمہ لے سکتا ہوں کہ لوگ احترام اور عاجزی کے ساتھ اپنی شکائتیں بیان

کریں گے اور کسی قسم کی بے ادبی نہ ہوگی۔

**محمد بٹ**: ظل اللہ! جب کسی کا آپ کی رعایا پر اتنا اثر ہے کہ فوج کے بغیر آپ کی سلامتی کا ذمہ لے سکے تو یہ سوچنے کی بات ہے کہ اس نے اپنے اثر سے کام لے کر فساد کو دبایا کیوں نہیں۔

**یوسف شاہ**: تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔

**سید مبارک**: عالیجاہ! اس وقت رعایا کی دلجوئی کی ضرورت ہے۔ یہ آپ ہی فرما سکتے ہیں۔ اب میرا اثر لوگوں کو روک نہیں سکتا۔

**محمد بٹ**: ظل اللہ! مجھے اس پر اعتراض ہے کہ اس طرح آپ کے خادموں کے طرز عمل کی شکایت کی جائے۔ کیا آپ اپنی رعایا کے خیر خواہ نہیں ہیں؟ کیا آپ حکومت کے فرائض کو انجام نہیں دے رہے ہیں۔ یہ دلجوئی کرنے کا مطالبہ مجھے صرف ایک بہانہ معلوم ہوتا ہے۔

**یوسف شاہ**: (یکبارگی طیش میں آکر) دیکھو سید مبارک اب میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ یہ فساد تمہاری وجہ سے بڑھا ہے اور اسے دور کرنا بھی تمہارا ہی فرض ہے۔ تم اسی وقت جاؤ اور بغاوت کے جذبے کو لوگوں کے دلوں سے نکالو۔ ورنہ جو کچھ ہوگا اس کے تم ذمہ دار ہو۔

**سید مبارک**: عالیجاہ! میں آپ کا حکم بجا لانے کی پوری کوشش کروں گا مگر میری درخواست ہے کہ آپ میرے ساتھ اپنے کسی معتبر وزیر کو بھیج دیجئے تاکہ وہ لوگوں کے جوش کا اندازہ کر لے اور میرے طرز عمل کو بھی جانچ لے۔

**محمد بٹ**: ظل اللہ! اس میں بھی آپ کی حکومت کو بڑی سبکی کا اندیشہ ہے لوگ کہیں گے کہ بادشاہ ہاتھ آیا تو وزیر ہی کو ذلیل کرو۔

**یوسف شاہ**: (مستی کے غصہ میں کانپتے ہوئے) بس کرو سید مبارک! اب جاؤ اور تم سے جو کچھ کہا ہے کرو۔

(سید مبارک سر جھکا کر دیوان خاص سے چلے جاتے ہیں۔ حبہ خاتون بھی اٹھ کر چلی جاتی ہے۔ یوسف شاہ ایک پیالہ بھر کر پیتا ہے۔)

**محمد بٹ:** ظل اللہ نے اس وقت ایسی دور اندیشی سے کام لیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے سید مبارک آپ کے دبدبہ اور شان سے مرعوب نہ کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ سلطنت کا تختہ لپٹ جائے۔ اب ظل اللہ اجازت دیں تو خادم جا کے دیکھے کہ سید مبارک کیا کرتا ہے۔

**یوسف شاہ:** ہاں جاؤ۔

(یوسف شاہ اشارے سے دربار برخاست کرتا ہے۔ درباری
اور مصاحب سب چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے یوسف شاہ
اکیلا رہتا ہے پھر ایک خواص آکر اوٹ ہٹاتی ہے۔ اسی وقت
حبہ خاتون دیہاتی عورت کے لباس میں داخل ہوتی ہے یوسف شاہ
اسے غور سے دیکھنے کے بعد ہی پہچان پاتا ہے)

**یوسف شاہ:** یہ کیسا لباس پہن کر آئی ہو؟

**حبہ خاتون:** یہ میرا لباس ہے جو میں محل میں آنے سے پہلے پہنا کرتی تھی ..... میں اتنے برس محل میں رہ کر آپ کے دل میں رعایا کی محبت نہیں پیدا کر سکی۔ اب میں چاہتی ہوں کہ جا کر رعایا کے دل میں آپ کی محبت پیدا کروں۔

**یوسف شاہ:** (حیرت سے) آپ کیا چاہتی ہیں؟

**حبہ خاتون:** میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے ایک گمنام عورت کی طرح زندگی گزارنے کی اجازت دے دیں۔

**یوسف شاہ:** اور میں کیا کروں؟

**حبہ خاتون:** آپ کے اختیار میں پورا ملک ہے۔ ہزاروں آدمیوں کی عزت۔ جان۔ مال آسودگی ہے۔ آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں

**یوسف شاہ:** (سوچ کر) یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

**حبہ خاتون:** میں محل سے چلی جاؤں گی تو ہر بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔

**یوسف شاہ:** (پھر ذرا دیر سوچ کر) یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

**حبہ خاتون:** آپ کے وزیر اور مصاحب آپ کو جو مشورہ دیتے ہیں وہ فوراً آپ کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ میں آپ سے
جو کہتی ہوں تو آپ الجھتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کی یہ الجھن دور ہو جائے۔

**یوسف شاہ:** اور آپ مجھے اکیلا چھوڑ دیں گی؟

**حبہ خاتون:** میں آپ کے لیے ساتھی تلاش کرنے جا رہی ہوں۔

**یوسف شاہ:** مجھے آپ کے علاوہ اور کوئی ساتھی نہیں چاہیے

**حبہ خاتون:** (بڑی مایوسی کے لہجے میں) میرا آپ کا ساتھ مدت ہوئی چھوٹ گیا۔

**یوسف شاہ:** (رفتہ رفتہ متاثر ہو کر) ملکہ جہاں! کل صبح تک تو ٹھہر جائیے۔

**حبہ خاتون:** کل صبح نہ آپ اس محل میں ہوں گے۔ نہ میں ہوں گی۔

**یوسف شاہ:** (گھبرا کر) کیوں؟

**حبہ خاتون:** مجھے محل میں رہنے کی اب خواہش نہیں (منہ پھیر کر) آپ اس محل کے لائق نہیں ہیں۔

**یوسف شاہ:** (لجاجت سے) ملکہ جہاں! کوئی بات تو کیجیے جو میری سمجھ میں آجائے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ اب میں
شراب زیادہ پینے لگا ہوں۔ لیکن آپ اصرار کریں تو میں اس سے بالکل توبہ کر لوں گا۔ آپ کو میرے ندیموں
سے شکایت ہے۔ تو جسے آپ حکم دیں، سولی پر چڑھا دوں۔ مگر اب اپنا ارادہ بدل دیجیے۔ جا کر وہ شاہانہ
لباس پہن لیجیے۔ جو آپ ہی کو زیب دیتا ہے۔ کل جب میرے حواس ٹھیک ہو جائیں گے تو آپ مجھے
سمجھائیے گا کہ کیا کروں۔

(حبہ خاتون حسرت کے ساتھ یوسف شاہ کی طرف دیکھتی رہتی ہے
اور کوئی جواب نہیں دیتی)

**یوسف شاہ:** ملکہ جہاں! آخر میں کیا کروں۔ آپ ایوان میں بیٹھتی ہیں۔ حکومت کے سب معاملے آپ کے سامنے طے ہوتے
رہیں آپ کی جو بات میری سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس پر عمل ضرور کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا کہ آپ خفا ہیں

**حبہ خاتون:** میں خفا نہیں ہوں۔ ایک رشتہ کہ جو ٹوٹ گیا ہے پھر سے جوڑنا چاہتی ہوں۔

**یوسف شاہ:** ملکہ جہاں! آپ نے مجھے بالکل حیران کر دیا ہے اب خدا کے لیے ان باتوں کو چھوڑیے۔

(ادھر اُدھر دیکھ کر) آج تو آپ کی قہوہ بھی نہیں آئی۔ نسرین۔

(نسرین داخل ہوتی ہے اور آداب بجا لاتی ہے)

**یوسف شاہ**: جاؤ ملکہ جہاں کے لیے قہوہ لاؤ اور چوبدار سے کہو کہ وہ قوالوں کو حاضر کرے۔

**نسرین**: (تو جاتا ل کے بعد) ظل اللہ! اس وقت کوئی چوبدار نظر نہیں آتا۔ میں ہر طرف دیکھ آئی ہوں

**یوسف شاہ**: کیوں سب کہاں غائب ہو گئے؟

**نسرین**: ظل اللہ! آج شام سے شہر میں بہت شور و غل برپا ہے۔ دشمنوں نے یہ خبر مشہور کر دی ہے کہ محل پر حملہ ہونے والا ہے۔

**یوسف شاہ**: یہ کیا؟ مجھ سے تو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ذرا علم شیر خاں کو تو بلاؤ۔

(خواص چلی جاتی ہے)

**یوسف شاہ**: یہ سب مبارک شاہ کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔ اسے پہلے ہی قتل کر دینا چاہیے۔

**حبہ خاتون**: جی ہاں! سیلاب کی خبر لانے والے کا منہ بند کر دیا جاتا تو سیلاب رک جاتا۔ اب اطمینان دلانے والوں کا اطمینان تک لا رہا ہے۔

**یوسف شاہ**: اس کا کیا مطلب ہے؟

**حبہ خاتون**: عالی جاہ! میری بات کا کبھی کوئی مطلب نہیں ہوتا:

**یوسف شاہ**: (عاجزی سے) آج آپ میری بہت سخت آزمائش کر رہی ہیں آخر بتایئے تو اب کیا کروں؟

**حبہ خاتون**: مجھے محل سے جانے کی اجازت دے دیجیے۔

**یوسف شاہ**: لوگ آپ کو پہچانتے ہیں۔ آپ کا محل سے نکلنا خطرناک ہے۔

**حبہ خاتون**: لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

(دیوانِ خاص کا ایک دروازہ زور سے کھلتا ہے اور محمد بٹ انتہائی پریشانی اور خوف کی حالت میں داخل ہوتا ہے)

**محمد بٹ**: ظل اللہ! غضب ہو گیا! شہر میں آپ کے خادم قتل ہو رہے ہیں اور ان کے گھر لوٹے جا رہے ہیں۔

فوج نے افسروں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ آپ کے جو خیر خواہ بچ گئے وہ ادھر ادھر چھپے ہوئے ہیں اور شہر سے بھاگنے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ اب حضور کا کیا حکم ہے ؟

**یوسف شاہ:** ملکہ جہاں اب فرمائیے۔

**حبہ خاتون:** عالی جاہ! آپ کو ابھی تھوڑی دیر پہلے یقین دلایا گیا تھا کہ آپکے خادم رعایا کی حالت سے باخبر رہتے ہیں۔ تو انھیں سے پوچھنا چاہئے کہ انھیں منہ چھپانے اور شہر سے بھاگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

**محمد بٹ:** ظل اللہ! مجھے اب یقین ہے کہ سید مبارک نے آپ کی دشمنی میں غداروں کو فساد پر آمادہ کیا۔

**یوسف شاہ:** (گھبرا کر) مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

**محمد بٹ:** لیکن اب اسے غداری کی سزا دینے کے لیے موقع کا انتظار کرنا ہوگا اس وقت تو ہمیں اپنی سلامتی کی تدبیر کرنا ہے۔

**یوسف شاہ:** ملکہ جہاں! اب بتائیے کیا کریں ؟

**حبہ خاتون:** آپ چاہیں تو میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔

**یوسف شاہ:** کہاں چلوں آپ کے ساتھ ؟

**حبہ خاتون:** جمہور کے دل میں۔

**یوسف شاہ:** اسی جمہور کے دل میں جو مجھے قتل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

**محمد بٹ:** جہاں پناہ! اب ایسی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں نے خزانہ کھلوایا ہے۔ اس میں سے جتنا آسانی سے لے سکیں گے لے لیں گے دریا کی طرف ایک کشتی تیار ہے اور دوسرے کنارے پر چند لوگ گھوڑے لیے کھڑے ہیں۔ اب دیر نہ کیجئے

**یوسف شاہ:** اور ملکہ جہاں! آپ کیا کریں گی ؟

**حبہ خاتون:** میں زمیندار کی بیٹی ہوں کسی کونے میں گمنامی کی چادر اوڑھ کر بیٹھ جاؤں گی۔

**محمد بٹ:** (یوسف شاہ کا ہاتھ پکڑ کر) چلئے ظل اللہ اب وقت بہت تنگ ہے۔

(محمد بٹ اور یوسف شاہ چلے جاتے ہیں اس کے بعد حبہ خاتون آہستہ آہستہ چلی جاتی ہے)

# چوتھا ایکٹ

## پہلا منظر

(اسٹیج کے پیچھے کی طرف دائیں جانب ایک نیچی خستہ حال کٹیا ہے۔ اس کے قریب چنار کا درخت جس کا صرف تنا دکھائی دیتا ہے۔ پیچھے کی طرف زمین قدرے اونچی ہے۔ حبہ خاتون بائیں طرف ایک کیڑے پر سوچ میں بیٹھی ہے۔ صبح کا وقت ہے اور وہ فجر کی نماز پڑھ چکی ہے)

(عطا محمد داخل ہوتا ہے اور جب تک حبہ خاتون اس کی طرف نہیں دیکھتی۔ دست بستہ کھڑا رہتا ہے)

**حبہ خاتون:** میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ اب مجھے دنیا سے کوئی مطلب نہیں مگر آپ مجھے روز صبح کوئی نہ کوئی ایسی خبر سنا دیتے ہیں جس سے طبیعت پریشان ہو جاتی ہے۔

**عطا محمد:** ملکۂ جہاں میں آپ کی ہر بات کی عزت کرتا ہوں۔ سارا کشمیر آپ کی عزت کرتا ہے۔ آپ کو اپنی آنکھوں کا نور سمجھتا ہے۔ —— آپ دنیا کو بھول جانا چاہتی ہیں۔ آپ نے یہ کبھی نہیں فرمایا کہ کشمیر کو بھول گئی ہوں —— یہ تو آپ کے دل کا درد ہے۔

**حبہ خاتون:** اچھا تو بتائیے کیا ہوا ہے؟

**عطا محمد:** آج قاضی ابو محمد آنے والے ہیں۔

**حبہ خاتون:** قاضی ابو محمد —— کیوں؟

**عطا محمد:** بہت سے لوگ سوچنے لگے ہیں کہ اپنوں کا ظلم بہتر ہے یا غیروں کا انصاف۔ شاید قاضی صاحب

اس بارے میں آپ کی رائے دریافت کریں گے۔

**خجستہ خاتون:** آپ نے میری طرف سے کہہ دیا ہوتا کہ غیروں کے انصاف سے بدتر اپنوں کا کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔

(خاموشی)

**عطا محمد:** میں نے شاہ صاحب کی خدمت میں درخواست کی ہے کہ وہ بھی تشریف لے آئیں۔ انھوں نے فرمایا کہ میں آج خود ہی آنے والا تھا۔

**خجستہ خاتون:** (اپنے آپ سے) شاہ صاحب نے ایک سال حکومت کر کے تخت و تاج چھوڑ دیا۔ ان کی فقیری کی شان بڑھ گئی۔ اب دنیا سمجھتی ہے کہ انھوں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ کوئی ان کے گلے میں پھر بادشاہی کا طوق پہنانے کی کوشش نہیں کرتا۔ میں چند سال محل میں رہ کر ہمیشہ کے لیے گنہ گار بن گئی۔

(خاموشی)

**عطا محمد:** (پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے) معلوم ہوتا ہے۔ قاضی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

**خجستہ خاتون:** (اٹھ کر) یہ چادر ان کے نیچے بچھا دیجیے۔

(عطا محمد چادر اٹھا کر اس جگہ سے پانچ چھ فٹ ہٹ کر بچھا دیتا ہے اور بیگم کے پیچھے کی طرف جا کر چار کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد قاضی ابو محمد دائیں طرف سے چند لوگوں کے ساتھ آتے ہیں۔ ایک دو لمحہ خجستہ خاتون کو جو سر جھکائے بیٹھی ہے دیکھتے ہیں۔ پھر السلام علیکم کہہ کر آگے بڑھتے ہیں۔ یہ سمجھ کر کہ چادر انھیں کے لیے بچھائی گئی ہے۔ جوتے اتار کر اس پر بیٹھ جاتے ہیں)

**قاضی ابو محمد:** (اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے) اب آپ لوگ تھوڑی دیر کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دیں۔

(ساتھی سب چلے جاتے ہیں)

(خاموشی)

**قاضی ابو محمد**: حبہ خاتون آپ کی ذات سے کشمیر کو جو فیض پہنچا ہے اس کا آج اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کی جتنی عزت آج اور اس وقت ہے اتنی کبھی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے میں ایک معاملے میں آپ سے گفتگو کرنے آیا ہوں۔ میرے علم کے مطابق اس معاملے میں شبہے کی گنجائش نہیں لیکن جب سے آپ نے میری تنبیہ کی ہے میں اپنے علم پر بھی بھروسہ نہیں کرتا۔

(حبہ خاتون خاموش سر جھکائے بیٹھی رہتی ہے)

**قاضی ابو محمد**: آپ دُور اندیش اور مردم شناس ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص حبہ کے دل پر سے گذرتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ آپ کا خاص منصب مشکلوں کو آسان کرتا رہا ہے۔ جب سے آپ نے محل چھوڑا کشمیر کو چین نصیب نہیں ہوا ہے۔ سید مبارک نے ایک سال کی حکومت کی۔ پھر لوہر شاہ نے۔ آپ کے گیتوں نے یوسف شاہ کے قصور معاف کرا دیئے اور ان کے مغل دربار سے یہاں کھینچ کر لے آئے۔ اُنھوں نے ہمت نہ ہاری ہوتی تو شاید آپ کی شخصیت شہنشاہ اکبر کو بھی مرعوب کر کے کشمیر کی آزادی کو بچا لیتی۔ لیکن یوسف شاہ نے پھر شہنشاہ اکبر کے دربار میں پناہ مانگی ہے اور آپ نے اس گوشے میں دنیا سے پناہ لی ہے اب یعقوب شاہ کی ہدایت کرنے کے لیے کوئی نہیں اور ہر طرف ظلم و فساد کا بازار گرم ہے۔

(خاموشی)

**قاضی ابو محمد**: کل بھرے دربار میں مفتی محمد قاضی امان اللہ شہید کر دیئے گئے اور ان کی نعش کی وہ بے حرمتی کی گئی جو کسی مجرم کے لیے بھی روا نہیں رکھی جاتی۔

(حبہ خاتون چپکے سے آہ کرتی ہے اور اس طرح جھک جاتی ہے۔ گویا اس کی کمر ٹوٹ گئی)

(خاموشی)

**قاضی ابو محمد**: ممکن ہے اہل سنت والجماعت کا کوئی پیرو ایسی خبر سُن کر غصے میں کوئی فیصلہ کرے جو حق کے خلاف ہو۔ میں آپ سے دریافت کرنے آیا ہوں کہ جو شخص اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہتا ہو۔

اسے اس وقت کیا کرنا چاہئے۔

**حبہ خاتون:** اسے چاہئے کہ اسے ظالم کو شرمندہ کرنا چاہئے۔

**قاضی ابو محمد:** آپ خود فیصلہ کیجئے کہ ظالم کو شرمندہ کرنے کے لیے مسلک پر کتنے لوگ چل سکیں گے۔

**حبہ خاتون:** حق پر عمل کرنے کے لیے کم سے کم کتنے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

**قاضی ابو محمد:** آپ معرفت اور شہادت کی باتیں کر رہی ہیں مجھے جمہور سے سابقہ رہتا ہے وہ ایسی باتیں نہیں سمجھتے۔

**حبہ خاتون:** جب آپ نے معلوم کر لیا ہے کہ جمہور کی سمجھ میں کیسی باتیں آتی ہیں تو مجھ سے کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔

**قاضی ابو محمد:** حبہ خاتون! آپ جانتی ہیں کہ میں کیا کہنے آیا ہوں۔ بادشاہ کے تعصب نے ان لوگوں کے لیے جو مذہبی معاملوں میں اس سے اختلاف کرتے ہیں کشمیر میں رہنا ناممکن کر دیا ہے اب وہ یا تو یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے مذہب کو بدل دیں یا یہ کہ حکومت کو بدل دیں۔

**حبہ خاتون:** آپ نے خود ہی مجھ سے بیان فرمایا ہے کہ کشمیر کی حکومت چار مرتبہ بدل چکی ہے۔

**قاضی ابو محمد:** ہر بار اور ہر تبدیلی کے ساتھ وہ زیادہ کمزور ہوتی گئی۔ آگے یہی سلسلہ جاری رہا تو کشمیر تباہ ہو جائے گا۔

**حبہ خاتون:** حکومت کو مضبوط اور پائدار ہونا چاہئے۔ میری ہمیشہ آرزو رہی ہے۔

**قاضی ابو محمد:** میری بھی یہی آرزو ہے مگر اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ کشمیر میں کوئی ایسا نہیں ہے جو استقلال کے ساتھ حکومت کر سکے۔ بادشاہ متعصب ہے، امرا میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ عوام کا جوش اعتبار کے قابل نہیں۔

**حبہ خاتون:** ان کے جوش میں مذہب کے ذریعہ پختگی اور استقلال پیدا کیجئے۔

**قاضی ابو محمد:** مذہب کے ذریعے استقلال کیسے پیدا کیا جائے جب مذہب خود خطرے میں ہے۔

**حبہ خاتون:** مذہب تو خطرے سے اور مضبوط ہوتا ہے۔

**قاضی ابو محمد**: (کچھ سوچ کر) آپ مجھے بار بار چکر دے کر اسی جگہ پر لے آتی ہیں جہاں سے بحث شروع ہوئی تھی۔

**حبہ خاتون**: قاضی صاحب اگر آپ مجھ سے اس بارے میں مشورہ چاہتے ہیں کہ مغلوں کو کشمیر پر قبضہ کرنے کی دعوت دی جائے یا نہ دی جائے تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری لڑائی اور میرا تدبر کیا رہا ہے کشمیر کشمیریوں کا ہے اور ہونا چاہیے۔ ان کے اس حق کا مذہب اور سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔

**قاضی ابو محمد**: مجھے یہ بات اسلام کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ مذہب کے حق پر کسی اور حق کو ترجیح دی جائے۔

**حبہ خاتون**: میں یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ اسلام کو کشمیریوں کی غلامی کا ذریعہ بنایا جائے۔

**قاضی ابو محمد**: سچے دین کی محبت اور اس کی خدمت کسی کو غلام نہیں بنا سکتی۔

**حبہ خاتون**: تو قاضی صاحب سچے دین کے علم بردار بن جائیے۔ حاکم اور حکومت بدلیے کشمیر کو ظلم سے بچائیے میں دل اور جان سے آپ کے ساتھ ہوں۔

**قاضی ابو محمد**: (کچھ سوچ کر) میں دیکھتا ہوں کہ آپ وقت کی مصلحت کو نہیں سمجھ رہی ہیں۔ اب بحث کو بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔

**حبہ خاتون**: جی ہاں ——— میری سمجھ میں صرف آزادی کی مصلحت آ سکتی ہے۔ مجھ سے بحث کرنے میں کوئی فائدہ نہیں۔

**قاضی ابو محمد**: میں نے کبھی کوئی رائے معاملے کے ہر پہلو پر غور کیے بغیر نہیں قائم کی ہے۔ بادشاہوں کے عمل کے ساتھ ساتھ جمہور کے عمل پر بھی غور کرتا رہا ہوں۔ آپ مجھ سے اصولی بحث کرتی ہیں مجھے یہ نہیں بتاتی ہیں کہ کشمیر میں کس کی حکومت قائم کی جائے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس وقت جمہور میں اس کی قابلیت نہیں ہے کہ اپنے حاکم کو منتخب کریں اور پھر اس کی فرمانبرداری کریں ——— اچھا اب خدا حافظ کہتا ہوں۔

(حبہ خاتون کوئی جواب نہیں دیتی۔ قاضی ابو محمد جوتا پہن کر آہستہ

آہستہ چلے جاتے ہیں )

( خاموشی )

**عطا محمد** : ( قریب آکر ) ملکۂ جہاں! مجھے معلوم ہوا ہے کہ قاضی صاحب اکبر کے دربار میں جاکر اس کی درخواست کریں گے کہ وہ کشمیر میں سنی حنفی مذہب کو بچانے کے لیے یہاں اپنی حکومت قائم کرلے۔

**حبہ خاتون** : ہاں! سنی حنفی مذہب کو بچانے کے بہانے سے مغلوں کی فوج آئے گی۔ بستیوں کو لوٹے گی ہزاروں مردوں، عورتوں کی آبرو کو خاک میں ملائے گی اور آخر میں جب ہمت والے کشمیری سب مٹ جائیں گے تو کہا جائے گا کہ کشمیر میں مغل بادشاہ کے اقبال سے امن قائم ہو گیا ہے۔

( خاموشی )

( حبہ خاتون اس طرح بیٹھی ہے جیسے مراقبے میں۔ ہر عمر کے لوگ جن میں عورتیں بھی ہیں۔ ایک ایک دو دو کرکے جمع ہوتے ہیں۔ اس طرح گویا روز کا یہی دستور ہے۔ ایک نوجوان بیٹھنے سے پہلے عطا محمد کو ایک پرچہ دیتا ہے۔ عطا محمد اسے پڑھ کر حبہ خاتون کی طرف دیکھنے لگتا ہے اور پھر پاس جاکر کھڑا ہو جاتا ہے )

**عطا محمد** : ملکۂ عالم، خواجہ حبیب اللہ نوشہری نے ایک پیغام بھیجا ہے۔

**حبہ خاتون** : خواجہ صاحب نے!

**عطا محمد** : جی ہاں! ملکۂ جہاں، ایک رباعی لکھی ہے۔

**حبہ خاتون** : سنائیے!

**عطا محمد** : فرماتے ہیں :

کار مردانہ بکن کار زناں پیشہ نیست
جان خود باز کہ این جانِ جہاں چیزے نیست
ذکر ماضی مکن و فکر مضارع بگذار
کہ بدست ہمہ جز نقد زماں چیزے نیست

**حبہ خاتون**: یہ پیغام کون لایا ہے ؟

**نوجوان**: ملکۂ جہاں! آج میں فجر کے وقت خواجہ صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا نماز ختم ہوتے ہی انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور فرمایا کہ یہ پرچہ ملکۂ جہاں کی خدمت میں جلد از جلد پہنچا دو۔

**حبہ خاتون**: خواجہ صاحب قبلہ کی خدمت میں میرا سلام عرض کر دیجیے گا اور فرما دیجیے گا کہ انشاء اللہ کل صبح ملاقات کی سعادت حاصل کروں گی۔ ان کی ہر خواہش میرے لیے حکم ہے۔

**نوجوان**: بہت مناسب ہے ملکۂ جہاں!

**حبہ خاتون**: (انتہائی مایوسی کے عالم میں) یا خدا میں کیا کروں؟ ایک طرف سے غلامی اور موت کی دھمکی دی گئی ہے۔ دوسری طرف سے زندگی اور جان بازی کا حکم آیا ہے۔ میری ہمت کا سرمایہ ختم ہو چکا ہے اب نیا سرمایہ کہاں سے جمع کروں۔

**عطا محمد**۔ ملکۂ جہاں! قاضی ابو محمد فرما گئے ہیں کہ جمہور حق کی بات نہیں سمجھتے۔ کیا یہ آپ کے دل میں ہمت پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں۔

**حبہ خاتون**: (عطا محمد کی طرف اس طرح دیکھتی ہے۔ جیسے پردہ نشین عورت کسی اجنبی کو جو اچانک سامنے آگیا ہو) اگر آپ مجھ سے اس طرح کی باتیں کریں گے تو مجھے پھر پردے میں بیٹھنا پڑے گا۔

**عطا محمد**: ملکۂ جہاں! اب آپ کے اور جمہور کے درمیان کسی قسم کا پردہ نہیں رہ سکتا۔ میں جمہور کی ترجمانی کر رہا ہوں۔

**ایک نوجوان**: عطا محمد بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب آپ ہمارے دلوں کی کیفیت معلوم کیجیے اور ہمیں اپنے دل کی بات بتلایئے

**حبہ خاتون**: میرے دل کی کون سی بات ہے جو سب کو معلوم نہیں۔ پہلے محل کا پردہ تھا۔ اب کھلے میں رہتی ہوں۔

**دوسرا نوجوان**: ملکۂ جہاں! ہمارا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی خواہش اور مرضی گیتوں میں بیان نہ کیجیے۔ ہمیں صاف صاف حکم دیجیے کہ ہم کیا کریں۔ ہم اپنوں سے بے زار ہوں تب بھی ہم غیروں کی حکومت نہیں چاہتے۔ ہم آزادی اور خود داری کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں۔ آپ ہماری رہنمائی کیجیے۔

(حبہ خاتون ہاتھوں سے چہرے کو بند کر لیتی ہے اور سر ہلاتی ہے)

(خاموشی)

**حبہ خاتون:** میرا ساتھ دینے سے کس کو کچھ ملے گا۔

**عطا محمد:** تو پھر ہمیں سمجھا دیجئے کہ ملنوں کا خیر مقدم کرنے سے ہمیں کیا مل جائے گا

(حبہ خاتون پریشان ہو کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اپنی کٹیا کی طرف چلتی ہے
مگر قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں تو بیٹھ جاتی ہے۔ عطا محمد لوگوں کو اشارہ کرتا
ہے کہ چلے جائیں اور وہ ایک ایک دو دو کر کے چلے جاتے ہیں۔ آخر
عطا محمد بھی چلا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو اکیلا پا کر حبہ خاتون ہاتھوں سے
چہرے اور بالوں کو ملتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی طبیعت
کو بحال کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں جب
سید مبارک آتے ہیں تو اس کی طبیعت بہت بہتر ہوتی ہے)

**سید مبارک:** حبہ خاتون کیا بات ہے۔ یہاں آج کوئی نہیں ؟

**حبہ خاتون:** میرے پاس زندگی کا ایک پیام آیا تھا میں اسے برداشت نہ کر سکی۔ مردہ قبر میں اکیلا ہوتا ہے اس لیے
میں اکیلی ہوں۔

**سید مبارک:** (حبہ خاتون کے قریب بیٹھ کر) خیر ایک مردے کے پاس دوسرا ملنے کو آ جائے تو اس سے بات تو
کر ہی لینا چاہیئے۔

**حبہ خاتون:** شاہ صاحب! اس وقت مجھے اپنی زندگی حسرت اور ناکامی کی مثال معلوم ہوتی ہے۔ اس میں کوئی
بو نہیں۔ کوئی رنگ نہیں۔

**سید مبارک:** ہاں! مجھے بھی کبھی کبھی خیال آیا ہے کہ تمہاری زندگی کا رنگ زمین کا سا ہے —— اس
زمین کا سا جس میں زعفران کے پھول ہوتے ہیں —— جب کبھی مجھے ایسا خیال آیا ہے۔ تو میں نے
خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ دنیا میں اس رنگ کے آدمی بھی ہوتے ہیں۔

**حبہ خاتون:** زمین کے زرخیز سکون کو میری بے چینی سے کیا نسبت —— میری عمر تڑپتے گزری ہے۔

**سید مبارک:** تمھاری عمر تڑپتے گذری ہے ——— خدا کرے تم صدیوں اسی طرح تڑپتی رہو۔

**حبہ خاتون:** اور کریں شاہ صاحب یہ کیسی دعا ہے؟

**سید مبارک:** یہ کشمیر کی آزادی کے لیے دعا ہے —— تم نے کشمیری زبان میں سوز و زاری پیدا کی ہے۔ کشمیریوں کے دل کو آزادی کی ہوا دی ہے۔ خدا کرے یہ ہوا چلتی رہے ——— مجھ میں بے چینی اور تڑپ نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ علم اور تصوف نے صبر کا ایسا سبق پڑھایا ہے کہ ظلم اور انصاف، غلامی اور آزادی، موت اور زندگی سب ایک ہی حقیقت کے مختلف رنگ معلوم ہوتے ہیں

**حبہ خاتون:** مگر آپ کا ایک طریقہ ہے اور آپ اس پر قائم رہتے ہیں ——— میں تنکے کی طرح ادھر ادھر اڑتی رہتی ہوں۔ قاضی ابو محمد کو میں سمجھا سکتی تو شاید وہ اپنا ارادہ بدل دیتے۔ خواجہ حبیب اللہ کی نصیحت پر عمل کرنے کی ہمت ہوتی تو جمہور کو منظم کر کے مغلوں سے لڑنے کی تیاری کرتی۔

**سید مبارک:** ٹھہرو! تم بہت کچھ کر سکتی ہو اور کرو گی۔ تم یعقوب شاہ کو اس سے آگاہ کرو کہ ان کے طرز عمل کا انجام کیا ہوگا۔ وہ تمھارا بہت لحاظ کرتے ہیں۔ تمھارے کہنے سے اثر لیں گے۔ [illegible] تم ہی آمادہ کر سکتی ہو ——— ان کا حساب نہ لگاؤ کہ آزادی کی قیمت کیا ہے اور کشمیر والے اس کے لیے کیا لے سکتے ہیں ——— جو بعد کو بھی ہوگا اسے آنا ہی ہے [illegible] ——— میں نے سنا ہے تم بڈشاہ کے مزار کا اکثر طواف کرتی ہو۔

**حبہ خاتون:** جی ہاں۔ میں سوچتی ہوں کہ شاید پھر [illegible] ممکن ہے کوئی دوسرا بڈشاہ پیدا ہوگا۔

**سید مبارک:** یہ سوچنے کی بات نہیں ہے۔ یقین کی ہے۔ کشمیر کا چارہ ساز پیدا ہوگا۔ ضرور پیدا ہوگا۔ اس لیے تم اس کے لیے تڑپ رہی ہو۔ تمھاری نظر دل کی نظر ہے۔ آنے والے زمانے کے پردوں کو چاک کر کے اس شخصیت کو دیکھ لیا ہے جو کشمیر کو آزاد کرے گی۔ اپنی نظر کا نور جمہور میں پھیلاؤ۔

**حبہ خاتون:** شاہ صاحب! آپ کیسی نظر اور کیسے دل کا ذکر کر رہے ہیں؟ میں ایک عورت ہوں۔ عورت کی طرح سے چاہتی ہوں۔ عورت کی طرح سے سوچتی ہوں۔ میری محبت اندھی اور لاچار ہے۔

**سید مبارک**: تم کشمیر کو عورت کی طرح چاہتی ہو۔ تمھاری محبت عقیدت کی تدبیروں میں سے ایک بڑی تدبیر ہے۔ تم جس طرح سوچتی ہو اور کوئی سوچ نہیں سکتا۔ اسی لیے کہ تم جمہور کو اپنی اولاد سمجھتی ہو۔

**حبہ خاتون**: مگر شاہ صاحب یہ بھی تو دیکھیے کہ عورت کتنی بے بس ہوتی ہے۔ جب سے غالب جاہ نے کشمیر چھوڑا ہے میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ میری عقل کام نہیں دیتی بس دل دھڑکتا رہتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں بیوی ہوں یا بیوہ۔ زندہ یا مردہ ——— میرے گیت کو اب کسی ساز کا سہارا نہیں ملتا،

**سید مبارک**: اب زمانے کی کیفیت کو دیکھو اور اپنی کیفیت کو بھول جاؤ۔ اپنے اور جمہور کے درمیان سے حجاب اور تکلف کے پردے اٹھا دو ——— اپنے گیتوں کو آزادی کا پیام سمجھو۔ آج سے نئی زندگی کی علم بردار بن جاؤ۔

حبہ خاتون اٹھتی ہے اور آہستہ آہستہ کشتی کے اندر جا کر ایک ساز نکال کر لاتی ہے۔ اسے اپنے آنچل سے جھاڑتی ہے اور پھر اس کے سر ٹھیک کرنے لگتی ہے۔ دوسری طرف علا محمد داخل ہوتا ہے اور ایک کنارے بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ پہنچتے ہیں اور تھوڑی دیر میں دائیں طرف کا اسٹیج بھر جاتا ہے۔ اس وقت سب عقیدت مندوں کو امید ہے کہ گیت شروع ہوگا اور حبہ خاتون کے منہ سے آواز نکلنا چاہتی ہے )

**پردہ**

نندکمار
میرزا ادیب

# کردار

ہاردل

فرانسس

مانسن

کلیورنگ — کونسل کے ارکان

وارن ہیسٹنگز — ہندوستان کا گورنر جنرل

لیڈی وارن ہیسٹنگز — گورنر جنرل کی جرمن نژاد بیوی

سر ایلیجا امپی — عدالتِ عالیہ کا چیف جسٹس

موہن پرشاد — کلکتے کا ایک جوہری

نندکمار —

## زمانہ

۱۲۲۵ھ ہجری

## مقام

کلکتہ

○

# پہلا منظر

(علی پور کلکتہ میں ایک شاندار بنگلہ (بلویڈیر) کا کونسل ہال)

یہ کمرہ اعلیٰ درجے کے سامانِ آرائش سے مزین ہے چھت سے
بلّور نہایت خوبصورت اور بیش قیمت فانوس لٹک رہے ہیں یہ فانوس
کچھ عرصہ پیشتر مرحوم نواب سراج الدولہ کے محل کی زینت تھے۔
نواب کے خاتمے پر جب کمپنی کے ارباب بست وکشاد نے اس
کے محل میں لوٹ مار مچائی تھی تو جو چیزیں انھیں خاص طور پر بہت پسند
آگئی تھیں وہ انھوں نے ولایت بھجوا دی تھیں اور باقی سامان
اپنے ہندوستانی بنگلوں اور سرکاری دفاتر میں منتقل کر دیا تھا۔
ان فانوسوں اور فرش پر بچھے ہوئے بیش بہا کشمیری قالین کے
علاوہ اور بھی کافی سامان گورنر کے حصے میں آیا تھا جس سے "بلویڈیر"
کے مختلف کمروں کی زینت بڑھائی گئی تھی۔

دیواروں پر مغلیہ اور چینی آرٹ کے نادر نمونے آویزاں ہیں۔
یہ چیزیں کمپنی کے اہل کار گورنر کی خاص مراعات حاصل کرنے کی خاطر
اس کی خدمت میں وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہے ہیں۔

سنوت دن کا دوسرا پہر ہے۔ کمرے کے وسط میں ہاتھی دانت کی بنی
ہوئی میز کے اردگرد گورنر جنرل کی کونسل کے چار ارکان بیٹھے ہیں
دائیں طرف "فرانسس" ہے اور کونے میں کرنل مانسن اس طرح
دوسری جانب "جنرل کلیورنگ" ہے اور کونے میں فرانسس کے

بالمقابل "بارول" بیٹھا ہے ایک طرف کونسل کے صدر اور ہندوستان میں برطانوی مقبوضات کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کی کرسی خالی پڑی ہے۔

ان میں سب سے کم عمر فرانسس ہے جس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ باقی تینوں ارکان کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان ہے۔

چاروں اپنے قومی لباس کوٹ پتلون میں ملبوس ہیں۔

فرانسس کے سامنے میز پر کچھ کاغذات پڑے ہیں جن پر وہ نگاہیں جمائے کچھ سوچ رہا ہے۔ بارول ذرا کرسی کھسکا کر فرانسس کی طرف دیکھتا ہے۔

(فرانسس کی توجہ بھی کاغذوں سے ہٹ کر اس کی طرف منعطف ہو جاتی ہے)

بارول: میں سمجھتا ہوں یہ معاملہ نہایت اہم ہے۔ ہمیں ہر ممکن احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

فرانسس: (ذرا مسکرا کر) مسٹر بارول! یہ فقرہ آپ کم از کم چار مرتبہ کہہ چکے ہیں۔

بارول: معاملہ اس درجہ اہم ہے کہ میں بار بار یہ فقرہ کہنے پر مجبور ہوں

مانسن: احتیاط سے کام لیے بغیر ہم اس معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

فرانسس: (کاغذ اٹھا کر انہیں دوبارہ میز پر رکھتے ہوئے) کیا اس شہادت کے باوجود کسی فیصلے پر پہنچنا مشکل ہے؟

بارول: اسکے باوجود بھی۔

فرانسس: اس سے زیادہ بھی کسی وضاحت کی ضرورت ہے؟ مسٹر بارول۔ آپ ان خطوں کو صحیح تسلیم نہیں کرتے؟

بارول: میں ایک لمحے کے لیے بھی ان پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ وجہ ظاہر ہے۔

کلورنگ: وجہ کیا ہے؟

بارول: کیا مجھے پھر وہی فقرے دہرانے پڑیں گے جنھیں میں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں۔

کلورنگ: کیا ہرج ہے؟ زیادہ وضاحت ہو جائے گی۔

باروِل : اتنی بات تو ظاہر ہے کہ گورنر جنرل نے اس بنگالی برہمن نند کمار کی دیرینہ آرزو پوری نہیں کی تھی یعنی نند کمار چاہتا تھا کہ رضا خاں کی بجائے وہ دوبارہ بنگالے کا صوبہ دار بن جائے۔ مگر ایسا نہ ہُوا۔ گورنر جنرل نے ریگولیٹنگ ایکٹ کے ماتحت صوبوں کے دیوانی اختیارات اپنے قبضے میں لے لیے۔ یعنی نند کمار جو عہدہ چاہتا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ کیا اب بھی یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ نند کمار نے گورنر جنرل پر رشوت ستانی کا جو الزام لگایا ہے وہ ایک انتقامی کارروائی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ؟

مانسن : لیکن یہ خط ؟

باروِل : مَیں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجھے ان خطوں پر کوئی اعتبار نہیں یہ نقلی ہیں !

فرانسس : (کرسی کے بازو پہ دائیں کہنی رکھتے ہوئے) دوستو مَیں مانتا ہوں۔ یہ معاملہ بہت اہم ہے اور ہمیں ہر ممکن احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ مگر میرے دوست مسٹر بارول کو یہ خیال دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ وہ چونکہ ہندوستان میں مسٹر ہیسٹنگز کے دستِ راست رہ چکے ہیں۔ اس لیے انہیں گورنر جنرل کی ہر معاملے میں حمایت کرنی چاہیے اور ہم چونکہ ابھی ابھی انگلینڈ سے آئے ہیں۔ اس لیے ہم ان کی ہر طرح مخالفت کریں گے ہمیں حالات کو بہتر اور خوشگوار بنانا ہے۔ ہمیں گورنر جنرل کو ہر معاملے میں نیک مشورہ دینا ہے۔

باروِل : مَیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔

فرانسس : سوال یہ ہے کہ نند کمار کو گورنر جنرل پر الزام لگانے کی جرأت کیونکر ہوئی ؟ کوئی شخص بھی اتنی بڑی شخصیت پر جھوٹا الزام لگانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

باروِل : بہتر یہ ہے کہ واقعات کو ان کے حقیقی تسلسل کے ساتھ سمجھا جائے جیسا کہ مَیں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اگر نند کمار کو بنگالے کا صوبہ دار بنا دیا جاتا تو معاملہ یہیں ختم ہو جاتا اور اسے مسٹر ہیسٹنگز پر الزام لگانے کی قطعاً ضرورت نہ پڑتی۔ چونکہ اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکا۔ اس لیے گورنر جنرل کو بدنام کرنے کے لیے اس نے یہ الزام لگا دیا ہے۔ یہ ہندوستانی —— اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔

فرانسس : مسٹر بارول ! آپ کو اپنی پوزیشن کا خیال رکھنا چاہیے۔

باروِل : مَیں بالکل درست کہہ رہا ہوں۔

**فرانسس** : آپ کو ایسی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

**بارول** : حقیقت بیان کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔

**فرانسس** : ناجائز حمایت یقیناً ایک جرم ہے۔

**کلیورنگ** : حضرات! اس معاملے کو چھوڑیئے۔ میں بارول سے پوچھتا ہوں انھوں نے ان خطوں کو پڑھا بھی ہے۔

**بارول** : پڑھ چکا ہوں اور تین مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔

**مانسن** : بارول کو سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ خط نند کمار نے بھیجے ہیں۔ اگر نند کمار کی بجائے یہ خط کسی اور شخص نے بھیجے ہوتے تو شاید انھیں زیادہ اعتراض نہ ہوتا۔ کیوں بارول!

**بارول** : ہمیں ہندوستانیوں کی فطرت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے اور اس چیز کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ کمپنی اور گورنر جنرل کا اس ملک میں مقصد کیا ہے۔

**فرانسس** : کاش بارول کو معلوم ہوتا کہ اس وقت انگلستان میں ان کا محبوب گورنر جنرل کس درجہ بدنام ہو گیا ہے۔

**بارول** : سب کچھ فضول —— وارن ہیسٹنگز اس عہد کا ہیرو ہے گریٹ مین (GREAT MAN)

**کلیورنگ** : آپ لوگ کن چیزوں سے الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اصل معاملے پر غور کیجئے۔ مسٹر بارول۔ آپ یہ بات بھول گئے ہیں کہ ہمارے پاس صرف نند کمار ہی کا نہیں۔ منی بیگم کی تحریر بھی ہے۔ اگر نند کمار کے خط کو یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے کہ یہ محض انتقامی کارروائی ہے تو منی بیگم کی تحریر کو کیا سمجھنا چاہیئے۔

**فرانسس** : (طنزاً) شاید تحریر جعلی ہے۔

**بارول** : میں اس تحریر کو جعلی سمجھتا ہوں یا نہیں۔ یہ الگ بات ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے گورنر جنرل کو ان بیہودہ معاملات میں گھسیٹ سکتے ہیں یا نہیں۔ ہندوستانیوں کے لگائے ہوئے الزام پر غور کرتے وقت ہمیں یہ بات ہرگز نہ فراموش کرنی چاہیئے کہ وارن ہیسٹنگز ہندوستان کا گورنر جنرل ہے —— اس کونسل کا صدر ہے —— انگلستان کے وقار کا نمائندہ ہے (جوش میں کھڑے ہو کر) ہندوستانی لوگ آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے پر حملہ کرنا ان کی فطرت بن چکی ہے اس لیے ہمیں بڑے ٹھنڈے دل سے اس معاملے پر غور کرنا چاہیئے۔ ہماری مخالفت سے ہمارے اپنے وقار کو نقصان پہنچے گا ہمارے

اپنے مقاصد کو نقصان پہنچے گا۔ ——— جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی راہ میں رکاوٹیں حائل ہو جائیں گی۔ کیا میرے دوست اس امر سے ناواقف ہیں کہ اگر آج ہم اپنی مجوزہ پالیسی پر سختی کے ساتھ عمل نہ کر سکے تو ہندوستانی راجے اور نواب اور خود مغل بادشاہ اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ بس طرح ہماری کوششیں خاک میں مل جائیں گی۔ میری رائے یہ ہے کہ ان کا غذوں کو پھاڑ کر پھینک دینا چاہئے۔ اور نند کمار جیسے فریب کار شخص کی کسی طرح بھی ہمت افزائی نہیں کرنی چاہئے۔

فرانسس: اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر گورنر جنرل ہندوستانیوں سے رشوت لے کر انگلستان کے وقار کو خاک میں ملائے تو ہمیں بالکل خاموش رہنا چاہئے۔ ——— بات کچھ معقول ہی معلوم ہوتی ہے (طنزاً) ہندوستان میں بے شمار دولت موجود ہے۔ اگر گورنر جنرل چند لاکھ یا چند کروڑ روپیہ بطور رشوت کے لے لیتا ہے۔ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

مانسن: اگر گورنر جنرل یہ روپیہ کمپنی کے حوالے کر دے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

بارول: (مسکرا کر) بلکہ بہتر یہ ہے کہ وہ آپ کے حوالے کر دے۔

فرانسس: (میز پر مکہ مار کر) مسٹر بارول! آپ نے تسلیم کر لیا ہے۔ گورنر جنرل نے رشوت لی ہے۔

بارول: ہرگز نہیں!

کلیورنگ: ابھی تو آپ نے کہا ہے کہ گورنر جنرل رشوت کا روپیہ مانسن کے حوالے کر دے۔

بارول: وہ تو محض ایک مذاق تھا۔

فرانسس: خیر مذاق مذاق ہی میں آپ نے حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے اور ———

فرانسس ابھی اپنا فقرہ مکمل کرنے نہیں پاتا کہ گورنر جنرل کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ وارن ہیسٹنگز مسکراتا ہے اور جلدی جلدی قدم اٹھا کر فرانسس اور کلیورنگ کے درمیان اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ جاتا ہے وارن ہیسٹنگز چھریرے بدن کا آدمی ہے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی مگر نہایت تیز ہیں جو فقرہ مخاطب کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں

ستواں ناک کشادہ پیشانی دہانہ تنگ۔ چہرے سے بلا کی
ذہانت نمایاں ہے۔ ارکان اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔

**وارن ہیسٹنگز** : معلوم ہوتا ہے۔ کونسل کسی اہم معاملے پر غور کرنا چاہتی ہے۔

**بارول** : ہمارے دوست اس وقت ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں گورنر جنرل نے نند کمار کے قول کے مطابق رضا خاں۔ منی بیگم اور شتاب رائے سے رشوت میں روپیہ حاصل کیا ہے۔ میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کہ نند کمار نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ محض انتقام کی خاطر کیا ہے۔

( وارن ہیسٹنگز کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے غصے کی سرخی آتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے )

**فرانسس** : گورنر جنرل اس معاملے میں کیا کہتے ہیں ؟

**وارن ہیسٹنگز** : ( صبر اور تحمل سے ) مسٹر بارول نے جو کچھ کہا ہے درست ہے۔

**فرانسس** : تو گورنر جنرل اس الزام کو غلط سمجھتے ہیں۔

**وارن ہیسٹنگز** : ( لہجے میں نرمی اور تحکم ) کیا کونسل آج اسی موضوع پر گفتگو کرنا چاہتی ہے۔

**فرانسس** : معاملے کو صاف کرنا کونسل کا فرض ہے۔ اس الزام سے تاجِ برطانیہ "بدنام ہوتا ہے۔

**وارن ہیسٹنگز** : یہ الزام غلط ہے۔ اس نیچ برہمن نے انتقام لیا ہے۔

**فرانسس** : ( کاغذوں کو ہاتھ میں لے کر ) اور یہ خط منی بیگم کا۔

**وارن ہیسٹنگز** : ( تحکم سے ) میں کہتا ہوں۔ یہ سب کچھ بکواس ہے۔

**کلیورنگ** : گورنر جنرل یقیناً محسوس کریں گے کہ اس طرح معاملہ صاف نہیں ہو سکتا۔

**بارول** : اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔

**وارن ہیسٹنگز** : اس موضوع کو ختم کیجئے۔ کوئی اور معاملہ چھیڑیئے۔

**مانسن** : میں گورنر جنرل کی خدمت میں درخواست کروں گا کہ وہ سب سے پہلے اس معاملے کو ختم کریں۔

**وارن ہیسٹنگز** : تو میں اس معاملے کو ختم کرتا ہوں۔ اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

فرانسس : کونسل یہ بات سمجھ نہیں سکی۔

وارن ہیسٹنگز : (ملائم لہجے میں) دوستو! آپ کو انگلستان سے آئے ہوئے بہت کم عرصہ ہوا ہے۔ میں گورنر اور گورنر جنرل بننے سے پہلے بھی اس ملک میں رہ چکا ہوں۔ مجھے ان لوگوں کی فطرت کا بخوبی علم ہے۔ ایک دوسرے پر الزام لگانا ان کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ ہمیں ان باتوں پر وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے اور اس کام کو جاری رکھنا چاہیے جس کے لیے ہماری حکومت نے ہمیں یہاں بھیجا ہے۔

فرانسس : یہ درست ہے۔ مگر ہمیں حالات کو خوشگوار بنانا ہے۔ کمپنی ہندوستان اور انگلستان —— دونوں جگہ بدنام ہو گئی ہے۔

وارن ہیسٹنگز : یہ غلط ہے۔

فرانسس : اور بدنامی کی وجہ یہ ہے کہ ہماری حکومت کے نمائندے اس ملک میں احتیاط سے کام نہیں لے رہے۔

وارن ہیسٹنگز : (غصے سے) تم نے اس کمبخت برہمن کی باتوں پر اعتبار کر لیا ہے؟

فرانسس : اس نے اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے جو ثبوت بہم پہنچایا ہے وہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

کلیورنگ : کونسل نے نند کمار کو بھی بلایا ہے۔ آ ہی رہا ہو گا۔

وارن ہیسٹنگز : (غصے سے کھڑے ہو کر) گویا ایک ذلیل شخص کو میرے مقابلے میں لا کر کونسل میری توہین کرنا چاہتی ہے؟

فرانسس : اس سے توہین کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ کونسل چاہتی ہے کہ گورنر جنرل اور نند کمار جو کچھ کہنا چاہتے ہیں ایک دوسرے کے سامنے کہیں۔

وارن ہیسٹنگز : اس سے بڑھ کر میری اور کیا توہین ہو سکتی ہے؟

بارول : واقعی گورنر جنرل کی توہین ہے۔ انگلستان کی توہین ہے۔ "تاج برطانیہ" کی توہین ہے۔ کونسل اس بات کی مجاز نہیں ہے کہ گورنر جنرل کی موجودگی میں نند کمار کو طلب کرے۔

کلیورنگ : نند کمار کو اس لیے طلب کیا گیا ہے کہ وہ گورنر جنرل کی موجودگی میں جو کچھ کہنا چاہتا ہے کہے۔ اس کے بعد کونسل فیصلہ کرے گی کہ یہ صرف اس کی انتقامی کارروائی ہے یا اس میں کچھ صداقت بھی ہے۔ کونسل

کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہے ۔ اگر یہ الزام غلط ثابت ہوا تو نند کمار ہماری گرفت سے بچ کر نہیں جا سکے گا ۔ مگر ہمیں انصاف کا تقاضا پورا کرنا پڑے گا ۔

فرانسس : کونسل گورنر جنرل سے پوچھتی ہے کہ انہیں نند کمار کی موجودگی میں حقیقت بیان کرنے سے کیوں انکار ہے ۔

بارول : صاف ظاہر ہے ۔ یہ تاج برطانیہ کے سب سے بڑے نمائندے کی توہین ہے ۔

وارن ہیسٹنگز : میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کونسل کو اس بات کی اجازت نہیں دوں گا ۔ کہ وہ بیہودہ اور فضول باتوں میں اپنا قیمتی وقت ضایع کرے ۔

فرانسس : کونسل کو بہرصورت اپنا فرض پورا کرنا ہوگا ۔

بارول : یہ فرض شناسی نہیں ہٹ دھرمی ہوگی ۔

وارن ہیسٹنگز : میں بحیثیت صدر کے کونسل کو برخاست کرتا ہوں ۔

( وقفہ )

فرانسس : اگر گورنر جنرل کونسل سے الگ ہو جانا چاہتے ہیں ۔ تو یہ الگ بات ہے ۔ کونسل نے اپنے ذمے جو کام لیا ہے اُسے ضرور پورا کرے گی ۔

وارن ہیسٹنگز : مجھے معلوم نہ تھا ۔ کونسل کے ارکان اپنا قیمتی وقت ضایع کرنے کیلیے ہندوستان میں آئے ہیں ۔ میں اس بات کا اعلان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ از روئے قانون میں کونسل کو برخاست کر سکتا ہوں ...... اگر میری عدم موجودگی میں کونسل جاری رہی تو اس کا کوئی فیصلہ میرے لیے قابل قبول نہیں ہوگا ۔

( کرسی سے الگ ہو کر جانے لگتا ہے )

بارول : مجھے بھی گورنر جنرل سے اتفاق ہے ۔

( جانے لگتا ہے )

فرانسس : ہمیں اس کی توقع نہیں تھی ۔

( گورنر جنرل چلا جاتا ہے اس کے پیچھے پیچھے بارول بھی رخصت ہو جاتا ہے )

مانسن : اب کیا کرنا چاہیئے ؟

فرانسس: کارروائی جاری رکھنی چاہیے۔ میں تجویز کرتا ہوں، موجودہ اجلاس کی صدارت مسٹر کلیورنگ انجام دیں۔

مالسن: مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ مسٹر کلیورنگ صدارت کے فرائض انجام دیں گے۔

کلیورنگ: یقیناً ——— دوستو! معاملے نے بڑی نازک صورت اختیار کرلی ہے۔ گورنر جنرل اس بات کو پسند ہی نہیں کرتے کہ رشوت ستانی کے سلسلے میں ان سے باز پرس کی جائے۔

فرانسس: یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہیسٹنگز کے دل میں کھوٹ ہے۔ اگر انھوں نے رشوت نہیں لی تو نندکمار کے سامنے اظہارِ صداقت کرتے ہوئے انھیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم انگلستان سے تماشائی کی حیثیت سے نہیں آئے۔ ہمیں حالات کو سنوارنا ہے اور ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے جو نفرت پیدا ہو گئی ہے اسے دور کرنا ہے۔

(ایک چپراسی اندر آتا ہے)

چپراسی: نندکمار۔

کلیورنگ: بھیج دو اُسے اندر۔

(سب کی نگاہیں دروازے پر جم جاتی ہیں۔ نندکمار دروازے میں آتا ہے۔ سر جھکا کر پرنام کرتا ہے اور کھڑاؤں اتار کر کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ نندکمار کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ مگر صحت نہایت اچھی ہے۔ جسم پر ڈھاکے کی ململ کی قمیص اور دھوتی ہے۔ چہرے پر ایک ایسا جلال برستا ہے جو بُردبار اور باہمت لوگوں کا امتیازی خصوصیت ہے۔
نندکمار بڑی متانت اور سنجیدگی سے قدم اٹھاتا ہوا کونسل کے قریب آتا ہے)

فرانسس: نندکمار (ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے) بیٹھ جاؤ۔

نندکمار: شکریہ۔

(کرسی پر بیٹھتا نہیں)

**کلیورنگ** : (فرانسس کے سامنے کاغذوں پر اشارہ کرکے) یہ خط تم نے بھیجے ہیں؟

نندکمار : جی ہاں!

**کلیورنگ** : تم نے ہندوستان کے گورنر جنرل پر یہ الزام لگایا ہے کہ انھوں نے بہت سا روپیہ رشوت میں لیا ہے؟

نندکمار : میں نے یہ الزام لگایا ہے۔ اور اس کا ثبوت بھی دے چکا ہوں۔

**کلیورنگ** : ذرا تفصیل سے بیان کرو۔

**نندکمار** : مجھ سے کہا گیا تھا کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے گورنر جنرل کی موجودگی میں کہنا ہے۔

**فرانسس** : تم وہ باتیں اب بھی کہہ سکتے ہو۔

**نندکمار** : اور گورنر جنرل ——— ؟

کلیورنگ : تمھیں اس سے کیا تعلق ہے۔ فیصلہ کونسل کرے گی۔

نندکمار : گورنر جنرل نے رضا خاں کو بنگالے کا اور شتاب رائے کو بہار کا صوبہ دار بنایا تھا۔ یہ دونوں شخص اپنے صوبوں کے محاصل اصول کرکے کمپنی کے حوالے کرتے تھے۔ رضا خاں سات سال تک اپنے عہدے پر رہا اس سے پہلے یہ کام بہت بہتر دقت ——— میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ رضا خاں نے سات سال کے عرصے میں کم از کم تین کروڑ روپیہ لوگوں سے لوٹا۔ اور شتاب رائے نے نوے لاکھ۔ میں نے یہ واقعہ گورنر جنرل کو بتایا۔ انھوں نے دونوں کو گرفتار کر لیا۔ اب چاہیے یہ تھا کہ دونوں کے خلاف مقدمہ چلایا جاتا۔ اور انھیں سزا ملتی۔ مگر دونوں نے گورنر جنرل کو معقول رشوت دے کر قانون سے نجات حاصل کر لی۔ رضا خاں نے گورنر جنرل کو دس لاکھ رشوت دی اور شتاب رائے نے چار لاکھ۔ اس کے علاوہ میر جعفر کی بیوہ منی بیگم نے بھی ڈھائی لاکھ کی رقم رشوت دی اور نواب بنگال کی محافظہ مقرر ہو گئی۔ میرے پاس اس کا تحریری ثبوت موجود ہے۔ منی بیگم نے گورنر جنرل کو مرشد آباد میں ایک لاکھ اور قاسم بازار میں ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ دیا ——— منی بیگم نے یہ خط مجھ کو لکھا ہے اور اس میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ اس نے ڈھائی لاکھ کی رقم گورنر جنرل کے حضور میں پیش کی تھی۔

کلیورنگ: منی بیگم نے یہ خط تمھیں کیوں لکھا تھا؟

نند کمار: اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ منی بیگم کو مجھ پر کامل اعتماد تھا اور دوسرے اُسے گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک دن اس کا خط گورنر جنرل کے خلاف ایک تحریری ثبوت کے طور پر پیش کیا جائے گا۔

کلیورنگ: کیا یہ تحریر منی بیگم کی ہے؟

نند کمار: اس کا جواب براہ راست منی بیگم کے دستخط دے رہے ہیں۔

فرانسس: یہاں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ چونکہ گورنر جنرل نے تمھیں بنگالے کا صوبیدار نہیں بنایا۔ اس لیے تم ان سے انتقام لینا چاہتے ہو۔

نند کمار: کونسل کو ہر طرح اختیار ہے۔ کہ وہ اسے انتقام سمجھے یا کچھ اور ---- میں نے جس چیز کو حقیقت سمجھا ہے اس کا اظہار کر دیا۔ جب میں نے گورنر جنرل کو رضا خاں اور شتاب رائے کی لوٹ کھسوٹ کا حال بتایا تھا تو انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تمھیں بنگالے کا صوبیدار بنایا جائے گا۔ یہ وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ مجھے اس کا رنج ضرور ہے۔ لیکن گورنر جنرل پر میں نے جو الزام لگایا ہے وہ اس رنج کا ردِ عمل نہیں ہے۔ رضا خاں اور شتاب رائے نے میری زبان بند کرنے کے لیے مجھے بھی لاکھوں روپیہ رشوت دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ مگر میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اور نہ کبھی تیار ہو سکتا ہوں۔ اگر مجھے دولت کی خواہش ہوتی تو دولت حاصل کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ کیا ہو سکتا تھا ---- معاف کیجیے میں یہ بات کہنے پر مجبور ہوں کہ گورنر جنرل نے اس ملک میں ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ مچا رکھی ہے وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ وہ ہم میں نا اتفاقی پیدا کرتا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے خلاف ----

کلیورنگ۔ (بات کاٹ کر) نند کمار! اس معاملے کو الجھانے کی کوشش نہ کرو۔ یہ غلط چال ہے تمھاری۔

نند کمار۔ صرف میں ہی نہیں۔ میرے ساتھ ہزاروں لوگ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں۔ کہ ہندوستانیوں کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ نوابوں اور راجاؤں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑایا جا رہا ہے۔ یہاں کی دولت انگلستان بھیجی جا رہی ہے۔

کلیورنگ: نند کمار! تم نے گورنر جنرل پر جو الزام لگایا ہے۔ اسے کمپنی کے سامنے بیان کرو گے میرا مطلب

رشوت کے معاملے سے ہے۔

نند کمار۔ ہر وقت بیان کرنے کے لیے تیار ہوں۔

**کلیورنگ**۔ تو اب تم جا سکتے ہو۔ شکریہ!

( نند کمار، سی ننانت، ور سنجیدگی کے ساتھ چلا جاتا ہے جس ننانت

اور خوبی سے آیا تھا )

**فرانسس**: میں پہلے ہی کہتا تھا معاملہ نازک ہے۔

**کلیورنگ**: معاملہ اس لحاظ سے اور بھی نازک ہے۔ کہ یہاں کے لوگ ہم سے متنفر ہوتے جا رہے ہیں۔ نفرت آلود فضا میں حکومت برطانیہ کی پالیسی یہاں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

**مانسن**۔ لوگوں میں نفرت بڑھ گئی۔ تو ہمیں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

**کلیورنگ** اس وقت ہماری پالیسی کی کامیابی اور ناکامی کا سوال ہے۔ گورنر جنرل سے پوری طرح مواخذہ کرنا چاہیئے۔

**فرانسس**: میری رائے یہ ہے کہ یہاں کے لوگ اس وقت مطمئن ہوں گے۔ جب گورنر جنرل سے مواخذہ کیا جائے گا اور سختی سے کیا جائے گا۔

**کلیورنگ**: کاغذات تیار کر کے کمپنی کے حوالے کر دینے چاہئیں۔ اگر آپ اس پر رضامند ہیں تو فی الفور مقدمہ تیار کر کے کمپنی کے سپرد کر دیں گے۔

**فرانسس**۔ بالکل۔

**کلیورنگ**: تو اجلاس برخاست ہوتا ہے۔

○

# دوسرا منظر

(وارن ہیسٹنگز کا ڈرائنگ روم

کمرہ کافی آراستہ و پیراستہ ہے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پہ رنگین اور ریشمیں پردے لہرا رہے ہیں۔ مشرقی دروازے کے پاس فرانسیسی سکرین پڑی ہے۔ سکرین سے دور شمالی دیوار کے قریب مخملیں صوفے پر وارن ہیسٹنگز بیٹھا ہے اور اس کے سامنے کرسی پر کلکتے کی عدالتِ عالیہ کا چیف جسٹس امیرِ عدالت، سر ایلیجا امپی نظر آ رہا ہے۔ سر ایلیجا ٹھگنے قد کا آدمی ہے۔ عمر ہیسٹنگز کے لگ بھگ ہو گی۔ چھ سات ماہ کا فرق ہو سکتا ہے۔ سر ایلیجا کے چہرے سے رعب و متانت ٹپک رہی ہے۔ کشادہ پیشانی ہے۔ گفتگو آہستہ آہستہ کرتا ہے —— وارن ہیسٹنگز کا بچپن کا دوست رہ چکا ہے۔ اس لیے دونوں میں کافی بے تکلفی ہے —— اس وقت رات کا پہلا پہر ہے۔ کمرہ شمعدانوں کی روشنی سے منور ہے ——

صوفے کے پاس تپائی پر ایک فائل کھلا پڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہیسٹنگز ابھی ابھی اس کی ورق گردانی کرتا رہا ہے۔)

**امپی** : لیکن مجھے حیرت ہے۔ تمھاری کونسل کے یہ تین ارکان تمھارے خلاف کیوں ہیں؟

**وارن ہیسٹنگز** : بے وقوف ہیں۔ ان کی مخالفت سے مجھے جو نقصان پہنچے گا۔ وہ تو پہنچے گا ہی۔ ہندوستان میں برطانوی پالیسی بھی کامیاب نہیں ہو سکے گی

ایمپی : تمہارے خلاف انھوں نے سارے کاغذات کمپنی کے حوالے کر دیئے ہیں۔

وارن ہیسٹنگز : کارروائی شروع ہو چکی ہے۔ مگر میں بھی اس مردود برہمن کے خلاف ہتک عزت کا دعوےٰ کرنے والا ہوں۔

ایمپی : ضرور کرو۔ اگر اس سے بہتر کوئی صورت ہو سکے تو وہ بھی کرو۔

وارن ہیسٹنگز : اس سے بہتر بھی ایک صورت ہے۔

ایمپی : کیا؟

وارن ہیسٹنگز : ایک سنگین اخلاقی جرم میں اس برہمن کو قانون کے حوالے کر دینا چاہیے۔

ایمپی : کیا ایسی صورت ہو سکتی ہے ہیسٹنگز؟

وارن ہیسٹنگز : یقیناً ———— اور میں اس کی تمام تیاریاں مکمل کر چکا ہوں۔ اور اسی سلسلے میں تمھیں آج بلایا ہے۔

ایمپی : مجھے تفصیل بتاؤ۔

وارن ہیسٹنگز : (فائل کو ہاتھ میں لے کر) یہ فائل میں نے اسی مقصد کے لیے حاصل کی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے کلکتے کے ایک جوہری نے اس راجہ کے خلاف جعل سازی کی نالش کی تھی۔ اس وقت میں نے مداخلت کر کے اس مقدمے کو دبا دیا تھا

ایمپی : تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟

وارن ہیسٹنگز : میں اُسے ممنونِ احسان کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنے مقاصد کیلئے اسے استعمال کر سکوں۔ اس شخص کا لوگوں میں بڑا رسوخ ہے اور ظاہر ہے ایسے لوگ ہمارے بہت کام آ سکتے ہیں۔

ایمپی : ذرا تفصیل بتائیے۔

وارن ہیسٹنگز : واقعہ یوں ہے کہ کلکتے کے ایک صراف بلاقی داس نے ۱۷۶۹ء میں اپنے وارثوں اور قرض خواہوں میں جائداد کی تقسیم کی وصیت کی تھی اور اس کا مختار نامہ ایک جوہری موہن پرشاد کے نام لکھا گیا تھا۔ بلاقی داس کی موت کے بعد نند کمار نے ایک جعلی تحریر تیار کر کے بلاقی داس کی بیوی سے اڑتالیس ہزار

ایک سو اکیس روپے وصول کرنا چاہیے۔ حالانکہ وصیت نامہ میں نند کمار کا صرف دس ہزار کا قرضہ لکھا ہوا تھا۔ چنانچہ موہن پرشاد نے اس کے خلاف جعل سازی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ ابھی مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ میں نے مداخلت کرنی ضروری سمجھی اور نند کمار بری کر دیا گیا۔

امی : نند کمار کا اپنا بیان کیا تھا ؟

وارن ہیسٹنگز : وہ کہتا تھا کہ یہ رقم دس ہزار کے علاوہ ہے ——— اور بلاقی داس نے بقائمی ہوش و حواس اپنے دستخطوں کے ساتھ مجھے یہ تحریر کر دی تھی۔

امی : تمہارا خیال ہے کہ موہن پرشاد یہ مقدمہ سپریم عدالت میں دائر کر دے گا۔

وارن ہیسٹنگز : یقیناً ——— میں نے سب کام مکمل کر لیا ہے۔

امی : اس تحریر کا کوئی گواہ بھی تو ہو گا۔

وارن ہیسٹنگز : اگر موہن پرشاد کو دوبارہ مقدمہ چلانے کی ترغیب دی جا سکتی ہے۔ تو اس کے گواہ کو راہ راست پر نہیں لایا جا سکتا۔

امی : ضرور لایا جا سکتا ہے۔

( دروازے کا ریشمیں پردہ ہٹا کر لیڈی ہیسٹنگز آتی ہے۔ بیس تیس سال کی عمر کی خوبرو عورت ہے۔ چہرہ نہایت دلکش ہے۔ پلکیں لمبی لمبی اور ہونٹ باریک ہیں۔ آنکھوں اور ہونٹوں پر ہر وقت ایک دلفریب مسکراہٹ چھائی رہتی ہے ——— لیڈی ہیسٹنگز دروازے میں رک کر مسکراتی ہے۔ ابھی اس کی نظر سراج‌الدولہ؟ امی پر نہیں پڑتی )

وارن ہیسٹنگز : ابھی نہیں ڈارلنگ ——— !

لیڈی ہیسٹنگز : اوہ ! (مڑنے لگتی ہے یکایک امی کو دیکھ کر) ہیلو امی۔

امی : ہیلو ——— سیر سے واپس آ گئیں۔

لیڈی ہیسٹنگز : ابھی ابھی آئی ہوں ——— اچھا آپ کام کیجیے۔ گڈ نائٹ !

**ایمی** : گڈ نائٹ ۔

(بڑی ہیسٹنگز چلی جاتی ہے)

**وارن ہیسٹنگز** : ڈیئر ایمی امید رکھو۔ چند دن کے بعد یہ کیس پیش ہو جائے گا۔

**ایمی** : اگر ایسا ہو جائے تو نتیجہ بہت اچھا ثابت ہو گا۔

**وارن ہیسٹنگز** : ایسا ہو گا اور ضرور ہو گا۔

**ایمی** : (دائیں ہاتھ کی مٹھی بھینچ کر) اگر جعل سازی کا جرم ثابت ہو جائے تو یہ کمینہ برہمن زندہ نہیں رہے گا۔ اطمینان رکھو۔

**وارن ہیسٹنگز** : مجھے ہر طرح اطمینان ہے۔

**ایمی** : آل رائٹ (اٹھ بیٹھتا ہے) گڈ نائٹ ۔

**وارن ہیسٹنگز** : گڈ نائٹ!

(ایمی جانے لگتا ہے۔ وارن ہیسٹنگز دروازے تک اس کے ساتھ جاتا ہے۔ ایمی کے جانے کے بعد وہ واپس آتا ہے۔ فائل پر سرسری نظر ڈالتا ہے اور صوفے میں نیم دراز ہو جاتا ہے) (اسکرین کے قریب بارول آتا ہے ـــــــ ہیسٹنگز اسے دیکھتا ہے)

**وارن ہیسٹنگز** : کیوں ؟

**بارول** : آگیا ہے۔

**وارن ہیسٹنگز** : گڈ (Good)

(وارن ہیسٹنگز کمرے سے نکل آتا ہے۔ بارول چند لمحے توقف کرتا ہے۔ جب وارن ہیسٹنگز دوسرے دروازے سے نکل جاتا ہے تو واپس جاتا ہے۔ وقفے کے بعد واپس آتا ہے تو اس کے ساتھ

موہن پرشاد بھی ہے۔ موہن پرشاد لمبے قد کا سادہ آدمی ہے نہ دکاندار
کی طرح دھوتی اور قمیض پر ملبوس ہے۔ چہرہ اس قسم کا ہے کہ اس
پر کسی قسم کا اثر نمایاں نہیں ہے۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی
بارول موہن پرشاد کو کرسی پر بٹھا رہتا ہے۔ اور خود اس کے سامنے
دوسری کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ موہن پرشاد کرسی پر بیٹھتے ہوئے دو
ڈبے جنھیں وہ اٹھائے ہوئے کمرے میں آتا ہے۔ تپائی پر رکھ دیتا ہے )

بارول : آپ کو پہلے کبھی لیڈی ہیسٹنگز سے ملاقات کا موقعہ نہیں ملا۔

موہن پرشاد : جی نہیں !

بارول : عجب بات ہے۔ انھیں تو ہیروں اور جواہرات کا بے حد شوق ہے۔ کلکتے کی شاید کوئی ایسی جوہری کی دکان
ہوگی۔ جہاں وہ نہ گئی ہوں۔

موہن پرشاد : کئی مرتبہ میرا دل چاہا کہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی چیزیں پیش کروں ——— مگر اس خیال
نے روک دیا کہ شاید وہ پسند ہی نہ کریں۔

بارول : آپ کے پاس خاص چیز کیا ہے ؟

موہن پرشاد : ہار۔

بارول : ہار تو انھیں بے حد پسند ہیں۔

موہن پرشاد : پھر تو مجھے افسوس ہے کہ اب تک ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

بارول : خیر کوئی بات نہیں۔

( لیڈی ہیسٹنگز آتی ہے۔ اسے آتے دیکھ کر دونوں کھڑے ہو جاتے
ہیں۔ لیڈی ہیسٹنگز موہن پرشاد کے سامنے بیٹھ جاتی ہے )

بارول : لیڈی ہیسٹنگز یہ ہیں کلکتے کے مشہور جوہری موہن پرشاد۔ کل انہی کا ذکر ہو رہا تھا۔

لیڈی ہیسٹنگز : (NICE) مجھے افسوس ہے۔ اس سے پہلے کبھی آپ کو بلا نہ سکی۔ دراصل مجھے آپ کی خبر ہی نہیں تھی۔

بارول : یہ خود کہہ رہے ہیں کہ کئی مرتبہ میرا دل اپنی چیزیں پیش کرنے کے لیے چاہا۔ مگر اس خیال نے روک دیا کہ شاید لیڈی ہیسٹنگز پسند نہ کریں۔

لیڈی ہیسٹنگز : اچھی چیز مجھے کیوں نہ پسند ہوگی (موہن پرشاد سے) آپ لے آئے ہیں ہار ؟

موہن پرشاد : جی ہاں ! ملاحظہ فرمائیے۔

(تپائی سے ڈبہ اٹھاتا ہے۔ اسے کھولتا ہے اور ہار نکال کر لیڈی ہیسٹنگز کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)

لیڈی ہیسٹنگز : BEAUTIFUL

بارول : پسند ہے آپ کو۔

لیڈی ہیسٹنگز : اور بھی دکھایئے

(نام بھول جاتی ہے)

بارول : ان کا نام موہن پرشاد ہے۔

لیڈی ہیسٹنگز : (خاص انداز سے مسکرا کر موہن پرشاد کی طرف دیکھتے ہوئے) مسٹر موہن پرشاد۔

موہن پرشاد : بہت بہتر۔

(موہن پرشاد دوسرے ڈبے سے ہار نکال کر لیڈی ہیسٹنگز کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)

لیڈی ہیسٹنگز : (بہت اچھا) یہ ہمیں پہلے سے بھی زیادہ پسند ہے۔

بارول : دونوں پسند ہیں آپ کو !

لیڈی ہیسٹنگز : ہاں دونوں پسند ہیں۔

بارول : تو انھیں ضرور خرید لیجئے۔

لیڈی ہیسٹنگز : ضرور ضرور مسٹر موہن پرشاد آپ کو جب کبھی آنا ہو ——— فوراً آجایا کیجئے ——— میں ان دونوں ہاروں کو خرید لوں گی ——— دو لاکھ ٹھیک ہے قیمت ———

موہن پرشاد : (گھبرا کر ـــــ اُسے اپنی قیمت کا کبھی تصور تک بھی نہیں ہو سکتا تھا) جی!

(لیڈی ہیسٹنگز بے اختیار ہنس پڑتی ہے)

بارول : موہن پرشاد! تم خوش نہیں ہو گیا؟

موہن پرشاد ۔ (بے اختیار ہاتھ جوڑ کر) بہت خوش ہوں۔

لیڈی ہیسٹنگز : آپ آئندہ بھی آتے رہیں گے نا؟

موہن پرشاد : جی حضور۔ خدمت میں حاضر ہوتا رہوں گا! آپ نے

(اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اپنے جذبات کا اظہار کس طرح کرے)

ضرور آتا رہوں گا۔

بارول : مسٹر موہن پرشاد! یہ نند کمار آپ کا عزیز ہے کیوں؟

موہن پرشاد : جی ہاں! مگر عرصہ ہوا۔ ہمارے تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔

لیڈی ہیسٹنگز : بہت چالاک آدمی ہے۔

موہن پرشاد : جی ہاں! آج کل گورنر جنرل کو بدنام کر رہا ہے۔

بارول : یہ شخص تمہارا بھی دشمن ہے۔

موہن پرشاد : جی ہاں!

بارول : دشمنی کی وجہ کیا ہے؟

موہن پرشاد : یہ شخص چاہتا ہے کہ بلاقی داس اسے اپنی جائداد کا مختار بنا دے۔ مگر اس نے اپنی وصیت میں مجھے مختار نامہ دے دیا۔

لیڈی ہیسٹنگز : یہ شخص ہر شریف آدمی کا دشمن ہے۔ ہاں مسٹر پرشاد تم نے اس کے خلاف مقدمہ بھی کیا تھا؟

موہن پرشاد : کیا تھا۔ مگر کچھ نہ ہو سکا۔ گورنر جنرل نے دخل دے کر اسے بچا لیا۔

لیڈی ہیسٹنگز : ایسے شخص کو تو کبھی نہیں بچانا چاہیے تھا۔

بارول : میں بتا دوں مسٹر موہن پرشاد! کلکتے میں جو نئی عدالت عالیہ قائم ہوئی ہے۔ آپ اس پر اس عدالت میں

مقدمہ دائر کر دیں۔

**موہن پرشاد** : (ہچکچاتے ہوئے) جی!

**لیڈی ہیسٹنگز** : یہ عدالت یہاں جیسی عدالت نہیں ہے آپ ضرور مقدمہ جیت لیں گے۔

**بارول** : ہمارا مشورہ یہی ہے۔

(بارول لیڈی ہیسٹنگز کی طرف خاص انداز سے دیکھتا ہے۔
لیڈی ہیسٹنگز تپائی پر سے رومال ہٹا دیتی ہے۔ تپائی پر نوٹوں کے
بنڈل پڑے ہیں)

**لیڈی ہیسٹنگز** : یہ لیجئے۔

**موہن پرشاد** : (خوشی سے چہرہ سرخ ہو گیا ہے) شکریہ!

**بارول** : مسٹر موہن پرشاد! بہتر ہے کہ آپ مقدمہ دائر کر دیں۔ آپ کو ضرور کامیابی ہوگی ——— یہ آپ کا بھی دشمن ہے ——— ہر شریف آدمی کا دشمن ہے۔ ضرور مقدمہ دائر کیجئے۔

**موہن پرشاد** : ضرور کروں گا۔

**لیڈی ہیسٹنگز** : ادتعینس (یک لخت اپنی غلطی کا احساس کر کے) مسٹر پرشاد! آپ آئندہ بھی آتے رہیں گے نا؟

**بارول** : (جلدی سے) ضرور آتے رہیں گے۔

**موہن پرشاد** : کیوں نہ آؤں گا۔ یہ تو میرا فرض ہے آپ بہت ہی اچھے اور مہربان ہیں۔

**لیڈی ہیسٹنگز** : (مسکرا کر) اور یہ آپ کا نندکمار تو ہمیں بہت برا ثابت کر رہا ہے۔

**موہن پرشاد** : بے وقوف ہے۔ کمینہ کہیں کا

**بارول** : مسٹر موہن پرشاد! ہندوستان میں جہاں تم جیسے نیک اور اچھے آدمی ہیں وہاں نندکمار جیسے غیر ذمہ دار لوگ کیوں ہیں۔

**لیڈی ہیسٹنگز** : ہمیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اسی کو نقصان ہوگا۔ بھلا لوگ ہمیں جانتے نہیں۔ ہم کیوں رشوت لیں گے؟

بارول : جعل سازی خود کرتا ہے۔

لیڈی ہیسٹنگز : ایسے آدمی کو سزا ملنی چاہئے۔

موہن پرشاد : ضرور ملے گی۔ میں دوبارہ مقدمہ دائر کروں گا۔

لیڈی ہیسٹنگز : اور کیا۔ ایسی بری باتیں کرکے خواہ مخواہ ہندوستانیوں کو بدنام کر رہا ہے۔

موہن پرشاد : نواب مجھے اجازت دیجئے۔

لیڈی ہیسٹنگز : اچھا۔

(موہن پرشاد نوٹوں کے بنڈل اٹھانے لگتا ہے۔ لیڈی ہیسٹنگز
بارول کی طرف مسکرا کر دیکھتی ہے۔)

O

# تیسرا منظر

(کلکتے کی عدالتِ عالیہ ——— جولائی کا آخری ہفتہ

گرمی لوپڑے شباب پر ہے )

اپنی مخصوص کرسیوں میں عدالتِ عالیہ کے چاروں جج بیٹھے ہیں۔
چاروں کے سروں پر "وِگ" ہیں، درمیان میں "سرایلیجا امپی" ہے
دائیں جانب ہائڈ اور چیمبرس ہے اور بائیں طرف لیمیسٹر کرے
میں چاروں طرف لوگ کھڑے ہیں جو بڑی بے تابی سے سرایلیجا
امپی" کی طرف دیکھ رہے ہیں جو فیصلہ لکھ رہا ہے۔
مجرموں کے کٹہرے میں نندکمار کھڑا ہے۔ نندکمار کے چہرے پر
تھکاوٹ اور اضمحلال نمایاں ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کے
رُعبِ جلال میں کوئی فرق نہیں آیا۔
لوگ سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔
اور ساتھ ساتھ بے چینی سے چیف جج کو دیکھتے بھی جاتے ہیں
اس طرح چند لمحے گزر جاتے ہیں۔ سرایلیجا امپی قلم ہاتھ سے رکھ
دیتا ہے۔
"سنو سنو" "دیکھو" "خاموش" کہتی ہوئی آواز بلند ہوتی ہے
سرایلیجا امپی میز پر ہاتھ مارتا ہے )

سرایلیجا امپی: خاموش حضرات!

(مکمل خاموشی چھا جاتی ہے )

اس مقدمے کو شروع ہوئے کئی دن گزر چکے ہیں۔ عدالت نے اس
کے ہر پہلو پر پوری طرح غور کیا ہے۔ کلکتے کے جوہری موہن پرشاد نے
کلکتے کے سابق صوبیدار نند کمار پر یہ الزام لگایا ہے کہ نند کمار نے
اڑتالیس ہزار ایک سو اکیس روپے کے لیے جعلی دستاویز
تیار کی ہے۔ نند کمار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ
یہ دستاویز اصلی ہے اور اس پر متوفی بلاقی داس کے جو دستخط
ہیں وہ جعلی نہیں ہیں۔ یہ مقدمہ آج سے ساڑھے تین سال پہلے
ایک مقامی عدالت میں جا چکا ہے مگر اس کا فیصلہ نہیں ہوا تھا
——— اس عدالت میں یہ مقدمہ دوسری مرتبہ دائر
کیا گیا ہے۔ —— عدالت نے ہر ممکن طریقے سے اس
مقدمے پر غور کیا ہے اور عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے۔ کہ
موہن پرشاد نے نند کمار پر جو الزام لگایا ہے۔ وہ درست ہے
نند کمار فی الواقع جعل سازی کا مرتکب ہو چکا ہے انگلستان
میں اس جرم کی سزا موت ہے۔ عدالت اسی سزا کا یہاں اعلان
کرنے پر مجبور ہے۔

"نند کمار۔ عمر ساٹھ سال۔ ذات برہمن کو جعل سازی کے جرم
میں پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔"

یہ الفاظ سنتے ہی لوگوں کی ایسی کیفیت ہو جاتی ہے۔ جیسے وہ
زلزلے کا جھٹکا محسوس کر رہے ہوں۔

نند کمار کا چہرہ یک لخت ہلدی کی طرح زرد پڑ جاتا ہے۔ اس
کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں اور وہ سہارا لینے کے لیے کٹہرے

سُنو تھام لیتا ہے ـــــــ دو چار لمحوں کے بعد وہ اپنے

آپ پر قابو پا لیتا ہے لوگوں کی شعوری کیفیت جاگنے لگتی ہے

انھیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا۔ وہ ایک دوسرے کی طرف مستفسرانہ

دیکھتے ہیں ” واقعی یہ فیصلہ ہو گیا ہے“ ـــــــ واقعی ایسا

ہو گیا ہے؟

دو چار لمحے اور گزر جاتے ہیں ـــــــ

” پھانسی کی سزا۔ جعل سازی کی سزا موت“ ـــــــ اور

اسی قسم کے فقرات بلند ہو رہے ہیں۔ سر ایلیجا فیصلے کے کاغذ

سے نگاہیں ہٹا لیتا ہے۔ سرسری طور پر لوگوں کو دیکھتا ہے۔

ایک لمحے کے لیے پھر خاموشی چھا جاتی ہے ـــــــ اس کے

بعد وہی الفاظ کہتی ہوئی رُکی رُکی، گھٹی گھٹی آوازیں اُبھرنے

لگتی ہیں۔

نند کمار کا جھکا ہوا سر، سر ایلیجا کی طرف مڑتا ہے۔ اُس کی

آنکھیں اب سُرخ ہیں۔ گردن اکڑی ہوئی ہے۔ لوگ خاموش ہو کر

بڑی بے تابی سے اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں )

**نند کمار**: مسٹر ایلیجا۔ میں نے اپنی موت کا فیصلہ سُن لیا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ قانون کا فیصلہ نہیں ہے ( آواز میں جوش

بڑھتا جا رہا ہے ) یہ انصاف کا فیصلہ نہیں۔ بلکہ گورنر جنرل کے انتقام کا فیصلہ ہے ـــــــ گورنر جنرل

اور چیف جسٹس کی سازش کا فیصلہ ہے۔

**سر ایلیجا**: مجرم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس قسم کی باتیں کرنا فضول ہیں۔ قانون اور انصاف نے جو فیصلہ کیا ہے

ـــــــ عدالت نے اسی فیصلے کا اعلان کر دیا ہے۔

**نند کمار**: تم اسے انصاف کہتے ہو ـــــــ؟ اگر یہ انصاف ہے تو دنیا میں ناانصافی کس چیز کا نام ہے؟

سرایلیجا: عدالت نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ مجلس برخاست ہوتی ہے۔

(اٹھنے لگتا ہے)

نندکمار: مجھے جو کچھ کہنا ہے۔ وہ ضرور کہوں گا۔

(لوگوں کا شور "سنو" "سنو" کی آوازیں)

سرایلیجا: یہ عدالت ہے کوئی تماشہ نہیں ہے۔

نندکمار: اب تک جو کچھ ہوا ہے۔ اس کی حیثیت کٹھ پتلیوں کے تماشے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے

مجھ جیسے مالدار شخص کے خلاف اتنی حقیر رقم کے لیے جعل سازی کا مقدمہ کرنا تماشا نہیں تو اور کیا ہے:

اب تک جتنے لوگ یہاں آکر بولتے رہے ہیں وہ صرف کٹھ پتلیاں تھے۔ جو گورنر جنرل اور اس کے ساتھیوں کے

اشاروں پر ناچتے رہے ہیں۔ اس سارے کھیل ــــــ اس سارے تماشے کا مقصد صرف یہ تھا کہ گورنر

جنرل کے مخالف کو راہ سے ہٹا دیا جائے ــــــ اُسے کسی طرح ختم کر دیا جائے اور آج یہ مقصد پُورا

ہو گیا ہے۔ ــــــ موہن پرشاد اور اس جیسے دوسرے کمینے اور ذلیل فطرت لوگوں کو جن کاموں کے

لیے رشوت دی گئی تھی، وہ کام ختم ہو گیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں آج ہی نندکمار کے خلاف جعلسازی کا مقدمہ

چلانے کی کیوں ضرورت پیش آئی جب ایک مرتبہ مقامی عدالت نے اسے داخل دفتر کر دیا تھا۔ تو پھر اتنے

عرصے کے بعد اسے زندہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ضرورت صرف یہ تھی کہ گورنر جنرل اپنے مخالف کو موت

کے حوالے کر کے اپنی مخالفت کے طوفان کو دبا دینا چاہتا تھا۔ اور میری موت کے بعد مخالفت کا یہ طوفان خود بخود

دب جائے گا۔ مگر گورنر جنرل کو معلوم ہونا چاہیئے کہ چیف جسٹس کے فیصلہ صادر کرنے کے بعد یہ مقدمہ ختم نہیں

ہو جاتا۔ ــــــ یہ مقدمہ دوبارہ ہوگا ــــــ میری موت کے بعد ہوگا۔ اور اس وقت

ہوگا جب میرے ہم وطن تم لوگوں کو ــــــ تم سفید چمڑی والے مکار تاجروں کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔

اس وقت تمھاری جگہ مجرموں کے کٹہرے میں ہوگی۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مجرم نندکمار نہ تھا جس کے

خلاف جعلسازی کا مقدمہ کیا گیا تھا بلکہ وارن ہیسٹنگز اور سرایلیجا امپی تھے جنھوں نے سازش کر کے ایک بے گناہ

کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا تھا ــــــ تم نے میرے وطن میں چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح لوٹ کھسوٹ

مجارہی ہے۔ یہ لوٹ کھسوٹ آج جاری ہے کل جاری نہیں رہے گی۔ وقت آنے پر تمہیں اس طرح اس زمین سے نکال دیا جائے گا جس طرح چوروں اور ڈاکوؤں کو گھر سے نکال دیا جاتا ہے ---- آج تمہیں موقع ملا ہے۔ ظلم پہ ظلم کرتے جاؤ --- بے گناہوں کو پھانسی پر لٹکاتے رہو ---- اور ہم میں پھوٹ ڈال کر فائدہ اٹھاتے رہو --- مگر وہ وقت آنے والا ہے جب یہی لوگ جنھیں تم بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک رہے ہو --- تمھیں مکار، غاصب اور لٹیرا سمجھ کر -- یہاں سے چلے جانے پر مجبور کر دیں گے ---- تم مجھے مار کر بھی نہیں مار سکو گے ---- میں مر کر جیوں گا جی جی کر مروں گا۔ ---- !

(لوگوں کا ہجوم بے قرار ہو جاتا ہے۔ فضا میں آوازیں گونجنے لگتی ہیں

"یہ ظلم ہے ---- یہ زیادتی ہے ---- اپنا فیصلہ بدلو ----")

(سراجا ایبی کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے)

(ہانڈ جلدی سے اٹھ کر میز پر ہاتھ مار کر لوگوں کو خاموش ہونے کے لیے کہتا ہے)

(شور تھم جاتا ہے)

**ہانڈ** : حضرات! عدالت اس فیصلے پر غور کرے گی۔

("کب کب" کا شور ہونے لگتا ہے)

**ہانڈ** : (میز پر ہاتھ مار کر) چند دن تک آپ مطمئن رہیں

سپاہی گنہگار کے گرد حلقہ ڈال دیتے ہیں وہ بڑے وقار اور تحمل کے ساتھ قدم اٹھانے لگتا ہے جب تک وہ دروازے سے باہر نہیں نکل جاتا۔ لوگ طرح طرح کے فقرے کستے رہتے ہیں۔ گنہگار جب دروازے سے باہر نکل جاتا ہے تو سراجیا ایبی اور دوسرے جج بھی روانہ ہو جاتے ہیں لوگ ابھی تک کھڑے ہیں

# چوتھا منظر

جیل خانے کا بلند آہنی اور مقفل دروازہ۔ دروازے کے سامنے لوگوں کا ہجوم

## دن

۵ اگست بروز ہفتہ ۱۸۷۵ عیسوی

## وقت

صبح کے سات بجنے میں کچھ منٹ باقی ہیں۔ روشنی پوری طرح پھیلی نہیں۔ فضا میں گھٹن اور بوجھل پن۔ ہوا رک رک کر چل رہی ہے۔ بہت آہستہ جیسے شکستہ پا ہو۔ ہجوم میں مرد بھی ہیں، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ سب دروازے کے سامنے کھڑے ہیں۔ سب کے چہروں پر غم و ملال کے گہرے اثرات چھائے ہوئے ہیں۔

عورتیں رو رہی ہیں۔ اور بچے ان کی دیکھا دیکھی۔ حالات کا اندازہ کیے بغیر سر جھکائے اس طرح خاموش کھڑے ہیں جیسے ان کے معصوم دلوں پر غم و الم کا پہاڑ آ پڑا ہو —— نگاہیں بار بار آہنی دروازے کی طرف اٹھتی ہیں۔ اور پھر خود بخود جھک جاتی ہیں۔ ہجوم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کا اضطراب بھی بڑھتا جا رہا ہے۔

سرگوشیوں کی گھٹی گھٹی کیفیت میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک عورت کے رونے کی آواز بلند ہو جاتی ہے۔ اور اس کے

ساتھ ہی ایک اس قسم کی آواز آنے لگتی ہے۔ جیسے بہت سی عورتیں
ایک ساتھ سسکیاں بھر رہی ہیں ——————
مکمل سکوت پھیل جاتا ہے۔ کلاک کی آواز اس بوجھل سکوت میں
ڈاب ڈاب کر اُبھر رہی ہے۔ اُبھر اُبھر کر ڈوب رہی ہے۔
ہجوم میں اضطراب کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جیسے
سمندر کی سطح پر طوفان برپا ہو جائے۔ سب دروازے کی طرف
بھاگتے ہیں ——— مرد، عورتیں، بچے ——— سب کے
سب دروازے کے دونوں پٹ ایک دوسرے سے جدا ہونے
لگتے ہیں۔
غم و اندوہ کی بجائے اضطراب اور بے چینی چھا گئی ہے۔ دل
دھڑک رہے ہیں۔ آنکھیں پھیل گئی ہیں اور فضا پر ایک اضطراب
انگیز سکوت مسلط ہے۔
سپاہی لوگوں کو پیچھے ہٹاتے ہیں ——— مگر ہجوم ہے کہ پیچھے
ہٹنے کا نام نہیں لیتا
"پیچھے ہٹ جاؤ" ایک سپاہی للکارتا ہے۔ مگر ہجوم کے
اضطراب اور جوش میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یکلخت سب کے سب
اپنی جگہ پر رک جاتے ہیں۔ سانس رک گئے۔ نگاہیں دروازے کے اندر
جم گئے بے حس و حرکت۔ سنگھار دروازے پر آتا ہے۔ اس کے
چہرے پر ایک ایسا جلال اور ایک ایسی عظمت نمایاں ہے کہ دیکھنے
والے فرطِ احترام سے بے اختیار نگاہیں جھکا لیتے۔ اس کی
کشادہ پیشانی پر فکر و ملال کا ہلکا سا غبار بھی نہیں ہے آنکھوں

جو سرخی جھلک رہی ہے اور اس نے اس کے چہرے کے جلال میں
اور اضافہ ہو گیا ہے
لوگوں پر ایسی مرعوبیت طاری ہو گئی ہے کہ سب رونا دھونا
بھول گئے ہیں۔ خاموش کھڑے ہیں۔ کسی کو یہ احساس نہیں ہے
کہ کیا ہونے والا ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔
نند کمار قدم اٹھاتا ہے ـــــــ ایک عورت روتی ہوئی
آتی ہے اور اس کے قدموں میں گر پڑتی ہے۔ نند کمار اٹھاتا ہے
عورت سسکیاں بھرنے لگتی ہے۔
نند کمار مجمع کی طرف دیکھتا ہے اور اپنے صاف خلوص سے
لبریز اور بلند آواز میں کہنے لگتا ہے۔)

نند کمار: تمہیں رونا نہیں چاہیے ـــــــ تم کیوں رو رہی ہو۔ اس لیے کہ میں مر رہا ہوں ـــــــ میں مر رہا ہوں۔ ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے ـــــــ میں ہمیشہ گناہ بے گناہی کا داغ بن کر داراں ہیسٹنگز اور ایسی ہی پیشانیوں پر نمایاں رہوں گا۔ (آواز میں جوش) میں آج گوشت پوست کا انسان نہیں ہوں۔ بلکہ ایک آدرش ہوں۔ اجنبی قوت کی ناانصافی ظلم اور لوٹ کھسوٹ کو مٹانے والا آدرش ہوں۔ یہ آدرش زندہ رہے گا ـــــــ نند کمار زندہ رہے گا۔ اپنے راستے پر چلتے جاؤ اور مجھے خوشی خوشی اپنی راہ پر جانے دو۔

(لوگوں کی نگاہیں اس کے پُر عظمت اور باوقار چہرے پر جمی ہیں سب کے سب سانس روکے بت بنے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔
نند کمار دونوں ہاتھوں کو ہوا میں اس طرح لہراتا ہے جیسے کہہ رہا ہو مجھے جانے کے لیے راستہ دو۔ لوگ درمیان میں راستہ بنا دیتے ہیں۔

ایک بچہ آتا ہے اور اس کی ٹانگ سے لپٹ جاتا ہے۔ یہ نند کما
کا پوتا ہے۔ نند کمار اسے گود میں اٹھاتا ہے۔ پیار کرتا ہے۔
اور اسے اس کی سسکیاں بھرتی ہوئی ماں کی گود میں دے دیتا ہے۔
— نند کمار چلا جا رہا ہے — چٹان کے تختے
کی طرح قدم اٹھا رہا ہے بغیر رکے۔ بغیر لغزش کے۔ اس
بہادری کے ساتھ گویا موت کی طرف نہیں نئی زندگی حاصل کرنے
جا رہا ہے۔ — آہ و زاری بلند ہو رہی ہے۔ چیخیں بلند
ہو رہی ہیں۔ عورتیں فرط صدمہ سے نڈھال ہو کر گر رہی ہیں
بچے۔ بال نوچ رہے ہیں۔

فضا میں سسکیوں سے چیخوں سے ایک ہنگامہ برپا ہے —
اور رونے والوں کے درمیان چیخنے والوں کے قریب نند کما
اسی ہمت، جرات کے ساتھ قدم اٹھائے جا رہا ہے جس ہمت
جرات کے ساتھ اس نے کونسل کے سامنے گورنر جنرل کے
خلاف رشوت کا الزام لگایا تھا

O

# پانچواں منظر

اُسی دن

ساڑھے نو بجے

( وارن ہیسٹنگز کا ڈرائنگ رُوم )

( کمرے میں وارن ہیسٹنگز، سر ایلیجا امپی اور لیڈی ہیسٹنگز ایک میز کے گرد کوچ پر بیٹھے ہیں۔ میز پر شراب کی بوتلیں اور پیگ نظر آتے ہیں۔ دورِ شراب جاری ہے۔ تینوں کے چہروں پر فتحمندانہ مسرت کی سُرخی نمایاں ہے۔ )

وارن ہیسٹنگز ۔ ( خالی پیگ رکھ کر دوسرا پیگ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے ) اس ملک میں ہماری پالیسی کبھی ناکام نہیں ہو سکتی۔

امپی : اس میں کیا شک ہے۔

وارن ہیسٹنگز : یہ پاگل اس پالیسی کو نہیں سمجھ سکے ـــــ بالکل فول ( FOOL )

امپی : اس سے بہتر پالیسی اس ملک کے لیے ہو ہی نہیں سکتی۔ دو آدمیوں کو لڑا دو اور پھر ان کے ہاتھوں میں بندوقیں دیدو۔ جو مر جائے گا وہ موت کے قبضہ میں چلا جائے گا اور جو نڈھال ہو کر آسرا ڈھونڈے گا وہ یقیناً ہمارے قبضہ میں آجائے گا ( EXCELLANT POLICY )

( دُوسرا پیگ اٹھاتا ہے )

لیڈی ہیسٹنگز : MIRACLE

( ہنس پڑتی ہے )

امپی : اس معاملے میں لیڈی ہیسٹنگز نے کافی اہم پارٹ ادا کیا ہے۔

وارن ہیسٹنگز : (لیڈی ہیسٹنگز کی طرف محبت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) ( VERY NICE WOMAN

(بارول آتا ہے۔ اس کا چہرہ کسی قدر فکر مند ہے)

ایمی : ہیلو! مائی ڈیر بارول! اتنی دیر سے کیوں آئے تم؟

وارن ہیسٹنگز : مر گیا اچی برہمن۔

(غصے میں پیگ پرے جھٹک دیتا ہے)

بارول : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) عجیب واقعہ!

لیڈی ہیسٹنگز : بارول بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

بارول : میں ساری زندگی میں نہیں بھول سکتا۔ بلا کا بہادر انسان۔

وارن ہیسٹنگز : (پیگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے) چھوڑو اب اس قصے کو۔ مر گیا نا وہ بدمعاش۔

بارول : مر گیا۔ مگر کس جرأت ——— کس بہادری کے ساتھ ——— میں اس کی موت کے واقعہ کو کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ میں جیل سے پھانسی کے میدان تک اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کے چہرے پر گھبراہٹ نہیں دیکھی

ایمی : بہت خوفناک انسان تھا ——— ایسے شخص ملکوں میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔

وارن ہیسٹنگز : (تیزی سے پیگ حلق میں انڈیلتے ہوئے) DAMN

ایمی : ہمیں ایک بہت بڑے اور خطرناک دشمن سے نجات ملی ہے۔

بارول : آپ کچھ بھی کہیں۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس جیسا بہادر انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا موت سے وہ ڈرتا نہیں تھا۔ پھانسی کے تختے کی طرف اس طرح قدم اٹھا رہا تھا جیسے جیسے موت کی طرف نہیں زندگی کی طرف جا رہا ہے۔ نہ تو اس کی ٹانگوں کو لغزش ہوئی اور نہ ہی اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ جیسا تھا ویسے کا ویسا رہا سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے اس نے بیٹے کو گلے سے لگایا اور بے خوف، خطرات اور پرجوش لہجے میں بولا۔ میری تعلیم اور تمام ہندوستانیوں کو یہی وصیت ہے کہ ان سفید چمڑی والے ڈاکوؤں کو جلد سے جلد اپنے ملک سے نکال دو۔

**وارن ہیسٹنگز** : (غصّے سے خالی پیگ پرے پھینکتے ہوئے) باغی ۔

**بارول** : یہ کہتے ہوئے جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں سرخی دوڑ گئی ۔ جیسے کبھی ہوئی آگ یکلخت بھڑک اُٹھے ۔ اسے ہم سے نفرت تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہندوستان میں ہمارا سب سے بڑا دشمن تھا میں چاہتا تھا کہ اسے جلدی جلدی ختم کر دیا جائے ۔ مبادا اس کے الفاظ اس نازک موقع پر لوگوں میں بغاوت کی آگ لگا دیں ۔

**وارن ہیسٹنگز** : ابھی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی بیسیوں نند کماروں کی ضرورت ہے ۔

**بارول** : اس نے آخری وقت بھی کہا تھا "میں مر نہیں رہا ۔ میں مر مر کر جیوں گا جی جی کر مروں گا" اور اس کے بعد اس نے بیٹے کو رخصت کر دیا ۔ بیٹے کا بُرا حال تھا ۔ رنج و غم میں وہ اس قدر نڈھال ہو گیا تھا کہ اس سے ایک قدم بھی نہ اٹھایا جاتا تھا ۔ اس کا جسم لرز رہا تھا ۔ کئی لوگوں نے اسے سنبھالا اور لے کے جانے لگے مگر نند کمار اسی طرح کھڑا رہا جس طرح کھڑا تھا ۔ اس نے کمزوری کا اظہار نہ کیا ۔ وہ اپنے آپ کو شہید سمجھ رہا تھا اسے کامل یقین تھا کہ اس کی موت شہادت ہوگی اور وہ ہمیشہ زندہ رہے گا ۔ اس نے خود اپنی پشت پر ہاتھ رکھ دیئے ۔ جب اس کے ہاتھ باندھ دیئے گئے تو اس کے چہرے پر سیاہ کپڑا باندھا جانے لگا ۔ اس نے سیڑھیوں پر چڑھتے وقت کسی سہارے کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ اس وقت بھی اس کی ٹانگوں میں لغزش نہ ہوئی ۔ اس وقت میں اپنے اندر ایک عجب کیفیت محسوس کر رہا تھا ۔ میں اس کی بہادری سے متاثر تھا یا کسی اور جذبے سے ۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ سولی کا تختہ ہٹانے کے دو ایک منٹ بعد لاش زمین پر آ پڑی میرے دل میں بڑی خواہش تھی کہ اس کا مردہ چہرہ دیکھوں ۔ مگر میں نہ دیکھ سکا ۔ ۔ ۔ لاش فوراً جلانے کے لیے برہمنوں کے حوالے کر دی گئی ۔

**لیڈی ہیسٹنگز** : (متاثر ہو کر) BRAVE MAN

**وارن ہیسٹنگز** : (بدستور غیر متاثر حالت میں) جل گئی لاش

**بارول** : ہاں !

(شور سنائی دیتا ہے)

**امپی** : یہ کیسا شور ہے ؟

**پارول** : شاید وہ لوگ ہیں۔

( کھڑکی کی طرف جاتا ہے اور نیچے دیکھنے لگتا ہے )

**وارن ہیسٹنگز** : کون سے لوگ ؟

**پارول** : ( ادا سی کر ) وہ لوگ احتجاج کر رہے ہیں۔

**امپی** : ( گھبرا کر ) زیادہ لوگ ہیں ؟

**وارن ہیسٹنگز** : احتجاج کرنے آگئے ہیں پاجی

**لیڈی ہیسٹنگز** : ( گھبرا کر ) وہ کیا کریں گے ——— وہ کیا کرنے آگئے ہیں !

**وارن ہیسٹنگز** : ( مطمئن لہجے میں ) کوئی فکر نہ کرو — سب ٹھیک ہو جائے گا ——— سب کچھ ٹھیک ہے ——— بے فکر ہو کر پیجیے ——— شراب دل کھول کر پیجیے۔ ہمیں نکالنے کے لیے ایک نندکمار نہیں ہزاروں نندکماروں کی ضرورت ہے۔ ہزاروں نندکمار مریں گے جب کہیں جا کر انگریز قوم ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہوگی۔ آج ایک نندکمار — مقابلے میں ہزاروں موہن پرشاد موجود ہیں .... اور ہماری کامیابی یہی ہے کہ ہم موہن پرشادوں کی تعداد میں اضافہ کرتے جائیں۔ ——— دوستو! مزے سے پیتے جاؤ۔ مزے سے پیتے جاؤ۔

( وارن ہیسٹنگز پیگ اٹھا کر منہ سے لگاتا ہے۔ پارول، امپی اور لیڈی ہیسٹنگز اس کی طرف دیکھ رہے ہیں ———

شور بڑھتا ہے )

O

ناصر شمسی

○

## کردار

ابّا جان
امّی جان
اکبر
اصغر
صفیہ

رضیہ
احسن
اسماء
نیلم
عبدل

ایک عورت

## زمانہ

۶ ستمبر ۱۹۴۷ء تا ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء

# پہلی مد   پہلا منظر

(سول لائن، دہلی کی ایک کوٹھی۔ ہفتہ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کی صبح ساڑھے آٹھ بجے کچھ دیر ہوئی ہے۔ ڈرائنگ روم۔ بائیں جانب دروازہ ہے اور کھڑکی۔ یہ سامنے کے برآمدے میں کھلتے ہیں۔ عقب میں بائیں طرف ایک دروازہ ہے جو گیلری میں کھلتا ہے۔ اس دروازے کے پیچھے ایک اور دروازہ نظر آتا ہے جو کھانے کے کمرے میں کھلتا ہے۔ عقب میں دائیں طرف کونے میں انگیٹھی ہے۔ دائیں جانب وسط میں ایک دروازہ ہے جو سونے کے کمرے میں کھلتا ہے۔

ڈرائنگ روم بہت کشادہ ہے۔ صوفہ سیٹ کا بڑا صوفہ عقب کی دیوار کے متوازی رکھا ہے اور دو صوفے دائیں جانب کے دروازے کے دونوں جانب ایک زاویے سے رکھے ہیں۔ ایک گدے دار کرسی بائیں جانب کونے میں رکھی ہے۔ بڑا لیمپ بڑے صوفے کے پیچھے بائیں جانب رکھا ہے۔ جوگی نما نیچی سی میز بیچ میں رکھی ہے۔ بخاری پر آرائش کا کچھ سامان رکھا ہے۔ عقب کی دیوار اور بائیں جانب کی دیوار کے ساتھ ۴ فٹ اونچے شیشہ لگے بک کیس رکھے ہیں جو کتابوں سے پُر ہیں۔ ان کے اوپر بھی کتابوں کے سیٹ خوشنما بکسوں میں رکھے ہیں۔ فرش پر ایرانی قالین بچھا ہے۔ دروازوں پر پردے آویزاں ہیں۔ بائیں جانب کے دونوں طرف پیتل کے خول میں اسٹینڈ پر گملے رکھے ہیں جن میں سدا بہار، منی پلانٹ کے پودے لگے ہیں۔ عقب کی دیوار پر ایک بڑی روغنی تصویر ہے اور دائیں جانب دیوار پر ایک چھوٹی سی روغنی تصویر۔ یہ ڈرائنگ روم منہ سے بول رہا ہے۔ اس کوٹھی میں رہنے والے بہت باحیثیت آدمی ہیں۔

اکبر بڑے صوفے سے ٹیک لگائے ٹانگیں پھیلائے قالین پر بیٹھے ہیں۔ اکبر کی
عمر چالیس سال کے قریب ہو گی۔ ایک موٹی عینک لگائے کسی کتاب کا مطالعہ
کر رہے ہیں۔ کچھ کتابیں صوفے پر پڑی ہیں کچھ فرش پر۔ (اکبر کچھ مستقل مزاج ہیں۔
بائیں جانب سے باہر بجری پر کسی موٹر کار کے آنے کی آواز آتی ہے)

**اکبر** : (آواز دیتا ہے) دیکھو کس کی موٹر آئی ہے باہر ... عبدل!

(عقب میں کمرے سے دائیں سمت سے امی جان کی آواز آتی
ہے جس میں نصیحت کی تاثیر ہے اور نخرے کی چاشنی جو عمر کی زیادتی
کی وجہ سے بے اثر ہو چکی ہے۔ یہ آواز قدم بہ قدم نزدیک
آتی ہے)

**امی جان** : (آواز) عبدل بازار سامان لانے گیا ہوا ہے۔ آٹھ بجے شہر میں کرفیو ختم ہوتا ہے۔ اسی وقت تازہ ترکاری
وغیرہ بھی آتی ہے اور دکانیں بھی کھلتی ہیں۔ دس بجے پھر کرفیو شروع ہو جائے گا۔

(امی جان داخل ہوتی ہیں۔ پچپن سال کی ضعیفہ ہیں لٹھے کا تنگ پاجامہ
ململ کا سفید دوپٹہ اور کسی صوفیانے رنگ کا کرتہ جس پر کسی دوسرے مناسب
رنگ کی سوتی صدری پہنے ہیں۔ کلائیوں میں سونے کے سادے کڑے اور چوڑیاں
ہیں اور کانوں میں پرانی وضع کی سونے کی بالیاں۔ سیدھی مانگ اور کسی ہوئی چوٹی ہے
رنگ بالکل صاف ہے اور آنکھیں بڑی۔ ناک اونچی اور پتلی ٹھوڑی۔ دانت
کثرت سے پان کھانے کی وجہ سے کتھئی ہو چکے ہیں۔ ایک کلا ان کا بیٹھا رہنے
کی وجہ سے ذرا اکڑ گیا ہے۔ بدن کبھی گول تھا لیکن اب عام طور پر بیٹھے رہنے
جو فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے رہنے کی عادت اور فراغت کا نشان دیتا ہے
چہرے پر بیزاری کی ایک مستقل کیفیت ہے جو زمانے کی ہر کروٹ کے ساتھ
بڑھتی رہی ہے)

**امّی جان:** (سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے) میں نے بس ابھی آٹھ بجتے ہی اسے سائیکل دے کر بھیج دیا ہے تاکہ کرفیو شروع ہونے سے پہلے تمام چیزیں خرید کر واپس آجائے۔

**اکبر:** (حیرت سے) تو کیا ابھی سے آٹھ بھی بج گئے؟

(بائیں جانب سے صفیہ داخل ہوتی ہے۔ زردی مائل صاف رنگ ہے۔ قد لمبا ہے۔ اور بدن تیلا۔ چہرہ بھی لمبا اور پتلا ہے۔ اس پر بڑی اور بالکل سیاہ آنکھیں اور بھی زیادہ بڑی معلوم ہوتی ہیں۔ آنکھوں کے گرد ہلکے ہلکے سیاہ گڑھے ہیں۔ صفیہ کی عمر پچیس ۲۵ سال کی ہوگی۔ لیکن پہلی نظر میں تو نازک سی نوجوان لڑکی معلوم ہوتی ہے ریشمی لباس ہے۔ ڈھیلے پاجامے کا کسی ہلکے رنگ کا جوڑا۔ ہلکا ہلکا زیور۔ ہاتھ گلے اور کانوں میں ہے۔ ہاتھ میں لیڈیز PURSE ہے)

**صفیہ:** آداب بھائی جان! آٹھ بجے آدھ گھنٹے سے زیادہ بھی ہوگیا۔

(پرس بائیں جانب کرسی پر رکھ دیتی ہے)

**اکبر:** (خوشی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے) تو یہ تمھاری موٹر آئی تھی صفیہ؟

**صفیہ:** جی ہاں! ——— آداب امّی جان!

**امّی جان:** جیتی رہو بیٹی ——— تمھارے میاں بھی ساتھ آئے ہیں؟

**صفیہ:** جی ہاں! (بائیں دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ ہیں تو۔

(احسن خوش وضع وجیہہ مرد ہے۔ عمر پینتیس سال ہوگی۔ لباس انگریزی ہے۔ سفید پتلون اور (MANILA) شرٹ۔ بلبل کو آگے آگے لیے آتا ہے۔ تبسم پانچ سال کی لڑکی ہے۔ ریشمی فراک پہنے ہے رنگ اور خد و خال بھی ماں صفیہ جیسے ہیں اور بدن لمبا

اندر دوں ہے )

**احسن** : آداب بھائی جان !

**اکبر** : (مسرت سے) ارے بھئی احسن ! آج تو بہت سویرے آپہنچے !

**احسن** : اور آپ اس وقت بھی کتابوں میں گھرے بیٹھے ہیں۔ آپ نہیں اب سمیٹ لیجیے۔ اب یہ تعلیم کی سے نا (تسلیم سے) چچا جان کو آداب عرض کیجیے — — اور ہاں دیکھیے چچا جان کی کسی کتاب کا آج کوئی صفحہ نہ پھاڑنا ۔۔۔

( صغر کی دائیں جانب سے آواز آتی ہے )

**اصغر** : (آواز) ارے یہ تو احسن بھائی کی آواز آرہی ہے

**احسن** : (بآواز بلند) جی ہاں ! اسماء بھی ساتھ آئی ہیں۔

**اصغر** : (خوشی سے) اچھا ! معاف کیجیے میں شیو (SHAVE) کر رہا ہوں۔ ابھی آیا۔

( بائیں جانب کے دروازے سے اسماء داخل ہوتی ہے۔ سترہ سال کی لڑکی ہے۔ خوبصورت۔ بالکل معصوم اور بہت شگفتہ۔ ڈھیلے پائجامے کا ریشمی جوڑا پہنے ہے۔ مناسب زیور۔ زیب بدن ہے۔ سر پہ نگی سبز کی جالیدار ہاکٹ جس میں ٹانکنے کے لیے کپڑے ہیں۔ دونوں ہاتھوں میں اٹھائے ہے )

**اسماء** : آداب !

**امّی جان** : جیتی رہو ۔ — — ہاتھ میں یہ کیا اٹھائے ہو ؟

**صفیہ** : امّی جان ! اسماء کو آپ ڈھیلے پاجامے کے پائنچے پر گوکھیرد کی رکمیت بھول ٹانکنی بتا دیجیے۔ یہ اپنا زعفرانی جوڑے کا پاجامہ ساتھ لائی ہیں۔

**امّی جان** : ہاں ہاں ! ضرور اور اب تو یہ میری ہونے والی بہو ہیں۔ یہ جو کچھ کہیں۔ میں کروں گی۔

**احسن** : (ہنس کر) آج کل تو گھر میں رات دن جہیز کے جوڑوں کی باتوں کے علاوہ کوئی اور آواز سنائی ہی نہیں دیتی۔ صفیہ اور اسماء کو جہیز کی باتوں کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں ہے۔

**صفیہ** : شادی کی تاریخ تو قریب آ رہی ہے۔

**امّی جان** : صفیہ! چلو اندر چلو میرے ساتھ ناشتہ منوا لو ذرا۔

**صفیہ** : اچھا امّی جان۔

**احسن** : چچی جان! ہم ناشتہ کر آئے ہیں۔ آپ تکلیف نہ کیجئے۔

**امّی جان** : اچھا چائے کی ایک پیالی اور پی لینا۔ تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

**احسن** : (ہنس کر) بہت اچھا ——— صفیہ! ہماری اس گڑیا کو بھی ساتھ لے جاؤ۔

**صفیہ** : نیلم میرے ساتھ اندر چلو!

**احسن** : صفیہ دیکھو۔ تمھارے پیچھے پیچھے اسماء بھی آ رہی ہیں۔ انھیں ذرا نظروں میں رکھنا۔ انھیں صفدر بھائی سے باتیں کرنے کا بہت شوق ہے۔

(ہنستا ہے)

**اسماء** : (روٹھی ہو کر) دیکھ لیجئے! بھابھی جان! آپ بھائی جان کو منع کیجئے۔

**صفیہ** : وہ غریب تمھاری اس چھیڑ کی وجہ سے یہاں آ نہیں رہی تھی۔ بس آتے ہی تم نے اسے ستانا شروع کر دیا۔

**احسن** : اچھا بھئی میں معافی چاہتا ہوں۔

(امّی جان، صفیہ، نیلم اور اسماء عقب کے دروازے سے گیلری میں دائیں جانب چلی جاتی ہیں)

**اکبر** : میں یہ کتابیں سمیٹ لوں ذرا تم بیٹھو!

**احسن** : (بیٹھ جاتا ہے) آج کل کس موضوع پر مطالعہ کر رہے ہیں؟

**اکبر** : (کتابیں سمیٹتے ہوئے) بھئی موضوع تو کیا کہا جائے اسے۔ ذرا طبیعت کی تفریح کے لیے تاریخ کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ ابھی ۱۵ اگست کو ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب دہلی کے قلعہ معلی پر ہندوستان کا نیا ترنگا جھنڈا لہرایا تو دل چاہا کہ معلوم کروں کہ اس سے پہلے دہلی پر کون سے جھنڈے لہرائے ہیں اور گزشتہ دو ہزار سال میں کس کس کی حکومت کی راجدھانی بنی رہی ہے۔ اسی سلسلے میں ابھی ورق گردانی کر رہا تھا۔

**احسن** : ۱۸۵۷ء سے تو یہاں یونین جیک لہرا رہا ہے۔ اس سے پہلے چار پانچ صدیوں تک مسلمانوں کی دستاروں کے جھنڈے لہراتے رہے۔ اس سے پہلے یہاں ہندوؤں کا راج تھا ——— آپ اس پر ایک مقالہ لکھیے بہت دلچسپ ہوگا۔

**اکبر** : کوئی سنجیدہ کام تو ابھی مشکل ہے جب تک میں اپنی کتاب کا مسودہ پورا نہ کر لوں۔

**احسن** : اکبر کے دینِ الٰہی پر!

**اکبر** : ہاں مسودہ تو پورا ہو چکا۔ نظرِ ثانی باقی ہے (کتابیں اٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔) اچھا میں کتابیں رکھ آؤں ذرا۔

**احسن** : جی ہاں!

(اکبر عقب کے دروازے سے گیلری میں دائیں طرف جاتا ہے اور چند لمحے بعد واپس آتا ہے)

**اکبر** : ہاں بھائی احسن! شہر کی کچھ تازہ تازہ خبریں تو سناؤ۔

**اصغر** : (دائیں جانب سے آواز) ذرا اونچی آواز سے احسن بھائی۔

**احسن** : اگر سننا چاہتے ہو تو یہاں آ جاؤ۔

(اصغر دائیں جانب کے دروازے سے ڈریسنگ گاؤن پہنے کندھے پر تولیہ ڈالے داخل ہوتا ہے۔ منہ پر شیو کا صابن کہیں کہیں لگا ہے۔ اچھی شکل کا تیئیس ۲۳ سالہ نوجوان ہے)

**اصغر** : سنائیے!

**اکبر** : تمہارے چہرے پر شیو کا صابن لگا ہوا ہے۔

**اصغر** : (تولیے سے صاف کرتے ہوئے) اوہ! معاف کیجئے گا۔ اب صاف ہو گیا؟

**اکبر** : ہاں!

**اصغر** : احسن بھائی! اگر آپ ذرا اونچی آواز سے سنا دیتے تو کچھ حرج تھا۔

**احسن** : ہاں! میں نہیں چاہتا، ہماری عورتیں یہ خبریں سنیں۔ صفیہ کا دل بہت کمزور ہے۔ میں نے اسی لیے انھیں کچھ

نہیں بتایا ہے۔

اکبر : تو کیا شہر کی حالت بہت خراب ہے؟

احسن : نہیں شہر کی حالت زیادہ خراب نہیں۔ شہر میں مسلمان اور ہندو الگ الگ محلوں میں بستے ہیں اور اپنے اپنے محلوں میں بالکل محفوظ ہیں اور پھر شہر میں زیادہ وقت کرفیو رہتا ہے۔

اکبر : کرفیو نے تو زندگی اجیرن کر دی ہے۔

احسن : کاروبار بالکل بند ہے۔ شہر میں کرفیو کی وجہ سے میں خود دکان پر تمام وقت نہیں رہ سکتا۔ آج آٹھ دن سے کناٹ پلیس کی میری دکان بند پڑی ہے۔ میں گھر میں بند بیٹھے بیٹھے اکتا گیا۔ سول لائنز میں کرفیو نہیں ہوتا۔ اس لیے آج یہاں چلا آیا کہ یہاں گھوم پھر سکوں گا۔ شام کو نئی دہلی جاکر چائے بھی وینگر WANGER میں پی سکتے ہیں۔ اسماء اپنے جہیز کے جوڑوں کے لیے کچھ ریشمی کپڑا بھی خرید لے گی۔ اور اگر جی میں آیا تو کوئی انگریزی فلم بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ صفیہ کا دل بھی بہل جائے گا۔

اصغر : ارادے تو بہت اچھے ہیں۔ تو ہم بھی سمجھیں کہ چائے بھی آج WANGER میں چائے پلائی جائے گی۔

احسن : ضرور تمھارا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ تمھاری پسند کے بغیر اسماء کوئی چیز نہیں خریدتی۔

اکبر : خوب!

احسن : اور انگریزی فلم بھائی صاحب دکھا رہے ہیں؟

اکبر : بہت خوب!

اصغر : (باآوازِ بلند صفیہ کو سناتے ہوئے) آپا جان! آپ ذرا سنیئے تو!

صفیہ : (دور عقب سے آواز آتی ہے) کیا ہے اصغر بھائی۔

(چند لمحے بعد صفیہ عقب کے دروازے سے داخل ہوتی ہے)

اصغر : آج شام کا پروگرام وینگر WANGER میں چائے پھر اسماء اور میں کناٹ پلیس سے کچھ کپڑا خریدیں گے اس کے بعد انگریزی فلم کی ایوننگ شو (EVEING SHOW) دیکھی جائے گی۔

صفیہ : (ہنس کر) میں سمجھتی ہوں کہ اسماء کے آنے کی خوشی میں یہ دعوت تم دے رہے ہو۔

**اصغر** : (ہنس کر) آپ کو آم کھانے سے مطلب ہونا چاہئے۔

**صفیہ** : لیکن تمہارے آم کھانے کو بہت کم ملتے ہیں ۔

(ہنستی ہے)

**اصغر** : (آواز دیتا ہے) رضیہ !

**رضیہ** : (عقب میں دائیں جانب سے آواز) جی اصغر بھائی !

(رضیہ عقب کے دروازے سے داخل ہوتی ہے۔ عمر امیں ۱۹ سال
ہوگی صورت میں صغرا کی بہت مشابہ ہے۔ صفیہ جیسا لمبا قد ہے
اور بدن چھریرا ہے لباس ذرا مسلا ہوا۔ جیسے گھر میں پہنے پہنے
سے ہو جاتا ہے ریشمی شلوار قمیض اور دوپٹہ پہنے ہیں چہرے
پہ دلالت ہے اور صحت کی ظاہر ہوتی ہے )

**اصغر** : آج کوئی اچھا انگریزی فلم چل رہا ہے ؟

**رضیہ** : جی ہاں ! اوڈیون (ODEON) میں ——— میں تو آپ کو بتانے ہی والی تھی اس فلم کو
ضرور دیکھا جائے ۔

**اصغر** : ہم نے تمہارے دل کی بات جان لی (ہنستا ہے) آج شام چلیں گے۔

**رضیہ** : اچھا !

**امی جان** : (عقب سے آواز) رضیہ ! ——— صفیہ بیگم !!

**رضیہ** : اچھا امی جان !

**اصغر** : آپا جان ! آپ اسما کو بھی بتا دیجئے گا یہ پروگرام ۔

**صفیہ** : اسما کو بتانے کی تمھیں ایسی بے قراری ہے تو انھیں بھیج دوں تمہارے پاس ۔

(ہنستی ہے۔ حسن بھی ہنستا ہے)

(صفیہ اور رضیہ عقب کے دروازے سے نکل کر دائیں طرف چلی جاتی ہیں ) .

اکبر : بھئی احسن، کچھ تازہ خبریں تو سنائی نہیں تم نے۔ اخبارات میں دہلی کے فسادات کی خبریں پوری پوری شائع نہیں ہوتیں۔ ریڈیو پر بھی سنائی نہیں جاتیں اور ہم جو شہر کے باہر سول لائنز میں بیٹھے ہیں، انھیں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ دہلی میں کیا ہو رہا ہے۔

احسن : اچھی آواز سے) قرول باغ، پہاڑ گنج اور سبزی منڈی کے علاقوں کی حالت بہت خراب ہے۔

اصغر : (متعجب) واقعی

احسن : کل رات ہمارا محلہ نہیں سویا۔ محلے والے اپنی تمام موٹریں دوڑاتے رہے اور قرول باغ، پہاڑ گنج اور سبزی منڈی کے علاقوں سے مسلمانوں کو نکال کر لاتے رہے۔

اصغر : اس کے معنی ہیں خطرہ زیادہ ہے۔

اکبر : ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

احسن : میں کل رات بالکل نہیں سو سکا۔ صفیہ کی بھی کئی بار آنکھ کھل گئی۔ بار بار موٹر سواریاں اور سامان اتارنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انھوں نے کئی بار پوچھا بھی کہ یہ کیسی آوازیں آ رہی ہیں تو میں نے کوئی بات بنا دی ورنہ ان کی نیند اڑ جاتی۔ صبح ہوتے ہی میں انھیں یہاں لے آیا تاکہ محلہ کی خبریں سن سن کر پریشان نہ ہوں۔

اکبر : یہ تو اچھا کیا تم نے۔

احسن : اب نئی دہلی میں بھی مسلمان خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔

اکبر : وہاں کیا خطرہ ہے؟ وہاں حکومتِ ہند کے ملازمین رہتے ہیں اور وہ سب ذمہ دار آدمی ہیں۔

اصغر : لیکن ابھی گئے مارچ کے مہینے فسادات میں نئی دہلی میں بھی کتنے ہی چاقو زنی کے واقعات ہوئے۔

احسن : یہ ایک امر واقعہ ہے کہ مسلمان نئی دہلی چھوڑ کر امان لینے پرانی دہلی آ رہے ہیں۔

اکبر : بڑے افسوس کی بات ہے کہ ملک میں ہندو مسلم فسادات بہت ہی مہیب اور وسیع پیمانے پر ہو رہے ہیں۔ میں اسے انسانیت کے خلاف فعل سمجھتا ہوں۔ سیاسی اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کو بغیر للکارے اور مقابلہ کا موقعہ دیئے مار ڈالنا بزدلی ہے۔

احسن : اس میں کیا شک ہے۔

**اصغر** : اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ پاکستان کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی ہندو قوم اپنے دل میں مسلمانوں کے خلاف کینہ رکھتی ہے۔

**احسن** : تمہیں کسی کے دل کا حال کیسے معلوم ہو گیا۔

**اصغر** : مسلمان بہت فراخ دل ہے۔ وہ اپنا دکھ اور دوسرے کی برائی بھول جاتا ہے۔ مسلمان کو تقسیم پنجاب اور بنگال کا دکھ ہے اور ہندو کی مسلم دشمنی بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ لیکن پھر بھی مسلمان نے اس کٹے پھٹے پاکستان کو بخوشی قبول کر لیا۔ اور ہندو کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ لیکن ہندو سے پاکستان کا قیام نہیں دیکھا جاتا۔ اس نے پاکستان اسپیشل کو بم سے اڑانے کی کوشش کی۔ پاکستان کے حصے کی مال گاڑی کو لوٹا اور آگ لگا دی۔ ہندو نے زبان اور قلم سے پاکستان تسلیم کیا ہے تاکہ ہم بھولے انگریز کی غلامی کا جوا اپنے گلے سے اتار سکے اور اس کی کوشش پہلے کی طرح اب بھی پاکستان کا بیڑہ غرق کرنا ہے۔

**احسن** : اصغر! ہندو کی مذمت میں تم بہت زیادتی کرتے رہو۔

**اکبر** : میرا خیال ہے ہم یہ باتیں بند کریں۔

**احسن** : بہت اچھا۔

**اصغر** : میں نے شیو ( SHAVE ) کے بعد منہ نہیں دھویا ہے۔ میں ابھی آیا۔

**اباجان** : ( گیلری کے دائیں جانب سے آواز آتی ہے جو قدم بہ قدم نزدیک ہوتی جاتی ہے ) میں نے سنا ہے احسن میاں آئے ہیں۔

( اباجان کی آواز سن کر احسن کھڑا ہو جاتا ہے۔ اکبر بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔ اباجان عقب کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں اباجان ساٹھ سالہ بزرگ ہیں۔ سفید لمبی ڈاڑھی ہے۔ سر پر پٹے ہیں۔ لباس بالکل سادہ اور سفید ہے۔ جو گوشہ سیاہ مخملی ٹوپی سر پر ہے اور ٹانگوں میں شرعی پاجامہ۔ رنگت زردی مائل سفید ہے اور چہرے پر متلی خدوخال بہت واضح ہیں۔ ان کے چہرے پر

ایک سکون ہے ۔ جو وقت کی ہر کروٹ سے بے نیاز ہے )

**احسن** : آداب چچا جان !

**ابا جان** : ( نیچے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ) جیتے رہو۔ اچھی طرح ہو؟

**احسن** : ( بیٹھتے ہوئے ) جی ہاں ۔ آپ کی دعا ہے ۔ صفیہ اور اسما بھی آپ کے آداب کو ساتھ آئی ہیں ۔

**ابا جان** : میں نے ابھی قرآن مجید کا آدھا پارہ ختم کیا تو وہ لوگ میرے پاس آئیں ۔ خداوند کریم سب کو خوش رکھے ۔ ( کچھ لمحے خاموش )
کیوں میاں تمہارا کیا خیال ہے ۔ یہ فساد اب کب ختم ہوں گے ؟

**احسن** : میرے خیال میں اب فساد ہونے کی کوئی وجہ تو نہیں ہے ۔ مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے ملک کی تقسیم کو تسلیم کر لیا ہے ۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ فسادات اب پہلے سے زیادہ شدید ہو رہے ہیں ۔

**ابا جان** : میں نہیں سمجھتا ۔ اب فسادات دو طرفہ ہیں ۔ مسلمان اب فساد نہیں کرے گا ۔ اسے پاکستان مل گیا ۔

**احسن** : ہندو کا طرز فکر اب یہ ہے جو مسلمان پاکستان کے حامی تھے وہ پاکستان جائیں اور ہندوستان میں صرف ہندو اور وہ لوگ رہیں جو نیشنلسٹ ہیں ۔

**ابا جان** : یہ تو بہت زیادتی ہوگی ۔ ہر شخص نہ نیشنلسٹ ہوتا ہے نہ مسلم لیگی نہ کانگرسی ۔ زیادہ تر تو آدمی کسی بھی سیاسی جماعت کے ممبر وغیرہ نہیں ہوتے ۔ اور پھر ملک کی تقسیم ضلعوں کی آبادی میں فرقہ وارانہ اکثریت کے لحاظ سے ہوئی ہے ۔ اس میں تبادلہ آبادی کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا ۔ اگر ہندو قوم کو یہی مقصود تھا تو صحیح حل یہ تھا کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو مشرق و مغرب میں جمع کر کے پاکستان قائم کیا جائے اور تمام ہندوؤں کو مشرق و مغرب سے لا کر ہندوستان میں جمع کر لیا جائے ۔

**اکبر** : ابا جان ! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں ؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ پانچ کروڑ مسلمان جو ہندوستان میں پیدا ہوئے ۔ پلے بڑھے ہوئے ۔ اپنے گھر بار اور وطن چھوڑ کر پاکستان آ جائیں ۔ اتنے وسیع پیمانہ پر تبادلہ آبادی ناممکن ہے ۔

**ابا جان** : اگر ممکن بھی ہو تو ایسا ہو نہیں سکتا ۔ ایک درخت جو اچھی طرح جڑیں پھیلا چکا ہے ۔ اکھاڑ کر دوسری سرزمین میں نہیں لگایا جا سکتا ۔ میں دلی میں پیدا ہوا ۔ یہاں ایک معزز خاندان میں جو ایک خاص تہذیب کا علمبردار ہے پلا اور بڑا ہوا ۔ یہاں کی ہر ایک چیز مجھے بہت مانوس ہے ۔ بہت چیزوں سے میری یادیں وابستہ ہیں میرے

عزیزو اقارب ۔ دوست آشنا سب یہیں ہیں۔ یہاں کے موسم کے سرد و گرم میں میرا بدن اور طبیعت دونوں ڈھل گئے ہیں۔ یہاں کے مناظر میری آنکھوں کی بینائی کے مترادف ہیں۔ اگر جامع مسجد مجھے کچھ دنوں تک نظر نہ آئے تو میری آنکھیں ترس جاتی ہیں۔

(امی جان عقب کے دروازے سے داخل ہوتی ہیں)

**امی جان:** آپ کے لیے انڈا ابالا جائے۔ یا ٹماٹر کا تلا ہوا کھائیں گے؟

**ابا جان:** پہلے آپ یہ بتایئے کہ ناشتہ پر توس ہیں یا روغنی ٹکیاں؟

**امی جان:** میں توس کٹوا چکی تھی۔ اور سکٹ رکھے تھے۔ صفیہ آئیں تو انھوں نے ٹکیوں کے لیے تھوڑے سے آٹے میں روغن ملا لیا۔ آج ٹکیاں بھی ہوں گی اور توس بھی۔

**ابا جان:** اب تو فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ تلا ہوا انڈا ٹکیوں کے ساتھ اچھا لگتا ہے اور توس ہوں تو انڈے کا لطف ابلا ہوا کر آتا ہے۔

**امی جان:** اب بتا بھی چکیں

**ابا جان:** جو تمھاری مرضی۔

**امی جان:** میں انڈا تلوا دیتی ہوں۔ کڑھائی انگیٹھی پر رکھی ہے۔

**ابا جان:** اچھا ذرا بات تو سنیئے۔

**امی جان:** کیا؟

**ابا جان:** کیا خیال ہے بیگم؟ ہم لوگ بھی اب پاکستان چلیں۔

(ہنستے ہیں)

**امی جان:** اے لو۔ یہ تم نے اچھا مذاق نکالا ہے۔ پاکستان چلیں۔ بنا بنایا گھر۔ اپنے عزیز۔ ملنے جلنے اور اپنا شہر چھوڑ کر کیا پاکستان چلے گئے انگریز کے آنے سے پہلے ہم یہاں رہتے آئے تھے۔ اور اب انگریز کے جانے کے بعد بھی یہیں رہتے رہیں گے۔

**رضیہ:** (عقب سے دور سے آواز آتی ہے) امی جان! کڑھائی میں گھی جل رہا ہے۔ جلدی بتائیے ابا جان کے

یہ انڈا نلا جائے گا یا نہیں ؟

**امّی جان** : (جاتے ہوئے) ہاں۔ ستائیس کا تل لو۔

(امی جان عقب کے دروازے سے دائیں جانب چلی جاتی ہیں)

(کچھ لمحے بعد دائیں جانب کے دروازے سے صفیہ آتی ہیں۔ کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ لیکن احتیاط لازم ہے۔ ابا جان اکبر اور حسن کو ایک نظر دیکھتی ہیں۔ اور دائیں جانب صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں)

**اکبر** : (قیافہ شناسی سے) کیا بات ہے صفیہ ؟

**صفیہ** : (متانت سے) اصغر بھائی اور اسماء کی شادی کے لیے جنوری کا مہینہ قرار پایا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ دونوں کو بہت شوق ہے۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ کیوں نہ یہ شادی جلدی کر دی جائے۔

**اباجان** : ہاں ہاں ! ہمیں کیا اعتراض ہے۔ ہم تو لڑکے والے ہیں اور لڑکے والوں کو ہمیشہ جلدی ہوتی ہے۔ تم حسن میاں کو راضی کر لو۔ یہ کام لڑکی والوں کی رضامندی کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے۔

**صفیہ** : میرا خیال ہے کہ بقر عید کے مہینے میں شادی ہو جائے۔

**اکبر** : یعنی نومبر کے مہینے۔

**صفیہ** : ہاں۔

**اکبر** : مجھے تو یہ اصغر کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔ اس نے صفیہ کو پٹی پڑھائی ہے۔

**حسن** : (ہنستا ہے) بہت خوب ! کیوں صفیہ ! بھائی جان ٹھیک کہہ رہے ہیں ؟

**صفیہ** : (مسکراتی ہے) بات تو یہی ہے۔ اصغر میرے سر ہو گیا۔ اب بتائیے۔ میں کیا کہوں اس سے ؟

**حسن** : اسماء کا کیا خیال ہے ؟

**صفیہ** : آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے ہاتھ کی سوئی کس قدر جلدی چل رہی ہے۔ اس کا بس چلے تو راتوں رات اپنا جہیز تیار کر کے بیاہ رچائے۔

**اباجان** : حسن میاں ! اب تمہیں بقر عید کے چاند کے لیے راضی ہو جانا چاہیے۔

**احسن** : اچھی بات ہے، چچا جان!

**صفیہ** : میں جاکر انھیں بتا دیتی ہوں۔

(صفیہ ابھی اٹھنے نہیں پاتی کہ عقب در گیلری سے اسما کی آواز
قدم بہ قدم نزدیک آتی ہے)

**اسما** : صغر بھائی ——— صغر بھائی!

(اسما نیلم کو آگے آگے لیے داخل ہوتی ہے۔ دائیں جانب کے
دروازے سے صغر داخل ہوتا ہے)

**اصغر** : کیا بات ہے؟

**اسما** : نیلم! انھیں بتا دو۔ نانی جان نے کیا کہلوایا ہے؟

**نیلم** : نانی جان کہہ رہی ہیں چائے کی پتی لا دیجیے۔

**اصغر** : (ہنستا ہے) اچھا۔

**اسما** : عیدل بازار گیا ہوا ہے اور چچی جان چائے لانے کے لیے کہنا بھول گئیں۔ آپ ذرا موٹر میں جاکر جلدی سے چائے کا ایک پیکٹ لا دیجیے۔

**اصغر** : کیا اس وقت کے لیے بھی چائے کی پتی نہیں ہے؟

**اسما** : جی نہیں۔

**احسن** : میں موٹر میں جاکر ابھی چائے لا دیتا ہوں۔

(کھڑا ہو جاتا ہے)

**اکبر** : اے بھائی احسن! تم کیوں تکلیف کرتے ہو۔

**احسن** : اس میں تکلیف کی بات ہے۔ صغر نے ابھی رات کے کپڑے نہیں بدلے ہیں۔ میں جاکر لا دیتا ہوں۔

**اسما** : FLOWERY ORANGEPEKOE یا LOPCHO کا ایک پیکٹ لا دیجیے۔

**احسن** : اچھا! میں ابھی لے کر آتا ہوں۔ چلو نیلم میرے ساتھ چلو۔ موٹر کی سیر ہو جائے گی تمھاری۔

**نیلم** : چلئے ابّاجان !

(احسن نسیم کو لے کر دائیں جانب کے دروازے سے باہر چلا جاتا ہے۔ اسمار اندر جانے کے لیے عقبی دروازے کی طرف مڑتی ہے)

**صفیہ** : اسمار !

**اسمار** : جی !

**صفیہ** : میں بھی ساتھ آرہی ہوں۔ (اُٹھ کر اسمار کے ساتھ گیلری میں عقبی دروازے سے جاتے ہوئے) اب تم ذرا جلدی اپنا جہیز تیار کر لو۔ بقر عید کا مہینہ زیادہ دور نہیں۔

**اصغر** : ٹھہریئے اباجان ! میں بھی آرہا ہوں۔

(اصغر جلدی سے صفیہ کے پیچھے عقبی دروازے سے گیلری میں جاتا ہے)

**اصغر** : (گیلری میں سے آواز آتی ہے) میری پیاری آپا جان !

**صفیہ** : اے ہے ! تم بالکل دیوانے ہو گئے ہو اصغر۔

(آواز دور ہو کر غائب ہو جاتی ہے)

(چند لمحے خاموشی۔ اباجان اور اکبر دونوں خاموش لیکن مسرور بیٹھے ہیں)

**اباجان** : آج کا اخبار آیا ہے ؟

**اکبر** : جی نہیں آج بھی اخبار والا اخبار نہیں لایا۔

**اباجان** : کسی نے ریڈیو پر بھی خبریں سنیں ؟

**اکبر** : رضیہ سن رہی تھیں (آواز دیتا ہے) رضیہ ! ———— رضیہ !!

**رضیہ** : (گیلری کے دوسرے سِرے سے آواز آتی ہے) کیا ہے بھائی جان ؟

**اکبر** : تم نے صبح ریڈیو پر خبریں سنی تھیں ؟

**رضیہ** : (گیلری میں آواز قدم بہ قدم نزدیک ہوتی جاتی ہے) جی ہاں۔ دہلی شہر میں کرفیو کے اوقات وہی ہیں جو پہلے تھے۔ (داخل ہوتی ہے) قرول باغ۔ پہاڑ گنج اور سبزی منڈی کے علاقوں میں بھی اڑتالیس ۴۸ گھنٹے کا

کرفیو لگ گیا ہے۔ وہاں کئی جگہ آگ لگی اور کئی کوٹھیاں اور دکانیں لوٹ لی گئیں۔

(گیلری کے عقبی حصّے سے امّی جان کی آواز آتی ہے)

**امّی جان :** (آواز) رضیہ!

**رضیہ :** (با آواز بلند) آئی امّی جان! (جاتے ہوئے)

**اکبر :** (نیچی آواز سے) رضیہ!

**رضیہ :** جی بھائی جان!

(رک جاتی ہے)

**اکبر :** (نیچی آواز سے) شہر کے فسادات کی خبریں ابھی ابّا جان اور امّی جان کو نہ سنانا۔ وہ گھبرا جائیں گی۔

**رضیہ :** بہت اچھا۔

(عقبی دروازے سے دائیں جانب گیلری میں چلی جاتی ہے)

**ابّا جان :** رات کو میں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ ایک سیاہ جنگل سے ہزاروں اور لاکھوں بھیڑیے نکلے۔ ان کی سرخ آنکھیں۔ ان کے سیاہ رنگ پر شعلوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔ ان کے لمبے لمبے پنجے چمک رہے تھے۔ وہ انسانوں کے خون کے پیاسے تھے۔ انھوں نے لاکھوں کی تعداد میں آکر دہلی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جب رات ہوئی۔ سب طرف اندھیرا چھا گیا۔ تو ان کی سرخ آنکھیں انگاروں کی طرح چمکیں۔ ایک دم سے جھپٹے۔ اور ان کے تیز پنجے انسانوں کے گوشت میں پیوست ہوگئے۔ رات کی خاموشی میں انسانوں کی چیخیں اور بھیڑیوں کی خونخوار بھیانک آوازیں ہر طرف سنائی دینے لگیں۔ ان بھیڑیوں کے پیچھے گیدڑ آئے اور مجروح اور مُردہ انسانوں کو گھسیٹ کر اپنے بھٹوں میں لے گئے۔ —————— کتنا بھیانک خواب تھا؟

**اکبر :** آپ چونکہ فسادات کی خبریں سنتے رہتے ہیں۔ اس لیے آپ کے ذہن میں بربریت کے حملے کا خوف چھپا رہتا ہے یہ خوف رات کو خواب بن کر آپ کو نظر آیا۔

**ابّا جان :** رات یہ خواب دیکھ کر آنکھ کھل گئی۔ خوف و ہراس محسوس ہوا۔ نہایت شدید۔ اس وقت بھی میرے سر

میں سخت درد ہے۔

(عقبی دروازے سے رضیہ اور صغریٰ داخل ہوتے ہیں دونوں گھبرائے

ہوئے ہیں)

رضیہ: بھائی جان! عبدل بازار سے واپس آیا ہے وہ بہت گھبرایا ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ شہر میں چوبیس گھنٹے کا کرفیو لگ گیا ہے۔ طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی ہیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ سکھ اور ہندو مسلمانوں پر حملہ کر رہے ہیں۔ سول لائنز میں پاری سڑک کے شروع کی مسلمانوں کی کوٹھی جو تیس ہزاری سے لگی ہوئی ہے۔ اس پر سکھوں اور ہندوؤں نے حملہ کیا۔

اکبر: نوکر بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔

رضیہ: نہیں بھائی جان! حقیقت تو ہے ضرور ان کی باتوں میں آپ اُس کی حالت دیکھیئے سٹی گم ہے۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کی کوٹھی لٹتے دیکھی ہے۔

اکبر: تم گھبراؤ نہیں۔ عبدل کو یہاں بھیجو۔ اور تم امی جان اور صفیہ کے پاس رہو۔ انھیں باتوں میں لگائے رہنا تاکہ ادھر نہ آئیں۔ نہ معلوم یہ باتیں سچ بھی ہیں۔

رضیہ: (تنک کر) آپ خود معلوم کر لیجیے۔ میں عبدل کو بھیجے دیتی ہوں۔

(جلدی سے قدم اٹھاتی عقب کے دروازے سے دائیں گیلری میں

چلی جاتی ہے)

اصغر: مجھے حیرت نہیں ہوئی اگر یہ سب کچھ صحیح بھی ہو۔ ——— سکھ پناہ گزینوں کا ایک بڑا کیمپ سبزی منڈی میں ہے اور دوسرا بہت بڑا کیمپ کنگسوے (KINGSWAY) پر ہے مغربی پنجاب سے آئے ہوئے ہندو اور سکھ پناہ گزینوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ یہ لوگ فتنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور کھلے بندوں کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو مار کر یہاں سے بھگا دیں گے۔ مال لوٹ لیں گے۔ ان کی جائیداد، مکان اور دکانوں پر قبضہ کر لیں گے۔ انھوں نے مسلمانوں کے قتل عام کی پوری اسکیم بنا رکھی ہے اور اس کام میں راشٹریہ سیوک سنگھ ان کی مدد کر رہا ہے۔

(عقب کے دروازے سے عبدل داخل ہوتا ہے۔ بہت گھبرایا ہوا ہے
اور سانس سمانہیں رہا)

**عبدل** : (گھبرا کر) میاں صاحب !

**اکبر** : تم اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو عبدل ؟

**عبدل** : میں پہلی کوٹھی کے سامنے سے تیس ہزاری کی طرف آرہا تھا۔ ایک تانگے میں داڑھی والے مسلمان بیٹھے تھے۔ اُن کی بیوی برقع اوڑھے تھیں۔ دو بچیاں اور ایک لڑکا تانگے میں سامنے کی طرف بیٹھے تھے۔ اچھے شریف آدمی تھے۔ برقع بھی ریشمی تھا۔ جونہی تانگہ پہلی کوٹھی کے سامنے آیا۔ دس بارہ سکھوں نے تانگے کو گھیر لیا۔ تانگے والا ہندو تھا۔ وہ تو ہاتھ جوڑتا "شما شما کرتا" تانگے سے اتر بھاگ گیا۔ ایک سکھ نے کرپان نکالی اور مسلمان پر حملہ کرنا چاہا۔ عورت کے منہ سے اللہ اکبر کی آواز ایسے نکلی۔ جیسے کوئی کنوئیں میں سے پکار تا ہو۔ میرے قدموں کی حرکت بند ہو گئی۔ دونوں بچیاں رونے لگیں۔ اور لڑکے نے چیخنا شروع کیا۔ "بچاؤ بچاؤ" اور کئی کرپانیں نکل آئیں اور میری آنکھوں کے سامنے خون خون ہو گیا۔ وہ تو کچھ خدا کی خیر ہوئی کہ گھوڑا اچکا اور بھاگ نکلا۔ میں نے دیکھا کہ تانگے میں سے کئی سوٹ کیس اور ایک بڑا سیاہ ٹرنک سکھوں نے اتار لیا ہے

**ابا جان** : مسلمانوں پر خدا اپنی خیر کرے۔

**عبدل** : بڑے صاحب میرے تو پیر تلے سے زمین نکل گئی۔ میں نے سائیکل لوٹائی اور سوار ہو کر واپس بھاگا۔ نہر سعادت خاں کے پل پر آیا۔ وہاں ایک مسلمان کی لاش پٹری پر پڑی تھی۔ ڈھلان سے اترا تو ایک مسلمان کی دکان کو لٹتے دیکھا۔ فصیل سے باہر آیا تو بہت سے سکھوں اور ہندوؤں کو تیس ہزاری کے میدان میں سے آتے دیکھا راجپور روڈ پہ آیا تو دوسری کوٹھی کے اندر سکھ گھسے ہوئے تھے۔ کوٹھی کے باغ میں بہت سارا فرنیچر جل رہا تھا میں زور زور سے سائیکل چلاتا گھر پہنچا ہوں۔

**اکبر** : اس تمام علاقے میں تمہیں پولیس نظر نہ آئی ؟

**عبدل** : دو سپاہی پہلی کوٹھی کے سامنے کھڑے تھے۔

**اکبر** : انھوں نے آکر سکھوں کو روکا نہیں ؟

**عبدل** : وہ تو کمرشے دیکھتے رہے۔ جب تانگہ بھاگ گیا اور سکھ سامان اٹھانے لیے جا رہے تھے تو سکھوں کے ساتھ وہ سپاہی بھی ترش رہے تھے۔

**اصغر** : (گرم ہو کر) ہندو سپاہی مسلمان کا خون بہنے سے کیوں روکتا۔

**عبدل** : آج تو غدر مچا ہوا ہے۔

**اکبر** : تم گھبراؤ نہیں عبدل۔ جاکر ٹھنڈا پانی پیو۔

**عبدل** : میاں صاحب۔ اگر بلوائی یہاں آگئے تو کیا ہوگا؟

**اکبر** : تم پریشان نہ ہو۔ ہم بندوبست کرتے ہیں۔

**عبدل** : جو حکم سرکار!

(عقب کے دروازے سے گیلری میں چلا جاتا ہے)

**ابا جان** : (گھبرا کر) عبدل ٹھیک کہتا ہے۔ پولیس کو اطلاع کرنی چاہیئے۔

**اکبر** : راجپور روڈ پر پولیس کا تھانہ ہے۔ بلوائی ادھر آئے تو تھانے کے سامنے سے آئیں گے۔ پولیس میں مسلمان سپاہی بھی ہیں۔ وہ ضرور بلوائیوں کو روکیں گے۔

**اصغر** : پولیس کا افسر ہندو ہوا تو وہ کیوں مسلمان سپاہیوں کو بلوائیوں پر گولی چلانے دے گا۔

**اکبر** : پولیس افسر ایسا نہیں کر سکتے۔

**ابا جان** : (خوف کے ساتھ) ذرا سننا۔ کیسی آوازیں ہیں؟

(اکبر اور اصغر دونوں متوجہ ہوتے ہیں۔ کچھ شور سنائی دیتا ہے)

**ابا جان** : (گھبرا کر) ذرا باہر نکل کر دیکھو تو۔ کیسا شور ہے۔ بلوائی تو نہیں آ رہے؟

(اصغر بائیں جانب کے دروازے سے باہر جاتا ہے۔ ابا جان گھبرائے بیٹھے ہیں۔ وہ شور آہستہ آہستہ ساز کے نغمے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ آواز گیلری میں سے آ رہی ہے)

**صفیہ** : (گیلری میں آواز آتی ہے) بھائی جان ریڈیو پر آپ کی پسند کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ ملکہ پکھراج کی گائی

ہوئی غالب کی غزل۔

(ساز کی آواز بلند ہوتی ہے اور گانا سنائی دیتا ہے "کیکس کو

ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے" )

**اکبر** : ابھی یہ آواز ریڈیو کی تھی ؟

**رضیہ** : (گیلری ہی سے ) میں ریڈیو ٹیون کر رہی تھی۔

**اباجان** : (اطمینان کا سانس لے کر ) یا الٰہی تیرا شکر ہے۔

(ریڈیو پر ریکارڈ کی آواز آتی رہتی ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی گیلری

میں بجتی ہے۔ اور رضیہ کی ٹیلی فون پر بات کرنے کی آواز گیلری

میں سے آتی ہے )

**رضیہ** : (گیلری سے آواز ) ہیلو ——— میں بلا آتی ہوں ——— ٹھہریے —— اچھا

فرمایئے۔ ——— آپ ہائی کمشنر کی کوٹھی جا رہے ہیں ———— ٹھہریے تو میں بھائی جان

کو بلاتی ہوں۔ ——— ہیلو ——— ہیلو۔

(ٹیلی فون رکھنے کی آواز آتی ہے اور بھاگتی ہوئی رضیہ عقب کے

دروازے سے اندر آتی ہے )

**رضیہ** : بھائی جان ! آپ کے دوست اسد اللہ صاحب کا ٹیلی فون نئی دہلی سے آیا تھا۔ نئی دہلی میں بلوائی کناٹ پلیس

کی مسلمانوں کی دکانیں اور کوٹھیاں لوٹ رہے ہیں۔ اسد اللہ صاحب گھر کے سب آدمیوں کو لے کر پاکستان

ہائی کمشنر کی کوٹھی گئے ہیں۔ بہت جلدی میں تھے۔ ٹیلی فون پر موٹر کے ہارن کی آواز آئی اور وہ فوراً بھاگے ٹیلی فون

بند کرنا بھی بھول گئے۔

**اکبر** : تم نے ابھی ٹیلیفون بند تو نہیں کیا ؟

**رضیہ** : نہیں !

(اکبر اٹھ کر جلدی سے بیچ کے دروازے سے گیلری میں جاتا ہے۔ وہاں

سے بس کی آواز آتی ہے۔

اکبر : (گیلری میں سے) ہیلو — ہیلو!

(اکبر ٹیلیفون بند کرکے واپس آتا ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہے)

اکبر : ان کی کوٹھی میں بلوائی گھس آئے۔

اباجان : یا الٰہی خیر!

(ریڈیو پر ریکارڈ بجنے کی آواز مسلسل آ رہی ہے)

اکبر : رضیہ!

رضیہ : (خوف سے بمشکل بول سکتی ہے) جی!

اکبر : تم یہیں رہو۔ صفیہ اور امی جان کے پاس مت جاؤ۔ تمہارا رنگ زرد ہو گیا ہے۔

(بائیں جانب کے دروازے سے اصغر آتا ہے)

اصغر : رج (RIDGE) کے پیچھے سے دھواں اٹھتا نظر آ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یونیورسٹی پر حملہ ہوا ہے۔ ابھی میرے سامنے رج (RIDGE) پر سے ایک ملٹری ٹرک آئی جس میں فوج کے سپاہی یونیورسٹی کے مسلمان سٹاف اور طلبا کو نکال کر لائے تھے۔

اباجان : اب تو بلوائی بالکل ہمارے قریب ہیں۔

اکبر : احسن باہر گئے ہوئے ہیں۔ ابھی تک واپس نہیں آئے۔

اباجان : خدا انہیں اپنی حفاظت میں رکھے۔

(باہر بجری پر ایک موٹر اندر آنے کی آواز آتی ہے)

اصغر : شاید آ گئے احسن بھائی!

(جلدی سے بائیں جانب دروازے کے باہر جاتا ہے اور احسن کو آگے آگے لیے داخل ہوتا ہے۔ احسن کا رنگ زرد ہو گیا ہے)

احسن : (گھبرایا ہوا ہے) چچا جان! اب بالکل وقت نہیں ہے۔ فوراً یہاں سے نکل چلیے۔

**اباجان** : (گھبرائے ہوئے) خیر تو ہے؟

**احسن** : (اکبر سے) بھائی جان! ابھی تو موقع ہے کہ نکل کر جانیں بچالیں۔ میں بڑی مشکل واپس آسکا ہوں۔ بلوائی ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ عورتوں کو بلوائیے اور سب کو موٹر میں سے چلئے۔

**اکبر** : (پریشان) یہ کوٹھی، سامان سب چیزیں؟

**احسن** : اس وقت آپ سامان کی فکر کی تو ڈر ہے کہ جانیں بھی نہ بچیں۔

**اکبر** : گھر بار چھوڑ کیسے خالی ہاتھ بھاگ نکلیں۔ کوئی بات بھی ہے؟

**احسن** : (ملتجیانہ) اصغر بھائی! یہ وقت بہت نازک ہے۔ چند منٹوں کی مہلت ہے۔ فوراً نکل چلئے۔ ورنہ پھر ہم سب چوہے کی موت مارے جائیں گے۔

**اصغر** : میں ابھی آتا ہوں۔

(اصغر دائیں جانب دروازے سے اندر جانا چاہتا ہے۔ احسن کو روک لیتا ہے)

**احسن** : کہاں جا رہے ہو اصغر! اصغر!

**اصغر** : (اپنے کو چھڑا کر اندر جانا چاہتا ہے) میں بندوقیں اور پستول نکال کر لاتا ہوں۔

**احسن** : تم سنو تو میری بات (پکڑ لیتا ہے) تم بچپن نہ کرو۔ یہ وقت بہادری دکھانے یا مقابلہ کرنے کا نہیں ہے ہم تین مرد بندوق اور پستول سے کیا کرلیں گے۔ بلوائیوں کے پاس ہتھیار ہیں۔ اور وہ پچاس پچاس سے زیادہ تعداد میں ہیں۔

**اصغر** : لیکن بھاگ کر جان بچانا بڑی بزدلی ہے۔

**احسن** : (ہاتھ جوڑتے ہوئے) خدا کے لئے چچا جان! آپکے پاس نقد روپیہ ہو تو ساتھ لے لیجئے ـــــ بھائی جان آپ عورتوں کا سارا گہنا لے آیئے (دھکیلتے ہوئے) جائیے ـــــ اصغر بھائی! تم گراج سے اپنی موٹر نکالو۔ بیٹی (دھکیلتے ہوئے) جلدی کرو رضیہ۔ تم اپنی اباجان اسما اور امی جان کو بلاؤ اور ہاں سنو۔ انھیں کچھ مت بتانا ـــــ سمجھیں ـــــ اور ہاں عبدل کو ساتھ لو اور سوٹ کیس

٦

میں دو دو جوڑے سب کے رکھ لو۔ جلدی جلدی۔

( یکے بعد دیگرے ابا جان ۔ اکبر اور اصغر جا چکے ہیں۔ اب بھاگتی ہوئی عقب کے دروازے سے صفیہ جاتی ہے۔ حسن کمرے میں اکیلا ہے پریشان۔ اپنے حواس جمع کرتا ہے۔ چند لمحوں بعد گیلری کے دائیں سرے سے امی جان کی آواز قدم بہ قدم نزدیک آتی ہے )

**امی جان:** (آواز) کیا بات ہے۔ ایسی جلدی کی۔

(امی جان داخل ہوتی ہیں پیچھے پیچھے صفیہ اور اسما بھی داخل ہوتی ہیں)

**حسن:** (صفیہ کے قریب جا کر صفیہ کا سر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے تاکہ وہ حسن کی پریشان صورت نہ دیکھ سکے) بتاتا ہوں۔

**امی جان:** (ناراضگی سے) آخر بات کیا ہے؟ بتاؤ؟

**حسن:** آپ کو رشیدہ آپا نے ابھی بلایا ہے۔ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔

**امی جان:** میں ابھی چلوں؟

**حسن:** جی ہاں! اصغر بھائی موٹر نکال رہے ہیں۔

**امی جان:** اچھا تو میں کپڑے تو بدل لوں۔ اور کنجیاں رضیہ کو سنبھلوا دوں۔

**حسن:** کپڑے بدلنے میں دیر ہوگی چچی جان! جلدی کیجئے۔

**امی جان:** ناشتہ تو میز پر رکھا ہے۔ ایک پیالی پی لوں۔ پھر چلتی ہوں۔

**حسن:** چائے آپ رشیدہ آپا کے ہاں پی لیجئے گا۔

**امی جان:** (تنک کر) اسے ہے ایسی بھی کیا جلدی ہے؟

**حسن:** صفیہ! تمہارا (PURSE) کہاں ہے؟

**صفیہ:** میں بھی ساتھ چلوں؟

**حسن:** ہاں ابھی لوٹ آتا۔ اسما تم بھی چلو۔ اپنے ساتھ ٹانکنے کے لیے جو کپڑے لائی تھیں وہ بھی لے چلو۔

**اسما:** اچھا میں بھائی جان کا ———— اور اپنی ٹوکری لے آؤں۔

احسن : جلدی لانا۔

( اسما جلدی سے عقب کے دروازے سے گیلری میں چلی جاتی ہے )

صفیہ : مجھے تو گھبراہٹ ہو رہی ہے۔

احسن : ایک گلاس پانی پی لو ( باآواز بلند ) اسما ایک گلاس پانی لیتی آنا۔

( چند لمحے بعد اسما واپس آتی ہے۔ ایک ہاتھ میں پانی کا گلاس ہے
جو وہ احسن کو دیتی ہے۔ دوسرے ہاتھ میں صفیہ کا پرس اور اپنی ٹوکری۔
احسن صفیہ کو پانی پلاتا ہے۔ باہر سے بلوائیوں کی آوازیں دور سے
سنائی دیتی ہیں۔ یہ آوازیں کوٹھی کے قریب آ رہی ہیں )

صفیہ . ( غل سن کر ) یہ غل کیسا ہے؟

احسن : غل؟ . . . . نہیں غل تو نہیں ہو رہا ــــــــ تمہیں خیال ہو گیا ہے۔

( یکے بعد دیگرے ابا جان گیلری کے دروازے سے جو عقب میں ہے
اکبر دائیں دروازے سے اور اصغر بائیں دروازے سے داخل
ہوتے ہیں۔ ابا جان نے شیروانی پہن لی ہے۔ لیکن ٹوپی کھلے ہیں ان
کے ہاتھ جزدان میں قرآن شریف ہے۔ اکبر کے ہاتھوں میں ایک
کالا بکس ہے )

ابا جان : ( گھبراتے ہوئے ) جلدی کرو جلدی! میں نے قرآن شریف بھی ساتھ لے لیا ہے۔

احسن : بھائی جان! آپنے وہ چیزیں لے لیں؟

اکبر : ہاں! اس بکس میں ہیں۔

اصغر : موٹر نکال لی ہے جلدی چلیئے۔

احسن : امی جان، صفیہ اور اسما سے ) چلیئے چلیئے۔

امی جان: لے ہے۔ ایسی بھی کیا مصیبت ہے مجھے پان کا ٹکڑا ہی کھا لینے دو۔ میرا منہ پھیکا ہو رہا ہے۔

(بائیں جانب کے دروازے سے امی جان، صفیہ، اسما، ابا جان۔
اکبر، صغرا اور محسن جاتے ہیں۔ کمرہ خالی رہ جاتا ہے۔ گیلری میں سے
ریڈیو بجنے کی آواز بدستور آرہی ہے)

(چند لمحے بعد رضیہ آتی ہے۔ گھبرائی
ہوئی ـــــــ بلوائیوں کا غل اب بہت قریب آگیا ہے)

**رضیہ**: (خالی کمرہ پاکر بدحواس ہو جاتی ہے اور چیختی ہے) بھائی جان! ـــــ بھائی جان!! (پلٹ کر گیلری میں آواز دیتی
ہے) عبدل سوٹ کیس جلدی بند کر دو جلدی! (پھر بدحواس ہو کر چیختی ہے) بھائی جان!

**اکبر**: (بائیں جانب باہر سے آواز دیتا ہے) رضیہ۔ عبدل! (بائیں جانب کے دروازے سے بھاگتا اندر آتا ہے) چلو
رضیہ! جلدی سے موٹر میں بیٹھ جاؤ۔ (آواز دیتا ہے) عبدل! عبـــدل!!
(بائیں جانب سے موٹر کے ہارن کی آواز آتی ہے۔ بلوائیوں کی آوازیں
اور بھی زیادہ قریب آگئی ہیں)
(عبدل بھاگتا ہوا سوٹ کیس اٹھائے عقب کے گیلری کے دروازے سے
اندر آتا ہے)

**عبدل**: میں آگیا سرکار!

**اکبر**: جلدی موٹر جا رہی ہے جلدی بھاگ کر بیٹھ جاؤ موٹر میں۔
(بائیں دروازے سے اکبر اور عبدل بھاگ کر باہر جاتے ہیں یکے بعد دیگرے دو
موٹروں کے جانے کی آواز آتی ہے۔ مکان خالی ہے۔ ریڈیو کی آواز گیلری سے
آرہی ہے۔ بلوائیوں کی آوازیں کوٹھی کے اندر سنائی دیتی ہیں۔ بہت غل شور
میں یہ نعرے سنائی دیتے ہیں۔)

**آوازیں**: یہ کس مُسلے سالے کا بنگلہ ہے؟ ـــــ لوٹ لو اسے ـــــ لگا دو آگ! ـــــ کوئی بچ کر
نہ جانے پائے ـــــ مار ڈالو سالوں کو ـــــ مار ڈالو ـــــ لوٹ لو ـــــ لگا دو آگ۔

پردہ

# دوسرا منظر

دلی کے باہر پُرانے قلعہ کی شکستہ فصیلوں کے اندر جنوب مشرقی گوشہ
میں ایک خیمہ ہے۔ ۱۹ر ستمبر ۱۹۴۷ء کی صبح۔ سورج اتنا بلند ہو چکا ہے
کہ اس کی کرنیں خیمہ کے اندر زمین پر تقریباً ۴۵ درجہ کا زاویہ بنا رہی
ہیں۔ خیمہ بالکل چھوٹا ہے۔ خیمہ کے بیچ میں کھڑے ہوئے دونوں بانسوں
کے درمیان ایک میلی سی دری بچھی ہے۔ دائیں جانب داخلہ کے لیے
خیمہ کا پردہ اٹھا ہوا ہے اور اس کے آگے پردے کے بیچ بیچ سے
بیٹھ کے دونوں اُوپر کے کونے خیمہ میں لٹکے ہوئے ہیں۔ بائیں جانب
ایک سوٹ کیس رکھا ہے اور اس پر بید کی ٹوکری رکھی ہے جس کی
جالیوں میں سے ریشمی سنہری کپڑا چمک رہا ہے۔ اور اس کے برابر کالا
بکس رکھا ہے۔

بائیں بانس سے پیٹھ لگائے سفینہ بیٹھی ہے۔ صفینہ کے رنگ پر
زردی کھنڈی ہوئی ہے۔ اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں اب بہت زیادہ
بڑی معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں وحشت اور گھبراہٹ جھلکتی ہے یہ کیفیت
آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کے اور سیاہ ہونے کی وجہ سے اور بھی
زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ امی جان بائیں سوٹ کیس کے پاس بیٹھی ہیں۔
ان کے چہرے پر عمر اب زیادہ معلوم ہو رہی ہے۔ آنکھیں سرخی
مائل ہیں۔ اور سوجی ہوئی۔ جیسے زیادہ رونے کی وجہ سے ہو جاتی ہیں۔
چہرہ بھی کچھ سوجا ہوا اور لٹکا ہوا ہے۔ پان نہ ملنے کی وجہ سے

ہونٹوں کی باچھیں جھک گئی ہیں۔ رضیہ۔ صفیہ کے پاس بیٹھی ہے
وہ اب پہلے سے زیادہ دبلی ہو گئی ہے۔ اس کا چہرہ بالکل بے آب
ہے۔ اس کی بھویں سکڑی رہتی ہیں جیسے کوئی خیال طبیعت کو پریشان
کر رہا ہے۔ ہونٹ اس طرح بھینچے ہیں۔ جیسے کوئی چیز شدت سے
محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن کہنا نہ چاہتی ہو۔ یہ ایک مستقل کیفیت
ہے۔ جو چہرے پر چھائی رہتی ہے۔ اسما دری کے باہر عقب میں
وسط میں بیٹھی ہے۔ چُپ۔ خاموش۔ اب اُنکی معصومیت اور
بھی جان لیوا ہو گئی ہے۔ کیونکہ اس میں حزن و یاس گھل مل گیا ہے
اس کی شگفتگی معدوم ہو چکا ہے۔ لیکن چہرے پر اب بھی آب ہے
اس کی خاموشی کچھ ایسی ہے۔ جیسے وہ خود نہیں جانتی کہ اب کیا کہے
نیلم حجرے کے باہر بیٹھی ہے اس کے بال میلے اور منہ ہاتھ میلا ہے
اس کی آنکھیں گڑھوں میں دھنس گئی ہیں۔ چہرہ اُتر گیا ہے اور
رنگ زرد ہو گیا ہے۔

گھر سے نکلے صرف بارہ دن ہوئے ہیں لیکن ان کی صورتیں دیکھ
کر معلوم ہوتا ہے کہ بارہ سال گذر گئے ہیں۔ پہلی خوش حالی اور
بے فکری کی جگہ اب پریشان حالی اور فاقوں کے نشان چھائے ہوئے
ہیں۔ سب کا لباس میلا ہے۔ اور منہ ہاتھ میلے صرف اسما
اب بھی ریشمی لباس پہنے ہے۔ صرف ایک چیز ان کی سابقہ
خوش حالی کا پتہ دیتی ہے اور وہ زیور ہے۔ جو اب بھی سب
پہنے ہوئے ہیں۔

رضیہ کو کھانسی اٹھتی ہے۔ امی جان ہاتھ بڑھا کر بید کی ٹوکری

اٹھاتی ہیں اور سنہری ساٹن کے ڈھیلے پاجامے کی کھلی گوٹ
پر "دیکھت بھولی" ٹانکنے لگتی ہیں )

**امّی جان** ۔ اسما آؤ۔ اپنے پاجامے کی گوٹ پر "دیکھت بھولی" بنا لو۔ اب تو تھوڑی سی گوٹ باقی رہ گئی ہے
اسے پورا کر لو۔

**اسما** : ( اٹھ کر امّی جان کے پاس آ بیٹھتی ہے ) میں بناتی ہوں۔ آپ دیکھتی رہیں۔ کہ ٹانکنے میں گھوکھرو کو غلط تو نہیں
موڑ رہی۔

**امّی جان** ۔ تم بیٹھ جاؤ میرے پاس۔ ایک دو ٹانکے میں بھر دوں۔

**اسما** : بہت اچھا!

( امّی جان کچھ لمحے ٹانکتی رہتی ہیں )

**امّی جان** : اس پاجامے کے ساتھ پہننے کے کرتے کے دامن پر دو انگلی چکلی بیل ہو۔ اس کے آگے گھوکھرو ٹکے ہوں اور سرے
پر دھنک۔ تب کہیں اس پاجامے کی دیکھت بھولی سے بیل ہوگا۔ دوپٹہ پہ گھوکھرو کے پھول ٹکنے چاہئیں۔
اور آنچل پہ بیل۔ گھوکھرو اور دھنک ٹکے۔ میں نے ایسے خوبصورت گھوکھرو کے پھول فتح پوری پر سراج الدین
گوٹے والوں کی دکان پر دیکھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گیندے کا باغ کھلا ہوا ہے اور تمہارے رنگ پر تو یہ جوڑا
ایسا کھلتا کہ کیا کہنے !

**اسما** : اس پاجامے کے ساتھ کے کرتے اور دوپٹہ کا کپڑا تو گھر ہی رہ گیا !

**امّی جان** : مجھے کیسا ارمان تھا کہ اپنے اصغر کی دلہن بیاہ کر گھر لاؤں۔

**صفیہ** : اسما بے چاری جہیز بناتے بار بار مجھ سے کہتی کہ کسی فقیر کی دعا ہے کہ اس کا کوئی کام پورا نہیں ہوتا۔ میں یونہی
ہنس کر ٹال دیتی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ غریب کا یہ جوڑا یوں ٹنگ کر رہ جائے گا۔

**امّی جان** : ( بھرائی ہوئی آواز میں ) یہ لو سوئی مجھے اب ٹانکا نظر نہیں آتا۔

( سوئی اور پاجامہ اسما کو دیتی ہیں اور اپنے آنسو پونچھتی ہیں )

**رضیہ** : اس پاجامے کی گوٹ میں جتنے آپ نے ٹانکے بھرے ہیں اتنے ہی آپ کے آنسو ٹپکے ہیں۔

**امی جان:** (روتے ہوئے) میں کیا کروں میرا دل بھر آتا ہے۔

(امی جان روتی رہتی ہیں۔ رضیہ کو کھانسی اٹھتی ہے۔ نیلم خیمہ کے باہر سے اٹھ کر اندر آتی ہے۔ بسورتی ہوئی آکر صفیہ کی گود میں گھس جاتی ہے اور رونے لگتی ہے)

**نیلم:** (روتے ہوئے) امی ——— امی!

**صفیہ:** کیا بات ہے۔ کیوں روتی ہو نیلم۔ چپ ہو جاؤ۔ تمہارے ابا جان ابھی آجائیں گے۔ وہ تمہارے لیے کھانے کو بسکٹ لائیں گے۔

**نیلم:** (روتے ہوئے) مجھے بھوک لگی ہے امی!

**رضیہ:** چپ ہو جاؤ نیلم! تم تو بہت اچھی لڑکی ہو تمہیں سب پیار کرتے ہیں۔ پیارے بچے روتے نہیں بھیا۔ آؤ میرے پاس آجاؤ۔ میں تمہیں پیار کروں گی۔

**نیلم:** (سسکیاں لیتے ہوئے) مجھے بھوک لگی ہے خالہ جان۔

(رضیہ اٹھ کر سوٹ کیس میں سے روٹی کا ایک ٹکڑا نکال کر نیلم کو دیتی ہے)

**رضیہ:** یہ لو نیلم روٹی کا ٹکڑا ——— اسے کھاؤ ——— ابھی تمہارے ابا جان آجائیں گے وہ تمہیں بسکٹ دیں گے۔

**نیلم:** بہت سخت ہے۔ ہم ایسی روٹی نہیں کھاتے۔

**رضیہ:** (پیار سے) تھوڑی تھوڑی کتر و (کتر کر دکھاتی ہے) ایسے! اسے تھوڑی دیر منہ میں گھلاؤ تو نرم ہو جائے گی۔ سمجھیں۔ شاباش!

(نیلم روٹی کا ٹکڑا لیے سسکیاں لیتی خیمہ سے باہر چلی جاتی ہے۔ اور باہر گھاس میں بیٹھ جاتی ہے)

**رضیہ:** (آواز بلند) نیلم! دیکھو۔ خیمہ کی رسیوں سے آگے نہ جانا۔ ورنہ بھیڑ میں کھو جاؤ گی۔

**نیلم:** (باہر سے) اچھا خالہ جان!

(رضیہ کو کھانسی اٹھتی ہے۔ چند لمحے بعد ابا جان خیمہ میں آتے ہیں لباس
وہی ہے۔ جو پہلے منظر میں تھا۔ لیکن بہت میلا ہو چکا ہے۔ سفید
ڈاڑھی بھی الجھی ہو گئی ہے۔ بغل میں قرآن شریف ہے قرآن شریف
کا سے بکس کے اوپر رکھ دیتے ہیں صفیہ کے پاس آکر اس کے چہرے
پر "اللہ شو" کرتے ہیں۔ اور پھر خیمہ کے دروازے کی جانب وہ کی
کے کونے پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

**ابا جان**: قرآن شریف کا آدھا پارہ پڑھ کر کس قدر طبیعت سنبھلتی ہے۔ خدا نے کسی کے ساتھ وعدہ نہیں کیا کہ وہ اسے ہمیشہ خوش حال ہی رکھے گا۔ وہ اپنے بندوں پر آزمائش کے لیے مصیبت نازل کرتا ہے تاکہ دیکھے کہ مصیبت میں بھی کوئی اس کا شکر گذار رہتا ہے۔

**رضیہ**: جی ہاں!

**ابا جان**: مجھے تو صرف ایک چیز کی تکلیف ہے۔ وضو اور غسل کے لیے پانی نہیں ملتا۔ اتنا نہیں کہ یہ کپڑے پانی میں کھنگال کر پہن لوں۔

**رضیہ**: عبدل! صبح اندھیرے سے پانی لینے کے لیے قطار میں کھڑا ہے۔ یہاں پانی کی بہت دقت ہے۔ ایک نل ہے اور ایک لاکھ آدمی پانی لینے والے۔

**ابا جان**: تیمم کر لیتا ہوں۔ لیکن طبیعت کو اطمینان نہیں ہوتا۔

(رضیہ کو کھانسی اٹھتی ہے)

**ابا جان**: رضیہ! تمہاری کھانسی میں کوئی افاقہ نہیں ہوا؟

**صفیہ**: بارش کی ٹھنڈک اور گیلے کپڑے پہنے رہنے کی وجہ سے سردی سینے میں بیٹھ گئی ہے۔

**ابا جان**: صفیہ تم لیٹ جاؤ۔ بیٹھے بیٹھے تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔

**صفیہ**: ابا جان! زمین بہت سخت ہے۔ زمین پر لیٹنے کی نسبت بیٹھے رہنے میں کم تکلیف ہوتی ہے۔

**ابا جان**: (گرم ہو کر) ہم پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے۔ ہم بہت آرام پسند ہو گئے تھے۔ ہم خیال بھی نہ کر سکتے تھے

کہ دھنّی کا فاقہ کیا معنی رکھتا ہے۔ ہمیں موسم کے سرد و گرم کی بالکل برداشت نہ رہی تھی ہم سے اپنے پسینے کی بُو بھی نہ سونگھی جا سکتی تھی اور کپڑوں میں عطر لگاتے تھے۔

**امّی جان:** (بھرائی ہوئی آواز میں) گھر سے نکلے آج بارھواں دن ہے۔ ان بارہ دن میں دو دو دن کے فاقے بھی کئے پینے کو پانی نہیں ملا۔ تین دن تک آسمان سے جھاجوں پانی برسا۔ کپڑے بھیگ کر بدن کو چپک گئے۔ بدلنے کو کپڑے نہ رہے۔ لیٹنے کو جگہ نہ رہی۔ ٹخنوں ٹخنوں پانی میں بیٹھے کئی راتیں کاٹی ہیں۔

**رضیہ:** مصیبت کو یاد کرکے تکلیف ہوتی ہے۔

**امّی جان:** صبر کی عادت ڈالیے ہمارے اور مسلمان بھائی بہن یہاں کس کس بری حالت میں ہیں۔

(امّی جان سو جاتی ہیں۔ رضیہ کو کھانسی اٹھتی ہے)

**ابا جان:** آج جب میں قرآن شریف کے آدھے پارے کی تلاوت کر چکا تو بار بار مجھے یہ خیال آیا کہ قدرت اپنے حکم سے سلطنتیں بناتی اور مٹاتی رہتی ہے۔ یہ وہ پرانا قلعہ ہے جو کبھی ہندوؤں نے بنایا تھا۔ اور ان کے راج کی نشانی ہے۔ پھر جب ہندوؤں پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ تو شیر شاہ سوری نے اس قلعہ میں مسجد بنوائی۔ انگریزوں کا راج قائم ہوا تو اس قلعہ کی دیواریں بڈھے کے دانتوں کے مانند تھیں۔ نئی دہلی میں انگریزی راجدھانی قائم ہوئی تو اس قلعہ کی مرمت ہوئی۔ گھانس لگی اور انگریز اپنے کتے کو پھرانے یہاں لاتا تھا۔ اور اب جب دہلی میں ہندوستان کا بیاتر نگا جھنڈا لہرا رہا ہے تو دہلی کے مسلمان شہر بدر ہو رہے ہیں۔ اس کی شکستہ دیواروں میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔

**صفیہ:** مجھ سے تو پناہ گزینوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔

**ابا جان:** یقین نہیں آتا۔ کہ مسلمانوں کے لیے دہلی کی وسعت ان شکستہ دیواروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے شیر شاہ سوری کی مسجد جس میں مسلمانوں کے حکم کی پوری آن تھی۔ اب سر بہ سجدہ نظر آتی ہے۔ وہ جامع مسجد کے مینارے ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے پیش امام۔ بغیر مقتدیوں کے نماز پڑھ رہا ہو۔

(رضیہ کھانستی ہے امّی جان اندر ہی اندر سسکیوں کی آواز آ رہی ہے)

**ابا جان:** میں جامع مسجد کو دیکھتا ہوں تو میری بہت ہمت بندھتی ہے۔ سر اٹھائے۔ سیدھی۔ آسمان پر نظر کیے سارے شہر کے درمیان کھڑی ہے۔ ساکت۔ خاموش۔ متوکل ———— میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی

پنچھی کی طرح وہاں میں گرا رہوں اور اس کی مٹی کو نہ چھوڑوں۔

صفیہ : ابا جان میری گھبراہٹ بڑھ رہی ہے۔

ابا جان : تم بہت کمزور ہو گئی ہو۔

صفیہ : میں ہمیشہ سے دل کی مریض ہوں۔ اب تو میری یہ حالت ہے کہ ہر وقت دل منہ کو آتا ہے۔ جب مسلمانوں کا خیال آتا ہے جیسے رحم کی حالت میں خیمہ کیے گئے ہیں تو دل میں سوئیاں چبھنے لگتی ہیں جب کسی بچے کو سڑک پہ بلکتے دیکھتی ہوں تو دل مسوس کر رہ جاتی ہوں۔ ابھی جب نیلم سڑک سے گذری تھی تو مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا۔

ابا جان : اللہ مالک ہے۔ اس پر بھروسہ رکھو۔

رضیہ : آپ اپنے دل کو سمجھایا کیجئے۔ ابا جان۔

صفیہ : (گھبرا کر) بھائی کہاں گئے ہیں ؟

رضیہ : (تسکین دیتے ہوئے) ابھی خیمہ سے نکل کر باہر گئے ہیں۔ آ جائیں گے۔

صفیہ : (آہ کرتے ہوئے) مجھ سے ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔

ابا جان : اکبر کو گھر کی بربادی کا بہت افسوس ہے۔

امی جان : (آنسو پونچھ کر) اکبر نے اپنے بھائی بہنوں پر اپنی جان چھڑکی ہے۔ اس نے گھر کی عزت اور حیثیت بنائے رکھی۔ اب اس بربادی کے بعد اس کا چہرہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی اندھیرا غار ہو۔ اس میں زندگی کی لو بالکل ٹھنڈی ہو گئی ہے۔

صفیہ : (ٹھنڈا سانس لے کر) ہائے۔

رضیہ : بھائی جان کو دیکھ کر سب کو تکلیف ہوتی ہے۔

امی جان : اگر اکبر شادی کر لیتا تو اس کا غم غلط کرنے کو اس کے بیوی بچے تو ہوتے۔

رضیہ : اب حالات ٹھیک ہو جائیں تو شادی کر دیجئے گا۔

امی جان : (روتے ہوئے) اب تو غریب کی دنیا اجڑ گئی۔

صفیہ : اچھی امی جان۔ آپ روئیں نہیں۔

رضیہ : اچھی امی! نہیں تو ابا جان کو پھر دھڑکن ہونے لگے گی۔

(کچھ دیر خاموشی۔ امی جان رو رہی ہیں)

رضیہ : عبدل صبح اندھیرے سے پانی کے لیے نلکے پر جا کھڑا ہوا تھا۔ غریب ابھی تک واپس نہیں آیا۔

صفیہ : تمھارے بھائی صاحب اور صغیر بھائی صبح سویرے سے کہ گئے ہوئے ہیں ابھی واپس نہیں آئے۔ جب اپنے اپنوں میں سے کوئی ایک بھی نظر سے اوجھل ہو تو دل کو قرار نہیں آتا۔

رضیہ : لاہور جانے کے لیے وہ ریل کے ٹکٹوں کا بندوبست کر رہے ہیں۔

صفیہ : میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کیوں لاہور جانا چاہتے ہیں۔

رضیہ : آپ اپنی طبیعت پریشان نہ کیجیے۔

ابا جان : تم سب لاہور جاؤ۔ میں یہیں رہوں گا۔

امی جان : مجھے کیا معلوم تھا کہ گھر سے نکل کر دوبارہ گھر جانا نصیب نہیں ہوگا مجھے کپڑے بھی نہ بدلنے دیے۔ چائے کی ایک پیالی بھی نہ پینے دی۔ انگیٹھی پر دودھ جوش کرنے رکھا تھا۔ وہ بھی تو نہ اتارا۔ ریڈیو بھی بجتا چھوڑ آئے ساتھ پاندان بھی نہ لائے ہر وقت اپنا گھر نظروں میں پھرتا ہے (روتے ہوئے) اگر مجھے بتایا ہوتا کہ گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں تو میں ضرورت کا سارا سامان جمع کر کے موٹر میں رکھ لیتی۔ ابھی کھانے کا نیا سیٹ خریدا تھا۔ اس میں ایک بار کھانا نہ کھایا۔

رضیہ : امی جان! جب یہاں کھانے کو ہی نہیں ملتا تو اب ڈنر سیٹ کا خیال کرنے سے حاصل؟

امی جان: اب تم لاہور جانے کے لیے کہہ رہے ہو۔ بغیر سامان کے کیا کیا مصیبت یہاں اٹھائی۔ اب دیکھیے وہاں کیا مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔

رضیہ : آپ دیکھیے گا۔ لاہور میں اتنی مصیبت نہیں ہوگی۔

امی جان: جب اپنے شہر میں یہ حال ہے تو پردیس میں تو اور بھی برا حال ہوگا؟

رضیہ : کبھی دیس سے پردیس بھی بھلا ہوتا ہے۔

امی جان : یہاں ہماری جائداد کا کیا ہوگا؟ کون کرایہ وصول کرے گا؟ مجھے تو دیس سے پردیس جانا اچھا نہیں لگتا

یہاں تو ہمیں سب جانتے ہیں۔ خاندان کا نام ہے۔ عزت ہے۔ وہاں نئی جگہ ہمیں کون جانے گا کہ ہم کون ہیں؟
خدا ان حیوانوں سے سمجھے۔ کمینوں نے ہمیں بے گھر کیا ہے۔

(سسکیوں کی آواز آتی رہتی ہے)

**اباجان**: اصغر اور حسن اور رضیہ لاہور جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔ ہم ابھی یہیں رہیں گے۔ جب شہر میں امن چین ہو جائے گا تو شہر کے اپنے آبائی مکان میں چلے جائیں گے۔

**رضیہ**: آپ ابھی سے کیوں یہ سوچتے ہیں۔ دیکھئے ابھی ٹکٹ ملتے بھی ہیں یا نہیں؟ اس کیمپ میں اس قدر تو پناہ گزین ہیں اور ہر شخص پاکستان جانے کے لیے بے تاب ہے۔ پندرہ دن کے بعد اب ٹرینیں چلنی شروع ہوئی ہیں۔ آج تیسری ٹرین جا رہی ہے۔ اس ٹرین میں ہمیں جگہ بھی ملتی ہے یا نہیں؟

**اباجان**: میں دہلی چھوڑنے کے سخت خلاف ہوں۔ سکھ ہندو ہمیں کتنا ہی تنگ کریں۔ یہاں سے قدم نہیں ہٹانے چاہئیں۔ مسلمان ہونا کوئی جرم نہیں ہے۔ اور اگر سکھ اور ہندو ہمیں یہاں رہنے نہیں دیں گے۔ تو ہم شہید ہو جائیں گے۔

**صفیہ**: (گھبرا کر) ہائے! ——— ہائے!! ——— ہائے!!!

**رضیہ**: کیا بات ہے آپا جان؟

**صفیہ**: میری طبیعت گھبرا رہی ہے۔

**رضیہ**: اباجان! آپ ذرا دیکھئے تو بھائی جان باہر کہیں نظر آ رہے ہیں؟

**اباجان**: اچھا!

(اباجان اٹھ کر دائیں جانب خیمہ سے باہر چلے جاتے ہیں نیلم خیمہ کی رسیوں کے پاس بیٹھی ہے)

**رضیہ**: مسلمانوں کا قتل عام دیکھ کر اباجان کا اسلام کا جوش بہت زیادہ ہو گیا ہے۔

**امی جان**: اے ہے! ان کا کیا ہے۔ انہیں تو ہمیشہ جوش آتا رہتا ہے کبھی گھر بار سے غرض ہی نہ رہی۔ میری امی کی جائداد جو میرے حصے میں آئی وہ تھی ہے کہ انہیں کبھی دو پیسے کمانے کی ضرورت نہ پڑی خیالی آدمی کیا کرتے؟ اسلام کا جوش بگھارتے رہے۔ اب بھی یہاں اس مصیبت میں کسی کی تسلی تشفی کی بجائے ہر وقت گرم ہی ہوتے رہتے ہیں۔

رضیہ : امی جان! آپ تو جانتی ہیں کہ ہمارے خاندان کی روایت ہے کہ ہر پیڑھی میں ایک مرد فقیر اللہ ہوتا ہے۔ پچھلی پیڑھی میں نانا خضر تھے۔ اس پیڑھی کے فقیر ابا جان ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ انھوں نے کبھی آج تک ایک پیسہ کو بھی اپنی ذات پر صرف نہیں کیا۔

امی جان : اسے ہے ابا کیا نانا خضر کی برابری کریں گے۔

(رضیہ کھانستی ہے۔ امی جان منہ بنائے بیٹھی ہیں۔ صفیہ کو گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ اسما اپنے پاجامہ کی گوٹ پر دیکھت جھولی بنا رہی ہے۔ چند لمحوں پر دائیں جانب سے خیمہ میں ایک عورت آتی ہے۔ معمولی حیثیت کی شریف عورت ہے جس نے ریشمی سیاہ برقع اوڑھ رکھا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں کچھ برتن ہیں اور دوسرے ہاتھ میں گٹھری ہے)

عورت : السلام علیکم!

امی جان : وعلیکم!

عورت : پرانے برتن اور کپڑے مجھ سے خرید لیجئے تو بڑی مہربانی ہوگی۔ ہمارے پاس بیچنے کو یہی ایک دو چیزیں ہیں؟

رضیہ : آپ بیٹھ جائیے۔

عورت : (بیٹھتے ہوئے) دیکھ لیجئے۔ ممکن ہے آپ کی ضرورت کی کوئی چیز ان میں نکل آئے۔

رضیہ : (مسکرا کر) اب ضرورتیں بہت ہی مختصر ہو کر رہ گئی ہیں۔

عورت : (اسما کی طرف اشارہ کر کے) یہ کیا پاجامہ کی گوٹ ٹانک رہی ہیں۔

رضیہ : ہاں

امی جان : ان کے جہیز کا جوڑا ہے۔ نومبر میں بچاری کی شادی ٹھہری ہوئی ہے۔

عورت : خدا کرے امن چین ہو جائے اور منہی خوشی رہیں۔

صفیہ : بچاری کو وہم ہے کہ کسی فقیر کی دعا ہے کہ ان کا کوئی کام پورا نہیں ہوتا۔ آپ دعا کیجئے کہ شادی بخیر ہو جائے۔

عورت : انشاء اللہ! (سامان کی طرف اشارہ کر کے) آپ ہماری کوئی چیز خرید لیں تو ہماری کچھ مدد ہو جائے گی جو تھوڑا

ساتھ تھا روپیہ ساتھ لائے تھے وہ سب ختم ہو گیا۔ اس سامان کو بیچ کر کچھ روپیہ ہاتھ میں آ جائے تو بہت سہولت ہو جائے گی۔

**رضیہ** : آپ کو اس سامان کی خود بھی ضرورت ہو گی؟

**عورت** : انسان کو ضرورت تو ہر چیز کی ہوتی ہے۔

**رضیہ** : لیکن سامان بیچنے کے بعد کیا کریں گی آپ! ابھی تک شہر میں امن ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ پناہ گزین دہلی کے کونے کونے سے امنڈے چلے آتے ہیں۔ اتنا ہی بڑا ایک اور کیمپ ہمایوں کے مقبرے میں کھل گیا ہے۔

**عورت** : اب تو لوٹ کر شہر جانے کی ہمت نہیں ہے۔ دل میں خوف بیٹھ گیا ہے۔ دیکھئے پاکستان جانے کیلئے ریل میں جگہ کب ملتی ہے۔ اور زندہ بھی پہنچ پاتے ہیں یا نہیں۔ نہ معلوم خدا کو کیا منظور ہے۔

**رضیہ** : ہم آپ کی کچھ مدد کریں تو آپ برا تو نہیں مانیں گی؟

**عورت** : آپ اس سامان کو دیکھ لیجئے جو چیزیں چاہیں اور جس دام چاہیں خرید لیں۔ یہ بڑی مدد ہو گی۔

**رضیہ** : ہر ایک کو اپنی چیز پیاری ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ خوشی کے زمانے کی بہت سی یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔ آپ اپنی یہ چیزیں اپنے پاس رکھیں۔ ہمارے پاس کچھ نقد روپیہ ہے۔ اپنی ضرورت کے مطابق کچھ آپ لے لیجئے۔

**عورت** : آپ کی سخاوت کا شکریہ!

(اپنی گٹھڑی اٹھا لیتی ہے اور برتن اٹھا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ رضیہ بھی ساتھ کھڑی ہو جاتی ہے)

**رضیہ** : آپ نے میری بات کا برا منایا؟

**عورت** : آپ مجھے معاف کیجئے۔ اگر میں نے کوئی گستاخی کی ہو۔

**رضیہ** : اچھا۔ آپ جو چیز بغیر وقت کے دے سکیں دے دیجئے اور اس کے عوض روپیہ لیجئے۔

**عورت** : (مڑ کر جانے لگتی ہے) جی نہیں۔ السلام علیکم!

(جلدی سے دائیں جانب سے خیمہ سے نکل جاتی ہے)

**رضیہ** : (پیچھے آواز دیتے ہوئے) ذرا سنئے تو!

(عورت مڑ کر بھی نہیں دیکھتی اور چلی جاتی ہے ——— رضیہ کھانستی ہے اور دری پر صفیہ کے پاس آ بیٹھتی ہے)

صفیہ : (آہ بھرتی ہے) یہ کیسے شریف آدمی اور کس مفلسی کو پہنچ گئے ہیں۔

امّی جان : اے ہے رضیہ! تم نے اس کا سامان دیکھا بھی تو نہیں۔ ممکن ہے۔ کوئی ضرورت کی چیز ہی نکل آتی یہاں تو ہر چیز کے لیے ہاتھ تنگ ہے۔

رضیہ : آپ نے دیکھا! مرتیں چیزیں۔ مجھے تو کسی کی مصیبت سے فائدہ اٹھانا اچھا نہیں لگتا۔

(خاموشی ——— امی جان کی تیوری چڑھ گئی ہے۔ صفیہ گھبرا کر اپنی گردن ادھر اُدھر موڑتی ہے۔ اسماء پاجامے کی گوٹ پر دیکھت بھرلی ٹانک رہی ہے۔ اکبر خیمہ کے دروازے پر آتا ہے۔ نیلم کو گود میں اٹھا لیتا ہے۔ اور اندر آتا ہے۔

اکبر کے چہرے پر اب عمر بہت زیادہ معلوم ہو رہی ہے۔ چہرہ بہت پژمردہ ہے اور لباس میلا۔ اکبر دری پر دروازے کی طرف بیٹھ جاتا ہے اور نیلم کو اپنے پہلو میں بٹھا لیتا ہے۔

رضیہ : بھائی جان!

اکبر : کیا بات ہے؟

رضیہ : آپ اس قدر خاموش کیوں رہتے ہیں؟

اکبر : اب جو محسوس ہوتا ہے۔ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

رضیہ : لیکن کیوں؟

اکبر : (توقف کے بعد) ٹھیک ٹھیک میں نہیں جانتا۔ شاید اس لیے کہ احساس بیان میں کوئی آسودگی نہیں پاتا۔

رضیہ : اچھا! آپ کیا سوچتے رہتے ہیں ہر وقت؟

اکبر : کچھ نہیں۔ دماغ کام ہی نہیں کرتا۔ جو منظر آنکھوں کے سامنے ہے۔ شاید اس نے دماغ کی قوتِ فکر معطل کر دی ہے۔

رضیہ : آپ ایسی باتیں کریں گے تو آپا جان گھبرائیں گی۔

اکبر : یہ میں جانتا ہوں۔ اسی لیے خاموش رہتا ہوں۔

رضیہ : آپ کو دہلی کے مسلمانوں کی بربادی دیکھ کر افسوس نہیں ہوتا۔ میں نے کبھی آپ کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں سنا۔

اکبر : میں مسلمان اور انسان دونوں کی بربادی پر روتا ہوں۔ آنسو نہیں بہتے۔

رضیہ : آپ کو خیال نہیں آتا۔ کہ آپ نے کس محبت اور جانفشانی سے ہماری تعلیم اور بہبودی کا خیال کیا۔ ہماری حیثیت اور عزت قائم رکھی۔ وہ سب چشم زدن میں برباد ہو گئی۔ آپ کو اپنی بربادی کا بھی افسوس نہیں ہوتا۔

اکبر : (درد و کرب سے) تم یہ باتیں کیوں کہہ رہی ہو؟

رضیہ : میں آپ کے دل کی آواز آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔

اکبر : (بے تاب) لیکن کیوں؟

رضیہ : وہ آواز اس خاموشی جیسی دردناک نہیں ہو سکتی۔

صفیہ : اپنے دل کی بات ہمیں تو بتائیے!

امّی جان : ہاں بیٹا! بتاؤ تو سہی!

(اکبر (توقف کے بعد) مجھے انسان کی جبلی شرافت پر اعتقاد تھا۔ مجھے یقین تھا کہ علم اور تہذیب انسان کو سنوارتے ہیں۔ میرا ایمان تھا کہ ایک تعلیم یافتہ اور مہذب انسان حیوان نہیں ہوتا۔ لیکن جب میں نے بے گناہ مسلمانوں کا خون تعلیم یافتہ اور مہذب ہندوؤں اور سکھوں کو بہاتے دیکھا تو میرا اعتقاد فنا ہو گیا۔ میں نے اپنی ساری زندگی انسانیت کی خدمت کے لیے صرف کی۔ اور اب یہ معلوم ہوا کہ انسان پر تعلیم اور تہذیب کے بعد بھی بہیمیت کا جنون طاری ہو جاتا ہے۔ ایک دو افراد پر نہیں پوری پوری کی آبادی پر۔ ہزاروں۔ لاکھوں۔ کروڑوں انسان جانوروں کی طرح ایک دوسرے کو جان سے مارتے پھرتے ہیں۔ بے دردی سے۔

بے رحمی سے۔ بچوں کو۔ عورتوں کو۔ بوڑھوں کو ـــــ مجھے انسان اور

تہذیب پر بھروسہ نہیں رہا ـــــ اب میری زندگی بے کار ہے

آؤ نیلم (کھڑا ہو جاتا ہے) چلو تمہیں ذرا کیمپ میں پھرا لائیں)

**نیلم** : چلیے :

(اکبر۔ نیلم کو لے کر دائیں جانب سے باہر چلا جاتا ہے)

**صفیہ** : جائی جان کو قلبی اذیت پہنچی ہے۔ یا اللہ! اب کیا ہو گا؟

**رضیہ** : (کھانستے ہوئے) آپ گھبرایئے تو نہیں آپا جان۔

**امی جان** : میرے لال کی کیسی زندگی تباہ ہوئی ہے۔

(روتی ہے)

(کچھ دیر بعد دائیں جانب سے ابا جان آتے ہیں۔ جہاں اکبر بیٹھا تھا

اسی جگہ بیٹھ جاتے ہیں)

**ابا جان** : تم سب اس قدر پریشان کیوں ہو؟

**رضیہ** : کوئی بات نہیں ابا جان۔

**ابا جان** : اکبر میاں آئے تھے۔ پھر چلے گئے باہر؟

**رضیہ** : جی ہاں! آ جائیں گے۔ خیمہ کے اندر ان کا دل گھبراتا ہے۔

**ابا جان** : میں خیمہ کے باہر جاتا ہوں تو جدھر نظر پڑتی ہے آنکھیں پھیر لینے کو جی چاہتا ہے۔ وہ مسلمان خاندان جن کی مستورات پردہ کرتی تھیں۔ اس مصیبت نے انہیں بے پردہ کر دیا ہے۔ جو غریب لوگ اپنا کچھ سامان لے آئے تھے اب اونے پونے بیچ رہے ہیں۔ پانی کے لیے ہر وقت آدھ میل لمبی قطار لگی رہتی ہے۔ ہر طرف گندگی پھیلی ہوئی ہے کوئی شخص بھی صاف کپڑوں میں بھلے حال نظر نہیں آتا۔ کوئی چہرہ ایسا نہیں جس پر فاقوں کے نشان نہ ہوں اس مصیبت میں دلی کے رئیس بھی ہیں۔ اعلیٰ خاندان بھی ہیں۔ خوش حال لوگ بھی ہیں۔ اور شریف انسان بھی۔

**صفیہ** : ابا جان! ایسی باتیں مجھے مت سنایئے۔ میرا دل ٹھیک نہیں ہے۔

**رضیہ** : (کھانستے ہوئے) عبدل صبح اندھیرے سے پانی کے لیے قطار میں کھڑا ہوا ہے۔ ابھی تک غریب کی باری نہیں آئی۔

(حسن اور اصغر دائیں جانب سے خیمہ میں داخل ہوتے ہیں۔ دونوں کا
لباس میلا ہے۔ بال میلے اور الجھے ہوئے۔ حسن کی صورت پہچانی
نہیں جاتی ہے کہ چہرے پر رنج اور مایوسیت کی بدلیاں چھائی ہوئی ہیں۔
اصغر کے چہرے پر سختی آگئی ہے)

**حسن** : (چاروں طرف دیکھ کر) نیلم کہاں ہے؟

**رضیہ** : بھائی جان ابھی ساتھ لے کر گئے۔ ابھی لے آئیں گے۔

**حسن** : (صفیہ سے) تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ — آج منہ بہت اترا ہوا ہے؟

**صفیہ** : گھبراہٹ بہت ہے۔

**اصغر** : (اسماء کی طرف متوجہ ہو کر) آپ اپنی یہ سلائی براہِ مہربانی سمیٹ لیجئے اور چلنے کو تیار ہو جائیے۔

**اسماء** : (حیرت سے آنکھ اٹھا کر) کہاں؟

**اصغر** : لاہور۔ آج کے دن کے دو بجے اسپیشل ٹرین نظام الدین اولیا کے اسٹیشن سے لاہور جا رہی ہے۔ سب کے لیے ٹکٹ مل گئے ہیں۔

**حسن** : دس ٹکٹ ہیں ہم سب کے لیے۔

**ابا جان** : (ناراض ہو کر) تم نے میرے لیے ٹکٹ کیوں لیا؟ میں نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا۔

**حسن** : اچھا کوئی نہیں جاتا۔ آپ غصہ نہ ہوں چچا جان۔

**امی جان** : (روتے ہوئے) میں اپنا بھرا گھر کھلا چھوڑ کر چلی آئی۔ میں تو گھر واپس جاؤں گی۔

**حسن** : چچی جان۔ ہم نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ آپ کو تکلیف ہوگی۔ جونہی ہم کوٹھی سے نکلے۔ بلوائی کوٹھی میں گھس آئے اور تمام قیمتی سامان لوٹ لیا۔ بھاری فرنیچر توڑ ڈالا۔ کتابوں کو پھاڑ کر آگ لگا دی۔ اب وہاں کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک سکھ نے کوٹھی پر قبضہ کر لیا ہے۔

**امی جان:** (روتے ہوئے) میں واپس جاؤں گی۔ بہت ہوگا تو سکھ مجھے مار ڈالے گا۔ جب میرا گھر لٹ گیا تو اب میں جی کر کیا کروں گی۔

**صفیہ:** (امی جان کے رونے کی آواز سے گھبرا کر) اللہ! ہمیں پڑا رہنے دیجئے۔ یہ مصیبت کیا کم ہے جو لاہور لیے جا رہے ہیں۔

(چند لمحے امی جان کے رونے کی آواز آتی ہے۔ وہ کچھ آنسو پر قابو پاتی ہیں۔)

**احسن:** تمہارا کیا خیال ہے رضیہ بہن؟

**رضیہ:** (کھانستے ہوئے) میرے خیال میں سب کو ساتھ رہنا چاہئے —— یا سب یہیں رہیں۔ یا سب لاہور جائیں۔ بھائی جان آگئے۔ ان سے پوچھئے۔

(اکبر نیلم کو گود میں لیے آتا ہے۔ نیلم رو رہی ہے۔ احسن نیلم کو اپنی گود میں لیتا ہے)

**احسن:** چپ ہو جاؤ نیلم۔ (پیار کرتے ہوئے) تم تو اچھی بیٹی ہو۔ (جیب میں سے نکال کر بسکٹ دیتا ہے۔ نیلم جلدی سے لے کر کھانے لگتی ہے) ہاں روتے نہیں۔

(نیلم چپ ہو جاتی ہے۔ احسن نیلم کو گود میں بٹھا لیتا ہے)

**اصغر:** بھائی جان! لاہور جانے کے لیے ٹکٹ مل گئے ہیں۔ آپ لاہور چلیں گے؟

**اکبر:** تم سب جانا چاہتے ہو؟

**احسن:** اگر سب جانا چاہیں تو آپ ساتھ چلیں گے؟

**اکبر:** ہاں۔ چلوں گا!

**احسن:** چچا جان! بھائی جان کو تو جانے میں اعتراض نہیں۔

**ابا جان:** میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں دہلی نہیں چھوڑوں گا۔

**اصغر:** اس مصیبت سے ٹکٹ لیے اور اب جانے کو کوئی تیار نہیں (غصہ سے) لاحول ولا قوۃ میں یہ ٹکٹ واپس

کر آتا ہوں۔

**احسن** : ٹھہرو تو اصغر بھائی۔

**اصغر** : (غصہ سے) ان سترہ دن میں جو کچھ ہُوا۔ اس سے سبق نہیں ملا۔ اب بھی ہم لوگ دلی چھوڑنے پر تیار نہیں (طنزیہ ہنس کر) دہلی۔ دہلی چھوٹ گئی۔ دہلی کے باہر پرانے قلعہ کی شکستہ دیواروں میں بیٹھے ہیں۔ پھر بھی دہلی چھوڑنے کو تیار نہیں۔

**اباجان** : (اصغر سے) اصغر!

**احسن** : اصغر بھائی! تم غصہ کیوں ہو جاتے ہو۔ سمجھ کر بات کیوں نہیں کرتے۔

**اصغر** : میں جا کر ٹکٹ تقسیم کر دیتا ہوں۔ پھاڑ دیتا ہوں۔ پھینک دیتا ہوں۔

(اُٹھ کر جانے لگتا ہے)

**احسن** : (اسلم کو فرش پر بٹھا کر اصغر کو روکتا ہے) ارے بھائی ٹھہرو تو سہی۔ تم بیٹھو تو یہاں۔

**اصغر** : میرا خون پہلے ہی کھولا ہوا ہے۔ اب مجھ میں زیادہ تاب نہیں۔

**احسن** : (اصغر کو بٹھاتے ہوئے) تم بیٹھو تو سہی۔

**اصغر** : (بیٹھتے ہوئے) میں نے کہہ دیا ہے کہ میں دلی نہیں رہوں گا جس شہر میں مسلمانوں کا اس قدر خون بہا۔ وہاں اگر اب بھی مسلمان رہے تو اُس پر لعنت۔

**احسن** : (روکتے ہوئے) اصغر بھائی! ایسی بات کیوں کہتے رہو۔

**اصغر** : کیوں کہتا ہوں؟ کیا مسلمان یہاں کے باشندے نہیں ہیں؟ یہاں کی حکومت کا فرض نہیں ہے کہ ان کی حفاظت کرے۔ یہ حفاظت کی ہے کہ نہتے مسلمانوں کو چوہے کی موت مروا دیا۔

**صفیہ** : (گھبرا کر) ہائے اللہ!

**رضیہ** : آپا جان!

**احسن** : للہ خاموش تو رہو۔ اصغر بھائی۔

**اصغر** : مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آپ سب جانتے بوجھتے انجان کیوں بنتے ہیں۔ اب اس کیمپ کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ دلی

میں مسلمانوں کے قتل وغارت کے لیے بڑی منظم سازش کی گئی تھی۔ ہفتوں اس کی تیاریاں کی گئیں۔ کھلے خزانے اس کے
لیے ہندوؤں اور سکھ عوام کو ہموار کیا گیا۔ پھر دہلی کے مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔ اُن کا مال لوٹا گیا۔ ان کے مکان جلائے گئے
کناٹ پیلس میں دن دہاڑے مسلمانوں کی دکانیں لوٹی گئیں۔ ایک ایک مسلمان کے کوارٹر اور کوٹھی پر حملہ ہوا۔ قرول باغ
پہاڑ گنج اور سبزی منڈی سے مسلمانوں کو نابود کر دیا گیا۔ شہر کے مسلمان محلوں پر حملے ہوئے جب مسلمان اپنی جانیں ہتھیلی
پر رکھ کر اپنے گھروں سے نکل بھاگے اور انھوں نے آکر یہاں پناہ لی تب حکومت کو پتہ چلا کہ دہلی میں کشت و خون
ہوا تھا۔ اور آج تین دن ہوئے کہ انھیں ہوش آیا کہ مسلمانوں کی حفاظت ان کی ذمہ داری ہے۔ ملاحظہ ہو۔ قلعہ کے
باہر ڈوگرا فوج کے سپاہی ہماری مدد کر رہے ہیں۔

احسن : اب یہ باتیں عورتوں کے سامنے دہرانے سے کیا حاصل ؟

اصغر : میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمان کے لیے اب دہلی میں جگہ نہیں۔ جب ہمیں تلوار اور کرپان کی نوک سے گھروں
سے نکالا گیا ہے۔ تو اب وہ ہمیں واپس آنے دیں گے؟ ہم واپس گئے تو ہمیں وہاں رہنے دیا جائے گا؟ میں نے
مسلمانوں کی لاشیں چوراہوں پر پڑی دیکھی ہیں۔ جن کے سینے پر انہی کے خون سے لکھا ہوا تھا۔ "یہ مسلمان ہیں انھیں
ہندوستان میں رہنے دو۔" میں اس طرح یہاں رہنے کو تیار نہیں ہوں۔

احسن : اچھا بھائی! تم مت رہو یہاں۔ تم لاہور چلے جاؤ!

اصغر : ہاں۔ میں یہاں نہیں رہوں گا؟

اکبر : (چند لمحے بعد) اب ہم گنتی کے چند نفس بھی تقسیم ہو جائیں گے۔

احسن : کیا کیا جائے؟ چچا جان دہلی نہیں چھوڑیں گے۔ اصغر بھائی یہاں رہیں گے نہیں ؟

(چند لمحے خاموشی)

رضیہ : بھائی جان آپ لاہور جانا چاہتے ہیں ؟

احسن : ہاں۔ ایک تو اس لیے کہ صفیہ دل کی مریض ہیں۔ یہاں نہ معلوم کب حالات درست ہوتے ہیں اور ڈاکٹر اور دوائیں
مہیا ہوتی ہیں۔ علاج کے علاوہ بھی ایسے مریض کے لیے ضروری ہے کہ دہلی کی تباہ حالت نظر سے اوجھل ہو۔
لاہور جاکر وہاں کی گہما گہمی شاید ان کی طبیعت بہلا دے۔ اور پھر میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ اگر لاہور چلا گیا تو شاید مجھے

دوبارہ ہمت ہو جائے کہ کوئی چھوٹی موٹی دکان کر لوں ——— ایک تاجر جب ایک جگہ دیوالیہ ہو جاتا ہے تو دوسری جگہ جا کر کاروبار کرتا ہے۔ نئی دلی میں جب میری دکان لٹ گئی۔ اب یہاں مجھ سے تجارت نہ ہو سکے گی۔

رضیہ : ہاں آپ کے لیے لاہور جانا ضروری ہے۔

احسن : تمھاری کھانسی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ وہاں اس کا علاج بھی ہو سکے گا۔

رضیہ : آپ میرے علاج کی فکر نہ کیجیے۔ آپ اباجان کو لاہور جانے پر راضی کیجیے۔

صفیہ : یہ کہیں گے تو میں ان کے ساتھ دوسری دنیا میں چلی جاؤں گی۔

امی جان : بری فال کیوں منہ سے نکالتی ہو بیٹی۔

احسن : (پیار سے) تم چلو گی نا لاہور صفیہ؟

صفیہ : ہاں خدا کرے۔ پہنچ جاؤں۔ میرے دل کی حالت ———

رضیہ : آپ گھبرائیے نہیں۔ ہم سب ساتھ ہوں گے۔

احسن : ہمارا تم اپنا یہ جوڑا بھی ساتھ لے چلو۔ وہاں کام آئے گا۔

(اباجان اٹھ کر جانا چاہتے ہیں)

احسن : آپ کہاں جا رہے ہیں چچا جان؟

اباجان : (غصے سے جاتے ہوئے) جہاں میرا سینگ سمائے گا چلا جاؤں گا۔ تم سب پاکستان جاؤ۔ تمھیں مجھ سے کیا واسطہ اب؟

احسن : (اٹھ کر اباجان کو روکتے ہوئے) آپ ذرا ٹھہریے تو (انھیں کھینچ کر خیمہ میں لاتا ہے) ذرا بیٹھیے ... ——— تھوڑی دیر ——— ———

اباجان : (مجبور ہو کر) اب میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا؟

رضیہ : اباجان! آپ ہمیں کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ہم تو آپ کو چھوڑ نہیں سکتے۔ آپ ذرا سوچیے تو۔ اب جب ہم سے سب کچھ چھوٹ گیا۔ اب آپ بھی ہمیں چھوڑ کر جا سکتے ہیں؟

**امّی جان:** (روتے ہوئے) مت جانے دو۔ انھیں للہ!

**احسن:** آپ اکیلے دلّی میں کیا کریں گے۔ کہاں رہیں گے؟

**ابّاجان:** میں یہاں اس لیے نہیں پیدا ہوا تھا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ یہاں کی مٹی مٹی میں میری سات پیڑھیوں کی مٹی مل ہوئی ہے۔ میں نے اپنے لیے یہاں قبرستان میں جگہ محفوظ کر رکھی ہے مجھے کہیں جگہ نہ ملی تو وہاں جاکر لیٹ رہوں گا۔

**امّی جان:** (روتے ہوئے) نہ کہو ایسا۔ ایسا نہ کہو۔

**صفیہ:** (روتے ہوئے) ابا جان!

**رضیہ:** ابّاجان! کیا آپ کو مُردوں کی مٹی۔ زندوں کے آنسوؤں سے زیادہ عزیز ہے۔

**اباجان:** میں دہلی سے نہیں جاؤں گا۔ مجھے زبردستی مجبور نہ کرو۔ (آواز بھرّاتی ہے) میں دہلی سے نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا۔ (روتے ہیں) دلّی!

(ابّاجان، امّی جان اور صفیہ رو رہے ہیں کچھ لمحے بعد سسکیوں کی آواز رہ جاتی ہے)

**اکبر:** (یاسیت سے مغلوب ہوکر) ہم سب جیتے جی مر گئے ہیں۔ ہماری جڑیں کٹ گئی ہیں۔ ہمیں اپنی جگہ سے اکھاڑ دیا گیا ہے۔ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ ہمیں شہر بدر کر دیا گیا۔ اب ہمارے لیے یکساں ہے کہ یہاں رہیں کہ کہیں چلے جائیں۔

(اکبر کے الفاظ کے دوران سسکیاں بند ہو جاتی ہیں۔ اب صرف اباجان رو رہے ہیں)

**رضیہ:** اچھے اباجان! آپ مت روئیے۔

(اباجان روتے رہتے ہیں۔ عبدل پانی کا گھڑا لیے آتا ہے۔ گھڑا ہاتھ ہی میں رہ جاتا ہے اور حیرت سے اباجان کی طرف دیکھ رہا ہے)

**رضیہ:** (جلدی سے اٹھ کر) عبدل! تم لے آئے پانی! اباجان کو ایک گلاس پانی دو۔

**عبدل** : (گھبراکر) یہ لیجئے۔

**رضیہ** : (گلاس میں پانی لے کر) یہ لیجئے ابّاجان! پانی لیجئے۔ طبیعت سنبھلے گی۔

(ابّاجان پانی پیتے ہیں اور اپنے کو سنبھالتے ہیں اور کچھ دیر بعد)

**ابّاجان** : آج جمعہ ہے۔ ہماری گاڑی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے اسٹیشن سے جائیگی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ جاتا ہوں۔ وہاں باؤلی کے پانی میں اپنے کپڑے دھوؤں گا اور غسل کے بعد جمعہ کی دو رکعت نماز پڑھوں گا۔ پھر دلی چھوڑنے سے پہلے آخری بار حضرت خواجہ صاحب کے مزار اقدس پر فاتحہ پڑھوں گا۔

**رضیہ** : ابّاجان! للہ آپ دیر نہ کیجئے گا، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گاڑی روانہ ہوجائے۔

**عبدل** : (حیرت سے) کہاں جارہے ہیں سب؟ بیگم صاحب؟

**رضیہ** : (خوشی سے) ہم سب پاکستان جارہے ہیں۔

**عبدل** : سچ؟ بڑے صاحب بھی جارہے ہیں؟

**رضیہ** : ہاں! ابّاجان بھی ساتھ چلیں گے ٹکٹ مل گئے ہیں ہم آج دو بجے کی ٹرین سے لاہور جائینگے تم بھی ساتھ چلو گے؟

**عبدل** : ضرور! (فرطِ مسرت سے بے ساختہ ہوکر) نعرۂ تکبیر!

**عبدل و اصغر** : (خوشی سے) اللہ اکبر!

**ابّاجان** : (چند لمحے بعد آہستہ سے) اللہ اکبر!

**اصغر** : (جلدی سے صفیہ کے پاس جاکر خوشی سے) اچھی آپا جان، ذرا ایک بات سنئے۔ کان میں۔

**صفیہ** : ایسی کیا راز کی بات ہے؟

**اصغر** : ہاں! (کان میں کچھ صفیہ سے کہتا ہے)

**صفیہ** : (ہنستی ہے) اے تم تو دیوانہ ہوگئے ہو۔

**اصغر** : خوشی کی بات نہیں ہے۔ اب ہماری شادی پاکستان میں ہوگی۔

(رضیہ اور حسن ہنستے ہیں۔ اکبر اور امی جان مسکراتے ہیں
ابّاجان خاموش ہیں)

پردہ

○

# تیسرا منظر

لاہور۔ جمعہ۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء

چھوٹے سے مکان کا ایک کمرہ۔ سورج ڈھل چکا ہے۔ کمرے میں گھُٹی گھُٹی روشنی ہے۔ کمرے کے عقب کی دیوار کے وسط میں چھوٹی اونچی کھڑکی ہے جس کے تختے کی سلاخیں لگی ہیں۔ کھڑکی میں گھر کے استعمال کی کچھ چیزیں رکھی ہیں۔ کھڑکی کے دونوں طرف دیوار میں لگی ہوئی کیلوں پر کچھ کپڑے لٹکے ہیں۔ ایک کیل پر اسماء کا ریشمی زعفرانی پاجامہ بھی لٹکا ہے۔ اس کے پائنچوں کی بکھت بھی ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ کھڑکی کے نیچے لکڑی کی بے وضع تپائی پر دوائی کی شیشیاں رکھی ہیں۔ کمرے کے دائیں اور بائیں عقبی کونوں میں دو پلنگ بچھے ہیں۔ دائیں پلنگ پر صفیہ سو رہی ہے اور بائیں پر رضیہ۔ چونکہ موسم گرم ہے اس لیے دونوں نے سوتی رنگین لیکن میلی چادریں اوڑھی ہیں۔ پلنگوں پر پڑی ہوئی دو دریاں بھی نظر آتی ہیں۔ دو مونڈھے کمرے کے اگلے حصے میں بے عنوان پڑے ہیں۔ بائیں جانب اگلے حصے میں کمرے سے باہر جانے کا راستہ ہے۔

ایک بے پشت کے مونڈھے پر حسن صفیہ کے پاس بیٹھا ہے۔
اسماء کھڑکی کے نیچے مونڈھے پر بیٹھی ہے۔ حسن کا قمیص پاجامہ میلے ہیں۔ اسماء سفید سوتی شلوار قمیص پہنے ہے۔ کپڑے اسماء کے

بھی بیٹھے ہیں اور ان کے بدن پر کوئی زیور نہیں ہے حسن کے چہرے کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ رنج و غم کی بدلیاں خوب گرج گرج کر برس رہی ہیں۔ اس کے چہرے کی وجاہت غم کے اس طغیان میں بہہ چکی ہے۔ اسماء کے چہرے کا رنگ اور آب دونوں مفقود ہیں آنکھیں روتے روتے سرخ ہو گئی ہیں اور سوج گئی ہیں۔

کچھ دیر اسماء گم سم سی بیٹھی رہتی ہے۔ حسن بیٹھا صفیہ کو دیکھتا ہے۔ سوتے سوتے صفیہ ڈر جاتی ہے اور ایک ہلکی سی چیخ مارتی ہے نیند میں کچھ بڑبڑاتی ہے۔ لیکن نیند ٹوٹتی نہیں۔ حسن جلدی سے اٹھ کر صفیہ کے پلنگ کے پاس اکڑوں بیٹھ جاتا ہے اور صفیہ کے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اب اسماء چپکے چپکے رو رہی ہے۔ دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہے۔ حسن مڑ کر اسماء کی طرف دیکھتا ہے۔ اور اٹھ کر پاس آتا ہے۔

**حسن**: بہت رو رہی ہیں اسماء، اپنی طبیعت کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔

**اسماء**: (سسکیاں لیتے ہوئے) میں تو بہت ضبط کرتی ہوں۔

**حسن**: اسماء! میں نے اب تک بہت سی تکلیفیں اور رنج برداشت کیے ہیں۔ تم نے کبھی میری آنکھ میں آنسو نہیں دیکھا۔ لیکن تمہیں دن رات روتا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ للہ! اتنا مت روؤ۔ اسماء!

**اسماء**: (روتے ہوئے) بھائی جان۔ میں کیا کروں؟ مجھ سے یہ غم ...... !

(ہچکی بندھ جاتی ہے)

**حسن**: (آہستہ سے) تم رو رہی ہو۔ تمہاری آواز سے صفیہ جاگ جائیں گی۔ آج تین رات اور تین دن بعد ان کی ذرا آنکھ لگی ہے۔

**اسماء**: (اپنے کو سنبھالتے ہوئے) میری آنکھوں میں آنسو امنڈے چلے آتے ہیں۔

(کچھ لمحے بعد)

احسن : تم ایک بار دل کھول کر رو لو۔ جو کچھ تم محسوس کرتی ہو۔ جو کچھ تمھارے دل میں چھپ رہا ہے۔ جو کچھ تم نے اپنے سینے کو گھونٹ رکھا ہے۔ وہ سب کہہ ڈالو۔

اسماء : میں صغر بھائی کے ساتھ مر کیوں نہ گئی ——— میں اب کیوں زندہ ہوں ——— اللہ! آپ مجھے زہر لا دیجیے۔

احسن : کہتی جاؤ۔ جو کچھ دل میں ہے کہہ ڈالو۔

اسماء : جب اس سکھ نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا تو آپ نے میرا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا۔ آپ نے صغر بھائی کو سامنے کیوں آنے دیا۔ آپ نے انھیں روکا کیوں نہیں۔ میں مر جاتی۔ آپ نے ان کی جان کیوں ضایع ہونے دی ——— بتائیے! بتائیے!!

احسن : (خاموشی کے بعد) تم کہتی جاؤ۔

اسماء : میں اب شادی نہیں کروں گی۔ میری زندگی بیکار ہے ——— ٹرین پر حملہ ہوا۔ اتنے مسلمان مرد عورتیں بچے مرے۔ مجھے کیوں نہ موت آگئی؟

احسن : (انگلی سے خاموشی کا اشارہ کرتے ہوئے) صفیہ جاگ جائیں گی!

اسماء : (آہستہ سے) مجھے راوی کے سیلاب میں ڈبو دیجیے۔ میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتی۔

احسن : (اسماء کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے) چلو۔ باہر چلو۔ ایک دفعہ دل کھول کر رو لو۔ پھر تمھیں صبر آجائے گا ——— چلو ——— اٹھو ——— چلو باہر چلو ——— یہاں روؤ گی تو صفیہ کی آنکھ کھل جائے گی۔ آج اتنے دن تو ان کی آنکھ لگی ہے چلو باہر چلو۔

(احسن اسماء کو کشاں کشاں بائیں جانب باہر لے جاتا ہے۔ باہر سے اسماء کے رونے کی آواز آرہی ہے۔ صفیہ سوتے سوتے پھر ڈر جاتی ہے اور ایک خوفزدہ آواز اس کے منہ سے نکلتی ہے۔ احسن بھاگا بھاگا کمرے میں آتا ہے اور صفیہ کے پاس فرش پر اکڑوں بیٹھ جاتا ہے۔

جب دیکھتا ہے کہ صفیہ کی نیند نہیں ٹوٹی اور بے خبر سو رہی ہے
تو مونڈھے کو گھسیٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔ بائیں جانب سے امی جان
آتی ہیں کھلی ہوئی بے مدعا آنکھیں جن کے آنسو خشک ہو چکے ہیں۔
بے جان بے رنگ۔ زرد چہرہ جیسے بے مقصد مشکل سے ڈھالی
گئی ہو۔ لباس بے حد میلا ہے۔ امی جان ایک نظر صفیہ اور نصیبہ کو
دیکھتی ہیں اور پھر حسن کے پاس جاتی ہیں )

**امی جان** : ( آہستہ سے ) ہمارا بہت۔ درتی ہے۔

**احسن** : ایک بار دل کھول کر رو لے تو شاید قرار آ جائے۔

**امی جان** اب کیا قرار آئے گا۔ امی جان ہکلا کر رہی ہے۔

**احسن** : اسے صغر بھائی سے تو بہت محبت تھی۔ وہ بھی ایک شریف لڑکی کو ہو سکتی ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے صغر کو سکھوں کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا ہے۔ وہ منظر اس کی نظروں سے کیسے اوجھل ہو سکتا ہے۔ وہ اگر روتی ہے تو اسے کیسے روکیں؟

**امی جان** : صغر میرا بیٹا تھا۔ لیکن میری تو آنکھوں سے آنسو سوکھ گئے ہیں۔ میں اب اس کی شہادت پر روتی نہیں ہوں۔

**احسن** : اللہ آپ کو صبر ایوب عطا فرمائے

**امی جان** : ڈاکٹر نے آج صفیہ اور نصیبہ کو دیکھ کر کیا کہا؟ مجھے سچ سچ بتا دو!

**احسن** : اب سچ کو زیادہ دن چھپایا بھی نہ جا سکے گا۔

**امی جان** : تو بتا دو نا مجھے۔

**احسن** : ٹرین پر حملے کا صفیہ کے ذہن پر شدید اثر ہوا ہے۔ دل کی حالت بہت نازک ہے۔ اگر آج رات نیند نہ آئی اور گھبراہٹ کا یہی عالم رہا۔ تو بہت خطرہ ہے کہ دل کی حرکت بند ہو جائے۔

**امی جان** : (سناٹے کے بعد) جو اللہ کو منظور ہو (ٹھنڈا سانس بھرتی ہے) صفیہ میرے لاڈ میں پلی۔ تم نے اسے پھول کی طرح رکھا۔ وہ یہ مصیبت کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ اس کا دل تو حباب جیسا ہے۔

**احسن** : صبر کیجئے چچی جان اپنے کو سنبھالے رہیں تاکہ صفیہ پر آپکی پریشانی ظاہر نہ ہو۔ وہ اور گھبرائیں گی نہیں تو۔

**امی جان** : اللہ صبر دے گا تمہیں بھی مجھے بھی۔

**احسن** : چچی جان ، میری زندگی برباد ہو گئی۔ ایک تاجر اپنی دکان زندگی سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ میری دکان لٹ گئی آپ نہ پوچھیئے کہ میرے دل کا کیا حال ہوا۔ میری زندگی میں اب کوئی آسودگی، کوئی چین، کوئی آرام باقی نہیں رہا مجھے اپنی اس بربادی کا اتنا افسوس نہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ اب صفیہ بھی مجھے چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ اس کے بعد میری زندگی میں کیا رہ جائے گا۔

**امی جان** : (خاموشی کے بعد) صفیہ کا دل بہت نازک ہے۔ اس مصیبت سے جس قدر جلد چھٹکارا ملے۔ اچھا ہے۔ میری تو یہی دعا ہے کہ اللہ اسے اب جلدی اٹھالے۔

**احسن** : (خاموشی کے بعد) آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ صفیہ کو بہت تکلیف ہے۔

**امی جان** : اصغر خوش قسمت تھا جو پہلے ہی مر گیا۔ ایک قیامت ٹوٹی تھی جب ٹرین بیاس کے پل کے پاس شام کے اندھیرے میں رکی۔ اور سکھوں اور ہندوؤں نے حملہ کیا۔ چار گھنٹے مسلسل ——————— اب میں سوچتی ہوں اصغر خوش قسمت تھا۔

**احسن** : ۔۔۔ وہ اچھی جگہ چلا گیا۔

(صفیہ نیند میں بھر خوف سے چیختی ہے۔ احسن جلدی سے صفیہ کے پلنگ کے پاس جاتا ہے۔ امی جان بھی صفیہ کے پاس جاتی ہیں۔)

**امی جان** : نیند میں خوف سے چونک پڑتی ہے۔

**احسن** : ڈاکٹر نے نیند آور دوا دی ہے۔ تو ذرا غفلت ہو گئی ہے لیکن دماغ سے خوف اور دہشت دور نہیں ہوئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد غفلت میں بھی خوفزدہ ہو کر چیختی ہیں۔ آج کمزوری اور نقاہت بھی بہت زیادہ ہو گئی ہے۔

**امی جان** : رضیہ سو رہی ہے۔ کتنی دیر سے ؟

**احسن** : کوئی دو گھنٹے سے کمزوری بہت زیادہ ہے اور جسم اندر سے بالکل کھوکھلا ہو چکا ہے۔

**امی جان** : ڈاکٹر نے رضیہ کو کیا مرض تشخیص کیا ہے ؟

**احسن** : (جھجک کر) تپ دق!

**امّی جان** : (حیرت سے) تپ دق! (ٹھنڈا سانس لے کر) جو اللہ کو منظور ہو۔

(امی جان مڑ کر دائیں جانب سے باہر جانا چاہتی ہیں)

**احسن** : آپ سنیئے تو چچی جان! کہاں جا رہی ہیں۔

(راستہ روک لیتا ہے)

**امّی جان** : کام بہت پڑا ہے۔ تم نے اچھا کیا۔ مجھے بتا دیا۔ میں اب سارا کام خود کر لوں گی اسے لیٹا رہنا چاہیئے۔

**احسن** : لیکن چچی جان!

**امّی جان** : (جاتے ہوئے) جب اللہ نے مجھ پر یہ برا وقت نازل کیا ہے تو میرا دل بھی سخت کر دیا ہے۔ میں اب روتی بھی نہیں ہوں۔ میری آنکھوں میں آنسو بھی نہیں آتا۔

(امی جان۔ دائیں جانب سے چلی جاتی ہیں۔ احسن آ کر پلنگ کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیتا ہے۔ تھوڑی دیر میں رضیہ ایک دم سے اٹھ بیٹھتی ہے)

**رضیہ** : (خوشی سے) ابا جان آ گئے —————— ابا جان!

**احسن** : (حیرت سے مڑ کر رضیہ کو دیکھتا ہے) کہاں ہیں چچا جان؟

**رضیہ** : (چاروں طرف دیکھ کر رونکھی ہو کر) وہ اب مجھے نظر نہیں آتے۔

**احسن** : تم نے خواب میں دیکھا ہوگا۔

**رضیہ** : ہاں! میں نے ابھی ابھی دیکھا کہ ابا جان آ گئے ہیں۔ وہ میرے پاس آئے۔ میری طبیعت پوچھی اور کہا کہ اب گھبراؤ نہیں میں آ گیا ہوں۔

**احسن** : تم گھبراؤ نہیں۔ چچا جان آ جائیں گے۔

**رضیہ** : (روتے ہوئے) ہمیں لاہور آئے آج اتنے دن تو ہو گئے۔ جمعہ کو دلی سے چلے تھے آج پھر جمعہ ہے۔ ابا جان ابھی تک نہیں پہنچے۔

احسن : وہ جلد ہی آجائیں گے۔ آج پناہ گزینوں کی ایک ٹرین دہلی سے لاہور پہنچنے والی ہے۔ اکبر بھائی دیکھنے گئے ہیں۔
ممکن ہے چچا جان آج اس ٹرین سے لاہور پہنچ جائیں۔

رضیہ : (کھانستے ہوئے) میں ڈرتی ہوں۔ ابا جان اب کبھی نہیں آئیں گے وہ دہلی نہیں چھوڑیں گے۔ ابا جان کو آنا ہوتا
تو وہ ہمارے ساتھ ہی آجاتے۔

احسن : تم اپنی طبیعت پریشان مت کرو۔ تم یہ تو سوچو کہ چچا جان جمعہ کی نماز ادا کرنے گئے تھے۔ نماز میں دیر ہو گئی۔
اور ہماری ٹرین حضرت نظام الدین اولیاء کے اسٹیشن سے چل پڑی۔ وہ ہمارے دہلی میں ہی رہ گئے۔ ان کی
شفقت ہم سب کے لیے بے تاب ہوگی۔ تم دیکھنا وہ بہت جلد ہمارے پاس آجائیں گے۔

رضیہ : مجھے یقین نہیں آتا۔ ممکن ہے ہم میں اتنی کشش نہ ہو۔ ممکن ہے انھیں اپنے بزرگوں کی مٹی ہم سے زیادہ عزیز ہو
اور وہ دہلی نہ چھوڑیں۔

احسن : تم یہ خیال دل سے نکال دو۔ چچا جان ضرور آئیں گے۔

(رضیہ کھانستی ہے)

رضیہ : آج بھائی جان مجھے اپنے ساتھ مہاجرین کے کیمپ بھی نہیں لے گئے۔ وہاں ہم سے بھی زیادہ مصیبت زدہ
مہاجر پڑے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں پیدل چلتے پہنچے ہیں۔ اس طرح کہ نہ پینے کو پانی ملا اور نہ کھانے کو کوئی
چیز۔ ان کو دیکھ کر کوئی کیسے گھر میں اطمینان سے بیٹھا رہ سکتا ہے۔ میں پلنگ پر لیٹی ہوں تو ان معصوم بچوں
اور غمزدہ عورتوں کی صورتیں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں (کھانستی ہے) مجھ سے اور کچھ نہیں ہو سکتا تو ان
کے خط لکھ دیتی ہوں۔ ان کی ضرورتوں کی چیزیں کیمپ کے کارکنوں سے مانگ مانگ کر لا دیتی ہوں۔

احسن : کل کیمپ چلی جانا۔ آج آرام کر لو۔

رضیہ : نہ معلوم میں اس قدر تھک کیوں جاتی ہوں۔ یہ کھانسی میری جان نکالے دیتی ہے۔

احسن : تم لیٹی رہو گی تو کھانسی زیادہ نہیں اٹھے گی۔

رضیہ : (لیٹ جاتی ہے) مجھے صغیر بھائی بہت یاد آتے ہیں۔ انھیں پاکستان آنے کی کیسی رٹ لگ گئی تھی۔ دہلی کے
مسلمانوں کے قتلِ عام کے بعد مسلمان ہونے کا جذبہ۔ ان میں کس قدر ابھر آیا تھا ———— کیسا

اچھا دل تھا جو اپنی منصوبہ کو سکھوں کے پنجے سے چھڑانے شہید ہو گیا ۔

احسن : رضیہ بہن، تم سب کو آزمائش میں صبر کی تلقین کرتی تھیں۔ اب تم ہی ایسی باتیں کرو گی تو پھر سب کا کیا حال ہوگا؟

رضیہ : جب اپنے لاہور پہنچنے کا منظر یاد آتا ہے اور مردوں، عورتوں اور بچوں سے بھری ٹرین آنکھوں کے سامنے آتی ہے تو میں سوچتی ہوں، موت اس منظر سے بہت بہتر ہے ۔

(صفیہ یکدم سے اٹھ بیٹھتی ہے ۔ رنگ بالکل سوکھ گیا ہے ۔ اور گالوں کے گڑھے بہت نمایاں ہیں۔ گردن بھی بہت پتلی ہو گئی ہے اس وقت سب سے نمایاں بھٹی ہوئی آنکھیں ہیں جن کی سیاہ بڑی بڑی پتلیاں دہشت سے خلا میں گھور رہی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں نے آنکھوں کو اور بھی زیادہ ڈراؤنا بنا دیا ہے ۔)

صفیہ : (چیخ مارتی ہے) وہ دیکھو، سکھ تلوار سے مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں —— ہے ہے ہے کتنا سارا خون! (احسن اور رضیہ دونوں لپک کر صفیہ کے پاس پہنچتے ہیں) اس مرد کے پیٹ میں سے ساری آنتیں نکل پڑیں اس کا سر کٹ گیا —— ارے کوئی روکو ان کو —— یہ تلواریں لیے ہماری طرف آ رہے ہیں —— ارے روکو —— روکو ——

(ایک چیخ مارتی ہے اور منہ اوندھا کر کے پڑ جاتی ہے)

رضیہ : منہ پر چھڑکنے کو میں پانی لاتی ہوں۔

(رضیہ جلدی سے دائیں جانب باہر جاتی ہے اور گلاس میں پانی لے کر بھاگی واپس آتی ہے۔ اسماء بھی پیچھے پیچھے آتی ہے)

رضیہ : لیجئے منہ پر پانی چھڑکئے ۔

اسماء : بھابی جان کروٹ لیٹی ہیں، چت لٹا دیجئے ۔

احسن : اچھا!

(صفیہ کو چت لٹا دیتے ہیں۔ منہ پر پانی چھڑکتے ہیں ——)

(کچھ دیر بعد)

صفیہ : (سانس اوپر نیچے ہو رہا ہے) میرا دم گھٹا جا رہا ہے ـــ کس قدر اندھیرا ہے ـــ معلوم ہوتا ہے
ایک قبر میں سب بند ہو گئے ہیں۔ کوئی ذرا کھڑکی اونچی کردو۔ ان کے آگے سے بکس ہٹا دو ـــ باہر
گولیاں چل رہی ہیں ـــ میں مر جاؤں گی ـــ میرا دم رکا ـــ دم رہ ـــ اوہ
ارے ـــ ہائے!

رضیہ : (سرگوشی کرتے ہوئے) میں ان کی ہتھیلیاں سہلاتی ہوں ـــ آپ پاؤں کے تلوے سہلائیے اسماء
تم دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی سہلاؤ۔

اسماء : بہت اچھا۔

احسن : ہاں ہاں!

صفیہ : (کچھ لمحے بعد) بندوق کی آوازیں ـــ آدمیوں کی چیخ و پکار ـــ یہ مسلمان عورتیں چیخ رہی ہیں۔
ارے دیکھو۔ سکھ اس لڑکی کو اٹھائے لیے جاتے ہیں ـــ انھیں روکو ـــ روکو۔

احسن : (رضیہ سے) انھیں ہوشیار کرنے کی کوشش کرو۔

صفیہ : آپ میری طرف تو دیکھیے آپا جان۔

اسماء : بھائی جان۔ بھابھی جان!

صفیہ : ارے دیکھو۔ اسما چیخ رہی ہے۔ اسے کوئی اس سکھ کے ہاتھ سے چھڑاؤ ـــ ہے ہے ہے
اصغر بھائی! اصغر بھائی۔ (روتے ہوئے) اصغر بھائی شہید ہو گئے ـــ اصغر ـــ

(پھر بے ہوش ہو جاتی ہے)

(اسماء رو رہی ہے)

احسن : تم ذرا باہر چلی جاؤ اسماء! صفیہ پھر بے ہوش ہو گئی ہے۔

(اسماء روتے ہوئے دائیں جانب سے باہر چلی جاتی ہے)

رضیہ : آپ منہ پر پانی چھڑکیے۔

(کھانستی ہے)

احسن : (صفیہ کے منہ پر پانی چھڑک کر دوست یار کرتے ہیں) صفیہ! صفیہ!!

صفیہ : (آہستہ سے) کون ؟

احسن : میں ہوں احسن۔ میری طرف دیکھو صفیہ۔ ——— صفیہ!!

صفیہ : ہمارے کمپارٹمنٹ کی چھت پر کون چل رہا ہے ؟

احسن : کوئی نہیں صفیہ۔ یہ تو گھر ہے۔ ٹرین نہیں۔

رضیہ : آپا جان!

(دونوں ہاتھوں میں صفیہ کو بھینچ لیتی ہے)

صفیہ : مجھے مضبوط پکڑ لو ——— مضبوط ——— مجھے چھوڑنا نہیں۔

رضیہ : آپ گھبرائیے نہیں۔ میں نہیں چھوڑوں گی۔

(صفیہ زار و قطار رو رہی ہے)

رضیہ : انھیں تھوڑا سا پانی پلائیے۔

احسن : پانی لو صفیہ۔

(پانی دیتا ہے)

(صفیہ پانی پیتی ہے۔ رضیہ پانی میں دوپٹہ بھگو کر ماتھے پر رکھتی ہے)

صفیہ : میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔

رضیہ : میں سر دباتی ہوں۔ آپ لیٹ جائیے۔

(رضیہ سر دباتی ہے۔ احسن پیر دباتا ہے۔ امّی جان دائیں جانب سے آتی ہیں)

امّی جان : (آہستہ سے) صفیہ کو پھر دورہ پڑا ؟

احسن : جی ہاں!

امّی جان : اللہ ہی حافظ ہے۔

**احسن** : اللہ سے دُعا کیجئے

**امّی جان** : آج کل دُعائیں بھی عرش تک نہیں پہنچتیں (کچھ دیر خاموشی کے بعد) ابھی تک اکبر میاں واپس نہیں آئے۔
عبدل نیلم کو لے کر بازار گیا تھا وہ بھی واپس نہیں لوٹا۔

**احسن** : دیر ہو گئی ہو گی۔ واپس آجائیں گے۔

**امّی جان** : اسما پھر بیٹھی رو رہی ہے۔

**رضیہ** : ابھی ابا جان نے اصغر بھائی کا نام لے کر غریب کا زخم پھر ہرا کر دیا۔

**امّی جان** : خدا خیر کرے۔

**رضیہ** : امّی جان۔ آپ ابا جان کا سر دبائیے۔ مَیں گھر کا کام کرتی ہوں۔

**امّی جان** : نہیں۔ تم یہاں رہو۔ مَیں کام کر رہی ہوں۔

**رضیہ** : (رونکھی ہو کر) امّی جان! آپ دن بھر خادماؤں کی طرح کام کرتی رہتی ہیں اور مجھے ہاتھ بھی نہیں بٹانے
دیتیں۔ جتنے غم آپ کو پہنچے ہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا بے حال ہو جائے۔

**امّی جان** : اللہ نے مجھے صبر دیا ہے۔

**رضیہ** : لیکن آپ اس قدر کام تو نہ کیجئے۔ آپ بیٹھئے یہاں۔ مَیں جاتی ہوں کام کرنے۔

**امّی جان** : نہیں تم یہیں بیٹھو۔

**احسن** : رضیہ بہن! تم اپنی امّی جان کی بات مان لو۔

(رضیہ کھانستی ہے۔ امّی جان چلی جاتی ہیں۔ رضیہ۔ صفیہ کا سر دباتی ہے۔
اور حسن پیر سہلاتا ہے۔ عبدل آتا ہے۔ گود میں نیلم ہے۔ نیلم بہت
دبلی ہو گئی ہے۔

**نیلم** : امّی جان! امّی جان!!

**احسن** : (خاموشی کا اشارہ کرتے ہوئے۔ جلدی سے نیلم کو اپنی گود میں لیتا ہے) اِشی۔ چُپ ہاں۔ تمہاری امّی جان
سو رہی ہیں۔

صفیہ : (آہستہ سے) نیلم !

احسن : نیلم عبدل کے ساتھ بازار کی سیر کر کے واپس آگئی۔ یہ دیکھو۔

(نیلم کو صفیہ کے پاس لے جاتا ہے)

صفیہ : میرے پاس بٹھا دو۔

احسن : تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔ نیلم کو میں گود میں لیے بیٹھا ہوں تم اطمینان رکھو (نیلم کو پیار کرتا ہے) نیلم بہت پیاری لڑکی ہے۔

عبدل : بیگم صاحب کی طبیعت کیسی ہے حضور ؟

رضیہ : ویسی ہی ہے۔ جیسے پہلے تھی۔

عبدل : خدا جلدی شفا دے۔

رضیہ : لاہور کی کیا خبریں ہیں ؟

عبدل : کیا بتاؤں حضور۔ سارے شہر میں سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔ اور مسلمان غصہ سے بھرے ہوئے ہیں۔

رضیہ : کیوں کیا ہوا ؟ خیر تو ہے ؟

عبدل : مسلمان مہاجروں کی ایک ٹرین دہلی سے آرہی تھی۔ اس میں ساڑھے تین ہزار کے قریب مسلمان تھے۔ جب وہ ٹرین یہاں پہنچی تو اس میں مشکل سے ڈھائی سو مسلمان زندہ بچے تھے۔

رضیہ : (ہلکی سی چیخ) تم سچ کہہ رہے ہو عبدل !

نیلم : ابا جانی ! آج تو ہم نے بہت خون دیکھا ——— اتنے سارے آدمی۔

احسن : (منع کرتے ہوئے) ایسی باتیں نہیں ——— تم آج اپنی گڑیا سے نہیں کھیلیں ؟

نیلم : میں عبدل کے ساتھ گئی تھی ہم نے اسٹیشن میں دیکھا۔ جہاں گاڑی آتی ہے۔

(رضیہ کھانستی ہے)

عبدل : حضور میرا تو خون کھول رہا ہے۔ میرا بس چلے تو ایک ہندو اور ایک سکھ کو زندہ نہ چھوڑوں۔ ظالموں نے کیسی بے دردی سے مسلمان بچوں اور عورتوں کو قتل کیا ہے۔

رضیہ : یہ سب مجھے مت بتائیے۔

(منہ چھپا لیتی ہے)

عبدل : مَیں نے بازار سے سامان لا دیا ہے۔ مَیں اب باہر جا رہا ہوں۔ اگر رات کو واپس نہ آؤں تو انتظار نہ کیجئے گا۔

احسن : تم کہاں جا رہے ہو ؟

عبدل : مَیں مسلمانوں کے خون بدلہ لوں گا۔

احسن : (اُٹھ کر آتا ہے کہ عبدل کو دونوں شانوں کو پکڑ لیتا ہے) نہیں عبدل! تم میری بات مانو! غصہ تھوک دو۔ یہ وقت بدلہ لینے کا نہیں ہے اور نہ اس طرح بدلہ لیا جا سکتا ہے۔ نہتے انسانوں کو مارنا کوئی بہادری نہیں ہے۔ اگر سکھ اور ہندو نہتے مسلمان عورتوں اور بچوں کو قتل کرتے ہیں۔ تو اس کا بدلہ یہ نہیں ہے۔ کہ تم بھی نہتے ہندوؤں اور سکھوں کو ان کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرو۔ ایسا کرنا مسلمان کی شان کے خلاف ہے۔

عبدل : مجھ سے اب اور دیکھا نہیں جاتا۔

احسن : تم سٹیشن نہ جایا کرو۔

عبدل : حضور! آپ تو مجھے کسی بات کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ بغیر پیسے دیئے کوئی چیز نہیں لینے دیتے۔ چاہے وہ کسی ہندو کا مال کیوں نہ ہو۔ ہمارا بھرا گھر دلی میں لٹ گیا۔ سارا زیور جسم پر سے سکھوں نے تلوار اور کرپانیں دکھا کر چھین لیا۔ اب ہم یہاں ہر چیز کو محتاج ہیں۔ یہاں ہندوؤں کے بھرے گھر پڑے ہیں۔ آپ ایک چیز بھی اٹھا کر لانے نہیں دیتے۔

رضیہ : اب ہم ان سب چیزوں کے بغیر بھی رہ سکتے ہیں عبدل۔

(دائیں جانب باہر سے امی جان عبدل کو آواز دیتی ہیں)

امی جان : (آواز) عبدل! ..

عبدل : آیا حضور!

(دائیں جانب باہر چلا جاتا ہے)

رضیہ : (کھانس کر) میں سوچتی رہتی ہوں کہ لاکھوں مسلمان۔ جو ہندوستان سے پاکستان میں ناداری کی حالت میں

آ رہے ہیں۔ کیسے وہ بارہ آباد ہوں گے ؟ کہاں اور کیسے پھر اپنا گھر بنائیں گے۔ معاش کا کیا بندوبست کریں گے؟
——— سو دو سو نہیں ——— لاکھوں مسلمان ۔ عورتیں ۔ بوڑھے ۔ بچے ایسے بھی جن کا دم لبوں
پہ ہے ۔ ایسے بھی جو اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے ہیں۔ ایسے بھی جو اب زندگی کی کش مکش کی تاب نہیں رکھتے۔ ایسے بھی
جن میں امید کی لہر نہیں رہی۔ ایسے بھی جن کا دنیا میں کوئی اپنا نہیں رہا۔

احسن : اللہ مالک ہے۔

( دائیں جانب سے امی جان آتی ہیں )

امی جان : عبدل چلا گیا ہے۔ کہہ گیا ہے اگر رات کو نہ آئے تو انتظار نہ کروں۔

رضیہ : اچھا!

امی جان : یہ کہاں گیا ہے ؟ کچھ معلوم ہے ؟

احسن : ( ٹالتے ہوئے ) آ جائے گا۔ کچھ کام ہو گا ——— بازار کا کچھ کام ہو تو مجھے بتا دیجئے گا۔ میں
کر دوں گا۔

امی جان : نہیں۔ ابھی تو کوئی کام نہیں ( نیلم سے ) نیلم ! چلو باہر چلو۔ اپنی اسما پھوپھی کے پاس۔ دیکھو وہ باہر
بیٹھی رو رہی ہیں۔ جا کر انہیں مناؤ۔ چلو۔

احسن : ہاں جاؤ نیلم۔

امی جان : چلو۔

( نیلم کی انگلی پکڑ کر چلتی ہیں )

نیلم : ( جاتے ہوئے آواز دیتی ہے ) اسما پھوپھی ——— اسما پھوپھی !

( نیلم اور امی جان دائیں جانب سے باہر چلی جاتی ہیں۔ کچھ دیر بعد
رضیہ رونے لگتی ہے )

احسن : تم رو رہی ہو۔ رضیہ بہن ؟

رضیہ : میں پانی پی آؤں ۔ ابھی آتی ہوں۔

(حسن دائیں جانب سے باہر جاتا ہے اور گلاس میں پانی لے کر
واپس آتا ہے)

احسن : لیجئے پانی!

رضیہ : (لے کر) شکریہ۔

(پانی پیتی ہے)

(چند لمحے خاموشی)

رضیہ : (کھانستے ہوئے) ابا جان۔ دہلی میں اکیلے ہیں۔ اس عمر میں بے آسرا رہ جانا کس قدر تکلیف دہ ہوگا۔ ان کی شفقت کسی اپنے کو ڈھونڈتی پھرتی ہوگی۔ ان کے کانوں میں ہماری آوازیں گونجتی ہوں گی۔ ہماری صورتیں ان کی نظروں کے سامنے ہوں گی۔ اور ہم ان سے اتنی دور ہیں۔ یہ فاصلہ دنیا میں سب سے طویل فاصلہ ہے۔

احسن : بڑی عمر میں ضد بڑھ جاتی ہے۔ انھیں ضد ہوگئی تھی۔ کہ دہلی نہیں چھوڑوں گا۔

رضیہ : لیکن انھوں نے وعدہ بھی تو کر لیا تھا لاہور آنے کا۔

احسن : انھوں نے اپنی زبان سے تو کبھی اقرار نہ کیا۔

رضیہ : ہم ہی دہلی سے نہ چلتے۔

احسن : جو ہو چکا۔ اس کے متعلق سوچنا بے سود ہے۔ اب دعا کرو کہ لاہور آ جائیں۔

رضیہ : (کھانستی ہے) بھائی جان ابھی تک واپس نہیں آئے۔

احسن : کسی کے آنے کی آواز تو آئی ہے ابھی ابھی۔

(دائیں جانب سے اکبر داخل ہوتا ہے لباس میلا ہے اور حال
پریشان چہرہ کسی تازہ غم میں ماتم کر رہا ہے۔ گردن جھکی ہوئی ہے
نظر اٹھ نہیں رہی)

رضیہ : آپ آ گئے بھائی جان۔ (اٹھ کر اکبر سے لپٹ جاتی ہے) ابا جان کی کوئی خبر معلوم ہوئی؟

اکبر : وہ نہیں آئے۔

رضیہ : (منت کرتے ہوئے) اچھے بھائی جان ۔ پوری بات بتائیے ۔

اکبر : (ٹالتے ہوئے) ارے بھائی ۔ وہ نہیں آئے ۔

رضیہ : کب آئیں گے ، یہ بھی معلوم ہوا ؟ کس طرح ہیں ؟ کہاں ہیں ؟

اکبر : (اپنے کو چھڑاتے ہوئے) تم اطمینان سے بیٹھو تو ۔

رضیہ : (اپنے پلنگ پر آ بیٹھتی ہے) بتائیے ۔

اکبر : (توقف کے بعد) ابا جان دہلی میں ہیں ۔ پرانے قلعہ سے جب مسلمان واپس شہر گئے تو ابا جان بھی شہر کے اپنے آبائی مکان میں جسے کر ایہ پر دے رکھا تھا جا کر رہ گئے ۔

رضیہ : اُن کی طبیعت کیسی ہے ؟ مجھے بتائیے تو ! مجھے بتا کیوں نہیں دیتے ؟

اکبر : ہمارے چلے آنے کے بعد تنہائی نے انہیں بہت پریشان کیا ۔ رات کو نیند نہ آئی ۔ شہر آئے تو اپنے محلے کی حالت دیکھ کر بہت مغموم ہوئے ۔ مکان والے اپنے مکان چھوڑ کر چلے گئے تھے ۔ گلی میں کوڑے اور گندگی کے ڈھیر لگے تھے محلہ سنسان پڑا تھا ۔ ابا جان دن رات روتے تھے ۔

رضیہ : یہ حال آپ کو کیسے معلوم ہوا ۔

اکبر : میرے ایک ملاقاتی کل ہوائی جہاز سے لاہور آئے ہیں ان سے معلوم ہوا ۔

رضیہ : کچھ اور بھی بتایا انھوں نے ؟

اکبر : ابا جان کو سخت بیچینی ہو گئی ہے ۔ اُن صاحب نے ابا جان سے بہت کہا کہ لاہور چلیئے ۔ لیکن وہ نہ آئے ۔

رضیہ : مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابا جان اب کبھی ہمارے پاس نہیں آئیں گے ۔ ہم کبھی ان کی صورت نہ دیکھ سکیں گے

( روتی ہے )

اکبر : دہلی کے مسلمان ۔ دہلی چھوڑ چھوڑ کر پاکستان آ رہے ہیں ۔

رضیہ : (روتے ہوئے) لیکن ابا جان دہلی نہیں چھوڑیں گے ۔

اکبر : رضیہ ! مجھے ایک گلاس پانی پلا دینا ۔

رضیہ : (آنسو پونچھتے ہوئے جاتی ہے) اچھا بھائی جان ۔

اکبر : (آہستہ سے) حسن بھائی۔ ابا جان کا دہلی میں انتقال ہوگیا ہے۔ مجھ میں تو تاب نہیں کہ ان مصیبت زدوں کو بتا سکوں کہ ان کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ —— حسن بھائی ——

(آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں)

حسن : انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اکبر : ہم میں اتنی کشش نہ تھی جو ابا جان کو پاکستان کھینچ لاتی۔ انہیں دہلی کی مٹی ہم سے زیادہ عزیز تھی۔

حسن : آپ آنسو پونچھیے بھائی جان! رضیہ آ رہی ہے۔

(رضیہ گلاس میں پانی لیے دائیں جانب سے آتی ہے)

رضیہ : لیجئے بھائی جان۔

اکبر : (ٹھنڈا سانس لے کر) اللہ!

(امی جان دائیں جانب سے داخل ہوتی ہیں)

امی جان : اکبر میاں! تمھارے ابا جان کی کچھ خبر ملی؟

اکبر : (عام لہجے میں) جی ہاں! امی جان۔ ابا جان دہلی میں ہیں اور جلدی لاہور آ جائیں گے۔

امی جان : اللہ مالک ہے۔ (ٹھنڈا سانس لے کر) مجھے امید نہیں کہ اب دوبارہ انہیں دیکھ سکوں گی۔

(امی جان باہر چلی جاتی ہیں رضیہ بھی گلاس لے کر باہر چلی جاتی ہے)

اکبر : امی جان کو کیا ہو گیا ہے۔

حسن : بالکل سُن ہو گئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم اتنا کھا گئی ہیں کہ اب غم ان میں حلول کر گیا ہے۔ غم کا عامیانہ اظہار ختم ہو گیا ہے۔ آنکھوں میں آنسو نہیں آتے۔ بالکل خاموش رہتی ہیں۔ نہ دہلی کا نام ان کی زبان پر آتا ہے نہ گھر کی کسی چیز کا ذکر کرتی ہیں۔ نہ چچا جان کی طرف سے پریشانی کا اظہار کرتی ہیں اور نہ صرف خرکسیا سے کیسی ہیں کرتی ہیں۔ رضیہ کو تپ دق کا موذی مرض کھائے جا رہا ہے۔ صفیہ چند گھنٹوں کی مہمان ہے۔ لیکن امی جان بالکل خاموش ہیں۔ جیسے ان کے اعصاب سُن ہو گئے ہیں۔

اکبر : خدا خیر کرے۔ امی جان کا یوں گم سم رہنا اچھا نہیں۔ ان کے سر پر غم کا طوفان ٹوٹ پڑا ہے۔ (چند لمحے

سوچتا ہے) میں سوچتا ہوں اب ہماری زندگی کیسے بسر ہوگی؟ صفیہ کی یہ حالت ہے۔ رضیہ دق کی مریض، اسماء کی آنکھ سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہے۔ امی جان غم سے بالکل بے اوسان ہیں۔ جو نقد ہمارے پاس تھا وہ ختم ہو رہا ہے۔ یہاں گرانی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ہماری کا خرچ ہے۔ تیمارداری کے لیے تمہارا گھر پر رہنا ضروری ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ روزی کا کیا بندوبست کروں؟

(صفیہ نیند میں خوف سے چیختی ہے۔ چند لمحے بعد رضیہ کھانسی ہوئی دائیں جانب سے اندر آتی ہے)

احسن : بھائی جان! میں تو صفیہ کی اس حالت کو دیکھ نہیں سکتا۔ مجھے اب زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں اور نہ اتنی سکت ہے کہ پھر سے کوئی کاروبار کرسکوں۔

اکبر : میں نے اپنی عمر کتابوں کی دنیا میں بسر کی ہے لیکن اب میری طبیعت نہیں چاہتی کہ کسی کتاب کو ہاتھ بھی لگاؤں۔ اتنا مطالعہ، اتنی جستجو اور مغز پاشی کے بعد اب اور دیدہ ریزی کی تاب نہیں۔ کوئی اور کام آتا نہیں جو کرسکوں۔

رضیہ : بھائی جان! آپ فکر نہ کیجیے۔ آپا جان اچھی ہوجائیں تو میں لڑکیوں یا بچوں کے کسی اسکول میں استانی کی نوکری کرلوں گی۔ اب ہماری ضرورتیں بھی زیادہ نہیں ہیں۔ ہم آسانی سے گذارہ کرلیں گے۔

اکبر : تم میں ہمت ہے رضیہ؟

رضیہ : جی ہاں! —— اچھا آپ ذرا منہ ہاتھ دھو لیجیے۔ دن بھر کی تھکن دور ہوجائے گی۔

اکبر : (اٹھتا ہے) میں تھک بھی گیا ہوں۔

(اکبر اور رضیہ دونوں دائیں جانب سے باہر جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد صفیہ آنکھیں کھولتی ہے)

صفیہ : (آہستہ سے) آپ کہاں ہیں؟

احسن : (لپک کر صفیہ کے پاس پہنچتا ہے) میں یہاں بیٹھا ہوں۔ تمہارے پاس۔ ادھر دیکھو۔

صفیہ : نہ معلوم میں کہاں بھٹکتی پھرتی ہوں۔ میں پریشان ہو جاتی ہوں۔

احسن : لو۔ تھوڑی دیر اُٹھ بیٹھو۔

صفیہ : اچھا۔

احسن : (صفیہ کو سہارا دے کر بٹھا دیتا ہے اور خود سرہانے آ بیٹھتا ہے) تم اپنا سر میرے سینے سے لگا لو۔

صفیہ : ہاں! (سر لگا کر آنکھیں بند کر لیتی ہے) تمہارے دل کی حرکت مجھے سنائی دے رہی ہے۔

احسن : (مسکرا کر) اچھا بتاؤ تو یہ کیا کہہ رہا ہے؟

صفیہ : (مسکرا کر) وہی جو پہلے کہا کرتا تھا۔

احسن : (آہستہ سے) تم میری ہو۔

صفیہ : ہاں! (اپنا رخسار احسن کے سینے سے لگا دیتی ہے اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگتی ہے) تم کتنے اچھے ہو؟

احسن : تم آنکھیں بند کر لو۔ میں تمہارے بال اُنگلیوں سے سنوارتا ہوں۔ نرم نرم۔ چمکیلے بالوں میں میری انگلیاں ایسا معلوم ہوگا کہ ہلکی ہلکی کُہر میں صبح کے سُورج کی کرنیں۔ ہلکی ہلکی۔ گرم گرم۔ تم آنکھیں بند کیے کوئی خوبصورت سا خیال اپنا تی رہو ——— کوئی بہت ہی خوبصورت خیال ——— جیسے تم بے داغ سنگِ مرمر کے حوض کے پاس بیٹھی ہو۔ حوض میں کنول کھلے ہوئے ہیں۔ ——— سفید ——— گلابی ——— اور ان کے گول گول بڑے سبز پتوں پر پانی کے قطرے ہیرے کی طرح چمک رہے ہیں۔ اُن پھولوں کے درمیان راج ہنس، پنے شفاف سفید پر پھیلائے تیر رہے ہیں ——— ایک دوسرے کے پیچھے اس پتے کے پاس سے گذرے اور اس پھول کا طواف کیا ——— پیچھے پانی کی سطح پر سلوٹیں آ گئیں ——— تم نے بھیل کے دو دانے پانی میں ڈالے ——— راج ہنس ایک دوسرے کے پیچھے تیزی سے دوڑتے آئے۔ خاموش ——— بے آواز ——— شبک رفتاری کے ساتھ ——— تمہارے بالکل پاس آ گئے بالکل پاس ——— ان کے سفید پَر ——— نرم اور صاف ——— جیسے آسمان پر سفید بادل تیرتے ہوں ——— سفید گہرے نیلے آسمان پر ——— اس گرد آلود زمین سے بہت اُوپر۔

(خاموش ہو جاتا ہے)

صفیہ : (چند لمحے بعد) تم خاموش کیوں ہو گئے۔ کہتے جاؤ۔ نہیں تو یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔

احسن : تم خود بھی تو حسین خواب دیکھنے کی کوشش کرو۔

صفیہ : اب تو حسین خواب بھی بھیانک نظر آتے ہیں کبھی میں نور جہاں اور ممتاز محل کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ لیکن اب ——— خواب زندگی سے زیادہ بھیانک ۔ ڈراؤنے ۔

احسن : تمہارے دل میں ڈر بیٹھ گیا ہے۔ اسے نکال دو۔ اب تم پاکستان میں ہو۔ یہاں نہ سکھ تمہاری طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھ سکتے ہیں ۔ اور نہ ہندو۔ تم اپنے دل سے ڈر نکال دو۔

صفیہ : میں خود اپنے کو بہت سمجھاتی ہوں ۔

احسن : تم بالکل بچی ہو۔ اب مت گھبرایا کرو ۔

صفیہ : میں کیا کروں ۔ مجھے اپنے پر قابو نہیں رہتا۔ میری نظر کے سامنے سکھ ہی خونیں آنکھیں اور ننگی تلواریں چمکاتے رہتے ہیں ۔ ( کانپ کر ) مجھے ڈر لگ رہا ہے ۔

( ایک ہلکی سی چیخ مارتی ہے اور منہ اوندھا کر پڑ جاتی ہے )

( نیلم روتی ہے اور بھاگی بھاگی دائیں جانب سے اندر آتی ہے )

نیلم : ابا میاں ! نانی جان کو کیا ہو گیا ہے ؟ ——— نانی جان !

( اسماء روتی ہوئی نیلم کے پیچھے پیچھے دائیں جانب سے آتی ہے )

اسماء : نیلم آؤ۔ میری گود میں۔ تمہاری امی جان جاگ جائیں گی۔

( نیلم کو گود میں لے کر اس کا منہ ہاتھ سے ڈھانک لیتی ہے کہ آواز طلب نہ ہو )

احسن : ( گھبرا کر ) کیا ہوا بچی جان کو ؟

اسماء : ( روتے ہوئے ۔ باہر جاتے ہوئے )

احسن : یا اللہ !

( گھبرا کر بھاگتا ہے اور اسماء کے پیچھے دائیں جانب سے باہر جاتا ہے۔ صفیہ کمرے میں اکیلی ہے وہ ایکبار اٹھ بیٹھتی ہے اور خوف سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دور کوئی بھیانک منظر دیکھتی ہے۔ ایک چیخ مارتی ہے اور بے ہوش ہو کر پلنگ پر گر جاتی ہے )